الجہاد فی الاسلام

اِسلامی جہاد کی حقیقت، اُس کی ضرورت و اہمیّت
اور اُس کے متعلّقہ تمام اصُولی مباحث پر مفصّل گفتگو

تألیف

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

شائع کردہ

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور (پاکستان)

یمت غیر مجلد اڑھ روپے

خطبات

دیہاتی مسلمانوں کو اسلام کی حقیقت اور اُس کی رُوح سے واقف کرنے
اور اُنہیں اسلام کے پیش کردہ نظامِ زندگی سے آگاہ کرنے کی ایک کوشش

تالیف

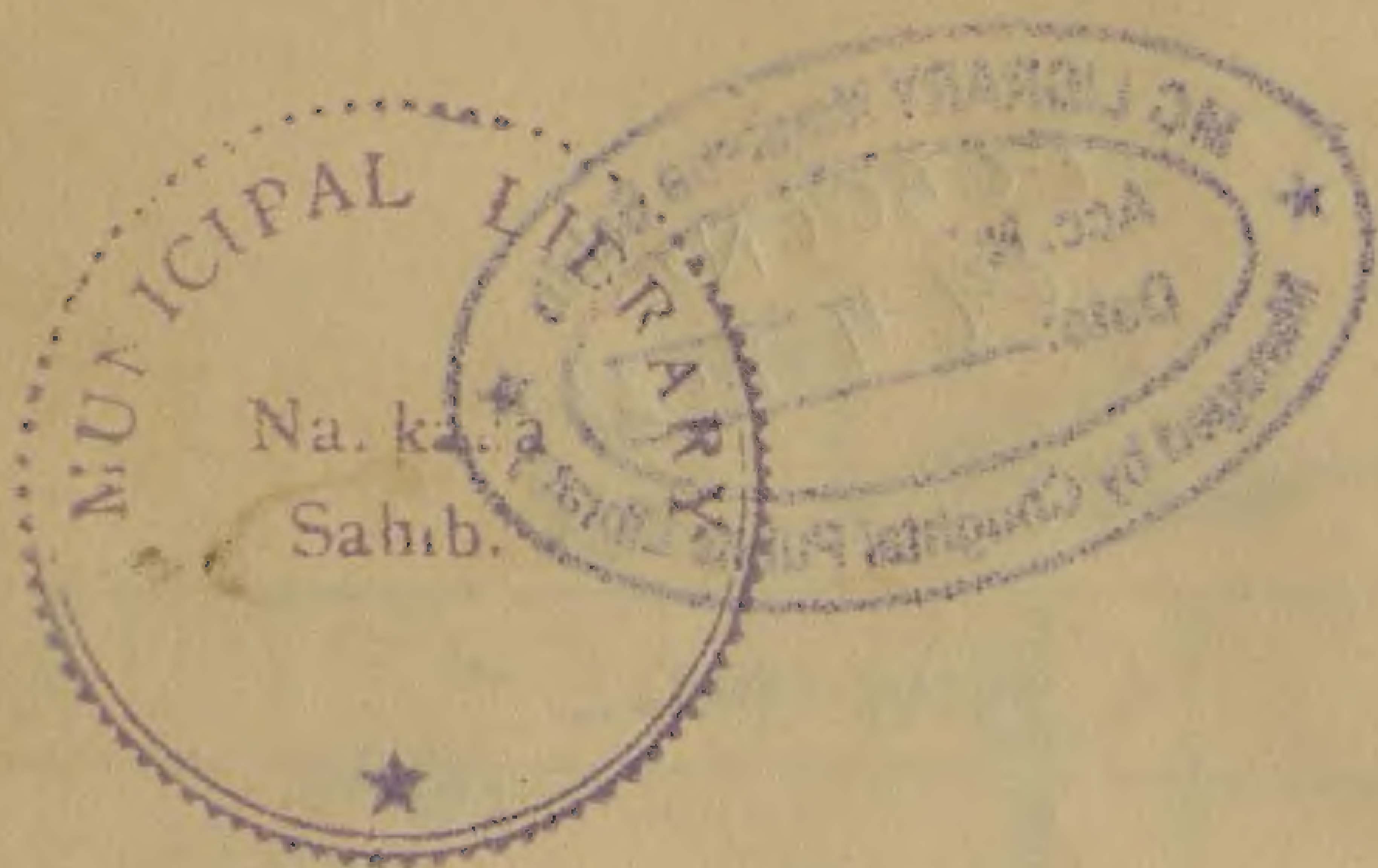
سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت غیر مجلد نیا ایڈیشن تین روپے

تنقیحات

تنقیحات یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔

۳۰۲ صفحات۔ قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک



الجہاد فی الاسلام

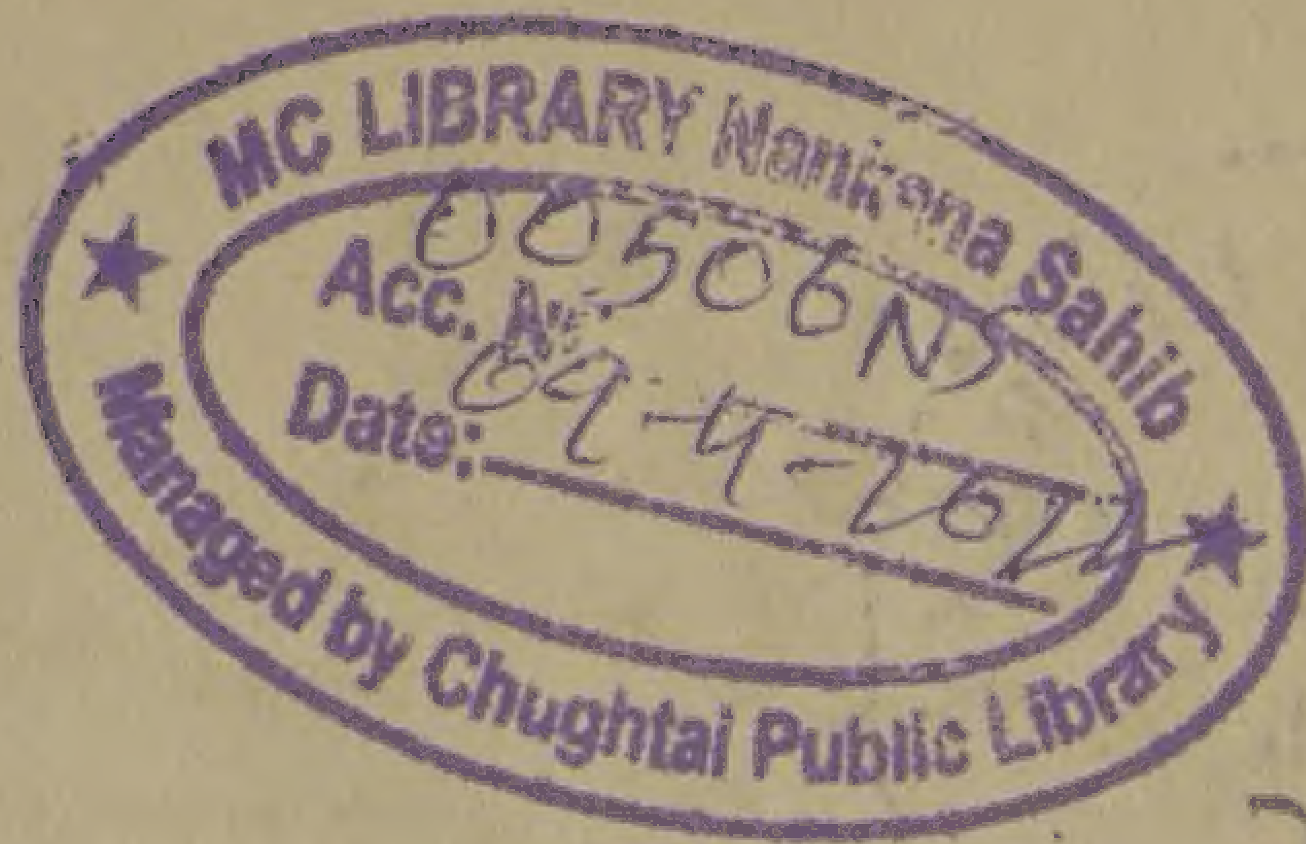
تالیف

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

شائع کردہ

دفتر "ترجمان القرآن" لاہور (پاکستان)

قیمت غیر مجلد:- آٹھ روپے



سید ابوالاعلیٰ مودودی، پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس، لاہور
میں چھپوا کر دفتر "ترجمان القرآن" اچھرہ
لاہور سے شائع کیا

طبع اول .... سنہ ۱۹۳۰ء

طبع دوم .... سنہ ۱۹۴۸ء ۳۰۰۰

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع اوّل

دورِ جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کے لئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں۔ اُن میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی۔ تو قدرتی طور پر اسے اس وقت پیش ہونا چاہیئے تھا جب پیروانِ اسلام کی شمشیرِ خارا شگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ برپا کر رکھا تھا اور فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید ان کے یہ فاتحانہ اقدامات کسی خونریز تعلیم کا نتیجہ ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتابِ عروجِ اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اس کے خیالی پتلے میں اس وقت روح پھونکی گئی جب اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس بہتان کے مصنف یورپ کی تلوار بیگناہوں کے خون سے سُرخ ہو رہی تھی۔ اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اس طرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں، جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرے کو رنگین کر دیا ہو، اور جو خود دوسری قوموں پر ڈاکے ڈال رہے ہوں، اُنہیں کیا حق ہے کہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جن کی فردِ جرم خود اُن پر لگنی چاہیئے؟ کیا اس تمام مورخانہ تحقیق و تفتیش اور عالمانہ بحث، و اکتشاف سے ان کا یہ منشا تو نہیں کہ دنیا کی اس نفرت و ناراضی کے سیلاب کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیں جس کے خود اُن کی اپنی خونریزیوں کے خلاف اُمنڈ کر آنے کا اندیشہ ہے؟ لیکن انسان کی یہ کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو

میدان میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے، جس کی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا، اور اسی لئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلوار بند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں چنانچہ اس مشاہدہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اس کے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اس طرح قبول کر لیا کہ کسی آسمانی وحی کو بھی اس طرح قبول نہ کیا ہوگا۔

گذشتہ اور موجودہ صدی میں مسلمانوں کی طرف سے بارہا اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے اور اس کثرت کے ساتھ اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے کہ اب یہ ایک فرسودہ اور پامال سا مضمون معلوم ہوتا ہے، مگر اس قسم کی جوابی تحریرات میں میں نے اکثر یہ نقص دیکھا ہے کہ اسلام کے وکلاء مخالفین سے مرعوب ہو کر خود بخود ملزموں کے کٹہرے میں جا کھڑے ہوتے ہیں اور مجرموں کی طرح صفائی پیش کرنے لگتے ہیں بعض حضرات نے تو یہاں تک کیا ہے کہ اپنے مقدمہ کو مضبوط بنانے کے لئے سرے سے اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین ہی میں ترمیم کر ڈالی اور شدت مرعوبیت میں جن جن چیزوں کو انہوں نے اپنے نزدیک خوفناک سمجھا انہیں ریکارڈ پر سے بالکل غائب کر دیا تاکہ مخالفین کی نظر اس پر نہ پڑ سکے لیکن جن لوگوں نے ایسا کمزور پہلو اختیار نہیں کیا ان کے ہاں بھی کم از کم یہ نقص ضرور موجود ہے کہ وہ جہاد و قتال کے متعلق اسلامی تعلیمات کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کرتے اور بہت سے پہلو اس طرح تشنہ چھوڑ جاتے ہیں کہ ان میں شک و شبہ کی بہت کچھ گنجائش باقی رہتی ہے۔ غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے اصلی ضرورت اس امر کی ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ اور قتال لغرض اعلائے کلمۃ الٰہی کے متعلق اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بکم و کاست اسی طرح بیان کر دیا جائے جس طرح وہ قرآن مجید، احادیث نبوی اور کتب فقہیہ میں درج ہیں۔ ان میں سے کسی چیز کو نہ گھٹایا جائے، نہ بڑھایا جائے، اور نہ اسلام کے اصلی منشاء اور اس کی تعلیم کی روح کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ میں اس طریقہ سے اصولی اختلاف رکھتا ہوں کہ ہم اپنے عقائد و اصول کو دوسروں کے نقطۂ نظر کے مطابق ڈھال کر پیش کریں۔ دنیا کا کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں تمام لوگ ایک نقطۂ نظر پر متفق ہوں۔ ہر جماعت اپنا ایک الگ نقطۂ نظر رکھتی ہے اور اس

کو صحیح سمجھتی ہے۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ پس ہم دوسروں کے نقطۂ نظر کی رعایت سے اپنے اصول وعقائد کو خواہ کتنا ہی رنگ کر پیش کریں یہ ناممکن ہے کہ تمام مختلف الخیال گروہ ہم سے متفق ہو جائیں اور سب کو ہمارا وہ رنگ پسند آ جائے۔ اس لئے زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے عقائد، اپنے مسائل، اپنی تعلیمات، اور اپنے قوانین کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کر دیں، بہتر سے بہتر طریقہ سے دنیا کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کریں، اور پھر خود اُس کی عقل پر چھوڑ دیں کہ خواہ اُسے قبول کرے یا نہ کرے۔ اگر قبول کرے تو زہے نصیب، نہ قبول کرے تو ہمیں اُس کی کوئی پرواہ نہیں۔ یہ دعوت و تبلیغ کا صحیح اصول ہے جسے ہمیشہ سے ارباب عزم لوگوں نے اختیار کیا ہے۔ اور خود انبیاء علیہم السلام نے بھی اسی پر عمل کیا ہے

میں ایک عرصہ سے اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا، مگر احساسِ ضرورت سے بڑھکر عمل کی جانب کوئی اقدام نہ کر سکتا تھا، کیونکہ اس کام کے لئے بڑی فرصت درکار تھی اور فرصت ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو کسی اخبار نویس کو میسّر نہیں آتی۔

لیکن دسمبر ۱۹۲۶ء کی آخری تاریخوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے مشکلات سے قطع نظر کر کے اقدامِ عمل پر مجبور کر دیا۔ یہ واقعہ شدھی کی تحریک کے بانی سوامی شردہانند کے قتل کا واقعہ تھا جس سے جہلا اور کم نظر لوگوں کو اسلامی جہاد کے متعلق غلط خیالات کی اشاعت کا ایک نیا موقع مل گیا، کیونکہ بدقسمتی سے ایک مسلمان اس فعل کے ارتکاب کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا اور اخبارات میں اس کی جانب یہ خیالات منسوب کئے گئے تھے کہ اس نے اپنے مذہب کا دشمن سمجھکر سوامی کو قتل کیا ہے، اور یہ کہ اس نیک کام کے کرنے سے وہ جنت کا امیدوار ہے۔ حقیقت کا علم تو خدا کو ہے، مگر منظرِ عام پر جو کچھ آیا وہ یہی واقعات تھے۔ ان کی وجہ سے عام طور پر اسلام کے دشمنوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا، انہوں نے علمائے اسلام کے اعلانات اور اسلامی جرائد وعمائدِ ملت کی متفقہ تصریحات کے باوجود اس واقعہ کو اس کی طبعی حد تک محدود رکھنے کے بجائے تمام امتِ مسلمہ کو بلکہ خود اسلامی تعلیمات کو اس کا ذمہ دار قرار دینا شروع کر دیا، اور قرآن کریم کے خلاف اس قسم کے الزامات عائد کرنے لگے کہ اُس کی تعلیم مسلمانوں کو خونخوار و قاتل بناتی ہے، اس کی تعلیم امن و امان اور مسالمت کے

خلاف ہے، اور اس کی تعلیم نے مسلمانوں کو ایسا متعصب بنا دیا ہے کہ وہ ہر کافر کو گردن زدنی سمجھتے ہیں اور اسے قتل کرکے جنت میں جانے کی امید رکھتے ہیں۔ بعض دریدہ دہنوں نے تو یہاں تک کہدیا کہ دنیا میں جب تک قرآن کی تعلیم موجود ہے، امن قائم نہیں ہوسکتا اس لئے تمام عالم انسانی کو اس تعلیم کے مٹانے کی کوشش کرنی چاہئیے۔ ان غلط خیالات کی نشر و اشاعت اس کثرت کے ساتھ کی گئی کہ صحیح الخیال لوگوں کی عقلیں بھی چکرا گئیں اور گاندھی جیسے شخص نے، جو ہندو قوم میں سب سے بڑے صائب الرائے آدمی ہیں، اس سے متاثر ہوکر بتکرار اس خیال کا اظہار کیا کہ:-

"اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے"

اگرچہ یہ تمام خیالات کسی تحقیق اور علمی تفحص پر مبنی نہ تھے، بلکہ "طوطی" کی طرح وہی سبق دہرایا جا رہا تھا جو "استاد ازل" نے سکھا رکھا تھا، مگر ایک غیر معمولی واقعہ نے ان اوہام میں حقیقت کا رنگ پیدا کر دیا تھا جس سے ناواقف لوگ آسانی کے ساتھ دھوکا کھا سکتے تھے۔ چونکہ ایسی عام بدگمانیاں اشاعت اسلام کی راہ میں ہمیشہ حائل ہوتی ہیں، اور ایسے ہی مواقع ہوتے ہیں جن میں اسلام کی صحیح تعلیم کو زیادہ صفائی کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ غبار چھنٹ جائے اور آفتاب حقیقت زیادہ روشنی کے ساتھ طلوع ہو، اس لئے میں نے فرصت کا انتظار چھوڑ کر اپنے اسی قلیل وقت میں جو ترتیب اخبار سے باقی بچتا تھا پیش نظر مضمون کی تحریر و تسوید کا کام شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ اخبار "الجمعیۃ" کے کالموں میں اس کی اشاعت بھی شروع کر دی۔ ابتداءً محض ایک مختصر مضمون لکھنے کا ارادہ تھا مگر سلسلۂ کلام چھڑنے کے بعد بحث کے اس قدر گوشے سامنے آتے چلے گئے کہ اخبار کے کالموں میں ان کا سمانا مشکل ہوگیا۔ اس لئے مجبوراً ۲۳ - ۲۴ نمبر شائع کرنے کے بعد میں نے اخبار میں اس کی اشاعت بند کر دی اور اب اس پورے سلسلہ کو مکمل کرکے کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ اگرچہ یہ کتاب مبحث کے اکثر پہلوؤں پر حاوی ہے، لیکن پھر بھی مجھے افسوس ہے کہ وقت کی کمی نے بہت سے مباحث کو تشنہ رکھنے پر مجبور کیا ہے اور جن مضامین کی توضیح کے لئے ایک مستقل باب کی ضرورت تھی انہیں ایک

ایک دو دو فقرے دل میں ادا کرنا پڑا ہے۔ اس کتاب میں میں نے خصوصیت کے ساتھ اس امر کا التزام رکھا ہے کہ کہیں اپنے یا دوسرے لوگوں کے ذاتی خیالات کو دخل نہیں دیا۔ بلکہ تمام کلی وجزئی مسائل قرآن مجید سے اخذ کرکے پیش کیے ہیں، اور جہاں کہیں ان کی توضیح کی ضرورت پیش آئی ہے، احادیث نبوی معتبر کتب فقہیہ، اور صحیح ومستند تفاسیر سے مدد لی ہے تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ آج دنیا کا رنگ دیکھ کر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی گئی ہے بلکہ جو کچھ کہا گیا ہے سب اللہ اور اس کے رسول اور ائمہ اسلام کے ارشادات پر مبنی ہے۔

میں تمام ان غیر مسلم حضرات سے، جو تعصب کی بنا پر اسلام سے اندھی دشمنی نہیں رکھتے، درخواست کرتا ہوں کہ اس کتاب میں اسلام کی اصلی تعلیم جنگ کا مطالعہ کریں اور اس کے بعد بتائیں کہ انہیں اس تعلیم پر کیا اعتراض ہے۔ اگر اس کے بعد بھی کسی شخص کو کچھ شک باقی ہو تو میں اسے رفع کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔

ابوالاعلیٰ

دہلی۔ ۱۵ ؍ جون ۱۹۲۷ء

دیباچہ طبع دوم

یہ کتاب کئی سال سے نایاب ہو گئی تھی۔ اوّل تو جنگ کے زمانے میں اتنی ضخیم کتاب کا طبع کرانا مشکل تھا، دوسرے اس خیال سے بھی میں نے اس کی طبع ثانی کو روک رکھا تھا کہ دوسری جنگ عظیم سے بین الاقوامی قانون میں جو تغیرات ہو رہے تھے اُن پر ایک تبصرے کا اس کتاب میں اضافہ کر دیا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ اسی دوران میں میری صحت خراب ہو گئی اور میرے لئے مطالعہ اور تحریر کا کام سخت مشکل ہو گیا۔ اب یہ کتاب محض تھوڑی سی ضروری ترمیم و اصلاح کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کام کی قوت عطا فرما دی تو کسی آئندہ ایڈیشن میں یہ پیش نظر اضافے کر دیئے جائیں گے۔

ابوالاعلیٰ

۱۲ رمضان ۱۳۶۶ھ (۳۱ جولائی ۱۹۴۷ء)

باب اوّل

اِسلامی جہاد کی حقیقت

انسانی جان کا احترام | انسانی تمدن کی بنیاد جس قانون پر قائم ہے اس کی سب سے پہلی دفعہ یہ ہے کہ انسان کی جان اور اس کا خون محترم ہے۔ انسان کے مدنی حقوق میں اولین حق زندہ رہنے کا حق ہے، اور اس کے مدنی فرائض میں اولین فرض زندہ رہنے دینے کا فرض ہے۔ دنیا کی جتنی شریعتیں اور مہذب قوانین ہیں ان سب میں احترامِ نفس کا یہ اخلاقی اصول ضرور موجود ہے، اور جس قانون اور مذہب میں اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو وہ نہ تو مہذب انسانوں کا مذہب و قانون بن سکتا ہے، نہ اس کے ماتحت رہ کر کوئی انسانی جماعت پر امن زندگی بسر کر سکتی ہے، اور نہ اسے کوئی فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ ہر شخص کی عقل خود سمجھ سکتی ہے کہ اگر انسان کی جان کی کوئی قیمت نہ ہو، اس کا کوئی احترام نہ ہو، اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ ہو، تو چار آدمی کیسے مل کر رہ سکتے ہیں، ان میں کس طرح باہم کاروبار ہو سکتا ہے، انہیں وہ امن و اطمینان اور وہ بیخوفی و جمعیتِ خاطر کیونکر حاصل ہو سکتی ہے جس کی انسان کو تجارت، صنعت، اور زراعت کرنے، دولت کمانے، گھر بنانے، سیر و سفر کرنے اور متمدن زندگی بسر کرنے کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ پھر اگر ضروریات سے قطع نظر کر کے خالص انسانیت کی نظر سے دیکھا جائے تو اس لحاظ سے بھی کسی ذاتی فائدہ کی خاطر، یا کسی ذاتی عداوت کی خاطر اپنے ایک بھائی کو قتل کرنا بدترین قساوت اور انتہائی سنگدلی ہے جس کا ارتکاب کر کے انسان میں کوئی اخلاقی بلندی پیدا ہونا تو درکنار، اس کا درجہ انسانیت پر قائم رہنا بھی محال ہے۔

دنیا کے سیاسی قوانین اس احترامِ حیاتِ انسانی کو صرف سزا کے خوف اور قوت کے زور سے قائم

رکھ سکتے ہیں۔ مگر ایک سچے مذہب کا کام دلوں میں اس کی صحیح قدر و قیمت پیدا کر دینا ہے تاکہ جہاں انسانی تعزیر کا خوف نہ ہو، اور جہاں انسانی پولیس روکنے والی نہ ہو، وہاں بھی بنی آدم ایک دوسرے کے خونِ ناحق سے محترز رہیں۔ اس نقطۂ نظر سے احترامِ نفس کی جیسی صحیح اور مؤثر تعلیم اسلام میں دی گئی ہے وہ کسی دوسرے مذہب میں ملنی مشکل ہے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف پیرایوں سے اس تعلیم کو دلنشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سورۂ مائدہ میں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بیان کر کے، جن میں سے ایک نے ظلماً دوسرے کو قتل کیا تھا، فرمایا ہے :-

مِنْ أَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ
فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۚ
وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۚ
وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ
اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ
لَمُسْرِفُوْنَ (رکوع ۵)

اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کو یہ لکھ کر دے دیا کہ جو کوئی کسی کی جان لے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد کیا ہو، تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا۔ اور جس نے کسی کی جان بچائی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو بچا لیا۔ ان لوگوں کے پاس ہمارے رسول کھلی کھلی ہدایات لیکر آئے مگر اس کے بعد بھی ان میں سے بہت ایسے ہیں جو زمین میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ خدا اپنے نیک بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے :-

لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ
اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ
يَلْقَ اَثَامًا (الفرقان-۶)

وہ اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے بغیر حق کے ہلاک نہیں کرتے، اور نہ زنا کرتے ہیں، اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ گناہ کی سزا پائے گا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے :-

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ
اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ
وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ

اے محمدؐ کہو کہ آؤ میں تم کو بتاؤں کہ اللہ نے تم پر کیا کیا حرام کیا ہے۔ تم پر واجب ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، والدین سے نیک سلوک کرو، اپنی اولاد کو

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (انعام - ۱۹)	مفلسی و تنگدستی کے باعث قتل نہ کرو ہم تمہاں تم کو رزق دیتے ہیں ان کو بھی دیں گے، بدکاریوں کے قریب بھی نہ پھٹکو، خواہ وہ چھپی ہوئی ہوں یا کھلی کسی ایسی جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے ہلاک نہ کرو بجز

اُس صورت کے کہ ایسا کرنا حق کا تقاضا ہو۔ اللہ نے ان باتوں کی تمہیں تاکید کی ہے، شاید کہ تم کو کچھ عقل آ جائے۔

اس تعلیم کے اولین مخاطب وہ لوگ تھے جن کے نزدیک انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں تھی اور جو اپنے ذاتی فائدہ کی خاطر ادنیٰ چیز کو بھی قتل کر دیا کرتے تھے۔ اس لئے داعی اسلام علیہ الف الف تحیۃ وسلام ان کی طبیعتوں کی اصلاح کے لئے خود بھی ہمیشہ احترام نفس کی تلقین فرماتے رہتے تھے اور یہ تلقین ہمیشہ نہایت موثر انداز میں ہوا کرتی تھی۔ احادیث میں کثرت سے اس قسم کے ارشادات پائے جاتے ہیں جن میں بے گناہ کا خون بہانے کو بدترین گناہ بتایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چند احادیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

انس بن مالک سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا:-

أَكْبَرُ الْكَبَائِرِ الْإِشْرَاكُ بِاللَّهِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَوْلُ الزُّورِ	بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، پھر قتل نفس، پھر والدین کی نافرمانی کرنا، پھر جھوٹ بولنا۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:-

لَنْ يَزَالَ الْمُؤْمِنُ فِي فُسْحَةٍ مِنْ دِينِهِ مَا لَمْ يُصِبْ دَمًا حَرَامًا	مومن اپنے دین کی وسعت میں اس وقت تک برابر رہتا ہے جب تک وہ کسی حرام خون کو نہیں بہاتا۔

نسائی میں ایک متواتر حدیث ہے کہ:-

أَوَّلُ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ الصَّلٰوةُ وَأَوَّلُ مَا يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِي الدِّمَاءِ۔	قیامت کے دن بندے سے سب سے پہلے جس چیز کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے۔ اور پہلی چیز جس کا فیصلہ لوگوں کے درمیان کیا جائے گا وہ خون کے دعوے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟

آپ نے فرمایا اَنْ تَدْعُوَ لِلّٰہِ نِدًّا وَّھُوَ خَلَقَکَ ۔ یہ کہ تو کسی کو اللہ کا نظیر و مثیل قرار دے حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا۔ اس نے پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا گناہ بڑا ہے؟ آپ نے جواب دیا۔ اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَکَ اَنْ یَّطْعَمَ مَعَکَ ، یہ کہ تو اپنے بچے کو قتل کر دے اس خیال سے کہ وہ تیرے کھانے میں شریک ہوگا۔ اس نے عرض کیا اس کے بعد کونسا گناہ ہے؟ آپ نے فرمایا اَنْ تُزَانِیَ حَلِیْلَۃَ جَارِکَ ، یہ کہ تو اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرے۔

دنیا پر اسلامی تعلیم کا اخلاقی اثر حرمتِ نفس کی یہ تعلیم کسی فلسفی یا مصلح کی نتیجۂ فکر نہ تھی کہ اس کا اثر صرف کتابوں اور مدرسوں تک محدود رہتا، بلکہ درحقیقت وہ خدا اور اس کے رسول کی تعلیم تھی، جس کا لفظ لفظ ہر مسلمان کا جزوِ ایمان تھا۔ اور جس کی تعمیل، تلقین اور تنفیذ ہر اس شخص پر فرض تھی جو کلمۂ اسلام کا قائل ہو، پس ایک چوتھائی صدی کے قلیل عرصہ ہی میں اس کی بدولت عرب جیسی خونخوار قوم کے اندر احترامِ نفس اور امن پسندی کا ایسا مادہ پیدا ہوگیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق قادسیہ سے صنعا تک ایک عورت تنہا سفر کرتی تھی اور کوئی اس کے جان و مال پر حملہ نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ یہ وہی ملک تھا جہاں پچیس سال پہلے بڑے بڑے قافلے بھی بے خوف نہیں گذر سکتے تھے۔ پھر جب مہذب دنیا کا آدھے سے زیادہ حصہ حکومت اسلامیہ کے ماتحت آگیا اور اسلام کے اخلاقی اثرات چار دانگ عالم میں پھیل گئے، تو اسلامی تعلیم نے انسان کی بہت سی غلط کاریوں اور گمراہیوں کی طرح انسانی جان کی اس بے قدری کا بھی استیصال کر دیا جو دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ آج دنیا کے مہذب قوانین میں حرمتِ نفس کو جو درجہ حاصل ہوا ہے وہ اس انقلاب کے نتائج میں سے ایک شاندار نتیجہ ہے جو اسلامی تعلیم نے دنیا کے اخلاقی ماحول میں برپا کیا تھا۔ ورنہ جس دورِ تاریک میں یہ تعلیم اتری تھی اس میں انسانی جان کی فی الحقیقت کوئی قیمت نہ تھی۔ عرب کی خونخواریوں کا نام تو اس سلسلہ میں دنیا نے بہت سنا ہے، مگر ان ممالک کی حالت بھی کچھ بہتر نہ تھی جو اس زمانہ میں دنیا کی تہذیب و شائستگی اور علم و حکمت کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ روم کے کولوسیم (Colosseum) کے افسانے اب تک تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں جس میں ہزارہا انسان شمشیر زنی (Gladiatory) کے کمالات اور رومی امراء کے تفریح طبع کا تماشا

کی نذر ہو گئے۔ مہمانوں کی تفریح کے لئے یا دوستوں کی تواضع کے لئے غلاموں کو درندوں سے پھڑوا دینا، یا جانوروں کی طرح ذبح کرا دینا، یا ان کے جلنے کا تماشا دیکھنا، یورپ اور ایشیا کے اکثر ممالک میں کوئی معیوب کام نہ تھا۔ قیدیوں اور غلاموں کو مختلف طریقوں سے عذاب دے دے کر مار ڈالنا اس عہد کا عام دستور تھا۔ جاہل و خونخوار امراء سے گذر کر یونان و روما کے بڑے بڑے حکماء و فلاسفہ کے اجتہادات میں بھی انسانی جانوں کو بے قصور ہلاک کرنے کی بہت سی وحشیانہ صورتیں جائز تھیں۔ ارسطو و افلاطون جیسے اساتذۂ اخلاق ماں کو یہ اختیار دینے میں کوئی خرابی نہ پاتے تھے کہ وہ اپنے جسم کے ایک حصّہ (یعنی جنین) کو الگ کر دے، چنانچہ یونان و روما میں اسقاطِ حمل کوئی ناجائز فعل نہ تھا۔ باپ کو اپنی اولاد کے قتل کا پورا حق تھا اور رومی مقننوں کو اپنے قانون کی اس خصوصیت پر فخر تھا کہ اس میں اولاد پر باپ کے اختیارات اس قدر غیر محدود ہیں۔ حکمائے رواقیین کے نزدیک خودکشی کوئی بُری چیز نہ تھی بلکہ ایک ایسی عزت کی بات تھی کہ لوگ جلسے کر کے ان میں خودکشیاں کیا کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ فلاطون جیسا حکیم بھی اسے کوئی بڑی معصیت نہ سمجھتا تھا۔ شوہر کے لئے اپنی بیوی کا قتل بالکل ایسا تھا جیسے وہ اپنے کسی پالتو جانور کو ذبح کر دے، اس لئے قانونِ یونان میں اس کی کوئی سزا نہ تھی۔ جیو رکھشا کا گہوارہ ہندوستان ان سب سے بڑھا ہوا تھا۔ یہاں مرد کی لاش پر زندہ عورت کو جلا[1] دینا ایک جائز فعل تھا اور مذہباً اس کی تاکید تھی۔ شودر کی جان کوئی قیمت نہ رکھتی تھی اور صرف اس بناء پر کہ وہ غریب برہما کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے، اس کا خون برہمن کے لئے حلال تھا۔ وید کی آواز سن لینا شودر کے لئے اتنا بڑا گناہ تھا کہ اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسا ڈال کر اسے مار ڈالنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری تھا۔ "جل پرواہ" کی رسم عام تھی جس کے مطابق ماں باپ اپنے پہلے بچہ کو دریائے گنگا کی نذر کر دیتے تھے اور اس قساوت کو اپنے لئے موجبِ سعادت سمجھتے تھے

ایسے تاریک دور میں اسلام نے آواز بلند کی کہ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔ انسانی جان کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، اس کو قتل نہ کرو مگر اُس وقت جبکہ حق اس کے قتل کا مطالبہ کرے۔ اس

[1] کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ عورتیں شوہر کی چتا میں جلائی نہ جاتی تھیں بلکہ خود جلتی تھیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مختلف طریقوں سے سوسائٹی کا دباؤ ہی ان کو یہ ہولناک خودکشی کرنے پر مجبور کرتا تھا۔

آواز میں ایک قوت تھی اور قوت کے ساتھ وہ "اہنسا پرمو دہرما" کی آواز کی طرح عقل اور فطرت کی مطابقت سے محروم نہ تھی۔ اس لئے وہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچی اس نے انسان کو اپنی جان کی صحیح قیمت سے آگاہ کیا۔ خواہ کسی قوم یا کسی ملک نے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کی ہو یا نہ کی ہو، اس کی اخلاقی زندگی اس آواز کا کسی نہ کسی حد تک اثر قبول کئے بغیر نہ رہی۔ اجتماعی تاریخ کا کوئی انصاف پسند عالم اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا کے اخلاقی قوانین میں انسانی جان کی حرمت قائم کرنے کا فخر جتنا اس آواز کو حاصل ہے اتنا "پہاڑی کے وعظ" یا "اہنسا پرمو دہرما" کی آواز کو حاصل نہیں ہے۔

قتل بالحق مگر ذرا غور سے دیکھو، فقط لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ اِلَّا بِالْحَقِّ بھی کہا ہے۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا نہیں کہا بلکہ اس کے ساتھ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ کا استثناء بھی کر دیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ کسی جان کو کسی حال میں قتل نہ کرو۔ ایسا کہا جاتا تو یہ تعلیم کا نقص ہوتا۔ عدل نہ ہوتا بلکہ حقیقتی ظلم ہوتا۔ دنیا کو اصلی ضرورت اس بات کی نہ تھی کہ انسان کو قانون کی پکڑ سے آزاد کر دیا جاتا اور اسے حق دے دیا جاتا کہ جتنا چاہے فساد کرے جتنی چاہے بدامنی پھیلائے، جس قدر چاہے ظلم و ستم کرے۔ بلکہ اصلی ضرورت یہ تھی کہ دنیا میں امن قائم کیا جائے، فتنہ و فساد کا بیج مٹا دیا جائے، اور ایسا قانون بنایا جائے جس کے تحت ہر شخص اپنے حدود میں آزاد ہو اور کوئی شخص ایک مقررہ حد سے تجاوز کر کے دوسروں کے مادی یا روحانی امن میں خلل برپا نہ کرے۔ پس اس کے لئے محض لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ کی حمایت ہی درکار نہ تھی بلکہ اِلَّا بِالْحَقِّ کی محافظ قوت بھی درکار تھی، ورنہ امن کی جگہ بدامنی ہوتی۔

دنیا کا کوئی قانون جو مکافاتِ عمل کے اصول سے خالی ہو کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔ انسانی فطرت اتنی اطاعت شعار نہیں ہے کہ جس چیز کا حکم دیا جائے اسے خوشی سے قبول کر لے، اور جس چیز سے منع کیا جائے اس کو خوشی سے ترک کر دے۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا میں فتنہ و فساد نام کو نہ ہوتا اور ملائکہ مقربین خدا سے نہ کہتے کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ "کیا آپ زمین میں اس انسان کو اپنا خلیفہ بنا رہے ہیں جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزی کرے گا؟" پس اس

کی سرکش طبیعت کو اطاعتِ امر پر مجبور کرنے کے لئے ایسے قانون کی ضرورت ہے جس میں حکم دینے کے ساتھ یہ بھی ہو کہ اگر تعمیل نہ کی گئی تو اس کی سزا کیا ہے۔ اور منع کرنے کے ساتھ یہ بھی ہو کہ اگر فعل ممنوع سے اجتناب نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ کیا بھگتنا پڑے گا۔ صرف لَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا (زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد نہ کرو) یا لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ (جس جان کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے قتل نہ کرو) کہنا کافی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے ساتھ یہ بھی نہ بتا دیا جائے کہ اگر اس گناہ عظیم سے کسی نے اجتناب نہ کیا اور فساد پھیلایا اور قتل و خون کیا تو اُسے کیا سزا دی جائے گی۔

انسانی تعلیم میں ایسا نقص رہ جانا ممکن ہے، مگر خدائی قانون اتنا ناقص نہیں ہو سکتا۔ اس نے صاف طور پر بتلا دیا کہ انسانی خون کی حرمت صرف اُسی وقت تک ہے جب تک اس پر حق نہ قائم ہو جائے۔ اسے زندگی کا حق صرف اسی حد تک دیا جا سکتا ہے، مگر جب وہ ان حدود سے تجاوز کر کے فتنہ و فساد پھیلائے، یا دوسروں کی جان پر ناحق حملہ کرے تو وہ اپنے حق حیات کو خود بخود کھو دیتا ہے، اس کے خون کی حرمت زائل ہو کر اباحت سے بدل جاتی ہے، اور پھر اس کی موت ہی انسانیت کی حیات ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ قتل بڑی بری چیز ہے مگر اس سے زیادہ بری چیز فتنہ و فساد ہے۔ جب کوئی شخص اس بڑے جرم کا مرتکب ہو تو اُس کی بڑی برائی کا اس چھوٹی برائی سے خاتمہ کر دینا ہی زیادہ بہتر ہے۔ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ اسی طرح جو شخص کسی دوسرے کی ناحق جان لے اس کے لئے حکم ہوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (تم پر مقتولوں کے لئے قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے) اور اس کے ساتھ اس امتیاز کو بھی مٹا دیا گیا جسے گمراہ قوموں نے اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں میں قائم کر لیا تھا۔ چنانچہ فرمایا وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ امیر غریب کو مار ڈالے یا آزاد غلام کو قتل کر دے تو وہ چھوڑ دیا جائے، بلکہ انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں، جان کے بدلے جان ہی لی جائے گی، خواہ امیر کی ہو یا غریب کی۔ پھر اس خیال سے کہ کسی کو اس ناگزیر خونریزی میں تامل نہ ہو فرمایا

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَّا أُولِي الْأَلْبَابِ، اے عقلمندو! اس قصاص کو موت نہ سمجھو بلکہ یہ تو فی الحقیقت سوسائٹی کی زندگی ہے جو اس کے جسم سے ایک فاسد و ہلاک پھوڑے کو کاٹ کر حاصل کی جاتی ہے۔ حیات فی القصاص کے اس فلسفہ کو حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر خوب سمجھایا ہے۔ ارشاد ہوا کہ اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا، اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ سننے والے کو حیرت ہوئی کہ مظلوم کی حمایت تو برحق، مگر یہ ظالم کی اعانت کیسی؟ پوچھا کہ یا رسول اللہ ہم مظلوم کی اعانت تو ضرور کریں گے لیکن ظالم کی اعانت کس طرح کریں؟ آپ نے فرمایا: تَأْخُذُ فَوْقَ يَدَيْهِ، اس طرح کہ تو اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اُسے ظلم سے باز رکھے۔ پس درحقیقت ظالم کو ظلم سے روکنا اور اس کے ساتھ جو سختی بھی کی جائے وہ سختی نہیں ہے بلکہ عین نرمی اور خود اس کی مدد ہے۔ اسی لئے اسلام میں حدود الٰہی کو قائم کرنے کی سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے اور اسے رحمت و برکت کا موجب بتایا گیا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اِقَامَةُ حَدٍّ مِنْ حُدُودِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ مَطَرِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً فِي بِلَادِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، اللہ کی حدوں میں سے ایک حد قائم کرنے کی برکت چالیس دن کی بارش سے زیادہ ہے۔ بارش کی برکت یہ ہے کہ اس سے زمین سیراب ہوتی ہے، فصلیں خوب تیار ہوتی ہیں، خوشحالی بڑھتی ہے۔ مگر اقامت حدود کی برکت اس سے بڑھ کر ہے کہ اس سے فتنہ و فساد، ظلم و بد امنی کی جڑ کٹتی ہے، خدا کی مخلوق کو امن چین سے زندگی بسر کرنا نصیب ہوتا ہے اور قیام امن سے وہ طمانیت میسر آتی ہے جو تمدن کی جان اور ترقی کی روح ہے۔

قتل بالحق اور قتل بغیر حق کا فرق

قتل بغیر حق کی ایسی سخت ممانعت، اور قتل بالحق کی ایسی سخت تاکید سے شریعت الٰہیہ نے افراط و تفریط کی دونوں راہیں چھوڑ کر عدل و توسط کی سیدھی راہ کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے۔ ایک طرف وہ مسرف اور حد سے تجاوز کرنے والا گروہ ہے جو انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا اور اپنی نفسانی خواہشات پر اسے قربان کر دینا جائز سمجھتا ہے۔ دوسری طرف وہ غلط فہم اور غلط بیں گروہ ہے جو خون کے تقدس اور ابدی حرمت کا قائل ہے اور کسی حال میں بھی اسے بہانا جائز نہیں سمجھتا۔ اسلامی شریعت نے ان دونوں غلط خیالوں کی تردید کر دی اور اس نے بتایا کہ نفس انسانی کی حرمت نہ تو کعبہ یا ماں بہن کی حرمت کی طرح ابدی ہے کہ کسی طرح

حلت سے بدل ہی نہ سکے، اور نہ اس کی قیمت اس قدر کم ہے کہ نفسانی جذبات کی تسکین کی خاطر اسے ہلاک کر دینا جائز ہو۔ اس نے ایک طرف یہ بتایا کہ انسان کی جان اس لئے نہیں ہے کہ تفریح طبع کے لئے اس کے بسمل وار تڑپنے کا تماشہ دیکھا جائے، اس کو جلا کر یا عقوبتیں دیکر لطف اٹھایا جائے۔ اس کو شخصی خواہشات کی راہ میں حائل دیکھ کر فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے، یا بے اصل توہمات اور غلط رسموں کی قربان گاہ پر اس کی بھینٹ چڑھائی جائے ایسی ناپاک اغراض کے لئے اس کا خون بہانا یقیناً حرام اور سخت معصیت ہے۔ مگر دوسری طرف یہ بھی بتایا کہ ایک چیز انسان کی جان سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور وہ "حق" ہے۔ وہ جب اس کے خون کا مطالبہ کرے تو اسے بہانا نہ صرف جائز بلکہ فرض ہے، اور اس کو نہ بہانا اوّل درجہ کی معصیت۔ انسان جب تک حق کا احترام کرتا ہے اس کا خون واجب الاحترام رہتا ہے، مگر جب وہ سرکشی اختیار کرکے "حق" پر دست درازی کرتا ہے تو اپنے خون کی قیمت خود کھو دیتا ہے، اور پھر اس خون کی قیمت اتنی بھی نہیں رہتی جتنی پانی کی ہوتی ہے۔

ناگزیر خونریزی یہ قتل بالحق اگرچہ صورت میں قتل بغیر حق کی طرح خونریزی ہی ہے، مگر یہ ناگزیر خونریزی ہے جس سے کسی حال میں چھٹکارا نہیں۔ اس کے بغیر نہ دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے، نہ شر و فساد کی جڑ کٹ سکتی ہے، نہ نیکوں کو بدوں کی شرارت سے نجات مل سکتی ہے، نہ حقدار کو حق مل سکتا ہے، نہ ایمانداروں کو ایمان اور ضمیر کی آزادی حاصل ہو سکتی ہے، نہ سرکشوں کو ان کے جائز حدود میں محدود رکھا جا سکتا ہے، اور نہ اللہ کی مخلوق کو مادی و روحانی چین میسر آسکتا ہے۔ اگر اسلام پر ایسی خونریزی کا الزام ہے تو اسے اس الزام کے قبول کرنے میں ذرہ برابر بھی عار نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اور کون ہے جس کا دامن اس ناگزیر خونریزی کی چھینٹوں سے سرخ نہیں ہے؟ بودھ مذہب کی اہنسا اس کو ناجائز کہتی ہے، مگر وہ بھی بھکشو اور گرہستی میں فرق کرنے پر مجبور ہوئی اور آخر اس نے ایک قلیل جماعت کے لئے نجات (نروان) کو مخصوص رکھنے کے بعد باقی تمام دنیا کو چند اخلاقی ہدایات دیکر گرہست دھرم اختیار کرنے کے لئے چھوڑ دیا جس میں سیاست، تعزیر، اور جنگ سب کچھ ہے۔ اسی طرح مسیحیت بھی جنگ کی کلّی تحریم کے باوجود آخر کار جنگ پر مجبور ہوئی اور جب رومی سلطنت کے مظالم برداشت کرنا اس کے لئے ناممکن ہوگیا تو آخر کار اس نے خود سلطنت پر قبضہ کرکے ایسی جنگ برپا کی جو ناگزیر خونریزی کی حد سے بھی بہت آگے نکل گئی۔ ہندو مذہب میں بھی متاخرین فلاسفہ نے "اہنسا پرمو دھرما" کا عقیدہ تجویز کیا اور جیو ہتیا

کرنے کو پاپ قرار دیا، مگر اسی عہد کے مقنن منو سے فتویٰ پوچھا گیا کہ "اگر کوئی شخص ہماری عورتوں پر دست درازی کرے یا ہمارا مال چھینے، یا ہمارے دھرم کی بے آبروئی کرے تو ہم کیا کریں"؟ تو اس نے جواب دیا کہ "ایسے جفاکار انسان کو ضرور مار ڈالنا چاہئیے، عام اس سے کہ وہ گورو ہو، یا عالم برہمن، بوڑھا ہو، یا نوجوان"۔

یہاں مذاہب کا مقابلہ کرکے اس ناگزیر خونریزی کی ضرورت ثابت کرنے کا موقع نہیں ہے۔ تقابلِ ادیان کی بحث ایک الگ چیز ہے جو اپنے موقع پر آئے گی اور اس وقت یہ ثابت ہو جائیگا کہ جو مذاہب جنگ کو بُرا سمجھتے ہیں وہ بھی عملی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اس ناگزیر چیز سے اپنے آپ کو مجتنب رکھنے میں ناکام رہے ہیں سردست ہمارا مدعا صرف یہ دکھلانا ہے کہ نمائشِ اخلاق کے لئے کوئی جماعت خواہ کیسے ہی بلند مگر خیالی فلسفوں تک پہنچ جائے لیکن عالمِ مادی میں آکر، جو سراسر کشمکش گاہِ عمل ہے، اسے دنیا کے تمام مسائل کو عملی صورتوں سے ہی حل کرنا پڑتا ہے اور یہ دنیا خود اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کی حقیقتوں کا عملی تدابیر سے مقابلہ کرے۔ خدائے اسلام کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ حرمتِ نفس کے لئے ویسے ہی خیالی لذت بخشنے والے اصول پیش کرتا جیسے کہ اہنسا کے عقیدہ میں پائے جاتے ہیں، اور یقیناً وہ اپنے معجزانہ کلام میں ان کو پیش کرکے دنیا کی عقلوں کو دنگ کر سکتا تھا۔ مگر اس فاطرِ کائنات کو خطابت اور تفلسف کی نمائش مقصود نہ تھی بلکہ وہ اپنے بندوں کے لئے ایک صحیح اور واضح دستور العمل پیش کرنا چاہتا تھا جس پر کاربند ہو کر ان کی دنیا اور دین درست ہو سکے اس لئے جب اس نے دیکھا کہ اِلَّا بِالْحَقِّ کے استثناء کے بغیر محض لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ کا عام حکم مفید نہیں ہو سکتا تو یہ اس کی بے عیب ذات سے بعید تھا کہ دنیا والوں کو لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ (تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو) کا طعنہ دینے کے باوجود انہیں زبان سے اہنسا پرمو دھرما کی آواز بلند کرنے اور ہاتھ سے تلوار چلانے کی تعلیم دیتا۔ پس یہ اللہ کی حکمتِ بالغہ ہی تھی کہ اس نے حرمتِ نفس کی تعلیم کے ساتھ قصاص کا قانون بھی مقرر کیا اور اس طرح اس قوت کے استعمال کو ضروری قرار دیا جس کا استعمال حرمتِ نفس کی حفاظت کیلئے ناگزیر ہے۔

اجتماعی فتنہ | یہ قصاص کا قانون جس طرح افراد کے لئے ہے اسی طرح جماعتوں کے لئے بھی ہے جس طرح افراد سرکش ہوتے ہیں اسی طرح جماعتیں اور قومیں بھی سرکش ہوتی ہیں جس طرح افراد حرص و طمع سے مغلوب ہو کر اپنی حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اسی طرح جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ اخلاقی مرض پیدا ہو جایا کرتا ہے اس لئے

جس طرح افراد کو قابو میں رکھنے اور تعدّی سے باز رکھنے کے لئے خونریزی ناگزیر ہوتی ہے اسی طرح جماعتوں اور قوموں کی بڑھتی ہوئی حرص و طمع اور بڑھتی ہوئی بدکاری کو روکنے کے لئے بھی جنگ ناگزیر ہوجاتی ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے انفرادی اور اجتماعی فتنہ میں کوئی فرق نہیں ہے، مگر کیفیت کے اعتبار سے عظیم الشان فرق ہے۔ افراد کا فتنہ ایک تنگ دائرے میں محدود ہوتا ہے، انسانوں کی ایک قلیل جماعت کو اس سے آزار پہنچتا ہے اور گز بھر زمین رنگین کر کے اس کا استیصال کیا جاسکتا ہے۔ مگر جماعتوں کا فتنہ ایک غیر محدود مصیبت ہوتا ہے جس سے بیشمار انسانوں کی زندگی دوبھر ہوجاتی ہے، پوری پوری قوموں پر عرصۂ حیات تنگ ہوجاتا ہے، تمدن کے سارے نظام میں ایک ہل چل برپا ہوجاتی ہے، اور اس کا استیصال خون کی ندیاں بہائے بغیر نہیں ہوسکتا جسے قرآن مجید میں اثخان فی الارض کے معنی خیز لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جماعتیں جب سرکشی پر آتی ہیں تو کوئی ایک فتنہ نہیں ہوتا جو وہ برپا کرتی ہوں۔ ان میں طرح طرح کے شیطان شامل ہوتے ہیں، اس لئے طرح طرح کی شیطانی قوتیں ان کے طوفان میں ابھر آتی ہیں اور ہزاروں قسم کے فتنے ان کی بدولت اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بعض ان میں دھن دولت کے لالچی ہوتے ہیں تو وہ غریب قوموں پر ڈاکے ڈالتے ہیں، ان کی تجارت پر قبضہ کرتے ہیں، ان کی صنعتوں کو برباد کرتے ہیں، ان کی محنت سے کمائے ہوئے روپے کو قسم قسم کی چالاکیوں سے لوٹتے ہیں اور قوت کے حق کی بنا پر اُس دولت سے اپنے خزانے بھرتے ہیں جس کی جائز حقدار وہ فاقہ کش مظلوم قومیں ہوتی ہیں۔ بعض ان میں ہوائے نفسانی کے بندے ہوتے ہیں تو وہ اپنے جیسے انسانوں کے خدا بن بیٹھتے ہیں، اپنی خواہشات پر کمزوروں کے حقوق قربان کرتے ہیں، عدل و انصاف کو مٹا کر ظلم و جفا کے علَم بلند کرتے ہیں، شریفوں اور نیکوکاروں کو دبا کر سفیہوں اور کمینوں کو سربلند کرتے ہیں، ان کے ناپاک اثر سے قوموں کے اخلاق تباہ ہوجاتے ہیں، محاسن اور فضائل کے چشمے سوکھ جاتے ہیں، اور ان کی جگہ خیانت، بدکاری، بے حیائی، سنگدلی، بے انصافی اور بے شمار دوسرے اخلاقی مفاسد کی بدرروئیں جاری ہوجاتی ہیں۔ پھر ان میں سے بعض وہ ہیں جن پر جہانگیری و کشورستانی کا بھوت سوار ہوتا ہے تو وہ بے بس اور کمزور قوموں کی آزادیاں سلب کرتے ہیں، خدا کے بے گناہ بندوں کے خون بہاتے ہیں، اپنی خواہشِ اقتدار کو پورا کرنے کے لئے زمین میں فساد

پھیلاتے ہیں اور آزاد انسانوں کو اُس غلامی کا طوق پہناتے ہیں جو تمام اخلاقی مفاسد کی جڑ ہے۔ ان شیطانی صفات کے ساتھ جب اکراہ فی الدین بھی شامل ہو جاتا ہے اور اِن ظالم جماعتوں میں سے کوئی جماعت اپنی اغراض کے لئے مذہب کو استعمال کر کے بندگانِ خدا کو مذہبی آزادی سے بھی محروم کر دیتی ہے، اور دوسروں پر اس وجہ سے ظلم و ستم توڑتی ہے کہ وہ اس کے مذہب کے بجائے اپنے مذہب کی پیروی کیوں کرتے ہیں تو یہ مصیبت اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے

جنگ ایک اخلاقی فرض ایسی حالت میں جنگ جائز ہی نہیں بلکہ فرض ہو جاتی ہے۔ اس وقت انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہوتی ہے کہ اُن ظالموں کے خون سے زمین کو سُرخ کر دیا جائے اور اُن مُفسدوں اور فتنہ پردازوں کے شر سے اللہ کے مظلوم و بے بس بندوں کو نجات دلائی جائے جو شیطان کی اُمّت بن کر اولادِ آدم پر اخلاقی، روحانی اور مادّی تباہی کی مصیبتیں نازل کرتے ہیں۔ وہ لوگ در اصل انسان نہیں ہوتے کہ انسانی ہمدردی کے مستحق ہوں بلکہ انسان کے لباس میں شیطان اور انسانیت کے حقیقی دشمن ہوتے ہیں جن کے ساتھ اصلی ہمدردی یہی ہے کہ ان کے شر کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔ وہ اپنے کرتوتوں سے اپنے حقِ حیات کو خود کھو دیتے ہیں۔ انہیں، اور اُن لوگوں کو جو اُن کے شر کو باقی رکھنے کے لئے ان کی مدد کریں، دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ وہ در حقیقت انسانیت کے جسم کا ایسا عضو ہوتے ہیں جس میں زہریلا اور فاسد مادہ بھر گیا ہو جس کے باقی رکھنے سے تمام جسم کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ اس لئے عقل و مصلحت اندیشی کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اُس فاسد و مفسد عضو کو کاٹ پھینکا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ دنیا میں کوئی تخیل پسند اخلاقی معلم یا متکلم؛ ایسا بھی ہو جس کے نزدیک ایسے ظالموں کا قتل بھی ناجائز ہو اور اس کی بزدل روح اُس خون کے سیلاب کے تصوّر سے کانپ اٹھتی ہو جو ان کا شر دفع کرنے میں بہتا ہے۔ مگر ایسا معلم دنیا کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں جا کر تقویٰ و ریاضت سے اپنی روح کو تو سرور و تسکین پہنچا سکتا ہے، مگر اس کی تعلیم دنیا کو بدی سے پاک کرنے اور ظلم و سرکشی سے محفوظ رکھنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ نفس کش انسانوں کی ایسی جماعت تو ضرور مہیا کر سکتا ہے جو مظلوموں کے ساتھ ظلم سہنے میں خود بھی شریک ہو جائے، مگر بلند حوصلہ انسانوں کی

ایسی جماعت پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے جو ظلم کو مٹا کر عدل قائم کر دے اور خلقِ خدا کے لیے امن چین سے رہنے اور انسانیت کے اعلیٰ نصب العین تک پہنچنے کے وسائل مہیا کر دے۔

عملی اخلاق جس کا مقصد تمدن کا صحیح نظام قائم کرنا ہے، دراصل ایک دوسرا ہی فلسفہ ہے جس میں خیالی لذت کے سامان ڈھونڈنا بیکار ہے جس طرح علمِ طب کا مقصد لذتِ کام و دہن نہیں بلکہ اصلاحِ بدن ہے، خواہ کڑوی دوا سے ہو یا میٹھی سے، اسی طرح اخلاق کا مقصد بھی لذتِ ذوق و نظر نہیں ہے بلکہ دنیا کی اصلاح ہے، خواہ سختی سے ہو یا نرمی سے۔ کوئی سچا اخلاقی مصلح تلوار اور قلم میں سے صرف ایک ہی چیز کو اختیار کرنے اور ایک ہی ذریعہ سے فریضۂ اصلاح انجام دینے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس کو اپنا کام پورا کرنے کے لئے دونوں چیزوں کی یکساں ضرورت ہے۔ جب تک زبانی تلقین و تبلیغ شوریدہ سر جماعتوں کو اخلاق و انسانیت کے حدود کا پابند بنانے میں کارگر ہو سکتی ہو، اُن کے خلاف تلوار استعمال کرنا ناجائز بلکہ حرام ہے۔ مگر جب کسی جماعت کی شرارت و بدباطنی اس حد سے گذر چکی ہو کہ اسے وعظ و تلقین سے راہِ راست پر لایا جا سکے اور اس کو دوسروں پر دست درازی کرنے، ان کے حقوق غصب کرنے، ان کی عزت و شرافت کو پامال کرنے، اور ان کی اخلاقی و روحانی اور مادی زندگی کو تباہ کرنے سے باز رکھنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے، تو ہر سچے بہی خواہِ انسانیت کا اولین فرض یہ ہے کہ اس کے خلاف تلوار اٹھائے اور اس وقت تک آرام نہ لے جب تک خدا کی مخلوق کو اس کے کھوئے ہوئے حقوق واپس نہ مل جائیں۔

جنگ کی مصلحت | جنگ کی اسی مصلحت و ضرورت کو خدائے حکیم و خبیر نے اپنے حکیمانہ ارشاد میں ظاہر فرمایا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۔ (الحج - ۶)

اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو صومعے اور گرجے اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے، مسمار کر دیئے جاتے۔

اس آیۂ مبارکہ میں صرف مسلمانوں کی مسجدوں ہی کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ تین اور چیزوں کا بھی ذکر فرمایا ہے یعنی صوامع، بیع اور صلوات۔ صوامع سے مراد عیسائیوں کے راہب خانے، مجوسیوں کے

معابد اور صابیوں کے عبادت خانے ہیں۔ بیع کے لفظ میں عیسائیوں کے گرجے اور یہودیوں کے کنائس دونوں داخل ہیں۔ یہ جامع الفاظ استعمال کرنے کے بعد پھر صلوات کا ایک اور وسیع لفظ استعمال کیا جس کا اطلاق ہر موضع عبادت الٰہی پر ہوتا ہے۔ اور ان سب کے آخر میں مساجد کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر اللہ عادل انسانوں کے ذریعہ ظالم انسانوں کو دفع نہ کرتا رہتا تو اتنا فساد برپا ہوتا کہ عبادت گاہیں تک بربادی سے نہ بچتیں جن سے ضرر کا کسی کو اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ فساد کی سب سے زیادہ مکروہ صورت یہ ہے کہ ایک قوم عداوت کی راہ سے دوسری قوم کے معبدوں تک کو برباد کر دے۔ اور پھر نہایت بلیغ انداز میں اپنے اس منشا کا بھی اظہار کر دیا کہ جب کوئی گروہ ایسا فساد برپا کرتا ہے تو ہم کسی دوسرے گروہ کے ذریعہ اس کی شرارت کا استیصال کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

جنگ کی اسی مصلحت کو دوسری جگہ جالوت کی سرکشی اور حضرت داؤدؑ کے ہاتھ سے اس کے مارے جانے کا ذکر کرتے ہوئے یوں بیان فرمایا ہے:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (البقرہ۔ ۳۳)	اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی مگر اللہ تو دنیا پر بڑا فضل کرتا ہے۔

ایک اور جگہ قوموں کی باہمی عداوت و دشمنی کا ذکر کر کے اس طرح ارشاد ہوتا ہے:۔

كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (المائدہ۔ ۹)	یہ لوگ جب کبھی جنگ و خونریزی کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اس کو بجھا دیتا ہے۔ یہ لوگ زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔

جہاد فی سبیل اللہ یہی فساد و بدامنی، طمع و ہوس، بغض و عداوت اور تعصب و تنگ نظری کی جنگ ہے جس کی آگ کو فرو کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو تلوار اٹھانے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّہُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِہِمْ لَقَدِیْرُ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِہِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ۔ (الحج - ۶)	جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے انہیں لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے، اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بے قصور نکالے گئے ہیں۔

ان کا قصور صرف یہ تھا کہ یہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے تھے۔

یہ اسلام میں پہلی آیتہ ہے جو قتال کے بارے میں اتری ہے۔ اس میں جن لوگوں کے خلاف جنگ کا حکم دیا گیا ہے ان کا قصور یہ نہیں بتایا کہ ان کے پاس ایک زرخیز ملک ہے، یا وہ تجارت کی ایک بڑی منڈی کے مالک ہیں، یا وہ ایک دوسرے مذہب کی پیروی کرتے ہیں، بلکہ ان کا جرم صاف طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ظلم کرتے ہیں، لوگوں کو بے قصور ان کے گھروں سے نکالتے ہیں، اور اس قدر متعصب ہیں کہ محض اللہ کو پروردگار کہنے پر تکلیفیں پہنچاتے ہیں اور مصیبتیں توڑتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف صرف اپنی مدافعت ہی میں جنگ کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ دوسرے مظلوموں کی اعانت وحمایت کا بھی حکم دیا گیا ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ کمزور و بے بس لوگوں کو ظالموں کے پنجہ سے چھڑاؤ:۔

وَمَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا ۔ (النساء - ۱۰)	تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے خدا ہمیں اس بستی سے نکال۔ یہاں کے لوگ بڑے ظالم وجفاکار ہیں، اور ہمارے لئے خاص اپنی طرف سے ایک محافظ و مددگار مقرر فرما۔

اس جنگ کو جو ظالموں اور مفسدوں کے مقابلہ پر کمزوروں، بے بسوں اور مظلوموں کی اعانت کے لئے کی جائے اللہ نے خاص راہ خدا کی جنگ قرار دیا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ جنگ بندوں کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے ہے، اور بندوں کی اغراض کے لئے نہیں بلکہ خاص خدا

کی خوشنودی کے لئے لڑی جاتی ہے۔ اس جنگ کو اس وقت تک جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک خدا کے بیگناہ بندوں پر نفسانی اغراض کے لئے دست درازی اور جبر و ظلم کرنے کا سلسلہ بند نہ ہو جائے، جیساکہ فرمایا وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ۔ (اُن سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے) اور حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا۔ (یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔ اور فساد کا نام و نشان اس طرح مٹ جائے کہ اس کے مقابلہ پر جنگ کی ضرورت ہی باقی نہ رہے) اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس مبنی بر حق جنگ کو خونریزی سمجھ کر چھوڑ دینے یا اس میں جان و مال کا نقصان دیکھ کر تامل کرنے کا نتیجہ کس قدر خراب ہے۔

حق و باطل کی حد بندی اس طرح خدا نے حمایتِ حق کی جنگ کی مصلحت و ضرورت ظاہر کرنے اور تاکید فرمانے ہی پر قناعت نہیں کی، بلکہ یہ تصریح بھی فرما دی کہ

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا۔ (النساء - ۱۰)	جو لوگ ایماندار ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جو کافر و نافرمان ہیں وہ ظلم و سرکشی کی خاطر لڑتے ہیں پس شیطان کے دوستوں سے لڑو کہ شیطان کی جنگ کا پہلو کمزور ہے۔

یہ ایک قول فیصل ہے جس میں حق اور باطل کے درمیان پوری حد بندی کر دی گئی ہے۔ جو لوگ ظلم و سرکشی کی راہ سے جنگ کریں وہ شیطان کے دوست ہیں۔ اور جو ظلم نہیں بلکہ ظلم کو مٹانے کے لئے جنگ کریں وہ راہِ خدا کے مجاہد ہیں۔ ہر وہ جنگ جس کا مقصد حق و انصاف کے خلاف بندگانِ خدا کو تکلیف دینا ہو، جس کا مقصد حق داروں کو بے حق کرنا اور انہیں ان کی جائز ملکیتوں سے بیدخل کرنا ہو، جس کا مقصد اللہ کا نام لینے والے لوگوں کو بے قصور ستانا ہو، وہ سبیل طاغوت کی جنگ ہے۔ اسے خدا سے کچھ واسطہ نہیں۔ ایسی جنگ کرنا ایمانداروں کا کام نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ ایسے ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کی حمایت و مدافعت کرتے ہیں، جو دنیا سے ظلم و طغیان کو مٹا کر عدل و انصاف قائم کرنا چاہتے ہیں، جو سرکشوں اور فسادیوں کی جرأت کہ بندگانِ خدا کو امن و اطمینان سے زندگی بسر کرنے

اور انسانیت کے اعلیٰ نصب العین کی طرف ترقی کرنے کا موقع دیتے ہیں، ان کی جنگ راہ خدا کی جنگ ہے، وہ مظلوموں کی کیا مدد کرتے ہیں گویا خود خدا کی مدد کرتے ہیں، اور اللہ کی نصرت کا وعدہ انہی کے لئے ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت یہی وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے جس کی فضیلت سے قرآن کے صفحے بھرے پڑے ہیں جس کے متعلق فرمایا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ، (الصف۔۲)

اے ایمان والو کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے؟ وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لئے بہترین کام ہے اگر تم جانو۔

جس میں لڑنے والوں کی تعریف اس طرح کی ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ۔ (الصف۔۱)

اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف باندھے ہوئے جم کر لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

جس کی بلندی و عظمت کی گواہی اس شان سے دی ہے:۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا يَسْتَوُونَ عِندَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ اللَّهِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۔ (التوبہ۔۳)

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو ان لوگوں کے کام کے برابر ٹھیرایا ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں لڑے؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ جو لوگ ایمان لائے جنہوں نے حق کی خاطر گھر بار چھوڑا اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے لڑے ان کا درجہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا ہے اور

وہی لوگ ہیں جو حقیقت میں کامیاب ہیں۔

پھر یہی وہ حق پرستی کی جنگ ہے جس میں ایک رات کا جاگنا ہزار راتیں جاگ کر عبادت کرنے سے بڑھ کر ہے، جس کے میدان میں جم کر کھڑے ہونا گھر بیٹھ کر ۶۰ برس تک نمازیں پڑھتے رہنے سے افضل بتایا گیا ہے، جس میں جاگنے والی آنکھ پر دوزخ کی آگ حرام کر دی گئی ہے، جس کی راہ میں غبار آلود ہونے والے قدموں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ کبھی آتش دوزخ کی طرف نہ گھسیٹے جائیں گے، اور اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کو جو اس سے بچ کر گھر بیٹھ جائیں اور اس کی پکار سن کر کسمسانے لگیں اس غضبناک لہجہ میں تنبیہہ کی گئی ہے:۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۣاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ (التوبہ - ۳)

ان سے کہدو اگر تمہیں اپنے باپ بیٹے، بھائی، بیویاں رشتہ دار، اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور وہ تجارت جس کے مندے پڑ جانے کا تمہیں ڈر لگا ہوا ہے، اور وہ گھر بار جنہیں تم پسند کرتے ہو، اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو بیٹھے انتظار کرتے رہو یہاں تک کہ خدا اپنا کام پورا کرے یقین رکھو کہ اللہ فاسقوں کو کبھی ہدایت نہیں بخشتا۔

فضیلت جہاد کی وجہ غور کرو کہ جہاد فی سبیل اللہ کی اتنی فضیلت اور تعریف کس لئے ہے؟ جہاد کرنے والوں کو بار بار کیوں کہا جاتا ہے کہ وہی کامیاب ہیں اور انہی کا درجہ بلند ہے؟ اور اس سے بچکر گھر بیٹھنے والوں کو ایسی تنبیہیں کیوں کی جاتی ہیں؟ اس سوال کو حل کرنے کے لئے ذرا ان آیات پر پھر ایک نظر ڈال جاؤ جن میں جہاد کا حکم اور اس کی فضیلت اور اس سے بھاگنے کی برائی لکھی ہے۔ ان آیات میں کامیابی اور عظمت کے معنی کسی جگہ مال و دولت اور ملک و سلطنت کا حصول نہیں بتائے گئے جس طرح کرشن جی نے ارجن سے کہا تھا کہ "اگر تو اس جنگ (مہا بھارت) میں کامیاب ہوا تو تو دنیا کے راج کو بھوگے گا" (گیتا ۲: ۳۷) اس طرح قرآن میں کہیں یہ کہکر قتال فی سبیل اللہ کی جانب رغبت نہیں دلائی گئی کہ اس کے عوض تمہیں دنیا کی دولت اور حکومت ملے گی۔ بلکہ اس کے برعکس ہر جگہ جہاد فی سبیل اللہ کے عوض صرف خدا کی خوشنودی اور صرف

اللہ کے ہاں بڑا درجہ ملنے اور عذاب الیم سے محفوظ رہنے کی توقع دلائی گئی ہے۔ سقایۂ حاج اور عمارۂ مسجد حرام سے، جو عرب میں بڑے رسوخ واثر اور بڑی آمدنی کا ذریعہ تھا، گھربار چھوڑ کر نکل جانے اور جہاد فی سبیل اللہ کرنے کو افضل بتایا، اور پھر اس کے عوض اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللهِ (اللہ کے نزدیک بڑے درجے) کے سوا اور کسی کامیابی کی راہ بھی نہیں بتائی۔ دوسری جگہ ایک تجارت کا گر سکھایا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہاں کچھ دھن دولت کا ذکر ہوگا۔ مگر پڑھ کر دیکھئے تو اس تجارت کی حقیقت یہ نکلتی ہے کہ اللہ کی راہ میں جان اور مال کھپاؤ، اور اس کے عوض عذاب سے نجات حاصل کرو۔ ایک اور جگہ لڑائی سے جی چرانے والوں کو ڈانٹا جا رہا ہے کیونکہ وہ بیوی بچوں کی محبت میں گرفتار پائے جاتے ہیں اور اپنے کمائے ہوئے مال اور اپنی تجارت کے کساد اور اپنے محبوب مکانوں کے چھٹنے کا خوف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، حالانکہ دنیا میں جنگ کر کے جو لوگ ملک فتح کرتے ہیں انہیں روپیہ بھی خوب ملتا ہے، ان کی تجارت بھی خوب چمکتی ہے، اور انہیں مفتوح قوم سے چھینی ہوئی قلعۂ معلی جیسی عالیشان عمارتیں بھی رہنے کو ملتی ہیں۔

پھر جب اس جہاد سے دنیا کی دولت اور ملک گیری مقصود نہیں ہے تو آخر اس خون بہانے سے اللہ کو کیا ملتا ہے کہ وہ اس کے عوض اتنے بڑے بڑے درجے دے رہا ہے؟ آخر اس خونریزی کی تگ و دو میں کیا رکھا ہے کہ اس کی بھاگ دوڑ سے گرد آلود ہونے والے قدموں تک کو الطاف وعنایات کا مورد بنایا جاتا ہے؟ اور آخر اس میں وہ کونسی کامیابی مضمر ہے کہ اس خشک وبے مزہ جہاد کے لڑنے والوں کو بار بار أُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ کہا جا رہا ہے؟ اس کا جواب اسی لَوْلَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ اور إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ میں پوشیدہ ہے۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی زمین پر فتنہ وفساد پھیلایا جائے۔ اسے یہ گوارا نہیں ہے کہ اس کے بندوں کو بے قصور ستایا اور تباہ وبرباد کیا جائے۔ اسے یہ پسند نہیں ہے کہ طاقتور کمزوروں کو کھا جائیں، ان کے امن چین پر ڈاکے ڈالیں، اور ان کی اخلاقی، روحانی اور مادی زندگی کو ہلاکت میں مبتلا کریں۔ اسے یہ منظور نہیں ہے کہ دنیا میں سیہ کاری، بداعمالی، ظلم وبے انصافی، اور قتل وغارت گری قائم رہے۔ وہ پسند نہیں کرتا کہ جو خاص اس کے بندے ہیں ان کو مخلوق کا بندہ بنا کر ان کی انسانی شرافت پر ذلت کا داغ لگایا جائے۔ پس جو گروہ بغیر کسی معاوضہ

کی خواہش، بغیر کسی دھن دولت کے لالچ، بغیر کسی ذاتی نفع کی تمنا کے محض خدا کی خاطر دنیا کو اس فتنہ سے پاک کرنے کے لئے اور اس ظلم کو دور کرکے اس کی جگہ عدل قائم کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے، اور اس نیک کام میں اپنی جان و مال، اپنی تجارت کے فوائد، اپنے بال بچوں اور ماں باپ بھائیوں کی محبت، اور اپنے گھربار کے عیش و آرام سب کو قربان کردے، اس سے زیادہ اللہ کی محبت اور اللہ کی رضامندی کا مستحق کون ہو سکتا ہے؟ اور لیلائے کامرانی کی آغوش اس کے سوا اور کس کے لئے کھل سکتی ہے؟

جہاد فی سبیل اللہ کی یہی فضیلت ہے جس کی بنا پر اسے تمام انسانی اعمال میں ایمان باللہ کے بعد سب سے بڑا درجہ دیا گیا ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت یہی چیز تمام فضائل و مکارم اخلاق کی روح ہے۔ انسان کی یہ اسپرٹ کہ وہ بدی کو کسی حال میں برداشت نہ کرے اور اسے دفع کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جائے، انسانی شرافت کی سب سے اعلیٰ اسپرٹ ہے۔ اور عملی زندگی کی کامیابی کا راز اسی اسپرٹ میں مضمر ہے۔ جو شخص دوسروں کے لئے بدی کو برداشت کرتا ہے اس کی اخلاقی کمزوری اسے بہت جلد ہی اس پر بھی آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ خود اپنے لئے بدی کو برداشت کرے، اور جب اس میں برداشت کا یہ مادہ بھی پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس پر ذلت کا وہ درجہ آتا ہے جسے خدا نے اپنے غضب سے تعبیر کیا ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ اس درجہ میں پہنچ کر اس کے اندر شرافت و انسانیت کا کوئی احساس باقی نہیں رہتا۔ وہ جسمانی و مادی غلامی ہی میں نہیں بلکہ ذہنی و روحانی غلامی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور کمینگی کے ایسے گڑھے میں گرتا ہے جہاں سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل جس شخص میں یہ اخلاقی قوت موجود ہو کہ وہ بدی کو محض بدی ہونے کے باعث برا سمجھے اور انسانی برادری کو اس سے نجات دلانے کے لئے انتھک جدوجہد کرتا رہے، وہ ایک سچا اور اعلیٰ درجہ کا انسان ہوتا ہے اور اس کا وجود عالم انسانی کے لئے رحمت ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو چاہے دنیا سے کسی معاوضہ کی خواہش نہ ہو، مگر دنیا ان تمام ناشکریوں کے باوجود جن کے داغ اس کی پیشانی پر موجود ہیں، اتنی احسان ناشناس نہیں ہے کہ وہ اس خادم انسانیت کو

اپنا سرتاج، اپنا امام اور اپنا سردار تسلیم نہ کرے جو بے اثر، بے امید، اجر و بے تمنائے مزد اسے بدی کے تسلط سے چھڑانے اور اخلاقی و روحانی اور مادی آزادی عطا کرنے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ یہی معنی ہیں اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (زمین کے وارث میرے نیکوکار بندے ہوتے ہیں) کے، اور یہیں سے یہ بات نکلتی ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ سے محض آخرت ہی کی کامیابی مراد نہیں ہے بلکہ دنیا کی کامیابی بھی حقیقتہً انہی لوگوں کے لئے ہے جو نفسانی اغراض سے پاک ہو کر خالصتہً اللہ کی خوشنودی اور اللہ کے بندوں کی بھلائی کے لئے جہاد کرتے ہیں۔

نظام تمدن میں جہاد کا درجہ | جہاد کی اس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ قوموں کی زندگی میں اس کو کیا درجہ حاصل ہے اور نظام تمدن کو درست رکھنے کے لئے اس کی کس قدر ضرورت ہے۔ اگر دنیا میں کوئی ایسی قوت موجود ہو جو بدی کے خلاف پیہم جہاد کرتی رہے اور تمام سرکش قوتوں کو اپنی اپنی حدود کی پابندی پر مجبور کر دے تو نظام تمدن میں یہ بے اعتدالی ہرگز نظر نہ آئے کہ آج سارا عالم انسانی ظالموں اور مظلوموں، آقاؤں اور غلاموں میں بٹا ہوا ہے۔ اور تمام دنیا کی اخلاقی و روحانی زندگی کہیں غلامی و مظلومی کے باعث اور کہیں غلام سازی و جفا پیشگی کے باعث تباہ و برباد ہو رہی ہے۔ بدی کو دوسروں سے دفع کرنا تو ایک بڑا درجہ ہے۔ اگر اسے خود اپنے سے دفع کرنے کا احساس بھی ایک قوم میں موجود ہو اور اس کے مقابلہ میں وہ اپنے عیش و آرام کو، اپنی دولت و ثروت کو، اپنی نفسانی لذات اور اپنی جان کی محبت کو غرض کسی چیز کو بھی عزیز نہ رکھے تو وہ کبھی ذلیل و خوار ہو کر نہیں رہ سکتی اور اس کی عزت کو کوئی قوت پامال نہیں کر سکتی۔ حق کے آگے سر جھکانا اور ناحق کے آگے سر جھکانے پر موت کو ترجیح دینا ایک شریف قوم کا خاصہ ہونا چاہیئے اور اگر وہ اعلائے حق اور اعانت حق کی قوت نہ رکھتی ہو تو اسے کم از کم تحفظ حق پر پختگی کے ساتھ خود تو قائم رہنا چاہیئے جو شرافت کا کم سے کم درجہ ہے لیکن اس نتیجہ سے گر کر جو قوم حق کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور اس میں ایثار و قربانی کا فقدان اس قدر بڑھ جائے کہ بدی و شرارت جب اس پر چڑھ کر آئے تو وہ اسے مٹانے یا خود مٹ جانے کے بجائے اس کے ماتحت زندہ رہنے کو قبول کر لے تو ایسی قوم کے لئے دنیا میں کوئی عزت نہیں ہے، اس کی زندگی یقیناً موت سے

بدتر ہے۔ اسی رمز کو سمجھانے کے لئے خدا نے بار بار اپنی حکیمانہ کتاب میں ان قوموں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے بدی کے خلاف جہاد کرنے میں جان و مال اور لذات نفسانی کا ٹوٹا دیکھ کر اس سے جی چرایا اور بدی کا تسلط قبول کر کے اپنے اوپر ہمیشہ کے لئے خسران و نامرادی کا داغ لگا لیا۔ ایسی قوموں کو خدا ظالم قومیں کہتا ہے یعنی انہوں نے اپنے اعمال سے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ اور حقیقتہً وہ اپنے ہی ظلم سے تباہ ہوئیں۔ چنانچہ ایک جگہ اس طرح ان کی مثال دی ہے:۔

أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ أَتَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (التوبہ-۹)

کیا ان لوگوں کو ان قوموں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے ہو گذری ہیں یعنی نوح کی قوم اور عاد، ثمود اور قوم ابراہیم اور اصحٰب مدین اور موتفکات۔ ان کے پاس ان کے پیغمبر کھلی کھلی ہدایتیں لے کر آئے۔ مگر اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ جو ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں ہیں وہ باہم ایک دوسرے کے مددگار ہیں، وہ نیکی کا حکم کرتے اور بدی کو روکتے ہیں۔

یہاں پچھلی قوموں کے ظلم بر نفس خود کا ذکر کرتے ہی جو ایمانداروں کی یہ صفت بتائی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے یار و مددگار ہیں اور نیکی کو قائم کرتے اور بدی کو روکتے ہیں تو اس سے صاف یہی تبلانا مقصود ہے کہ ان مٹنے والی قوموں نے نیکی کا حکم کرنا اور بدی کو روکنا چھوڑ دیا تھا اور یہی ان کا وہ ظلم تھا جس نے آخر ان کو تباہ کیا۔

ایک اور جگہ بنی اسرائیل کی بزدلی اور جہاد سے جی چرانے کا نہایت عبرتناک انجام بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کی نعمتیں یاد دلا کر حکم دیا کہ تم ارض مقدس میں داخل ہو جسے اللہ نے تمہاری میراث میں دیا ہے۔ اور ہرگز پیٹھ مت پھیرو کیونکہ پیٹھ پھیرنے والے ہمیشہ نامراد رہا کرتے ہیں۔ مگر بنی اسرائیل پر دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا:۔

يَا مُوسَىٰ إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ وَإِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ۔

اے موسیٰ! اس زمین میں تو ایک زبردست قوم ہے ہم اس میں ہرگز نہ داخل ہونگے جبتک کہ وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے

قوم کے دو جوانمردوں نے جن پر اللہ نے انعام فرمایا تھا قوم کو مشورہ دیا کہ تم بیخوف داخل ہو جاؤ، تم ہی غالب رہوگے، اور اگر تمہیں دولتِ ایمان حاصل ہے تو اللہ پر توکل کرنا چاہئے۔ مگر وہ ڈرپوک اور ذلت پر قانع رہنے والی قوم انسانوں کے خوف سے کانپتی ہی رہی اور اس نے صاف کہدیا کہ :-

يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا أَبَدًا مَا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ۔

اے موسیٰ! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم تو اس میں ہرگز داخل نہ ہونگے۔ بس تو اور تیرا خدا وہاں جائے اور تم دونوں لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

آخر اس بزدلی کی بدولت قدرتِ الٰہی نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ وہ چالیس برس تک دربدر کی خاک چھانتے پھریں اور کہیں ان کو ٹھکانا نصیب نہ ہو :

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ۔ (المائدہ۔ ۴)

اللہ نے کہا کہ جو زمین ان کے حق میں لکھ دی گئی تھی وہ اب چالیس سال تک کے لئے ان پر حرام کر دی گئی۔ اب وہ زمین میں بھٹکتے پھریں گے۔

ایک دوسری جگہ بڑی تفصیل کے ساتھ بنی اسرائیل کی اس محبتِ نفس و دل اور بزدلی و خوفِ موت کا ذکر کیا ہے جس کے باعث انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ کو چھوڑ دیا اور جس کی بدولت وہ آخر کار قومی ہلاکت میں مبتلا ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے :

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ

کیا تم نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جو موت سے ڈر کر نکل گئے حالانکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ اس لئے اللہ نے ان پر موت ہی کا حکم صادر کر دیا۔ پھر اس نے انہیں دوبارہ زندگی بخشی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ

النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ۔

لوگوں پر بڑا فضل کرتا ہے لیکن اکثر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔

اس کے بعد ہی اس طرح مسلمانوں کو قتال کا حکم دیا ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ

اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو کہ وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے۔

اور اس کے بعد دوبارہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا ذکر کیا ہے کہ

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ۔ (البقرہ-۳۲)

کیا تو نے بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا حال نہیں دیکھا جس نے موسیٰ کے بعد اپنے زمانہ کے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ نبی نے ان سے کہا کہ تم سے کچھ بعید نہیں ہے کہ اگر تم پر جنگ فرض کر دی گئی تو تم مکر جاؤ۔ انہوں نے کہا کہ ہم کیسے نہ لڑیں گے جبکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے ہیں اور اپنی اولاد سے چھڑائے گئے ہیں۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک چھوٹی سی جماعت کے سوا سب کے سب نے منہ پھیر لیا۔ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

یہ اور ایسی بہت سی مثالیں بار بار اسی حقیقت کو سمجھانے کے لئے دی گئی ہیں کہ زندگی کے قیام و بقا کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز اس کی حفاظت کرنے والی سچی قربانی کی روح ہے۔ اور جس قوم سے یہ روح نکل جاتی ہے وہ بہت جلدی بزدلی سے مغلوب ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔

باب دوم

مدافعانہ جنگ

گذشتہ بحث سے یہ امر اچھی طرح واضح ہوگیا ہوگا کہ قرآن کی تعلیم اپنے پیرووں میں حمایتِ حق کی ایسی ناقابلِ تسخیر روح پیدا کرنا چاہتی ہے جس سے ان کے اندر کسی حال میں بدی و شرارت کے آگے سر جھکانے اور ظلم و طغیان کے تسلط کو قبول کرنے کی کمزوری پیدا نہ ہونے پائے۔ قرآنی تعلیم کے مطابق انسان کی سب سے بڑی ذلت یہ ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام یا مال و دولت یا اہل و عیال کی محبت میں مبتلا ہوکر حفاظتِ حق کی سختیوں سے ڈرنے لگے اور باطل کو طاقتور دیکھکر اس کی غلامی قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوجائے۔ یہ ضعف، جو درحقیقت جسم و جان کا ضعف نہیں بلکہ قلب و ایمان کا ضعف ہے، جب کسی قوم میں پیدا ہوجاتا ہے تو اس کے اندر سے عزت و شرافت کے تمام احساسات خود بخود دور ہوجاتے ہیں اور اعلائے حق کی اعلیٰ خدمت کو انجام دینا تو درکنار وہ خود اپنے آپ کو بھی حق کے راستہ پر قائم رکھنے میں کامیاب نہیں رہ سکتی۔ جسم کی غلامی کو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کی بندشیں صرف اوپر ہی اوپر رہتی ہیں اور قلب و روح تک ان کا اثر نہیں پہنچتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جسم کے غلام ہونے سے پہلے روح غلام ہوچکتی ہے اور جسم غلامی کا غیرت شکن و ذلت انگیز لباس پہنتا ہی اُس وقت ہے جب روح غیرت و حمیت کے جوہر سے عاری ہوجاتی ہے اور عزت و شرافت کا احساس اس سے رخصت ہوچکا ہوتا ہے۔ پس جو قوم اپنی کمزوری و بزدلی کے باعث اپنے حقوق کے تحفظ میں کوتاہی برتتی ہے اور شرارت کو قوی بازو دیکھکر اس کی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ ہوجاتی ہے، اس میں یہ قوت کبھی باقی نہیں رہتی اور رہ نہیں سکتی کہ اپنے شعائر، اپنے

آداب، اپنے قوانین اور اپنے دینی و اخلاقی اصولوں پر سختی سے قائم رہے، اور اپنے اجتماعی نظام کو ٹوٹنے نہ دے۔ پھر جبکہ حق اور باطل دونوں باہم ضد ہیں اور ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک قوم باطل کی غلامی قبول کرنے کے بعد بھی حق کی بندگی پر قائم رہے اور ایک سے عبدیت کا رشتہ جوڑ کر دوسرے کے رشتۂ عبدیت کو ٹوٹنے سے محفوظ رکھے۔ حق کی فطرت تو یکتائی پسند ہے، وہ باطل کو اپنا سہیم و شریک بنا کر کبھی ایسی تقسیم نہیں کر سکتا کہ آدھا میرا ہے اور آدھا تیرا۔ اس لئے جس کسی کو اس کی بندگی کرنی ہو اسے باطل کی بندگی چھوڑنی پڑے گی اور اپنی گردن کو دوسری تمام بندگیوں کے طوق و زنجیر سے خالی رکھنا پڑے گا۔

قرآن جو درحقیقت صحیفۂ فطرت ہے، فطرت کے اس راز کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے۔ اسی بنا پر اس نے انسان کو صرف دو راہیں بتائی ہیں یا موت، یا شرف۔ زندگی بے شرف کی تیسری راہ اس نے نہیں بتائی، اگرچہ اس کے بدنصیب پیروؤں نے اپنے ایمان کی کمزوری اور حوصلہ کی پستی سے اس کو خود اختیار کر لیا ہے وہ تو اس زندگی کو "ذلت" و "مسکنت" قرار دیتا ہے۔ اللہ کے غضب سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے ان قوموں کی خصوصیت بتاتا ہے جو اپنی بزدلی اور خشیۃ ماسوی اللہ کے باعث اپنے تئیں قہر الٰہی کا مستوجب بنا لیتی ہیں۔ اور اس کی زبان میں اس ذلیل زندگی کو اختیار کر لینا اپنے اوپر آپ ظلم کرنا ہے۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو جو اس زندگی پر راضی ہو جائیں خسران و نامرادی کی یہ وعید سنائی ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ ؟ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۔ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ؟ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا
(النساء۔ ۱۴)

جن لوگوں کی روحوں کو فرشتوں نے اس حال میں قبض کیا کہ وہ خود اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے تو انہوں نے ان سے پوچھا کہ تم یہ کس حال میں جی رہے تھے؟ انہوں نے کہا ہم زمین میں کمزور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس جگہ کو چھوڑ کر نکل جاتے؟ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی بری جائے قرار ہے۔[1]

[1] یہ آیت ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں کی ہجرت کے بعد مکہ میں (باقی صفحہ ۴۰ پر)

غور کرو کہ یہ غیرتِ ملی کی کیسی روشن تعلیم ہے۔ اپنے آپ کو کمزور سمجھ کر غیر حق کی اطاعت پر راضی ہو جانے والوں کو اپنے اوپر آپ ظلم کرنے والا کہا جا رہا ہے۔ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے یہ ذلت کیوں قبول کی؟ وہ کمزوری وضعف کا عذر پیش کرتے ہیں تو قبول نہیں ہوتا۔ جواب ملتا ہے کہ اگر تم کمزور ہی تھے تو اس ذلت کے قبول کرنے سے بہتر تھا کہ گھر چھوڑ کر نکل جاتے اور کسی ایسی جگہ جا رہتے جہاں اپنے ایمان وضمیر کے خلاف زندگی بسر کرنے کی مجبوری نہ ہوتی۔ تن کے آرام و آسائش کی خاطر بندگیٔ باطل کی ذلت کیوں گوارا کر لی؟ آخر اسی جرم کی پاداش میں انہیں ذلت و نامرادی کے اس گڑھے کی طرف پھینک دیا جاتا ہے جس کا نام جہنم ہے، اور یقیناً اس سے زیادہ بری جانے بازگشت اور کوئی نہیں ہے۔

فریضۂ دفاع

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے سب معاملات میں تحمل و برداشت کی تعلیم دی ہے مگر ایسے کسی حملے کو برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دی جو دینِ اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں پر اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام مسلّط کرنے کے لئے کیا جائے۔ اس نے سختی کے ساتھ حکم دیا ہے کہ جو کوئی تمہارے انسانی حقوق چھیننے کی کوشش کرے، تم پر ظلم وستم ڈھائے، تمہاری جائز ملکیتوں سے تم کو بے دخل کرے، تم سے ایمان و ضمیر کی آزادی سلب کرے، تمہیں اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے روکے، تمہارے اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنا چاہے، اور اس وجہ سے تمہارے درپے آزار ہو کہ تم مسلمان ہو، تو اس کے مقابلے میں ہرگز کمزوری نہ دکھاؤ اور اپنی پوری طاقت اس کے اس ظلم کو دفع کرنے میں صرف کر دو:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ — جو لوگ تم سے لڑتے ہیں، ان سے خدا کی راہ میں جنگ کرو

وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ — مگر لڑنے میں حد سے تجاوز نہ کرو (یعنی ظلم پر نہ اتر آؤ) کیونکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹) گئے تھے اور جنہوں نے اپنے گھربار کے آرام، اپنے کاروبار اور اپنی جائدادوں کی خاطر کفر کے اس ماحول میں رہنا قبول کر لیا تھا جہاں وہ اپنے ایمان و اعتقاد کے مطابق اسلامی زندگی بسر نہ کر سکتے تھے مگر کفار سے دبے ہوئے ہونے کے باعث بہت سے کافرانہ طریقے اختیار کرنے پر مجبور تھے حتیٰ کہ اسی وبال کی وجہ سے آخر کار انہیں کفار کی فوج میں شامل ہو کر مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے بدر کے میدان جنگ میں آنا پڑا۔

اقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۔ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ۔ الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۔

(البقرہ - ۲۴)

اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان ظالموں کو جہاں پاؤ قتل کرو، اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے وہاں سے انہیں نکال باہر کرو، کیونکہ یہ فتنہ قتل سے زیادہ بُری چیز ہے۔ پھر جب تک وہ تم سے مسجد حرام میں قتال نہ کریں تم بھی اس کے پاس ان سے قتال نہ کرو، لیکن اگر وہ تم سے وہاں جنگ کریں تو تم بھی انہیں مارو اور کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تم ان سے برابر جنگ کئے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔ پس اگر وہ فتنہ برپا کرنے اور دین کے معاملہ میں زیادتی کرنے سے باز آجائیں تو جان لو کہ سزا ظالموں کے سوا اور کسی کے لئے نہیں ہے۔ ماہ حرام کا عوض ماہ حرام ہے اور تمام آداب اور حرمتوں کے بدلے ہیں[1]۔ پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے اُس پر تم بھی اتنی ہی زیادتی کرو۔ مگر اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ صرف متقیوں کے ساتھ ہے (جو حد سے تجاوز نہیں کرتے)

یہ حفاظت دین اور مدافعت دیار اسلام کا حکم ایسا سخت ہے کہ جب کوئی قوت اسلام کو مٹانے اور اسلامی نظام کو فنا کرنے کے لئے حملہ آور ہو تو تمام مسلمانوں پر فرض عین ہو جاتا ہے کہ سب کام چھوڑ کر اس کے مقابلہ پر نکل آئیں اور جب تک اسلام اور اسلامی نظام کو اس خطرہ سے محفوظ نہ کرلیں اس وقت تک چین نہ لیں۔ چنانچہ فقہ کی تمام کتابوں میں یہ حکم موجود ہے کہ جب دشمن دارالاسلام پر حملہ کرے تو ہر مسلمان پر فرداً فرداً دفاع کا فرض ایسی قطعیت کے ساتھ عائد ہو جاتا ہے جیسے نماز اور روزہ۔ فقہ کی مشہور کتاب بدائع الصنائع میں لکھا ہے:

[1] یعنی مہینے اور مقام کی جو حرمتیں قائم کی گئی ہیں ان کا لحاظ اسی صورت میں کیا جائیگا جبکہ دشمن بھی ان کا لحاظ کرے۔

(اما اذا عم النفير بان هجم العدو على بلد فهو فرض عين يفترض على كل واحد من آحاد المسلمين ممن هو قادر عليه فاذا عم النفير لا يتحقق القيام به الا بالكل فبقي فرضا على الكل عينا بمنزلة الصوم والصلوة فيخرج العبد بغير اذن مولاه والمرأة بغير اذن زوجها لان منافع العبد والمرأة في حق العبادات المفروضة عينا مستثناة عن ملك المولى والزوج شرعا كما في الصوم والصلوة وكذا يباح للولد ان يخرج بغير اذن والديه لان حق الوالدين لا يظهر في فروض الاعيان كالصوم والصلوة

(جلد ۷ صفحہ ۹۸)

مگر جب نفیر عام ہو جائے کہ دشمن نے ایک اسلامی ملک پر حملہ کیا ہے تو پھر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے اور ہر مسلمان پر جو جہاد کی قدرت رکھتا ہو فرداً فرداً اس کی فرضیت عائد ہو جاتی ہے ... نفیر عام ہونے کے بعد تو ادائے فرض کا حق بغیر اس کے پورا ہوتا ہی نہیں کہ سب کے سب جہاد کے لئے نکل کھڑے ہو جائیں، اس وقت وہ سب مسلمانوں پر اس طرح فرض عین ہو جاتا ہے جیسے روزہ اور نماز، پس غلام کو بغیر آقا کی اجازت کے اور عورت کو بغیر اپنے شوہر کی اجازت کے نکلنا چاہئے کیونکہ ان عبادات میں جو فرض عین ہیں غلام اور بیوی کی خدمات آقا اور شوہر کی ملک سے مستثنیٰ ہیں، جیسے نماز اور روزہ۔ اسی طرح بیٹے کے لئے مباح ہو جاتا ہے کہ وہ بغیر والدین کی اجازت کے نکل کھڑا ہو، کیونکہ روزہ نماز جیسے فروض اعیان میں والدین کا حق اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

بان ہجم العدو علی بلد کے الفاظ صاف طور پر بتلا رہے ہیں کہ یہ فرضیت عینیہ صرف اسی صورت پر موقوف نہیں ہے کہ خاص مذہبی جذبہ سے متاثر ہو کر کوئی قوم اسلام کو مٹا دینے پر آمادہ ہو جائے بلکہ حکومت اسلامیہ اور دیار اسلام پر ہر جارحانہ حملہ کے مقابلہ میں مدافعت اسی قطعیت کے ساتھ فرض ہے۔ اسلام میں مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے حریت و استقلال سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔ اپنی آزادی کو کھو دینے کے بعد صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں میں انسانیت کی اس اعلیٰ خدمت کو ادا کرنے کی قوت باقی نہیں رہتی جسے ادا کرنے کے لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں بلکہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم رکھنے کے قابل بھی نہیں رہتے جس پر ان کی مذہبی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس لئے اسلامی حکومت اور اسلامی قومیت پر حملہ کرنا

دراصل عین اسلام پر حملہ کرنا ہے اور خواہ کسی دشمن کا مقصد اسلام کا مٹانا نہ ہو بلکہ محض مسلمانوں کی سیاسی قوت ہی کو مٹانا ہو تب بھی اس سے جنگ کرنا مسلمانوں کے لئے ویسا ہی فرض ہوگا جیسا اسلام کو مٹانے والے سے جنگ کرنا ہے۔ اسی وجہ سے صرف اس شہر یا اس ملک ہی کے مسلمانوں پر دفاع کا فرض عائد نہیں کیا گیا جس پر حملہ کیا گیا ہو بلکہ روئے زمین کے تمام مسلمانوں کے لئے لازم کر دیا گیا ہے کہ وہ اس ملک یا شہر کے مسلمانوں کو غلبۂ اعداء سے بچائیں، جیسا کہ صاحب بدائع کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ یفترض علی کل واحد من احاد المسلمین اور لا یتحقق القیام بہ الا بالکل۔

صاحب نہایہ نے ذخیرہ سے اس اجمال کی تفصیل اس طرح نقل کی ہے:

ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو، فاما من وراءهم ببعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقا وغربا على هذا التدريج ونظيره الصلوٰة على الميت .... ان كان الذى يبعد من الميت يعلم ان اهل محلته يضيعون حقوقه او يعجزون عنه كان عليه ان يقوم بحقوقه،

جہاد کی جب نفیر عام ہو تو جو کوئی دشمن سے قریب ہو اس پر وہ فرض عین ہو جاتا ہے۔ مگر جو لوگ دشمن سے دور ہوں ان پر فرض کفایہ رہتا ہے یعنی اگر ان کی مدد کی ضرورت نہ ہو تو وہ شرکت جہاد سے باز بھی رہ سکتے ہیں لیکن اگر ان کی مدد کی ضرورت ہو جائے اس طرح کہ جو لوگ دشمن سے قریب ہیں وہ مقابلہ سے عاجز ہو جائیں، یا عاجز تو نہ ہوں مگر سستی کریں اور پوری کوشش سے مقابلہ نہ کریں تو ان سے قریب کے لوگوں پر فرض عین ہو جاتا ہے جیسے نماز اور روزہ کہ اسے چھوڑنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا پھر ان لوگوں پر جو ان سے قریب ہوں پھر ان پر جو ان سے قریب ہوں، یہاں تک کہ از شرق تا غرب تمام اہل اسلام پر اسی تدریج کے ساتھ فرض ہو جاتا ہے۔ اس کی نظیر نماز جنازہ ہے کہ جو شخص میت سے دور ہو اگر اسے معلوم ہو کہ اس کے اہل محلہ اس کے حقوق ادا نہیں کرتے یا ادا کرنے سے

کذا ھنا۔ (شامی ج ۲ ص ۲۴۰) عاجز ہیں تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ خود اس کے حقوق ادا کرے (یعنی اس کی تجہیز و تکفین کرے) یہی صورت یہاں بھی ہے۔

اسلام میں دفاع کے اس اہم فرض کی جو حیثیت ہے اس کا اندازہ صرف اسی سے نہیں ہوتا کہ اسے ایک عبادت اور فرض عین کا درجہ دیا گیا ہے اور اس کی فضیلت نماز روزہ سے بھی زیادہ بتائی گئی ہے بلکہ سورۂ توبہ کی اُن آیات سے جو غزوۂ تبوک کے بارہ میں نازل ہوئی ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی قوت اسلام اور مسلمانوں کے استقلال قومی کو مٹانے کے لئے حملہ آور ہو اور نفیر عام ہو جائے تو اس وقت یہ ایمان کے صدق و کذب کی کسوٹی بن جاتا ہے۔ چنانچہ اُن لوگوں کے متعلق جنہوں نے رومیوں کی زبردست طاقتور سلطنت کے مقابلہ پر حفاظتِ اسلام کے لئے جنگ میں جانے سے جی چرایا تھا اور جن کی ایمانی کمزوری کو دیکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں گھر بیٹھ رہنے کی اجازت دیدی تھی، یہ الفاظ فرمائے گئے ہیں:۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ (التوبہ - ۷)

اے محمدؐ خدا انہیں معاف کرے تم نے انہیں کیوں گھر بیٹھ رہنے کی اجازت دیدی؟ تمہیں چاہیئے تھا کہ اجازت نہ دیتے تاکہ تم پر وہ لوگ بھی ظاہر ہو جاتے جو سچے ہیں اور ان کا حال بھی معلوم ہو جاتا جو جھوٹے ہیں۔ وہ لوگ جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جنہیں یوم قیامت کے آنے کا یقین ہے تم سے ہرگز یہ رخصت نہ مانگیں گے کہ اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد نہ کریں، اللہ ان متقیوں سے خوب واقف ہے۔ یہ رخصت تو تم سے وہی لوگ طلب کریں گے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم قیامت کے آنے کا یقین۔ ان کے دلوں میں شک پڑ گیا ہے، اس لئے وہ اپنے شک ہی میں ڈگمگا ہو رہے ہیں۔

مدافعانہ جنگ کی ضرورتیں دفاع کے ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اُن دینی فرائض میں جو ان کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں سب سے بڑا اور سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دین اور اپنے قومی

استقلال کی سختی کے ساتھ حفاظت کریں اور اپنے قومی و دینی وجود کو کسی حال میں فتنہ سے مغلوب نہ ہونے دیں۔ اس کے لئے اسلام نے اپنے پیرووں کو جنگ کی محض اجازت ہی نہیں دی، بلکہ تاکید کی ہے، اور تاکید بھی ایسی سخت جس کی کیفیت اوپر بیان کی گئی ہے۔ مگر حملہ کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ ایک سلطنت باقاعدہ اعلان جنگ کر کے دار الاسلام پر حملہ آور ہو اور اس کو فتح کر کے مسلمانوں کو مٹانے، یا غلام بنانے، یا ان کی مذہبی آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کرے۔ بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی صورتیں ہیں جن سے ایک قوم کے امن و اطمینان اور اس کی اجتماعی زندگی کو خطرہ میں مبتلا کیا جا سکتا ہے۔ پس اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ صورتیں کیا ہیں، اور ان کے متعلق قرآن مجید ہم کو کیا حکم دیتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ہم ان تمام آیات کو جمع کریں گے جن میں مدافعانہ جنگ کا حکم دیا گیا ہے، اور ان کے حل طلب مسائل کو بھی قرآن سے یا اس کے بعد حدیث سے حل کریں گے تاکہ شخصی آراء کے دخل سے شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ رہے۔

(۱) ظلم و تعدی کا جواب: بقول اکابر مفسرین، اسلام میں پہلی آیت جو قتال کے متعلق اتری وہ سورۂ حج کی یہ آیت ہے:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ۔ (الحج ۶)

جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے انہیں جنگ کی اجازت دی گئی کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے ہیں صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے کہ صرف اللہ ہی ہمارا رب ہے۔

دوسری آیت جس کو علامہ ابن جریر اور بعض دوسرے مفسرین جنگ کی پہلی آیت قرار دیتے ہیں، سورہ بقرہ کی یہ آیت ہے:۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (البقرہ ۔ ۲۴)

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ بڑھ جاؤ کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور ان کو مارو جہاں پاؤ، اور ان کو نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے، کیونکہ فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے

ان دونوں آیات سے حسب ذیل احکام نکلتے ہیں۔

(۱) جب مسلمانوں سے جنگ کی جائے اور ان پر ظلم وستم کیا جائے تو ان کیلئے مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہے۔

(۲) جو لوگ مسلمانوں کے گھر بار چھینیں، ان کے جائز حقوق سلب کریں، اور انہیں ان کی ملکیتوں سے بے دخل کریں، ان کے ساتھ مسلمانوں کو جنگ کرنی چاہیئے۔

(۳) جب مسلمانوں پر ان کے مذہبی عقائد کے باعث تشدد کیا جائے اور انہیں محض اس لئے ستایا جائے کہ وہ مسلمان ہیں۔ تو ان کے لئے اپنی مذہبی آزادی کی خاطر جنگ کرنا جائز ہے۔

(۴) دشمن غلبہ کرکے جس سرزمین سے مسلمانوں کو نکال دے یا مسلمانوں کے اقتدار کو وہاں سے مٹادے اسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے، اور جب کبھی مسلمانوں کو طاقت حاصل ہو تو انہیں ان تمام مقامات سے دشمن کو نکال دینا چاہیئے جہاں سے اس نے مسلمانوں کو نکالا ہے۔

(۲) راہِ حق کی حفاظت: سورۂ انفال میں جن کافروں کے خلاف جنگ کرنے اور ان کی جڑ کاٹ دینے کا حکم دیا گیا ہے ان کا ایک قصور یہ بتایا گیا ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۔ (انفال ۴)	جو لوگ کافر ہیں وہ اپنی مالی وسائل اللہ کے راستہ سے روکنے میں صرف کرتے ہیں اور صرف کئے جائیں گے یہاں تک کہ ان پر حسرت ہوگی اور وہ مغلوب کئے جائیں گے

آگے چل کر قریش کی اس فوج کا جو بدر میں مسلمانوں سے لڑنے نکلی تھی، اور جس کے مقابلہ میں اللہ نے حق کو حق اور باطل کو باطل کرکے دکھانے کے لئے خاص اپنی فوج بھیجی تھی، اس طرح ذکر کیا ہے:-

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (انفال - ۶)	اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے تفاخر کے طور پر دنیا کو دکھانے کے لئے لڑنے کو اپنے گھروں سے نکلے اور وہ اللہ کے راستہ سے روک رہے ہیں،

سورۂ توبہ میں پھر ان مشرکین کا جرم جن سے قتال کا حکم دیا گیا تھا یہ بتایا ہے:-

اِشْتَرَوْا بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَصَدُّوا	ان لوگوں نے آیات الٰہی کا سودا بڑی ہی کم قیمت پر کیا

عَنْ سَبِیْلِہٖ اِنَّھُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (التوبہ-۲)

اور وہ اس کی راہ سے روکنے لگے یہ بہت برا کام ہے جو وہ کرتے ہیں۔

آگے چل کر اہل کتاب سے لڑنے کا حکم دیا ہے کہ قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (الآیہ) اور پھر ان کے جرائم کی تفصیل اس طرح دی ہے:-

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (التوبہ-۵)

اے ایمان والو! اہل کتاب کے بہت سے احبار اور راہب لوگوں کے مال ناجائز طریقہ پر کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

سورہ محمد میں زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمایا:-

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعْمَالَھُمْ ..... فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْھُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا (۴۷: ۱)

جن لوگوں نے دین حق کو ماننے سے انکار کر دیا اور اللہ کی راہ سے روکنے لگے ان کے اعمال اللہ نے ضائع کر دیئے..... پس جب تمہاری ان منکروں سے مڈبھیڑ ہو تو گردنیں مارو یہاں تک کہ ان کی طاقت کو کچل ڈالو۔ اس کے بعد قید کی گرفت کو مضبوط کرو اور انہیں گرفتار کر لو پھر تمہیں اختیار ہے کہ خواہ احسان کا معاملہ کرو یا فدیہ لے لو۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رکھو جب تک جنگ اپنے ہتھیار نہ ڈال دے اور اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ صد عن سبیل اللہ، یعنی اللہ کی راہ سے روکنا بھی ایک ایسا جرم ہے جس کے خلاف جنگ ضروری ہے۔ اللہ کی راہ سے مراد وہی دین حق ہے جس کو قرآن مجید میں صراط مستقیم بھی کہا گیا ہے۔ اور یہ قرآن مجید کے انداز بیان کی انتہائی خوبی ہے کہ اس نے دین کو راستہ سے تعبیر کیا۔ گویا وہ ایک طریق ہے جو سیدھا منزل تک لے جاتا ہے، اور جس پر شیطان و اولیائے شیطان رہزنی کرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے سبیل کے معنی محض معمولی چلنے پھرنے کی سڑک کے لئے ہیں اور صد عن سبیل اللہ کا مطلب رہزنی قرار دیا ہے۔ مگر قرآن مجید میں سبیل اللہ اور سبیل رب کے الفاظ ایسے مبہم نہیں ہیں جن کا مفہوم سمجھنے میں

ذرا بھی دقت ہو۔ اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ اور إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ میں موٹروں اور بائیسکلوں کی سڑک مراد نہیں ہو سکتی، بلکہ وہی سڑک مراد ہے جو خدا تک سیدھی(?) جاتی ہے۔ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ میں بھی سیدھی راہ سے مراد وہی ایمان کی راہ ہے اور اس کی ضد کفر کی راہ قرار دی گئی ہے۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ میں بھی ان مارے جانے والوں کو زندہ نہیں کہا گیا ہے جو مٹی اور پتھروں کی سڑکوں پر جان دیتے ہیں، بلکہ یہ شرف ان لوگوں کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے جو اللہ کے دربار تک لے جانے والی راہ میں جان دیں۔ پس اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ سبیل اللہ سے روکنا دراصل اسلام سے روکنا ہے۔

اب غور کیجئے کہ اسلام سے روکنے کا کیا مطلب ہے؟ اسلام کو جب راستہ کہا گیا تو ضرور ہے کہ اس کے روکنے کی بھی وہی صورت ہوگی جو ایک رہگذر سے روکنے کی ہوتی ہے۔ کسی راستہ کو روکنے کی قدرۃً تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ دوسرے راستہ پر چل رہے ہیں انہیں اس راستہ پر نہ آنے دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جو اس راستہ پر چل رہے ہیں انہیں اس سے زبردستی ہٹا دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ اس پر چلنے والوں کے راستہ میں کانٹے بچھا دیئے جائیں، ان کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی جائے اور انہیں اس طرح دق کیا جائے کہ وہ چلنے سے عاجز آ جائیں۔ یہی تینوں مفہوم "صد عن سبیل اللہ" کے بھی ہیں یعنی اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو روکنا، مسلمانوں کو زبردستی مرتد بنانے کی کوشش کرنا اور مسلمانوں کے لئے اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کو مشکل بنا دینا۔ قرآن میں ان تینوں مفہومات کی مثالیں موجود ہیں، اور جو گروہ اس طرح اسلام کی راہ روکنے کی کوشش کرے اس کو راستہ سے ہٹا دینا اور اس کا زور توڑ دینا مسلمانوں کا اخلاقی حق بھی ہے اور دینی فرض بھی۔

(۴) **دغابازی و عہد شکنی کی سزا** سورۂ انفال میں ایک اور جرم جس کے خلاف جنگ کرنے کا حکم ہے یہ بتایا گیا ہے:-

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ

اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والے جانداروں میں بدترین وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا ہے اور ایمان نہیں لاتے جن سے

يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ

(الانفال - ۷)

تونے معاہدہ کیا تھا مگر وہ بار بار اپنے عہد کو توڑتے ہیں اور بدعہدی سے پرہیز نہیں کرتے پس اگر تو جنگ میں ان کو پالے تو انہیں سخت سزا دیکر ان لوگوں کو خوفزدہ و پراگندہ کردے جو ان کے پیچھے ہیں (یعنی انہیں ایسی سزا دے جو ان کے بعد والوں کیلئے موجب عبرت ہو)، شاید کہ وہ کچھ سبق حاصل کریں اور اگر تجھے کسی قوم سے دغا کا خوف ہو تو برابری کو ملحوظ رکھکر علی الاعلان ان کا عہد ان کی طرف پھینکدے۔ اللہ یقیناً دغابازوں کو پسند نہیں کرتا۔

اسی طرح سورہ توبہ میں زیادہ سختی کے ساتھ ان کافروں کے متعلق جنہوں نے مسلمانوں سے بار بار عہد کئے تھے، فرمایا ہے:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ۔

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان براءۃ ہے ان مشرکوں کی طرف جن سے تونے معاہدہ کیا تھا (اور جنہوں نے بار بار اس کی خلاف ورزی کی)، پس چار مہینے اور زمین میں چل پھر لو، اس کے بعد خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور اللہ کافروں کو ضرور رسوا کرنے والا ہے۔

اس کے بعد ان مشرکوں کے متعلق جنہوں نے عہد نہیں توڑا تھا حکم دیا کہ فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ، ان کے معاہدہ کی مدت مقررہ تک پابندی کرو۔ پھر دوبارہ نقضِ عہد کرنے والوں کے متعلق فرمایا:-

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ

جب وہ چار حرمت والے مہینے جن کی مہلت اوپر دیگئی ہے، گذر جائیں تو ان کو قتل کرو جہاں پاؤ، اور انہیں گرفتار کرو، اور انہیں گھیر کر محصور کرلو (تاکہ بلادِ مسلمین میں نہ آسکیں) اور ان کے لئے ہر کمین گاہ میں بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کریں،

إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو یعنی چھیر ان سے تعرض نہ کرو، کیونکہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

آگے چل کر پھر انہی بدعہد اور دغاباز مشرکوں کے متعلق فرمایا:۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ

ان مشرکوں سے اللہ اور اس کے رسول کا عہد کیسے رہ سکتا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا سو وہ جب تک عہد پر قائم ہیں تم بھی قائم رہو کیونکہ اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔ مگر ان بدعہدوں سے کیونکر عہد ہو سکتا ہے جن کی حالت یہ ہے کہ جب تم پر غلبہ و فتح حاصل کر لیں تو نہ تم سے قرابت کا لحاظ کریں اور نہ عہد و اقرار کا۔ وہ تم کو زبان سے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں (یعنی وہ دل میں تمہیں نقصان پہنچانے کی فکر رکھتے ہیں) اور ان میں اکثر بدکار سرکش ہیں۔

اس کے بعد پھر انہی بدعہدوں کے متعلق فرمایا:۔

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ

وہ کسی مومن کے ساتھ قرابت یا عہد و اقرار کا لحاظ نہیں کرتے، اور وہی ہیں جو زیادتی کرتے ہیں پس اگر وہ توبہ کریں، نماز ادا کریں، اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں، اور یہ آیات ہم کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو کچھ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ لیکن اگر وہ عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر حملے کریں تو کفر کے لیڈروں کے ساتھ جنگ کرو کیونکہ اس کے بعد معلوم ہو گیا کہ ان کی قسم کا کچھ اعتبار نہیں، شاید کہ وہ اپنی حرکات سے باز آئیں۔ کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہ کرو گے

تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ. قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ۔

جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا، اور رسول کو نکال دینے پر تل گئے اور انہوں نے ہی اوّل مرتبہ تم پر پیش دستی کی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرو، بشرطیکہ تم ایماندار ہو۔ ان سے تم ضرور جنگ کرو، اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دیگا اور انہیں رسوا کریگا اور تم کو ان پر نصرت بخشے گا اور مومنوں کے قلوب کو شفا بخشے گا۔

ان تمام آیات اور ان کی شانِ نزول پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

(۱) جو لوگ مسلمانوں سے عہد کر کے توڑیں ان سے جنگ کرنی چاہئے۔ اس حکم میں وہ کفار بھی آجاتے ہیں جو مسلمانوں سے اطاعت کا معاہدہ کر کے پھر حکومتِ اسلامیہ کے خلاف بغاوت کریں۔

(۲) جن سے معاہدہ تو ہو مگر ان کا رویہ ایسا مخالفانہ و معاندانہ ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کو ہر وقت ان سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ لگا رہے تو انہیں علی الاعلان فسخِ معاہدہ کا نوٹس دے دینا چاہئے اور اس کے بعد ان کی دشمنی کا منہ توڑ جواب دینا چاہئے۔

(۳) جو لوگ بار بار بدعہدی و دغابازی کریں، اور جن کے عہد و اقرار کا کوئی اعتبار نہ رہے، اور جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں اخلاق و انسانیت کے کسی آئین کا لحاظ نہ رکھیں، ان سے دائمی جنگ کا حکم ہے اور صرف اسی صورت سے ان کے ساتھ صلح ہو سکتی ہے کہ وہ توبہ کریں اور اسلام لے آئیں۔ ورنہ ان کے اثر سے اسلام اور دارالاسلام کو محفوظ رکھنے کے لئے قتل، گرفتاری، محاصرہ اور ایسی ہی دوسری جنگی تدابیر اختیار کرتے رہنا ضروری ہے۔

(۴) اندرونی دشمنوں کا استیصال | ان بیرونی دشمنوں کے علاوہ کچھ اندرونی دشمن بھی ہیں جو ظاہر میں دوست مگر باطن میں اسلام کی جڑ کاٹنے والے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس جماعت میں داخل ہیں جس کے لئے قرآن حکیم نے منافق کا جامع لفظ استعمال کیا ہے اور ان کے باب میں یہ حکم دیا ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (التوبہ ۱)

اے نبی منافقوں اور کافروں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو، ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بری جائے قرار ہے۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ مَّلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا (احزاب - ۸)

اگر منافقین، اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، اور مدینہ میں بری خبریں اڑانے والے، اپنی معاندانہ حرکات سے باز نہ آئے تو ہم تجھے اُن پر مسلط کر دیں گے اور پھر وہ اس شہر میں تیرے ہمسایہ نہ رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن۔ اُن پر پھٹکار پڑے گی، جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے اور خوب قتل کئے جائیں گے۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح یہ خود کافر ہوئے تاکہ تم اور وہ برابر ہو جائیں پس تم ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ یہ اللہ کی راہ میں اپنے گھروں سے نہ نکلیں۔ اگر وہ انحراف کریں (اعانت کفر سے باز نہ آئیں) تو انہیں پکڑو۔ اور جہاں پاؤ مارو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا (النساء ۱۲)

کچھ دوسرے لوگ ایسے پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم کے کافروں سے بھی راس گئے جب تمہارے پاس آتے ہیں تو اقرار اسلام کرتے ہیں اور جب فتنہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں تو اس میں اوندھے گر پڑتے ہیں (یعنی خود بھی فتنہ میں شامل ہو جاتے ہیں) پس اگر وہ تم سے کنارہ کش نہ ہوں اور نہ تم سے صلح کی طرح ڈالیں اور نہ تمہارے ساتھ جنگ و دشمنی سے ہاتھ روکیں، تو انہیں پکڑو اور جہاں پاؤ قتل کرو۔ ان لوگوں پر ہم نے تمہیں واضح دلیل دے دی ہے۔

ان آیات میں منافقین کی اس جماعت کا جرم بھی بیان کر دیا گیا ہے جس کے باعث وہ

واجب القتل ہوئے ہیں لیکن مزید وضاحت کیلئے ہم قرآن مجید ہی کی چند آیات پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ سورۂ نساء میں ہے:۔

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ (النساء: ۱۱)

وہ تجھ سے تو کہتے ہیں کہ ہم مطیع ہیں، مگر جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ جو کچھ تو کہتا ہے اس کے خلاف رات کو منصوبے گانٹھتا ہے، اور جو کچھ یہ لوگ راتوں کو منصوبے گانٹھا کرتے ہیں اللہ ان سے خبردار ہے۔

سورۂ توبہ میں فرمایا:۔

لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ لَهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتَّى جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَارِهُونَ۔

اگر وہ تمہارے ساتھ ملکر لڑنے کو نکلتے تو تمہارے اندر فساد کے سوا اور کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے، اور تمہارے درمیان جھوٹی خبریں پھیلاکر اور چغلخوریاں کرکے فتنہ برپا کرنے کی کوشش کرتے۔ اور تمہارے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں، اللہ ان ظالموں سے خوب واقف ہے۔ انہوں نے اس سے پہلے بھی (غزوۂ احد میں) فتنہ برپا کرنا چاہا تھا اور تیرے خلاف طرح طرح کی چالیں چلی تھیں یہاں تک کہ حق کی نصرت آگئی اور اللہ کا حکم غالب ہوا اگرچہ وہ انہیں بہت ہی ناگوار تھا۔

وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ۔ لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ۞ (التوبہ ۔ ۷)

اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تم ہی میں سے ہیں، حالانکہ وہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں، بلکہ در اصل یہ ڈرپوک لوگ ہیں (جو تمہاری مخالفت کے خوف سے اظہار دوستی کرتے ہیں)۔ اگر انہیں کوئی جائے پناہ، یا غار، یا گھس بیٹھنے کا مقام مل جائے تو ضرور اس کی طرف پھر جائیں اور دوڑ کر جائیں۔

الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے

بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ

(التوبہ - ۹)

ہیں، بری باتوں کا حکم کرتے ہیں، اچھی باتوں سے روکتے ہیں، اور راہ خدا میں خرچ کرنے سے ہاتھ روکتے ہیں، وہ اللہ کو بھول گئے ہیں۔ اس لئے اللہ بھی ان سے بے پروا ہوگیا ہے، بیشک یہ منافق بڑے ہی بدکار اور نافرمان ہیں۔

سورۂ احزاب میں فرمایا:۔

وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ۔ وَإِذْ قَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ۔ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِم مِّنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ۝ (رکوع ۲)

اور جب (جنگ احزاب کے موقع پر) منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں شک کی بیماری ہے کہنے لگے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدہ ہم سے کیا تھا وہ دھوکے اور فریب کے سوا کچھ نہ تھا، اور جب ان میں سے ایک گروہ بولا کہ اے اہل یثرب اب تمہارے ٹھیرنے کا موقع نہیں ہے، یہاں سے بھاگ نکلو، اور ان میں سے ایک فریق نبی سے اجازت لینے لگا یہ کہکر کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے ہوئے (غیر محفوظ) نہ تھے اور ان کا مطلب بھاگ جانیکے سوا کچھ نہ تھا، اگر مدینہ کے اطراف سے دشمن گھس پڑتے اور ان سے درخواست کی جاتی کہ تم بھی (مسلمانوں کو قتل و غارت کرنے کے) فتنہ میں شریک ہو جاؤ تو وہ ضرور شریک ہو جاتے اور اس میں ذرا تامل نہ کرتے۔

سورۂ منافقون میں فرمایا:۔

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ۔ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا

جب منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً خدا کے رسول ہیں۔ ہاں اللہ بھی جانتا ہے کہ تم اس کے رسول ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو (اپنی دشمنی کیلئے)

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (رکوع ۱۰) | ڈھال بنا رکھا ہے اور یہ اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں اور بہت ہی بُرا کام ہے جو وہ کرتے ہیں۔

یہ آیات بتلاتی ہیں کہ منافقین میں سے ایک گروہ ایسا ہے جس کے ساتھ ظاہر میں بھی مسلمانوں کا سا معاملہ نہیں کیا جا سکتا، اور اس گروہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یا تو وہ اسلام قبول کرنے کے بعد علانیہ کفر کی باتیں کرتا ہے، یا زبان سے بدستور اسلام کا اقرار کرتا رہتا ہے مگر اس کی حرکات یہ ہوتی ہیں کہ ہر وقت مسلمانوں کے درپے آزار رہتا ہے، طرح طرح سے انہیں نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرتا ہے، ان کے دشمنوں سے ساز باز رکھتا ہے، ان کی خفیہ خبریں دشمنوں کو پہنچایا کرتا ہے، ان کا ایمان بگاڑنے اور انہیں گمراہ کرنے کی کوششیں کرتا ہے، ان کی جماعت میں ریشہ دوانیاں کرکے تفرقہ برپا کرتا ہے، ان کے دشمنوں کو اخلاقی و عملی مدد پہنچاتا ہے، اور اسلام پر جب کوئی مصیبت کا وقت آئے تو اس کی حفاظت کے بجائے اسے مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ گروہ اسلام کے لئے اس کے بیرونی دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے، اس لئے جو لوگ اس غدار گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ وہ ہر وقت کلمۂ توحید و رسالت پڑھتے رہیں، اور خواہ ظاہری حیثیت سے ان کے اسلام میں کسی شک کی گنجائش نہ ہو، مگر ان کے ساتھ قطعاً کوئی رعایت نہ کرنی چاہئے اور جب ان سے ان جرائم کا صدور ہو تو جسم اسلام کے ان پھوڑوں پر سختی کے ساتھ اصلاح کا نشتر استعمال کرنا چاہئے۔

(۵) حفاظتِ امن | دشمنوں کی ایک اور قسم وہ ہے جو دارالاسلام کے اندر رہ کر یا باہر سے آکر اس میں فساد پھیلاتی ہے، ڈاکے ڈالتی اور قتل و غارت کا بازار گرم کرتی ہے اور حکومت اسلامی کے امن و امان میں خلل برپا کرتی ہے۔ ان کے متعلق قرآن مجید میں یہ حکم دیا گیا ہے:-

اِنَّمَا جَزٰۗؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُـقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ | جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں لوٹ مار سے فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں، یا صلیب پر چڑھائے جائیں، یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے

خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (المائدہ۔۵)

جائیں، یا وہ ملک سے نکال دیئے جائیں۔ یہ رسوائی تو ان کیلئے دنیا میں ہے۔ اور اسکے علاوہ، آخرت میں بھی ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس سے پہلے کہ تم ان پر قدرت پاؤ (یعنی گرفتار کرو)، توبہ کر لیں۔ تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت میں یحاربون اللہ و رسولہ کے الفاظ سے جہلا کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ اس سے مراد وہ کفار ہیں جن سے مسلمانوں کی باقاعدہ لڑائی ہو لیکن دراصل خدا اور رسول کے ساتھ محاربہ کرنے سے مراد وہی سعی فساد فی الارض ہے جس کا ذکر تشریح کے طور پر اس فقرہ کے بعد ہی کیا گیا ہے۔ یہ آیت جس موقع پر اتری تھی اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حکم فسادیوں اور امن و آئین کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے لئے ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو کر مدینہ میں رہنے لگے۔ مگر وہاں کی آب و ہوا انہیں موافق نہ آئی اور وہ بیمار پڑ گئے۔ ایک روایت کے مطابق ان کے رنگ زرد پڑ گئے اور پیٹ بڑھ گئے تھے۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا لو خرجتم الی ذود لنا فشربتم من البانہا وابوالہا، اگر تم ہمارے اونٹوں میں جا کر رہو اور ان کے دودھ اور دوا کے طور پر اُن کے پیشاب[۱] پیو تو تمہاری صحت درست ہو جائے۔ چنانچہ وہ مدینہ سے باہر اونٹوں کی چراگاہوں میں پہنچے اور جب آرام ہو گیا تو رسول اللہ کے چرواہوں کو قتل کر کے اونٹوں کو ہانک لے گئے اور اسلام سے پھر گئے۔ ان کی اس حرکت کی جب آپ کو خبر ہوئی تو آپ نے لوگوں کو بھیجکر پکڑوا منگایا، ان کے ہاتھ پاؤں کٹوائے، ان کی آنکھیں نکلوائیں، اور انہیں دھوپ میں چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ مر گئے[۲]۔ صحیح بخاری میں بھی مختلف طریقوں سے اسی مضمون کی روایتیں درج ہیں، اور امام علیہ الرحمہ نے ان کو قول اللہ عز وجل انما جزاء الذین یحاربون اللہ و رسولہ الآیہ کے زیر عنوان درج کیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت انسؓ کے حوالہ سے آنکھیں اندھی کرانے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے

۱ حدیث میں اسی طرح مذکور ہوا ہے۔ ممکن ہے یہ مشورہ طبی وجوہ سے دیا گیا ہو اور اُس زمانے کی طبی معلومات میں اس مرض کا یہی علاج ہو

۲ ابن ماجہ جلد ثانی باب من حارب وسعی فی الارض فساداً۔

کہ انہوں نے آنحضرت کے چرواہوں کی آنکھیں سلائی پھیر کر پھوڑ دی تھیں، اس لئے آپ نے ان سے آنکھوں کا قصاص لیا تھا۔ ابو داؤد اور نسائی میں ابو الزناد کے واسطہ سے حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ یہ آیت انہیں عرنیوں کے باب میں نازل ہوئی تھی اور حضرت ابو ہریرہ کا بھی یہی بیان ہے۔ اگرچہ علمائے مجتہدین کی ایک جماعت اس طرف بھی گئی ہے کہ یہ آیت ان عرینہ والوں کے حق میں نہیں اتری لیکن یہ امر متفق علیہ ہے کہ قرآن مجید میں یہ عبرتناک سزائیں جو تجویز کی گئی ہیں یہ اُنہی لوگوں کے لئے ہیں جو دار الاسلام کے امن میں لوٹ مار اور قتل و غارت سے خلل برپا کریں، اور سزاؤں کے مختلف مدارج نوعیت جرم کے مختلف مدارج سے تعلق رکھتے ہیں جس کی تفصیل فقہائے کرام نے بوضاحت بیان فرمائی ہے۔

(۲) مظلوم مسلمانوں کی حمایت | مدافعانہ جنگ کی ایک اور صورت جس میں مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اپنی کمزوری و بیچارگی کے باعث دشمنوں کے پنجہ میں گرفتار ہو جائے اور اس میں اتنی قوت نہ ہو کہ اپنے آپ کو چھڑا سکے۔ ایسی حالت میں دوسرے مسلمانوں پر جو آزاد ہوں اور جنگ کی قوت رکھتے ہوں یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اُسے اس ظلم سے نجات دلانے کے لئے جنگ کریں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا (النساء - ۱۰)	اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے جنگ نہیں کرتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کسی کو حامی اور اپنی ہی طرف سے کسی کو مددگار بنا۔

دوسری جگہ وضاحت کے ساتھ اس اعانت کی ضرورت بیان کی ہے اور اس طرح اس کی تاکید فرمائی ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۔ (انفال - ۱۰)	جو لوگ ایمان تو لائے ہیں مگر دار الکفر کو چھوڑ کر دار الاسلام میں نہیں آئے ان کی ولایت کا کوئی تعلق تم سے نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔ البتہ اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم ہے سوائے اس صورت کے جبکہ وہ ایسی قوم کے خلاف مدد مانگیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھتا ہے۔ جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے ولی و مددگار ہیں، پس اگر تم (مسلمانوں کی مدد) نہ کروگے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا۔

اس آیت میں آزاد مسلمانوں اور غلام مسلمانوں کے تعلقات کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ پہلے مالکم من ولایتھم من شیئ سے یہ بتایا گیا ہے کہ جو مسلمان دار الکفر میں رہنا قبول کریں یا رہنے پر مجبور ہوں ان سے دار الاسلام کے مسلمانوں کے تمدنی تعلقات نہیں رہ سکتے۔ یعنی نہ وہ باہم رشتہ قائم کر سکتے ہیں، نہ انہیں ایک دوسرے کا ورثہ و ترکہ مل سکتا ہے، نہ فے اور غنیمت سے ان کو کوئی حصہ پہنچ سکتا ہے، اور نہ صدقات کے مصارف میں وہ داخل ہو سکتے ہیں لیکن ولایت کے یہ تمام تعلقات منقطع کر دینے کے باوجود ایک تعلق یعنی نصرت و مددگاری کا تعلق، پھر بھی منقطع نہیں کیا اور ان استنصروکم فی الدین سے صاف طور پر بتلا دیا کہ یہ نصرت کا تعلق دین کے ساتھ قائم ہے جب تک کوئی شخص مسلمان ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی کونہ میں ہو، اس سے مسلمانوں کا تعلق نصرت و مددگاری کسی حال میں منقطع نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے دین کو کوئی خطرہ ہو یا اس پر ظلم ہو اور وہ دینی رشتہ کا واسطہ دے کر مدد مانگے تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس کی مدد کو پہنچیں، بشرطیکہ جس کے خلاف مدد مانگی گئی ہو اس سے مسلمانوں کا معاہدہ نہ ہو، کیونکہ معاہدہ ہونے کی حالت میں مسلمانوں کے لئے عہد کی پابندی اپنے مسلمان بھائی کی مدد سے زیادہ ضروری ہے اور ان کے لئے جائز نہیں ہے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے اس کی مدد کریں۔ یہ حکم بیان کرنے کے بعد اس نصرت و اعانت

کی ضرورت جتائی ہے اور فرمایا ہے کہ دیکھو یہ کفار اسلام کے مٹانے میں ایک دوسرے کی کیسے مدد کرتے ہیں، اور اپنی آپس کی مخالفتوں اور دشمنیوں کے باوجود مسلمانوں کے مقابلہ میں کس طرح ایک ہو جاتے ہیں۔ پس اگر تم بھی دینی رشتہ کو ملحوظ رکھکر آپس میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو تو زمین میں کیسا فتنہ و فساد عظیم برپا ہو؟ فتنہ کا لفظ جیسا کہ آگے چلکر ہم تشریح بیان کریں گے، قرآنی اصطلاح میں غلبۂ کفر اور پیروانِ دین حق کے مبتلائے مصیبت و ذلت ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی طرح فساد بھی ہدایت پر ضلالت کے غالب ہونے اور نیکی و صلاحِ کار کے مٹ جانے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی کسی جماعت کے مٹائے جانے یا اس کے راہِ حق سے بھٹکا دیئے جانے کو فتنہ و فساد سے تعبیر کرتا ہے، اور اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کو مسلمانوں کا فرض قرار دیتا ہے۔

دفاع کی غرض و غایت ان دفاعی جنگ کی ان تمام صورتوں پر جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہیں، ایک غائر نظر ڈالو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ ان سب کے اندر ایک ہی مقصد کام کر رہا ہے، اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے قومی وجود کو کسی حال میں بدی و شرارت سے مغلوب نہ ہونے دیں، اور یہ بدی جس راہ سے بھی خروج کرے، خواہ باہر سے خواہ اندر سے، اس کا سر کچلنے کے لئے ہر وقت مستعد رہیں۔ اللہ کو مسلمانوں سے جو خدمت لینی ہے اس کے لئے اولین ضرورت ان کا فتنوں اور خرخشوں سے محفوظ رہنا اور ان کی دینی و سیاسی طاقت کا مضبوط رہنا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مٹنے سے نہ بچائیں اور اندرونی و بیرونی دشمنوں کی فتنہ پردازیوں سے غفلت برت کر اپنے تئیں ان اجتماعی امراض کا شکار ہو جانے دیں جنہوں نے اگلی ظالم قوموں کو ذلت و مسکنت اور غضب الٰہی میں مبتلا کیا، تو ظاہر ہے کہ وہ صرف خود اپنے آپ ہی کو ہلاکت میں نہ ڈالیں گے بلکہ انسانیت کی اس خدمت عظیم کو بھی انجام دینے کے قابل نہ رہیں گے جس کے لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ اور یہ ان کا صرف اپنے اوپر ہی نہیں بلکہ تمام عالم انسانی پر ظلم ہو گا۔ پس ان کو کھول کھول کر نہایت وضاحت کے ساتھ ان دشمنوں کے نشانات بتلائے گئے ہیں جو ان کی بربادی کا موجب بنتے ہیں یا بن سکتے ہیں، اور ایک ایک کا دفعیہ

توڑ دینے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ وہ دنیا سے ہدایت کے نور کو مٹانے اور عالمگیر اصلاح کے کام میں رکاوٹ پیدا کرنے کے قابل نہ رہیں۔ پھر اس کے لئے صرف اُسی وقت تلوار اٹھانے کی ہدایت نہیں کی گئی جبکہ بدی اپنا سر نکالے اور فتنہ پردازی شروع کر دے، بلکہ اس کے مقابلہ پر ہر وقت کمربستہ و مستعد رہنے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ اسے سر نکالنے کی جرأت ہی نہ ہو اور اس پر حق کی ایسی ہیبت بیٹھی رہے کہ اس کا دف اندر ہی اندر مر جائے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ
قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ
عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ
لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا
مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ
لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (انفال-۸)

(ان کے مقابلہ کیلئے، جس قدر تمہارے امکان میں ہو، سامان جنگ اور ہمیشہ تیار رہنے والے گھوڑے مہیا رکھو۔ اس سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے سوا ان دوسرے لوگوں کو جنہیں تم نہیں جانتے، مگر اللہ انہیں جانتا ہے، مرعوب و خوفزدہ کرو گے۔ اس کام میں جو کچھ تم فی سبیل اللہ خرچ کرو گے وہ تمہیں (دنیا میں امن و امان اور ترقی اسلام کی صورت میں اور آخرت میں خوشنودی الٰہی کی صورت میں) پورے کا پورا ادا مل جائے گا اور تم پر ہرگز ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یہ آیت بتلاتی ہے کہ مسلمانوں کی جنگی ضروریات کے لئے اُس قسم کی عارضی فوج (ردیف Militia) کافی نہیں ہو سکتی جو خاص ضرورت کے موقع پر جمع کی جائے اور ضرورت رفع ہونے کے بعد منتشر کر دی جائے، بلکہ انہیں مستقل فوج مرابط (Standing army) رکھنی چاہیئے جو ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس رہے۔ آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے عجیب عجیب معانی ظاہر ہوتے ہیں۔ سامانِ جنگ کی نوعیت کو صرف لفظ قوۃ سے بیان کیا ہے جو پہلی صدی ہجری کے تیروں اور دبابوں پر، چودھویں صدی کی توپوں، ہوائی جہازوں، اور آبدوز کشتیوں پر اور اس کے بعد آنے والی صدیوں کی بہترین حربی اختراعات پر یکساں حاوی ہے۔ ما استطعتم کے لفظ نے قوۃ کی کمیت کو مسلمانوں کی قدرت و استطاعت پر موقوف کر دیا یعنی اگر وہ ایک فوج گراں مہیا کرنے کی طاقت رکھتے ہوں

توان کو وہی کرنی چاہئے۔ لیکن اگر ان میں اتنی قوت نہ ہو اور وہ بڑی بڑی توپیں، بڑے بڑے جنگی جہاز، بڑے بڑے مہلک آلاتِ جنگ حاصل نہ کرسکیں تو ان سے یہ فرض ساقط نہیں ہوجاتا، بلکہ انہیں ہر اُس وسیلۂ جنگ کو اختیار کرنا چاہئے جو دشمنانِ حق سے مقابلہ کرنے میں کام آسکے اور جسے حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے ممکن ہو۔ پھر "رباط الخیل" کے مستعد رکھنے کی مصلحت بتلاتے ہوئے ترھبون به عدو الله وعدوکم کے بعد واخرین من دونهم لا تعلمونهم الله یعلمهم کے الفاظ جو فرمائے ان میں سیاست کا یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ اگر کوئی قوم اپنی فوجی طاقت کو مضبوط رکھتی ہے تو اس سے صرف یہی فائدہ نہیں ہوتا کہ جو طاقتیں اس کی علانیہ دشمن ہوں وہ اس سے مرعوب و خوفزدہ رہتی ہیں، بلکہ رفتہ رفتہ لوگوں پر اس کی ایسی دھاک جم جاتی ہے کہ اس کے ساتھ دشمنی کرنے کا خیال بھی دلوں میں نہیں آتا، اور وہ سرکش قوتیں جو اسے کمزور اور غافل دیکھ کر حملہ کر دینے میں ذرا تامل نہ کریں اس کی اس طرح مطیع اور دوست بنی رہتی ہیں کہ اسے ان کی طبیعت میں چھپی ہوئی سرکشی کا علم ہی نہیں ہوتا۔ اس کے بعد علم المعیشت کی اس حقیقت کو ذہن نشین کیا ہے کہ اس حفظ ماتقدم کی تیاری میں جو روپیہ صرف ہوتا ہے اسے یہ نہ سمجھو کہ وہ تم سے ہمیشہ کے لئے ضائع ہوگیا اور اس کے فوائد سے تم محروم ہوگئے، بلکہ درحقیقت وہ تمہیں واپس ملتا ہے اور اس صورت میں واپس ملتا ہے کہ تم پر ظلم نہیں ہوسکتا، اور ظلم سے محفوظ رہنے کی صورت میں تمہیں پُرامن زندگی کے فوائد حاصل ہوتے ہیں یوف الیکم وانتم لا تظلمون میں دنیا و آخرت دونوں میں فوائد حاصل ہونے اور دونوں میں ظلم سے بچے رہنے کا وعدہ مضمر ہے۔ اور درحقیقت اس جملہ سے دونوں مقصود ہیں، کیونکہ مسلمانوں کے دین کی بہتری وہی ہے جو ان کی دنیا کی بہتری ہے، اور ان کی دنیا کی بدتری وہی ہے جس کا نتیجہ دین کی بدتری ہے۔

باب سوم

مُصلحانہ جنگ

اب غور کرنا چاہیے کہ مدافعانہ جنگ کے ان احکام سے مسلمانوں کی جس قومی قوت کو مٹنے اور تباہ ہونے سے بچایا گیا ہے اس کا مصرف کیا ہے۔ آیا اس قوت کو بچانا فی نفسہٖ مقصود ہے، یا درحقیقت اس سے کچھ اور کام لینا ہے جس کے لئے اس کا فتنوں سے محفوظ رہنا ضروری ہے؟ گذشتہ صفحات میں جو ہم بار بار اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے رہے ہیں کہ مسلمان اپنی قومی طاقت کو کھو کر اُس "اصلی خدمت" کو انجام دینے کے قابل نہیں رہ سکتے جس کے لئے انہیں پیدا کیا گیا ہے، تو اس سے ہمارا مقصد دراصل اسی سوال کا جواب دینا تھا۔ وہ مواقع کسی تفصیلی گفتگو کے متحمل نہ تھے اس لئے صرف اشارات پر اکتفا کیا گیا۔ مگر اب ہم بحث کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں اس گرہ کو کھولنے سے سوءِ فہم کی گنجائش نہیں ہے۔

قرآن مجید، جو کتاب مجمل ہونے کے باوجود اسلامی تعلیم کے ایک ایک پہلو کی تفصیل کا حامل ہے، وہ مقصد بھی بیان کرتا ہے جس کے لئے مسلمان پیدا کئے گئے ہیں، اور وہ "اصلی خدمت" بھی بیان کرتا ہے جس کو انجام دینے کے لئے ان کی قوت کے تحفظ میں یہ سارا اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران - ۱۲۰)	تم ایک بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کی خدمت و ہدایت کے لئے برپا کیا گیا ہے، تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس ارشاد میں اخرجت للعرب، یا اخرجت للعجم، یا اخرجت للشرق نہیں کہا گیا بلکہ اخرجت للناس کہا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کسی خاص نسل یا خاص ملک کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، اور وہ بنی نوع انسان کی خدمت یہ ہے کہ وہ نیکی کا حکم کریں اور بدی سے روکیں۔

ایک قوم کی زندگی کا مقصد تمام بنی نوع انسان کی خدمت کرنا، یہ ایک ایسی بات ہے جس کے تخیل سے قومیت و وطنیت کی فضا میں پرورش پانے والے تنگ دماغ آشنا نہیں ہیں۔ وہ "قوم پروری" یا "وطن پروری" کو تو خوب جانتے ہیں، اور "قوم پرستی" تو گویا ان کے تخیل کی معراج ہے، مگر جغرافی و نسلی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر سارے عالم انسانی کی عملی خدمت انجام دینا اور اسی کو پوری قوم کا مقصد حیات قرار دینا اُن کی رسائی سے بہت دور ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ہمیں اس کی تشریح کرنی چاہئے کہ یہ اخرجت للناس کیا چیز ہے۔

اجتماعی فرائض کا اخلاقی تخیل اگر انسان کی جبلی خواہشات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصلیت کے اعتبار سے اس کے اندر کوئی خواہش ایسی نہیں ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کے حیوانات میں بھی موجود نہ ہو جس طرح ایک انسان اچھی اچھی خوش ذائقہ غذائیں کھانے کی خواہش رکھتا ہے اسی طرح ایک گھوڑے کی بھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُسے خوب ہری ہری گھاس کھانے کو ملے۔ جس طرح ایک انسان اپنے ابنائے جنس پر غلبہ و قدرت حاصل کرنے سے خوش ہوتا ہے اسی طرح ایک مینڈھے کے لئے بھی اس سے زیادہ خوشی کا موقع اور کوئی نہیں ہوتا کہ کوئی مینڈھا اس کی ٹکر کا مقابلہ نہ کر سکے۔ جس طرح ایک انسان اپنی جان کی حفاظت کے لئے مدافعت اور بچاؤ کی تدبیریں کرتا ہے اسی طرح ایک چھوٹے سے چھوٹے کیڑے میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ پس مجرد خواہشات کے اعتبار سے انسان اور حیوان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ البتہ جو چیز اسے ادنیٰ درجہ کے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ حیوانات کی زندگی کا منتہائے مقصود ان خواہشات کا پورا کر لینا ہے، مگر انسان کی زندگی کا مقصد ان خواہشات کا حصول نہیں ہے بلکہ وہ ایک بلند تر نصب العین کے لئے ایک لازمی وسیلہ کے طور پر ان کو پورا کرنے کی کوشش

کرتا ہے۔ اگر انسان کے سامنے فی الحقیقت حیوانی مقاصد سے بلند کوئی انسانی نصب العین نہ ہو، اور وہ اپنی ذہانت اور اُس عقل کو جو خدا نے اسے عطا کی ہے، صرف ایسے وسائل اور طریقے تلاش کرنے میں صرف کرے جن سے وہ زیادہ اچھی طرح اپنی حیوانانی خواہشات کو پورا کر سکتا ہو، تو وہ ایک اعلیٰ درجہ کا حیوان تو ضرور بن سکتا ہے مگر ایک اعلیٰ درجہ کا انسان نہیں بن سکتا۔

انسان اپنے بقائے حیات کے لئے روزی کمانے پر مجبور ہے کہ نہ کمائیگا تو بھوکوں مرجائے گا، عوارض طبعی سے محفوظ رہنے کے لئے مکان بنانے، کپڑے پہننے، اور دیگر وسائل حفاظت مہیّا کرنے پر مجبور ہے کہ نہ کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔ اور اسی طرح وہ اپنے دشمنوں سے اپنے آپ کو بچانے پر بھی مجبور ہے کہ اس کوشش میں دریغ کرے گا تو ذلت و مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ لیکن محض ان ضروریات کو پورا کر لینا فی نفسہٖ کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ وہ ذریعہ ہے اُس بلند مقصد کے حصُول کا جس تک پہنچنا انسانی زندگی کا اصلی مطمح نظر ہے۔ پس سچّا انسان وہ ہے جو اپنی ذات کے حقوق صرف اس لئے ادا کرتا ہے کہ وہ اپنے خاندان، اپنے شہر، اپنی قوم، اپنے ملک، اپنے ابنائے نوع اور اپنے خدا کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہو جائے، اور اپنے اُن فرائض کو بہتر طریقہ سے انجام دے سکے جو کائنات اور خالق کائنات کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ انسانیت کا اصلی معیار انہی حقوق اور فرائض کو سمجھنا اور پوری طرح ادا کرنا ہے۔ اور انسان پر اپنی ذات کے حقوق ادا کرنا اسی لئے فرض کیا گیا ہے کہ اس کے ذمہ صرف اس کے اپنے ہی حقوق نہیں ہیں بلکہ دوسروں کے حقوق بھی ہیں۔ اگر وہ اپنا حق ادا نہ کریگا تو دوسروں کے حقوق بھی ادا کرنے سے قاصر رہے گا۔

جب افراد کے لئے انسانیت کا یہ معیار صحیح ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ مجموعۂ افراد کے لئے بھی یہی معیار صحیح نہ ہو۔ جماعت بن جانے سے آدمیت میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہو جاتی۔ اس لئے بنی آدم کی اجتماعی شرافت کا معیار بھی وہی ہونا چاہیئے جو انفرادی شرافت کا ہے۔ اگر ایک ایسا آدمی جس کی زندگی کا نصب العین پیٹ بھرنے، تن پروری اور ذاتی منفعت نفس کے سوا کچھ نہ ہو، ہماری نظروں میں ایک ذی عقل حیوان سے زیادہ وقعت نہیں پاسکتا، تو یقیناً ایک ایسی انسانی جماعت بھی متمدن جانور ہی

زیادہ وقعت کی مستحق نہیں ہے جس کی کوششوں کا دائرہ صرف اپنی صلاح و فلاح، اپنی ترقی و بہبود، اور اپنے امن و چین تک محدود ہو اور عام انسانی فلاح سے اس کو کچھ مطلب نہ ہو۔ اگر ایک ایسے آدمی کو جو اپنے گھر کی آگ بجھانے، اپنے حقوق کی حفاظت کرنے، اور اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی مدافعت کرنے میں تو خوب مستعد ہو، لیکن دوسرے کا گھر جلتا دیکھکر، دوسرے کے حقوق پامال ہوتے اور دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو مٹتے دیکھکر ٹس سے مس نہ ہوتا ہو، ہم ایک بہترین آدمی کہنا تو درکنار ایک اچھا آدمی، بلکہ "آدمی" کہنے میں بھی تامل کرتے ہیں، تو ایک ایسی قوم یا ایسی جماعت کو ہم بہترین یا کم از کم شریف قوم کیونکر کہہ سکتے ہیں جو اپنا گھر بچانے، اپنی حفاظت کرنے اور اپنے سے بدی و شرارت کو دفع کرنے کے لئے تو سب کچھ کرنے پر تیار ہو، مگر جب دوسری قوموں پر بدی کا غلبہ ہو، دوسری قومیں شیطانی قوتوں کی سرکشی سے تباہ ہو رہی ہوں اور دوسری قوموں کی اخلاقی، مادی، اور روحانی زندگی برباد ہو رہی ہو، تو وہ ان کی نجات، ان کی آزادی اور ان کی صلاح و فلاح کے لئے کوشش کرنے سے انکار کر دے۔ جس طرح افراد پر اپنے نفس ہی کے نہیں بلکہ اپنے ابنائے نوع اور اپنے خدا کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں جنہیں ادا کرنا ان کا فرض ہوتا ہے، اسی طرح ایک قوم پر بھی اپنے خالق اور اپنی وسیع انسانی برادری کی طرف سے کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں، اور وہ ہرگز ایک شریف قوم کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ ان حقوق کو ادا کرنے میں اپنی جان و مال اور زبان و دل سے جہاد نہ کرے۔ اپنی آزادی کو محفوظ رکھنا، اپنے استقلال کی حمایت کرنا، اور اپنے آپ کو شرارت کے تسلط سے بچانا یقیناً ایک قوم کا پہلا فرض ہے لیکن صرف یہی ایک فرض نہیں ہے جس کو ادا کر کے اسے مطمئن ہو جانا چاہئے بلکہ اس کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ اپنی حاصل کردہ قوت سے تمام نوع بشری کی نجات کے لئے کوشش کرے، انسانیت کی راہ سے ان تمام رکاوٹوں کو دور کرے جو اس کی اخلاقی و مادی اور روحانی ترقی میں حائل ہوں، اور ظلم و طغیان، بدی و شرارت، اور فتنہ و فساد کے خلاف اس وقت تک برابر جنگ کرتی رہے جب تک یہ شیطانی قوتیں دنیا میں باقی ہیں۔

اجتماعی فرائض کے متعلق اسلام کی اعلیٰ تعلیم | افسوس ہے کہ دنیا کے کم نظر گیانیوں نے اجتماعی شرافت

کے اس بلند معیار اور اجتماعی زندگی کے اس اعلیٰ نصب العین کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی، اور اگر کسی نے کوشش کی بھی تو اس کی نظر کچھ زیادہ دور تک نہیں جاسکی۔ یہ لوگ افراد کے اخلاقی فرائض پر جب بحث کرتے ہیں تو انسانیت ہی کے نہیں بلکہ عالمِ مادی کے ذرہ ذرہ کے حقوق بھی گنا جاتے ہیں۔ مگر جب اجتماعی زندگی کا سوال ان کے سامنے آتا ہے تو انسانیت کے وسیع تخیل کے بجائے ان کے دماغ تنگ ہو جاتے ہیں اور اجتماعی فرائض کو قومیت یا وطنیت کے ایک محدود دائرے میں سمیٹ کر وہ اس قوم پرستی یا وطن پرستی کی بنیاد ڈال دیتے ہیں جو تھوڑے سے تغیر کے بعد آسانی کے ساتھ قومی و وطنی عصبیت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ تنگ نظری ہی دراصل انسانیت کی اس غیر طبعی تقسیم کی ذمہ دار ہے جس کی بدولت ایک نسل یا ایک زبان یا ایک قومیت رکھنے والے انسان اپنے دوسرے ابنائے نوع کو دائرہ انسانیت سے خارج سمجھتے ہیں، اور ان کے حقوق کو سمجھنا اور ادا کرنا تو در کنار، انہیں ان کے پامال کرنے میں بھی اخلاق و شرافت کا کچھ ٹوٹا نظر نہیں آتا۔

قرآن مجید نے اپنے ارشاد اخرجت للناس سے دراصل انسانیت کی اسی غیر طبعی تقسیم کو منسوخ کیا ہے۔ اس نے اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار کو پیش کر کے عالمگیر خدمت انسانی کے اس اعلیٰ نصب العین کی طرف امت مسلمہ کی رہنمائی کی ہے جو ہر قسم کے امتیازات سے بالاتر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک حق پرست قوم کی فرض شناسی کے لئے قومیت کا میدان بہت تنگ ہے، وہ ایک نسل یا ایک زبان یا ایک ملک کی قید بھی برداشت نہیں کرسکتی، اس کے لئے خشکی و تری کی حد بندیاں اور سمتوں اور جہتوں کی تقسیمیں بھی بے معنی ہیں کہ ایشیا اور یورپ یا شرق و غرب کا امتیاز اس کے ادائے فرض میں حائل ہو سکے، اس کے نزدیک تو تمام انسان اور آدم کے تمام بیٹے بیٹیاں برابر ہیں، اس لئے ان سب کی خدمت کرنا یعنی ان سب کو نیکی کا حکم کرنا اور سب کو بدی سے روکنا اور شر سے بچانا، اس کا فرض ہے۔ اس اعلیٰ تعلیم کو اس نے مختلف موثر پیرایوں میں پیش کیا ہے اور تنگ خیالی کے طلسم کو توڑ کر فرض شناسی کے ایک وسیع عالم کی راہیں کھول دی ہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا — اس طرح ہم نے تم کو ایک اعلیٰ و اشرف گروہ بنایا

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرہ - ۱۷)

ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر (حق کے) گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

اور اسی مضمون کی تشریح سورۂ حج میں اس طرح کی گئی ہے:-

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرٰهِيمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ (الحج - ۱۰)

اور اللہ کی راہ میں ایسا جہاد کرو جو جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تم کو اسی کام کے لئے چن لیا ہے اور تم پر دین کے دائرہ میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ یہ وہی ملت ہے جو تمہارے باپ ابراہیم کی تھی۔ اللہ نے تمہارا نام اس سے پہلے بھی اور اس کتاب میں بھی مسلم (اطاعت گذار) رکھا ہے تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور اللہ کے راستہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو۔

ان دونوں آیات کو جو ایک دوسرے کی تشریح و تفسیر کرتی ہیں، ملا کر پڑھئے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہاں بھی مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اسی عالمگیر خدمت انسانی کو بتایا ہے۔ فرمایا کہ تم ایک بہترین گروہ ہو جسے افراط و تفریط سے ہٹا کر عدل و توسط کی راہ پر قائم کیا گیا ہے۔ تمہیں اللہ نے خاص اس کام کے لئے منتخب فرمایا ہے کہ اپنے قول اور عمل سے حق کی شہادت دو اور دنیا میں صداقت کے گواہ بن کر رہو تاکہ زندگی کے ہر پہلو میں تمہاری زبان اور تمہارے طرز عمل سے دنیا کو معلوم ہو کہ حق کیا ہے، راستی کسے کہتے ہیں، انصاف کے کیا معنی ہیں اور بھلائی کس چیز کا نام ہے۔ یہی شہادت حق تمہاری زندگی کا مقصد ہے اور اسی کے لئے تم کو مسلم (یعنی خدا کے فرمانبردار گروہ) کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تمہارے اس دین میں کوئی تنگی نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ اتنا وسیع رکھا گیا ہے کہ نسل، رنگ، زبان، قومیت اور وطنیت کی قیود اس کی برکتوں کو عام ہونے سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ اس میں کوئی چھوت چھات یا درن آشرم کی قید نہیں ہے، نہ اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں یا اسمٰعیل کے بھٹکے ہوئے اونٹوں کی کوئی تخصیص ہے۔ ہر وہ انسان جو اصول اسلام کو قبول کرے، خواہ کسی نسل اور کسی قوم کا ہو اور کسی ملک کا

باشندہ ہو تمہارے اس دین میں برابری کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح وہ خدمت جو تمہارے سپرد کی گئی ہے، اس کا دائرہ بھی کسی ایک ملک یا قوم تک محدود نہیں ہے، بلکہ تمہیں ساری انسانیت کے لئے گواہِ حق بن کر رہنا ہے

پھر ایک دوسرے طریقہ سے اسی مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے:-

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج-۶)	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں طاقت بخشیں تو وہ نماز قائم کرینگے، زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم کریں گے اور بدی کو روکیں گے۔

یہاں الناس کے بجائے الارض کا لفظ استعمال کیا اور مسلمانوں کی طاقت و قوت کا فائدہ یہ بتایا کہ وہ زمین میں خدا کی بندگی کو فروغ دیں گے۔ نیکی کا پرچار کریں گے، اور بدی کو مٹائیں گے۔ اس سے بھی یہی بتانا مقصود ہے کہ مسلمانوں کا کام صرف عرب، یا صرف عجم، یا صرف ایشیا، یا صرف مشرق کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام دنیا کے لئے ہے۔ انہیں زمین کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں پہنچنا چاہئے، معمورۂ ارضی کے ہر دشت و جبل اور بحر و بر میں نیکی کا جھنڈا لئے ہوئے بدی کے لشکروں کا تعاقب کرنا چاہئے، اور اگر دنیا کا کوئی ایک کونہ بھی ایسا باقی رہ گیا ہو جہاں منکر (یعنی برائی) موجود ہو تو وہاں پہنچکر اس کو مٹانا اور معروف (نیکی) کو اس کی جگہ قائم کرنا چاہئے۔ اللہ کا کسی خاص ملک یا خاص نسل سے رشتہ نہیں ہے۔ وہ اپنی تمام مخلوق کا یکساں خالق ہے اور سب سے یکساں خالقیت کا تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے وہ کسی خاص ملک میں فتنہ و فساد پھیلنے کو بُرا نہیں سمجھتا بلکہ زمین میں خواہ کسی جگہ بھی فساد ہو اس کے لئے یکساں ناراضی کا موجب ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں فساد فی العرب یا فتنہ فی العجم کہیں نہیں آیا بلکہ ہر جگہ ارض کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لفسدت الارض، یسعون فی الارض فسادا، تکن فتنۃ فی الارض۔ پس وہ اپنے لشکرِ حق یعنی امت مسلمہ کی خدمت کو قومیت و نسل کی حدود میں مقید نہیں کرتا بلکہ اس رحمت کو تمام روئے زمین کے بسنے والوں کے لئے عام کرتا ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی حقیقت | اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے خَیْرُ اُمَّۃٍ ہونے کی وجہ

یہ ہے کہ وہ صرف اپنی ذات کی خدمت کے لئے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ تمام انسانیت کی خدمت ان کا مقصدِ وجود ہے۔ ان کے شرف کا راز اخرجت للناس میں پوشیدہ ہے۔ وہ قوم پرستی یا وطن پرستی کے لئے نہیں اٹھائے گئے ہیں بلکہ یہ عین فطرت اسلام ہی کا تقاضا ہے کہ وہ خادمِ انسانیت بن کر رہیں۔

اب دیکھنا چاہئے کہ مسلمانوں کی وہ اصلی خدمت جس کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کس قسم کی خدمت ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے۔

معروف لغت میں اُس چیز کو کہتے ہیں جو جانی پہچانی ہو، اور اصطلاحاً اس سے مراد ہر وہ فعل لیا جاتا ہے جس سے عقل صحیح آشنا ہو، جس کی خوبی کو فطرت سلیمہ جانتی اور سمجھتی ہو اور جسے دیکھکر ہر انسان کا دل گواہی دے کہ واقعی یہ بھلائی ہے۔ اس کے بالمقابل منکر کا لفظ ہے جو عربی لغت میں اَن جانی اور نامانوس چیز کے لئے بولا جاتا ہے اور اصطلاحاً اس کا اطلاق اس فعل پر ہوتا ہے جس کو فطرت سلیمہ پسند نہ کرتی ہو، عقل صحیح جس کی برائی کا حکم لگائے اور عام انسان جسے ناپسندیدہ سمجھتے ہوں۔ ایمانداری، راستبازی، پرہیزگاری، فرض شناسی ضعیفوں کی حمایت، مظلوموں کی مدد، محتاجوں کی اعانت، عدل وانصاف کا قیام، خدا اور بندوں کے اور خود اپنے حقوق کو سمجھنا اور انہیں ادا کرنا، یہ اور ایسے ہی دوسرے اخلاقی فضائل معروف ہیں اور ان پر خود عمل کرنے اور دوسروں کو آمادہ کرنے کا نام امر بالمعروف ہے۔ اس کے برعکس خیانت، بدکاری، دروغ بافی۔ فتنہ پردازی، فساد انگیزی، بے انصافی، اپنے حدود سے تجاوز کرنا۔ دوسروں کے حق مارنا باطل کی حمایت کرنا، حق وصداقت کو دبانا، کمزوروں اور ضعیفوں کو ستانا، یہ اور ایسے ہی دوسرے تمام خلاف عقل اور خلافِ فطرت اعمال منکر ہیں اور ان سے خود احتراز کرنا اور دوسروں کو باز رکھنا نہی عن المنکر ہے۔

اس میں خود نیک بننا اور بدی سے پرہیز کرنا مقدم رکھا گیا ہے اور نیک بنانا اور بدی سے روکنا مؤخر جیسا کہ امروا بالمعروف ونھوا عن المنکر سے پہلے اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ کا ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نیک بنانے سے پہلے نیک بننا ضروری ہے۔ لیکن جس طرح اپنا پیٹ بھرنے سے دوسرے کا پیٹ بھرنا زیادہ افضل ہے اُسی طرح فضیلت کے اعتبار سے نیکی کو پھیلانے اور بدی کو

روکنے کا درجہ بھی نیک بننے اور بدی کو ترک کرنے سے زیادہ ہے۔ کیونکہ ایک نفس کی خدمت ہے اور دوسری اپنے ابنائے نوع کی خدمت، ایک محض انسانیت کے درجہ میں ہے اور دوسری انسانیت کاملہ کے درجہ میں۔ نیکی پر خود عمل کرنا اور بدی سے خود پرہیز کرنا یقیناً ایک اچھی صفت ہے اور ایک شریف آدمی کا شیوہ، مگر شرافت کا کمال اور بزرگی کا اعلیٰ درجہ اُس وقت تک کسی انسان کو نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ دوسرے لوگوں کو بھی نیکوکار بنانے اور بدکاری سے روکنے کی کوشش نہ کرے۔ انسان کی فطرت ہے کہ اگر اسے کوئی چیز ناپسند ہوتی ہے تو چھوڑ دیتا ہے۔ اگر ناپسندی سے ایک درجہ بڑھکر نفرت ہوتی ہے تو اسے دیکھنا یا سننا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر نفرت سے ایک درجہ بڑھکر دشمنی ہو جاتی ہے تو وہ اسے مٹانے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اور اگر دشمنی سے بھی بڑھ کر اس کے دل میں بغض و عناد کے شدید جذبات پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اس کے مٹانے کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیتا ہے اور اس طرح ہاتھ دھوکر اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ جب تک اسے صفحہ ہستی سے محو نہ کر دے چین نہیں لیتا۔ اسی طرح جب وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو خود اختیار کر لیتا ہے۔ جب محبت کرتا ہے تو آنکھوں سے اس کو دیکھنے اور کانوں سے اس کا ذکر سننے میں وہ مسرت محسوس کرتا ہے۔ جب محبت سے بڑھکر عشق کا درجہ آتا ہے تو چاہتا ہے کہ دنیا کے ذرہ ذرہ میں اسی کا جمال ہو اور زندگی کا کوئی لمحہ بھی اس کے غیر کو دیکھنے اور غیر کا ذکر سننے اور غیر کا تصور کرنے میں ضائع نہ ہو۔ پھر اگر یہ عشق فدائیت کی حد تک بڑھ جائے تو وہ اپنی زندگی کو اسی کی خدمت کے لئے وقف کر دیتا ہے اور اپنی جان و مال، عیش و آرام، عزت و آبرو، غرض سب کچھ اس پر نثار کر دیتا ہے۔ پس امر بالمعروف جس چیز کا نام ہے وہ دراصل نیکی سے انتہائی شیفتگی اور والہانہ عشق ہے، اور نہی عن المنکر سے جس چیز کو تعبیر کیا گیا ہے وہ دراصل بدی سے انتہائی بغض و عناد ہے۔ معروف کا حکم دینے والا صرف نیک ہی نہیں ہوتا بلکہ نیکی کا عاشق اور فدائی ہوتا ہے، اور منکر سے روکنے والا صرف بدی سے محترز ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا دشمن اور اس کے خون کا پیاسا ہوتا ہے۔

ایک دوسرا جذبہ جس پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بنیاد قائم ہے حُبِّ انسانیت اور ہمدردی بنی نوع کا جذبہ ہے۔ خود غرض آدمی کو اللہ جو نعمت دیتا ہے اس میں وہ اکیلا رہنا چاہتا ہے، دوسرے

کو اس میں شریک نہیں کرتا۔ اسی طرح کوئی مصیبت اس کی اپنی ذات پر آئے تو وہ اسے دفع کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے مگر دوسروں کو مصیبت میں دیکھکر اُن کی مدد نہیں کرتا۔ بخلاف اس کے جو شخص ہمدرد اور محبِ انسانیت ہو وہ اپنی راحت میں سب کو شریک کرتا ہے، اپنی نعمتیں سب پر بانٹتا ہے، اور دوسرے کو درد و مصیبت میں دیکھکر اسی طرح بیتاب ہو جاتا ہے جس طرح خود اپنے لئے ہو سکتا ہے۔ اس خود غرضی و ہمدردی کو ہم عموماً محسوسات اور مادیات کے عالم تک محدود سمجھتے ہیں، لیکن اخلاق و روحانیت کے عالم میں ان صفات کا مقابلہ زیادہ سختی کے ساتھ ہوتا ہے، اور چونکہ انسان کی مادی بھلائی اور برائی اس کی اخلاقی و روحانی زندگی کے تابع ہوتی ہے اس لئے ان صفات کا اصلی مقابلہ حقیقۃً اسی عالم میں ہوتا ہے۔ ایک سچا ہمدردِ بنی نوع اور محبِ انسانیت خود نیک بن جانے پر قانع نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ اپنی انسانی برادری کے دوسرے افراد کو بھی بدی کے پنجہ سے چھڑا کر نیکی کا رستہ نہ دکھائے اسے اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی روح اپنے دوسرے بھائی کو بدی میں مبتلا دیکھکر بے چین ہو جاتی ہے۔ وہ دوسرے انسان کو نیکی کے لباس سے عاری دیکھکر اسی طرح بیقرار ہو جاتا ہے جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو سردی میں سکڑتے دیکھکر بیقرار ہو جایا کرتی ہے۔ اس کو جب کسی چیز کی اچھائی معلوم ہو جاتی ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ سارے انسان اُس سے فائدہ اٹھائیں، اور جب وہ کسی چیز کی برائی جان لیتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کے چنگل میں ایک شخص بھی گرفتار نہ رہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک چیز اگر اچھی ہے تو وہ صرف میرے ہی لئے اچھی نہیں ہے بلکہ ہر انسان کیلئے اچھی ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کو آدم کے ہر بیٹے اور بیٹی تک پہنچاؤں۔ دوسری چیز اگر فی الحقیقت بُری ہے تو وہ صرف میرے ہی لئے بری نہیں ہے بلکہ سب کے لئے اس کی برائی یکساں ہے اور لوگوں کو اس سے بچانا میرا فرض ہے۔ اپنی بھلائی پر قناعت کرکے دوسروں کی بھلائی نہ چاہنا اور اپنے سے بدی کو دور کرکے مطمئن ہو جانا اور دوسروں کو اس سے بچانے کی کوشش نہ کرنا سب سے بڑی خود غرضی اور سب سے بڑی انانیت ہے۔

لیکن یہ صرف خود غرضی ہی نہیں بلکہ خود کشی بھی ہے۔ انسان ایک متمدن ہستی ہے۔ وہ جماعت سے الگ ہو کر زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ بھلائی اور برائی سب کچھ اجتماعی ہے۔ جماعت بری ہوگی تو اس کی برائی سے وہ بھی نہ بچ سکے گا۔ اگر ایک شہر میں عام طور پر غلاظت پھیلی ہوئی ہو اور اس سے وبا پھوٹ پڑے تو ہوا کی خرابی صرف اسی شخص کو ہلاک نہ کریگی جس کے گھر میں غلاظت موجود ہو، بلکہ وہ صاف ستھرا روز

نہانے والا، روز گھر کو صاف رکھنے والا، اور حفظانِ صحت کا پورا لحاظ رکھنے والا آدمی بھی اس سے متاثر ہوگا جو اس شہر میں رہتا ہو۔ اسی طرح اگر کسی بستی کا عام اخلاق بگڑا ہوا ہو اور وہاں کے لوگ عموماً بدکار ہوں تو اس پر جو تباہی نازل ہوگی وہ صرف بدکاروں ہی تک محدود نہ ہوگی بلکہ ان چند نیکوکاروں کی عزت و شرافت پر بھی اس کی زد پہنچے گی جو اس بستی میں مقیم ہوں۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً (انفال: ۳) کے یہی معنی ہیں کہ کسی بستی کی عام تباہی سے صرف بدکار ہی تباہ نہیں ہوتے بلکہ نیکوکار بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مضمون کو ایک حدیث میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

ان اللہ لا یعذب العامة بعمل خاصة	اللہ عام لوگوں پر خاص لوگوں کے عمل کے باعث
حتی یروا المنکر بین ظہرانیہم وہم قادرون	اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتا جب تک ان میں
علی ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذا فعلوا ذلک	یہ عیب پیدا نہ ہو جائے کہ اپنے سامنے برے اعمال ہوتے
عذب اللہ الخاصة والعامة (رواہ امام احمد)	دیکھیں اور انہیں روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر نہ روکیں

جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں تو پھر اللہ عام اور خاص سب پر عذاب نازل کرتا ہے۔

پس امر بالمعروف و نہی عن المنکر صرف دوسروں ہی کی خدمت نہیں بلکہ اپنی خدمت بھی ہے اور درحقیقت مجموعی بہتری میں اپنی بہتری چاہنے کی دانشمندانہ حکمت عملی کا دوسرا نام ہے۔

حیات اجتماعی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا درجہ

پھر یہی وہ چیز ہے جس پر اجتماعی فلاح و بہبود کا دارومدار ہے، جو ایک قوم اور ایک جماعت کو ہلاکت میں مبتلا ہونے سے بچاتی ہے، جس کے بغیر انسانیت کی حفاظت نہیں کی جاسکتی۔ جب تک ایک قوم میں یہ اسپرٹ موجود رہتی ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے کا اہتمام کریں، یا کم از کم اس قوم میں ایک جماعت ہی ایسی موجود رہے جو اس فرض کو مستعدی کے ساتھ انجام دیتی رہے، تو وہ قوم کبھی تباہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اسپرٹ اس میں سے نکل جائے اور اس میں کوئی جماعت بھی ایسی نہ رہے جو اس فرض کو انجام دینے والی ہو تو رفتہ رفتہ بدی کا شیطان اس پر

مسلط ہوجاتا ہے، اور آخر وہ اخلاقی و روحانی اور مادی تباہی کے گڑھے میں ایسی گرتی ہے کہ ابھر نہیں سکتی۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا:۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ۔ (ہود - ۱۰)

پس کیوں نہ تم سے پہلے کی قوموں میں (جن پر عذاب نازل ہوا) ایسے نیکوکار لوگ اٹھے جو انہیں زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے؟ ایسے لوگ بہت تھوڑے تھے جنہیں ہم نے ان میں سے بچا لیا، ورنہ سارے ہی ظالم لوگ ان لذتوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انہیں عطا کئے گئے تھے اور وہ بڑے خطاکار تھے۔ سو تیرا رب ظالم نہیں ہے کہ بستیوں کو یونہی ہلاک کر دے حالانکہ ان کے باشندے نیکوکار ہوں۔

ایک دوسری جگہ بنی اسرائیل کے مبتلائے لعنت ہونے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ:۔

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ۔ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (المائدہ - ۱۱)

بنی اسرائیل میں کفر کرنیوالے لوگوں پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جاتے تھے، وہ ایک دوسرے کو ان بُری باتوں سے نہ روکتے تھے جو وہ کیا کرتے تھے اور یہ بہت بُری بات تھی جو وہ کرتے تھے۔

اس آیت کی تفسیر میں امام احمد، ترمذی، ابو داؤد اور ابن ماجہ رضی اللہ عنہم نے جو احادیث نقل کی ہیں ان سب میں تھوڑے اختلاف کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل میں پہلا نقص جو پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ان کے دلوں سے برائی کی نفرت دور ہو گئی تھی، اور وہ جھوٹی رواداری پیدا ہو گئی تھی جو برائی کو برداشت کرتے کرتے خود برائی میں مبتلا ہو جانے پر انسان کو آمادہ کر دیتی ہے۔ کان الرجل یلقی الرجل فیقول یا ھذا اتق اللہ ودع ما تصنع فانہ لا یحل لك ثم یلقاہ من الغد فلا یمنعہ ذالك ان یکون اکیلہ وشریبہ وقعیدہ یعنی جب ان میں کا ایک آدمی دوسرے سے ملتا

تو کہتا کہ اے شخص اللہ سے ڈر اور یہ فعل چھوڑ دے جو تو کرتا ہے کیونکہ یہ تیرے لئے جائز نہیں ہے۔ مگر دوسرے دن جب اس سے ملتا تو اسی کا ہم پیالہ و ہم نوالہ اور ہم نشین بننے سے کوئی چیز اسے باز نہ رکھتی۔ آخر ان پر ایک دوسرے کی برائی کا اثر پڑ گیا اور ان کے ضمیر مردہ ہو گئے، ضرب اللہ قلوب بعضہم ببعض جس وقت حضورؐ یہ فرما رہے تھے تو دفعتہً لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے اور جوش میں آکر فرمایا:-

والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنھن عن المنکر ولتاخذن علے ید المسیئ ولتاطرنہ علی الحق اطراً او لیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض او لیلعنکم کما لعنھم	اُس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تمہیں لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور برائی سے روکو اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف موڑ دو، ورنہ اللہ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دیگا، یا تم پر بھی اسی طرح لعنت کریگا جس طرح ان لوگوں کی تھی

اسی مثال پر تمام دنیا کو بھی قیاس کر لینا چاہئے جس طرح ایک قوم کی فلاح و بہبود اور نجات کا انحصار امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی عملی روح پر ہے، اسی طرح تمام عالم انسانی کی نجات و فلاح بھی اسی چیز پر منحصر ہے۔ دنیا میں کم از کم ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہئے جو بدکاروں کا ہاتھ پکڑنے والا، بدی کو روکنے والا، اور نیکوکاری کا حکم دینے والا ہو، اللہ کی طرف سے اس کی زمین پر شہید ہو، لوگوں کی دیکھ بھال کرتا رہے، شرارت کے عناصر کو قابو میں رکھے، انصاف قائم کرے اور بدی کو کبھی سر نکالنے کا موقع نہ دے۔ اللہ کی مخلوق کو عام تباہی سے بچانے اور اس کی زمین کو شر و فساد اور ظلم و زیادتی سے محفوظ رکھنے کے لئے ایسے گروہ کا وجود نہایت ضروری ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱)	اور تم میں ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔

پس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی حقیقت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ فی نفسہٖ ایک اچھی چیز ہے اور ہمدردی بنی نوع کا ایک پاکیزہ جذبہ ہے، بلکہ درحقیقت وہ نظام تمدن کو فساد سے محفوظ رکھنے کی ایک بہترین اور ناگزیر تدبیر ہے اور ایک خدمت ہے جو دنیا میں امن قائم کرنے، دنیا کو شریف

انسانوں کی بستی کے قابل بنانے اور دنیا والوں کو حیوانیت کے درجہ سے انسانیت کاملہ کے درجہ تک پہنچانے کے لئے اللہ نے ایک بین الاقوامی گروہ کے سپرد کی ہے، اور یقیناً انسانیت کی اس سے بڑی خدمت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرق یہ عالمگیر انسانی خدمت جو بین الاقوامی مسلم جماعت کے سپرد کی گئی ہے دو اجزا پر مشتمل ہے، ایک امر بالمعروف، دوسرے نہی عن المنکر۔ ان دونوں کا مقصود و مدعا اگرچہ ایک ہی ہے، یعنی آدمی کو انسان بنانا، لیکن دونوں کے مدارج مختلف ہیں، اس لئے دونوں کے طرز تعمیل میں بھی اختلاف ہے۔ آئندہ مباحث کو سمجھنے کے لئے اس اختلاف کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

علم الاخلاق میں انسان کے فرائض کو دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک وہ فرائض جن کے کرنے کا اس سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے، دوسرے وہ فرائض جن کا کرنا نہ کرنا خود اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ سوسائٹی کا ایک اچھا رکن بننے کے لئے انسان کا کم سے کم فرض یہ ہے کہ وہ بُرے کاموں سے بچے، دوسروں کے حقوق نہ چھینے، دوسروں پر ظلم نہ کرے، دوسروں کے امن و اطمینان میں خلل نہ ڈالے، اور ایسے اعمال سے پرہیز کرے جو اس کے وجود کو سوسائٹی کے لئے نقصان دہ یا غیر مفید بنانے ہوں۔ ان فرائض کے ادا کرنے کا ہر سوسائٹی اپنے ہر رکن سے مطالبہ کرتی ہے اور اگر وہ انہیں ادا نہ کرے تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے ادا کرنے پر اسے مجبور کرے۔ فرائض کی دوسری قسم وہ ہے جو فضائل اخلاق سے تعلق رکھتی ہے، جنہیں ادا کرنے سے انسان سوسائٹی کا ایک معزز اور اعلیٰ درجہ کا رکن بن سکتا ہے۔ مثلاً خدا اور بندوں کے حقوق پہچاننا اور انہیں ادا کرنا، خود نیک بننا اور دوسروں کو نیک بنانا، اپنے خاندان اور اپنی قوم اور اپنے ابنائے نوع کی خدمت کرنا اور حق کی حمایت و حفاظت کرنا وغیرہ۔ اس دوسری قسم کے فرائض کو انجام دینے کے لئے انسانی شعور کی تکمیل ضروری ہے۔ کوئی شخص انہیں اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک ان کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ نہ لے اور اس کے نفس میں اتنی پاکیزگی پیدا نہ ہو جائے کہ وہ انہیں ادا کرنے پر آمادہ ہو۔ اس لئے یہ فرائض جبری نہیں بلکہ اختیاری ہیں اور انسان کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ خواہ معزز اور اعلیٰ درجہ کا انسان بنے

یا نہ بنے۔ اگرچہ ایک سوسائٹی کا اخلاقی نظام ایسا ہی ہونا چاہئے کہ اس کے افراد میں اعلیٰ درجہ پر پہنچنے کی خواہش طبعاً پیدا ہو۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرق بھی تقریباً اسی تقسیم پر مبنی ہے۔ آدمی کو حیوانیت کے درجہ سے نکال کر انسانیت کی سطح پر لانا اور اسے انسانی سوسائٹی کا ایک غیر مفید اور نقصان دہ رکن بننے سے روکنا نہی عن المنکر سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کو انسانیت کی سطح سے اٹھا کر انسانیت کاملہ کے درجہ میں لے جانا اور اسے انسانی سوسائٹی کا ایک مفید اور معزز رکن بنانا امر بالمعروف سے متعلق ہے۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر سے افضل ہے لیکن ترتیب کے اعتبار سے نہی عن المنکر پہلے ہے اور امر بالمعروف بعد میں۔ جس طرح ایک کسان کا اصل مقصد اناج پیدا کرنا ہے لیکن اس کے لئے بیج ڈالنے سے پہلے ہل چلا کر زمین کو نرم کر دینا ضروری ہے۔ اسی طرح اسلام کا اصل مقصد تو انسان کو انسان اعلیٰ بنانا ہے مگر معروف کا بیج ڈالنے سے پہلے اس کی فطرت کو منکر سے پاک کر کے ہموار کر دینا ضروری ہے۔ اسلام ہر شخص کو معروف کی طرف دعوت دیتا ہے اور انسان کو اس کی خوبیاں دکھا کر اسے اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے لیکن منکر ایک پردہ ہے جو انسان کی آنکھ کو معروف کا پرتو قبول کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتا۔ اس لئے منکر کے پردہ کو ہر ممکن طریقہ سے چاک کرنا اور اس کے زنگ کو ہر ممکن طریقہ سے کھرچ دینا سب سے پہلی اور ضروری تدبیر ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص معروف کی دعوت قبول کرے تو اس کے لئے فضائل اخلاق کا ایک بڑا حصہ امتیازی نہیں رہتا۔ کہ لازمی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انسانیت کاملہ کے درجہ میں پہنچنے کے لئے وہ آسانیاں باقی نہیں رہ گئیں جو انسانیت محضہ کے درجہ میں اسے حاصل تھیں لیکن اگر منکر کا پردہ چھوٹ جانے کے بعد اور پردہ اٹھ جانے کے بعد بھی کوئی آنکھ معروف کا جمال نہ دیکھے اور کوئی قلب اس کا پرتو قبول نہ کرے تو اسلام اسے صرف منکر سے روکنے پر اکتفا کرتا ہے اور آگے اس کا معاملہ اس کے اپنے ضمیر پر چھوڑ دیتا ہے

ایک دوسری حیثیت سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرق اس فرق پر مبنی ہے جو خود اسلام کی دو مختلف حیثیتوں کے درمیان ہے۔ اسلام ایک حیثیت میں تو محض دعوت ہے نیکی اور تقویٰ کی جانب، اور دوسری حیثیت میں وہ اللہ کا قانون ہے تمام دنیا کے لئے۔ جب کوئی شخص اسلام قبول کر لیتا ہے تو

اس کے لئے یہ دونوں حیثیتیں جمع ہو جاتی ہیں اور دعوت کی دفعات بھی اس کے حق میں قانون کی دفعات بن جاتی ہیں۔ مگر اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں دعوت الگ رہتی ہے اور قانون الگ۔ دعوت کا منشاء یہ ہے کہ انسان اُس منصب خلافت کا اہل بن جائے جو اللہ نے اسے زمین پر بھیجتے وقت سپرد کیا تھا اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرے جو خلیفۃ اللہ فی الارض کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ قانون کا منشاء یہ ہے کہ انسان اگر منصب خلافت کی خدمات کو انجام نہ دے تو کم از کم فساد و خونریزی تو نہ کرے جس کا طعنہ فرشتوں نے اس کو دیا تھا۔ اگر وہ اشرف المخلوقات نہ بنے تو کم از کم ارذل المخلوقات تو نہ بن جائے۔ اگر وہ دنیا کو نیکی و تقویٰ سے روشن نہ کرے تو کم از کم بدی و شرارت سے اس کے امن و سکون کو غارت تو نہ کرے۔ پہلی چیز باطن کی روشنی اور طبیعت کی صلاحیت پر منحصر ہے جو ظاہر ہے کہ مار کوٹ سے پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن دوسری چیز حدود کی تعیین اور نگہداشت سے تعلق رکھتی ہے جس کا پاس نہ لحاظ کرنے پر اس کی سرکش طبیعت کو صرف وعظ و تلقین ہی سے آمادہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ بعض حالات میں اسے مجبور کرنے کے لئے قوت کا استعمال بھی ضروری ہوتا ہے۔

نہی عن المنکر کا طریقہ

اس مضمون کے بعض پہلو مزید روشنی کے محتاج ہیں جنہیں آگے چل کر ہم ایک دوسرے موقع پر بوضاحت بیان کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر بتانا مقصود ہے کہ اسلام نے غیر مسلم دنیا کو معروف کی تلقین کرنے کے لئے تو صرف دعوت و تبلیغ کا طریقہ بتایا ہے، لیکن منکر سے روکنے کے لئے اس کی قید نہیں رکھی بلکہ اس کی مختلف انواع کے لئے مختلف طریقے تجویز کئے ہیں۔ قلب و ذہن کی گندگی اور خیال و رائے کی ناپاکی کو وعظ و تلقین کے ذریعہ سے دور کرنے کی ہدایت کی:-

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل-۱۶)

اللہ کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ بلا اور ان سے ایسے طریقہ پر بحث و گفتگو کر جو بہترین ہو (یعنی سختی و بدکلامی اس میں نہ ہو)

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ - (عنکبوت-۵)

اور اہل کتاب سے بحث و مباحثہ نہ کر مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں ظالم و بدکار ہیں۔

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ۔۲) پس اس سے نرمی سے نرم گفتگو کرو شاید کہ وہ نصیحت پکڑ لے اور اللہ سے ڈرے۔

فعل و عمل کی برائی کو طاقت و قوت کے زور سے روکنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اوپر وہ حدیث گذر چکی ہے جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "ولتاخذن علی ید المسیء ولتطرنہ علی الحق اطراء" "تم پر لازم ہے کہ بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اس کو حق کی طرف موڑ دو"۔ اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں جن میں منکر کو روکنے کے لئے قوت کے استعمال کا حکم ہے۔ ایک موقع پر حضور فرماتے ہیں:۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذالک اضعف الایمان (رواہ مسلم) تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو اس کو ہاتھ سے بدل دے، اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے، اور اگر اس کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو دل سے۔ اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

ان احادیث میں ہاتھ کا لفظ محض جسمانی ہاتھ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ مجازاً قوت کے معنی میں بولا گیا ہے۔ بدکار کا ہاتھ پکڑنے سے مراد در اصل یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ وہ بدی و شرارت کا ارتکاب نہ کر سکے۔ اسی طرح ہاتھ سے بدل دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی قوت و طاقت کو منکر کے مٹانے اور روکنے اور معروف سے بدل دینے میں استعمال کرو۔ ایک اور حدیث میں ہے:۔

ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظھرانیھم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروہ (رواہ احمد) اللہ عام لوگوں کو خاص لوگوں کے عمل کی سزا اس وقت تک نہیں دیتا جب تک ان میں یہ غلط رواداری پیدا نہ ہو جائے کہ بدی کو اپنے سامنے ہوتے ہوئے دیکھیں اور اس کو روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر نہ روکیں۔

رسول اللہ کا ارشاد اللہ کے ارشاد کی تفسیر ہوتا ہے۔ پس ان احادیث سے قرآن پاک کے حکم نہی عن المنکر کے معنی صاف متعین ہو جاتے ہیں کہ اس سے مراد صرف زبان و قلم ہی سے منکر کو روکنا اور اس کے خلاف تبلیغ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ حسب ضرورت بزور قوت اس کو روک دینا اور دنیا کو اس کے وجود

سے پاک کر دینا بھی ہے۔ اور یہ مسلمانوں کی قدرت و استطاعت پر موقوف ہے۔ اگر مسلمانوں میں اتنی قوت ہو کہ تمام دنیا کو منکر سے روک کر اسے قانونِ عدل کا مطیع بنا دیں تو ان کا فرض ہے کہ اس قوت کو استعمال کریں، اور جب تک اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں چین نہ لیں۔ لیکن اگر وہ اتنی قوت نہ رکھتے ہوں تو جس حد تک ممکن ہو انہیں اس خدمت کو انجام دینا چاہیئے اور تکمیل مدعا کے لئے مزید قوت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

فتنہ و فساد کے خلاف جنگ منکر کی اس دوسری قسم کو جس کے خلاف اسلام میں قوت استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، پہلی قسم سے ممتاز کرنے اور اس کی نوعیت کو زیادہ واضح کر دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فتنہ اور فساد سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ ان تمام آیات میں جن میں منکر کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی ہے، یا جنگ کی ضرورت ظاہر فرمائی گئی ہے، یا اسے بزورِ شمشیر مٹانے کا حکم دیا گیا ہے، آپ کو منکر کے بجائے یہی فتنہ اور فساد کے الفاظ ملیں گے:-

قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔	ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔
لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ	اللہ اگر لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔
اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ۔	اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہو گا،
وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔	اور فتنہ قتل سے زیادہ بُری چیز ہے،
مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا	جو کوئی کسی شخص کو قتل کرے بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد پھیلایا ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔
لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ۔	انہوں نے فتنہ پھیلانا چاہا تھا۔
كُلَّمَا رُدُّوْا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا	جب کبھی فتنہ کی طرف واپس جاتے ہیں تو اس میں خود بھی شامل ہو جاتے ہیں

ان تمام آیات میں اُسی منکر کو فتنہ اور فساد کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ تمام منکرات میں یہ فتنہ و فساد ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا استیصال بغیر تلوار کے نہیں ہو سکتا۔

فتنہ کی تحقیق | عام طور فتنہ و فساد کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ کسی بات پر دو جماعتوں میں جھگڑا ہو جائے پہلے گالم گلوچ ہو، پھر فریقین کے مستعد آدمی اینٹ پتھر یا لاٹھی پونگے یا تلوار بندوق سے مسلح ہو کر میدان میں کود پڑیں، ایک دوسرے کے سر پھوڑیں اور خوب قتل و غارت کر کے آتش غضب کو ٹھنڈا کریں۔ اگرچہ فتنہ و فساد کا اطلاق اس مشغلہ پر بھی ہوتا ہے، لیکن قرآنی اصطلاح میں ان الفاظ کا مفہوم اس قدر تنگ نہیں ہے بلکہ اور بہت سے اخلاقی جرائم بھی ان کے تحت آتے ہیں۔ ہمیں ان کی تفصیل دوسری کتابوں میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، خود قرآن ہمکو بتا دیتا ہے کہ اس کی مراد فتنہ و فساد سے کیا ہے۔

لغت میں فتن کے معنی ہیں سونے کو تپا کر دیکھنا کہ وہ کھوٹا ہے یا کھرا۔ اسی لغوی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ انسان کے آگ میں ڈالے جانے پر بولا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے یَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ (جس روز وہ آگ پر بھونے جائیں گے)۔ پھر مجازاً اس سے ہر وہ چیز مراد لی گئی ہے جو انسان کو امتحان اور آزمائش میں ڈالنے والی ہو۔ چنانچہ مال و دولت اور اہل و عیال کو فتنہ کہا گیا وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ، کیونکہ یہ چیزیں انسان کو اس آزمائش میں ڈال دیتی ہیں کہ وہ حق کو زیادہ عزیز رکھتا ہے یا ان کو۔ راحت اور مصیبت کو بھی فتنہ کہا گیا وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً، کیونکہ ان دونوں حالتوں میں بھی انسان کی آزمائش ہوتی ہے۔ زمانے کے انقلابات اور تاریخ کی نیرنگیوں کو بھی فتنہ کہا گیا۔ کیونکہ وہ قوموں کی آزمائش اور ان کے امتحان کا ذریعہ ہیں، أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ۔ کسی کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالنے کو بھی فتنہ کہتے ہیں کیونکہ یہ اس کی قوت برداشت کا سخت امتحان ہے، وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ ائْذَنْ لِي وَلَا تَفْتِنِّي۔ ان تمام مثالوں سے معلوم ہوا کہ فتنہ کے اصل معنی امتحان اور آزمائش کے ہیں خواہ وہ فائدے کے لالچ اور لذت کی چاٹ اور محبوب چیزوں کی بخشش کے ذریعہ سے ہو یا نقصان کے خوف اور مصائب کی مار اور ایذا رسانی کے ذریعہ سے۔ یہ آزمائش اگر خدا کی طرف سے ہو تو برحق ہے کیونکہ خدا انسان کا خالق

ہے اور وہ اپنے بندوں کا امتحان لینے کا حق رکھتا ہے اور اس کے امتحان کا مقصد انسان کو بہتر اور بلند تر حالت کی طرف لے جانا ہے۔ لیکن اگر یہی آزمائش انسان کی طرف سے ہو تو یہ ظلم ہے کیونکہ انسان کو اس کا حق نہیں ہے، اور انسان جب کبھی دوسرے انسان کو فتنہ میں ڈالتا ہے تو اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اس کی آزادیِ ضمیر سلب کرے اور اس کو اپنی بندگی پر مجبور کرے۔ اور اسے اخلاقی و روحانی پستی میں مبتلا کر دے۔ اس موخر الذکر مفہوم میں فتنہ کا لفظ تقریباً انگریزی لفظ (Persecution) کا ہم معنی ہے، مگر انگریزی لفظ میں اتنی وسعت نہیں ہے جتنی فتنہ میں ہے۔

قرآن میں اس کی جو تفصیلات دی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کمزوروں پر ظلم و ستم کرنا، ان کے جائز حقوق سلب کرنا، ان کے گھر بار چھین لینا، اور انہیں تکلیفیں پہنچانا:۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْۤا (النحل - ۱۴)	پھر تیرا رب ان لوگوں کے لئے جو فتنہ میں ڈالے جانے یعنی خوب ستائے جانے کے بعد اپنے گھر بار چھوڑ کر نکل گئے

اور جنہوں نے حق کی خاطر سخت جد و جہد کی اور راہ حق میں ثابت قدم رہے مغفرت کرنے والا ہے)

وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (البقرہ - ۲۷)	(حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنا یقیناً مسجد حرام کی حق تلفی ہے) لیکن حرم کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا

اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ برا ہے اور فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے۔

(۲) جبر و استبداد کے ساتھ حق کو دبانا، اور قبول حق سے لوگوں کو روکنا۔

فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ (یونس - ۹)	پس موسیٰ پر ان کی قوم میں سے کوئی ایمان نہ لایا سوائے نوجوانوں کی ایک قلیل جماعت کے کیونکہ انہیں فرعون اور اپنے سرداروں سے (جو فرعون کے خوشامدی تھے) خوف تھا کہ انہیں فتنہ میں مبتلا کر دیں گے۔

(۳) صد عن سبیل اللہ جس کی تشریح گذشتہ باب میں کی جا چکی ہے چنانچہ سورۂ انفال میں پہلے تو کافروں

کا یہ جرم بتایا ہے کہ وہ سد سبیل اللہ کی کوشش کرتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (پھر ان کے مغلوب ہونے کی پیش گوئی کی ہے) ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ اور اس کے بعد ان کے اسی فعل کو فتنہ قرار دے کر جنگ کا حکم دیا ہے۔ وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔

(۴) لوگوں کو گمراہ کرنا اور حق کے خلاف خدع و فریب اور طمع و اکراہ کی کوششیں کرنا۔

وَاِنْ کَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَکَ عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَہٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْکَ خَلِیْلًا (بنی اسرائیل-۸)

اور انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ تجھے طمع و اکراہ کے ذریعہ اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تیری طرف بھیجی ہے تاکہ تو اسے چھوڑ کر ہم پر افترا باندھنے لگے، اگر تو ایسا کرتا تو اس وقت وہ تجھے دوست بنا لیتے۔

وَاحْذَرْھُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکَ۔ اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّۃِ یَبْغُوْنَ (المائدہ-۷)

اور ان سے متنبہ رہو کہ کہیں تجھے فریب دے کر ان احکام میں سے کسی سے نہ پھیر دیں جو اللہ نے تیرے اوپر اتارے ہیں۔ کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں)۔

(۵) غیر حق کے لئے جنگ کرنا، اور ناجائز اغراض کے لئے قتل و خون اور جتھہ بندی کرنا۔

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَیْھِمْ مِّنْ اَقْطَارِھَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَۃَ لَاٰتَوْھَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِھَآ اِلَّا یَسِیْرًا (الاحزاب-۲)

(جنگ احزاب کے موقع پر) اگر مدینہ کے اطراف سے دشمنوں کا داخلہ ہو جاتا اور پھر ان منافقین سے فتنہ میں شریک ہونے کی درخواست کی جاتی تو یہ ضرور اس میں کود پڑتے اور ذرا تامل نہ کرتے۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّاْمَنُوْکُمْ وَیَاْمَنُوْا قَوْمَھُمْ کُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَی الْفِتْنَۃِ اُرْکِسُوْا فِیْھَا۔ (النساء-۱۲)

تم ان منافقوں میں سے کچھ دوسرے لوگ ایسے پاؤ گے جو تم سے بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم سے بھی مگر جب فتنہ کی طرف پھیر دیئے جاتے ہیں تو اس میں اوندھے گر جاتے ہیں (یعنی خود بھی فتنہ برپا کرنے والوں کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں)

(۶) پیروان حق پر باطل پرستوں کا غلبہ اور چیرہ دستی :-

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ - (انفال - ۱۰)

اگر تم (پیروان حق کی مدد) نہ کروگے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا (یعنی غلبہ باطل سے حق پرستوں پر زمین تنگ ہو جائے گی)

فساد کی تحقیق اب دیکھئے کہ قرآن مجید میں فساد کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

لغت میں فساد کہتے ہیں کسی چیز کے حالت اعتدال سے نکل جانے کو اور صلاح اس کی ضد ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے تو ہر وہ فعل جو عدل و صلاح کے خلاف ہے فساد ہے۔ لیکن قرآن مجید میں عموماً اس کا اطلاق اجتماعی اخلاق اور نظام تمدن و سیاست کے بگاڑ پر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن فرعون۔ عاد اور ثمود کو فساد کا الزام دیتا ہے :

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ (الفجر - ۱)

کیا نہیں دیکھا تو نے کہ تیرے رب نے کیا کیا ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ جن کے مثل ملکوں میں کوئی پیدا نہیں کیا گیا اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں پتھر تراشے اور لشکر والے فرعون کے ساتھ؟ ان لوگوں نے ملکوں میں سرکشی کی اور ان میں بہت فساد پھیلایا۔

اور پھر مختلف مقامات پر ان کے وہ جرائم بیان کرتا ہے جن کی بنا پر وہ مفسد ٹھیرائے گئے :-

(۱) فرعون کے متعلق فرمایا کہ وہ متکبر تھا، اپنی رعایا کے درمیان نسلی امتیاز قائم کرتا اور ان میں پھوٹ ڈال کر ان پر حکومت کرتا تھا، اور کمزوروں کو ناحق قتل و غارت کرتا تھا۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (القصص - ۱)

فرعون نے زمین میں تکبر کیا، اس کے باشندوں کو فرقوں میں تقسیم کر دیا، اور ایک جماعت کو کمزور کر کے ان کے لڑکوں کو ذبح کرنے لگا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا، درحقیقت وہ مفسدوں میں سے تھا۔

وہ قبول حق سے لوگوں کو جبراً باز رکھتا تھا، چنانچہ جب حضرت موسیٰؑ کا معجزہ دیکھکر جادوگر ایمان لے آئے تو اس نے کہا:-

اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ	تم اس پر ایمان لے آئے قبل اسکے کہ میں تمہیں اجازت دیتا!
الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ	ضرور یہ تمہارا گرو ہے اور اسی نے تمہیں یہ جادو سکھایا ہے
اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ	اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤنگا
جُذُوْعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ	اور تمہیں کھجور کے تنوں پر صلیب دونگا اور تم بجھ لوگے کہ
عَذَابًا وَّاَبْقٰى (طٰہٰ-۳)	ہم میں سے کون زیادہ سخت اور دیرپا عذاب دینے والا ہے

اس نے ایک قوم کو کمزور پاکر اپنا غلام بنالیا تھا، چنانچہ جب اس نے حضرت موسیٰؑ پر احسان جتایا تو آپ نے جواب دیا کہ:-

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ	اور تیری وہ نعمت جس کا تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے یہ ہے کہ
اِسْرَآءِيْلَ (الشعراء-۲)	تو نے میری قوم بنی اسرائیل کو غلام بنالیا ہے۔

وہ اپنی قوت کے نشہ میں اپنے جیسے انسانوں کا خدا بنتا تھا اور محض طاقت کے حق کی بنا پر حکومت و پادشاہی کرتا تھا، حالانکہ اصلی حق عدل و انصاف اور خدا ترسی کا حق ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ	اور فرعون نے کہا کہ لوگو، میں تو اپنے سوا تمہارے کسی
مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ . . . . وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَ	خدا کو جانتا نہیں . . . . اور اس نے اور اس کے لشکروں
جُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ	نے زمین میں بغیر حق کے بڑائی کی اور سمجھ بیٹھے کہ گویا انہیں
اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ (القصص-۴)	کبھی ہمارے پاس واپس آنا ہی نہیں ہے۔

اُس نے اپنی رعایا کی ذہنی و اخلاقی حالت کو بگاڑ کر اتنا ذلیل کر دیا تھا کہ وہ اس کی غلامانہ اطاعت پر راضی ہوگئی۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا	اس نے اپنی قوم کو ہلکا (یعنی عقل و اخلاق میں گھٹیا) بنا دیا
فٰسِقِيْنَ (الزخرف-۵)	جس کے باعث انہوں نے اس کی اطاعت اختیار کی یقیناً

وہ بدکار قوم تھی۔

اُس کی حکومت کی بنیاد ناجائز اور غلط قوانین پر قائم تھی۔

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ (ھود-۹) ان لوگوں نے فرعون کے احکام کی تعمیل کی، حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔

(۲) اسی طرح عاد کا جرم یہ بتایا گیا ہے کہ وہ جابر و سرکش حاکموں کی پیروی کرتے تھے۔

وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (ھود-۶) انہوں نے ہر جبار دشمنِ حق کے حکم کی پیروی کی۔

وہ جابر و ظالم تھے اور عدل و انصاف سے انہیں واسطہ نہ تھا، چنانچہ حضرت ہودؑ انہیں ملامت کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (الشعراء-۷) اور تم جس پر بھی ہاتھ ڈالتے ہو جابرانہ ہی ڈالتے ہو۔

وہ اپنی قوت کے گھمنڈ میں بغیر کسی حق کے کمزور قوموں پر حکومت قائم کرتے تھے۔

فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (حٰم السجدہ-۲) وہ زمین میں حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہا کہ ہم سے زیادہ طاقت والا کون ہے۔

(۳) ثمود کے مفسدانہ اعمال کی تشریح قرآن مجید میں یہ ملتی ہے کہ ان کے حاکم اور سردار ظالم و بدکار تھے اور وہ انہی سرداروں کی اطاعت کرتے تھے، چنانچہ حضرت صالحؑ ان کو نصیحت کرتے ہیں:

وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (الشعراء-۸) تم اُن حد سے گذر جانے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

وہ ایسے سرکش تھے کہ ایک حق گو انسان کو بے قصور قتل کرنے کے لئے آمادہ ہوگئے اور اس ظالمانہ فعل کے ارتکاب کے لئے کذب و فریب کے بدترین حیلے اختیار کرنے میں بھی انہیں باک نہ ہوا۔

وَكَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا اور اس شہر میں ۹ آدمی (جتھوں کے سردار) تھے جو زمین میں فساد پھیلاتے تھے اور اصلاح نہ کرتے تھے۔ انہوں نے کہا یارو قسم کھالو کہ رات صالح اور اس کے گھر والوں پر چھاپہ

شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهٖ وَإِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (النمل-۴)

ماریں گے اور پھر اس کے خون کے دعویداروں سے کہدیں گے کہ ہم کو اس کی اور اس کے گھروالوں کی ہلاکت دیکھنے کا حال معلوم نہیں اور ہم بالکل سچ بولتے ہیں۔

(۴) قرآن مجید میں قوم لوط کو بھی مفسد کہا گیا ہے اور اس کے فساد کی تشریح اس طرح کی ہے:

أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَأْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ (عنکبوت-۳)

تم لوگ تو وہ بدکاری کرتے ہو جو دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کی۔ کیا تم مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں کھلم کھلا برے کام کرتے ہو؟

یہ تھا اس قوم کا فساد کہ ان میں فعل خلاف فطرت کا عام رواج ہو گیا تھا، تجارتی شاہراہوں پر وہ ڈاکے بھی مارتی تھی اور اس کا اجتماعی اخلاق اس قدر بگڑ گیا تھا کہ کھلم کھلا اپنی مجلسوں میں برے کام کرتے تھے اور کوئی ٹوکنے والا نہ تھا

(۵) مدین کے لوگ بھی مفسد کہے گئے ہیں اور حضرت شعیبؑ انہیں ان الفاظ میں نصیحت کرتے ہیں:

فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا (اعراف-۱۱)

پیمانوں سے پورا ناپو اور ترازو میں ٹھیک تولو، لوگوں کو چیزیں گھٹا کر نہ دیا کرو اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ، یہ تمہارے لئے اچھا ہے اگر تم ایماندار ہو اور راستوں پر بیٹھ کر لوگوں کو نہ ڈراؤ یعنی رہزنی نہ کرو۔ تم اللہ کے راستہ سے ان لوگوں کو روکتے ہو جو ایمان لاتے ہیں اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو۔

پھر جب حضرت شعیبؑ نے انہیں نیکوکاری کی ہدایت کی تو انہوں نے کہا کہ:-

وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ (ہود-۸)

اگر تیری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم تجھے پتھراؤ کر کے مار ڈالتے، تو ہم پر بھاری اثر نہیں رکھتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدین والوں کا فساد یہ تھا کہ وہ عام طور پر خائن تھے، ان کے تجارتی کاروبار میں بے ایمانی بہت بڑھ گئی تھی، تجارتی شاہراہوں پر جو اُن کے علاقہ سے گذرتی تھیں، ڈاکے ڈالتے تھے، ایمانداروں کو راہ راستی سے روکتے تھے اور انہیں حق سے اس قدر دشمنی تھی کہ نیکوکاری کی طرف بلانے والے ایک صالح انسان کو سنگسار کرنے کے لئے آمادہ ہوگئے تھے۔

(۶) چوری کو بھی فساد سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں پر جب گلاس چرانے کا الزام رکھا گیا تو انہوں نے کہا تَاللّٰہِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ وَمَا کُنَّا سَارِقِیْنَ (یوسف۔۹) "خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ ہم زمین میں فساد پھیلانے نہیں آئے اور ہم چور نہیں ہیں"۔

(۷) بادشاہوں کی ملک گیری سے جو تباہی پھیلتی ہے اور اس کے اثر سے مفتوح قوموں کے اخلاق میں جو دنائت پیدا ہو جاتی ہے اس کو بھی فساد کہا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمانؑ کا خط وصول ہونے پر ملکہ سبا اپنے درباریوں سے کہتی ہے اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً وَکَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ (النمل۔۳) "بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے فساد سے بھر دیتے ہیں، اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور وہ ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں"۔

(۸) فساد کی ایک جامع تعریف قرآن میں یہ کی گئی ہے کہ ان روابط اور تعلقات کو خراب کرنا اور ان پر تیشہ چلانا جو فی الحقیقت انسانی تمدن کی بنیاد ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

وَالَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ اللَّعْنَۃُ وَلَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (الرعد۔۳)

اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان تعلقات کو قطع کرتے ہیں جنہیں جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، انہی پر اللہ کی لعنت ہے اور وہی ہیں جن کے لئے برا ٹھکانا ہے۔

یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل کے معنی عام مفسرین نے بہت محدود لئے ہیں۔ وہ اسے صرف قطع رحم کے معنی میں لیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے وہ تمام جائز تعلقات مراد ہیں جو مختلف تمدنی اور عمرانی حیثیات سے بنی نوع انسانی کے افراد اور جماعتوں میں قائم ہوتے ہیں مثلاً عزیزوں

اور رشتہ داروں کے تعلقات، میاں بیوی کے تعلقات، دوستوں اور ہمسایوں کے تعلقات، بیین دین اور کاروباری معاملہ کے تعلقات، عہد و پیمان اور باہمی اعتماد کے تعلقات، مختلف ملکوں اور حکومتوں کے تعلقات۔ چونکہ یہی روابط انسانی تمدن کی بنیاد ہیں، انہی کے بہترین طریقے سے قائم رہنے پر دنیا کے امن و خوشحالی کا انحصار ہے، اور انہی کو توڑنے اور خراب کر دینے سے دنیا میں لڑائی جھگڑے پھیلتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے قطع کرنے کو فساد سے تعبیر کیا اور اس پر لعنت کی وعید فرمائی۔

(۹) اُس طرز حکومت کو بھی فساد سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں حاکمانہ طاقت کو اچھے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے بجائے ظلم و ستم اور غارت گری کے لئے استعمال کیا جائے چنانچہ فرمایا: وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (البقرہ - ۲۵) "اور جب وہ حاکم بنتا ہے تو زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتا ہے اور کھیتیوں اور نسلوں کو تباہ کرتا ہے اور اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

(۱۰) صد عن سبیل اللہ کے لئے بھی، جس کی تشریح اوپر گذر چکی ہے، فساد کا لفظ استعمال کیا ہے چنانچہ فرمایا: اَلَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ (النحل - ۱۲) "جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا ان پر ہم اُس فساد کے باعث جو وہ کرتے تھے، عذاب پر عذاب نازل کریں گے۔"

(۱۱) سورۂ مائدہ میں جن لوگوں کی طرف فساد کو نسبت دی گئی ہے کہ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا، "وہ زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں" اور جن کے متعلق فرمایا ہے کہ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ، "اور اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا" ان کی خصوصیات یہ بیان کی ہیں:۔

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ الآیہ۔	اور تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور حد سے تجاوز کرنے میں اور حرام کا مال کھانے میں جلدی کرتے ہیں۔
وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ	اور ہم نے ان کے درمیان بغض و عداوت کا بیج قیامت تک کے لئے ڈالدیا، اور جب کبھی انہوں نے جنگ کے لئے

اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (المائدہ - ۹) آگ بھڑکائی ہم نے اسے بجھا دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اثم یعنی وہ گناہ جو آدمی کے ذاتی اخلاق کو غارت کرتے ہیں، اور عدوان یعنی وہ گناہ جن کا برا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے، اور اکل سحت یعنی رشوت اور سود خواری جیسے ناجائز طریقوں سے لوگوں کے مال کھانا، اور نفسانی اغراض کے لئے باہم بغض و عداوت رکھنا اور ان کی خاطر جنگ کی آگ بھڑکانا، یہ سب اعمال فساد ہیں۔

فتنہ و فساد کو مٹانے کے لئے حکومت الٰہی کی ضرورت

اس تشریح سے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ قرآن مجید کی زبان میں فتنہ اور فساد کے کیا معنی ہیں۔ اب اگر ان تمام برائیوں پر دوبارہ ایک غائر نظر ڈالی جائے جن کو فتنہ و فساد سے تعبیر کیا گیا ہے، تو اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخدا ترس، اور بد اصل نظام حکومت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اگر کسی برائی کی پیدائش میں ایسی حکومت کا براہ راست کوئی اثر نہیں ہوتا تو اس کا باقی رہنا اور اصلاح کے اثر سے محفوظ ہونا یقیناً اسی کے باطل پرور اثرات کا رہین منت ہوتا ہے۔ اول تو ایسی حکومت فی نفسہٖ ایک فتنہ ہے، کیونکہ وہ حکومت کے منشائے اصلی کے خلاف ہوتی ہے۔ پھر اس کی برائی کسی ایک دائرہ تک محدود نہیں رہتی بلکہ تمام برائیوں کا سرچشمہ اور فتنہ و فساد کے تمام اصول و فروع کا منبع بن جاتی ہے۔ اسی سے صد عن سبیل اللہ ہوتا ہے، اسی سے حق و انصاف کا سر کچلا جاتا ہے، اسی سے بدکاروں اور ظالموں کو اپنے برے اعمال کی قوت حاصل ہوتی ہے، اسی سے اخلاق کو تباہ کرنے والے اور عدل اجتماعی (Social justice) کو غارت کرنے والے قوانین نافذ ہوتے ہیں، وہی بنی آدم کی جمعیت میں نفاق و شقاق کی تخم ریزی کرتی ہے، اسی کی بدولت جنگ و خونریزی کی آگ دنیا میں بھڑکتی ہے، اسی سے قوموں اور ملکوں پر بلائیں نازل ہوتی ہیں، اور خلاصۂ کلام یہ کہ یہی وہ چیز ہے جس کی قوت کسی نہ کسی حیثیت سے ہر بدی و بدکاری کا وسیلہ یا اس کے قائم ہونے اور باقی رہنے کا ذریعہ بنتی ہے پس اسلام نے بدی کے استیصال اور بدکاری کے دفع و انسداد کے لئے یہ کارگر تدبیر بتلائی کہ منظم جد و جہد (جہاد) سے، اور اگر ضرورت پڑے تو جنگ (قتال) کے ذریعہ سے ایسی تمام حکومتوں کو مٹا دیا جائے، اور ان

کی جگہ وہ عادلانہ و منصفانہ نظام حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد خدا کے خوف پر اور خدا کے مقرر کئے ہوئے مستقل ضابطوں پر رکھی جائے، جو شخصی یا طبقاتی یا قومی اغراض کے بجائے خالص انسانیت کے مفاد کی خدمت کرے، جس کے قیام کا مقصد نیکی کو پروان چڑھانا اور بدی کو مٹانا ہو، اور جس کے کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین سمجھتے ہوں اور اپنی بڑائی کے لئے نہیں بلکہ انسانیت کی بہتری اور خدا کی خوشنودی کے لئے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیں۔

قرآن مجید کو اٹھا کر دیکھو، جگہ جگہ تمہیں یہی نظر آئے گا کہ ظالموں اور جباروں کی اطاعت سے روکا گیا ہے اور انسان کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ باطل کے اتباع اور جبر و استکبار کی اطاعت سے اپنے آپ کو ہلاکت میں مبتلا نہ کرے۔ کہیں حکم ہوتا ہے کہ

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ هُمْ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۔ (الشعراء-۸)

ان حد سے گذر جانے والے لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا (الکہف-۴)

اُس کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے، جو اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا ہے اور جس کا حکم زیادتی پر مبنی ہے۔

کہیں ایک قوم کی بربادی کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ

وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ (ہود-۵)

انہوں نے ہر جبار دشمن حق کی پیروی کی پس ان پر اس دنیا میں بھی لعنت پڑی اور یوم قیامت کو بھی پڑے گی۔

کہیں صاف طور پر بتلا دیا کہ ایک قوم ہلاک ہی اس وقت ہوتی ہے جب اس کی دولت اور حکومت کی باگیں بدکار لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہیں:-

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا

جب ہم کسی بستی کو برباد کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے

فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيْرًا (بنی اسرائیل - ۲) دولت وحکومت والے لوگوں کو (طاعت وخیر کا) حکم بھیجتے ہیں پھر وہ نافرمانی کرکے بدکاریاں کرتے ہیں، تب وہ بستی حکم سزا کی مستحق ہو جاتی ہے اور ہم اس کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ اجتماعی زندگی میں جتنے عوامل (Factors) انسان کے اخلاق وتمدن پر اثر انداز ہوتے ہیں ان میں سب سے زیادہ قوی اور موثر عامل حکومت ہے۔ حکومت کا نظام اگر غلط ہو اور اس کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جو حاکمانہ طاقت کو اصلاح اور خدمت الناس کے بجائے افساد اور خدمت نفس کے لئے استعمال کرتے ہوں تو ایسی حالت میں کسی نیکی کا سر سبز ہونا، کسی اصلاحی کوشش کا بار آور ہونا اور کسی قسم کے اخلاقی محاسن کا پھلنا پھولنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ حکومت طبعاً بدی و شرارت کی سرپرست ہوتی ہے اور نہ صرف خود بدکار ہوتی ہے بلکہ اس کی قوت تمام اخلاقی مفاسد کی آبیاری کرتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر حکومت ایک صحیح اور عادلانہ دستور و آئین پر قائم ہو، اس کا مقصدِ حیات نظام عدل کا قیام ہو، اور اس کے چلانے والے نیکوکار و پرہیزگار لوگ ہوں جو اپنی قوت کو اپنی ذاتی یا طبقاتی یا قومی خواہشات کے حصول کے لئے نہیں بلکہ انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے استعمال کرتے ہوں، تو اس کی اصلاحی قوت کا اثر صرف اسی دائرہ تک محدود نہ رہے گا جو حکومت سے بلاواسطہ تعلق رکھتا ہے، بلکہ اجتماعی وانفرادی زندگی کے تمام شعبے اس کے نیک اثرات کو قبول کریں گے۔ مذہب، معیشت، معاشرت، اخلاق، تہذیب، علوم وافکار غرض ہر شعبہ میں اصلاح کی تحریک بار آور ہوگی اور بدکاری کی صرف روک تھام ہی نہ ہوگی بلکہ خود بدی کے چشمے بھی سوکھ جائیں گے۔ پس درحقیقت فتنہ وفساد کو مٹانے اور انسانی زندگی کو منکر سے پاک کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری اور مفید تدبیر یہی ہے کہ تمام غلط حکومتوں کا استیصال کر دیا جائے اور ان کی جگہ ایسی حکومت قائم کی جائے جو اصول اور عمل دونوں کے لحاظ سے نیکی اور نیکوکاری پر مبنی ہو۔

حکم قتال | یہ وہ دوسرا مقصد عظیم وجلیل ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو تلوار

اٹھانے کا حکم دیا ہے۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ خود اپنی قوت کو مٹنے سے محفوظ رکھو۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اس محفوظ شدہ طاقت کو تمام دنیا سے فتنہ و فساد کے مٹانے اور مفسدوں سے فساد کی قوت چھین کر انہیں نیکی کا تابع بنانے میں استعمال کرو۔ چنانچہ یہ حکم نہایت مختصر الفاظ میں اس طرح دیا گیا ہے:

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (التوبہ-۴)

اہل کتاب میں سے جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے، نہ یوم آخرت پر، نہ اُن چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھیرائی ہیں، اور نہ دین حق کو اختیار کرتے ہیں، اُن سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اس حال میں کہ وہ زیردست ہو کر رہیں۔

اس آیۃ میں قتال کا حکم جن لوگوں کے خلاف دیا گیا ہے ان کی خصوصیات یہ بتائی ہیں کہ وہ اگرچہ اہل کتاب ہیں مگر نہ اللہ اور یوم آخر پر واقعی ایمان لاتے ہیں، نہ اُن چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں جنہیں خدا اور رسول نے حرام کیا ہے، اور نہ دین حق کو اپنا دین بناتے ہیں۔ ان جرائم کی یہ ترتیب بے معنی نہیں ہے بلکہ اس پر غور کرنے سے حکم قتال کی وجہ خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔ فرمایا کہ ہم نے ان کی طرف کتابیں بھیجیں جن میں انہیں فکر اور عمل کی سیدھی راہ بتائی گئی تھی اور ان کے لئے ایک صحیح قانونِ زندگی وضع کر دیا گیا تھا لیکن انہوں نے ان کتابوں کو چھوڑ دیا اور اپنی آراء و اہواء اور اپنے ظنون و اوہام کے مطابق خود اپنے لئے الگ الگ مذاہب اور قوانین گھڑ لئے جو حق کے خلاف اور جادۂ استقامت سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اس انحراف کی بدولت ایک طرف ان کے خیالات بگڑ گئے کہ اللہ اور جزاء و سزا کے دن پر ان کا ایمان نہ رہا، اور دوسری طرف ان کے اعمال بھی بگڑ گئے کہ حلال و حرام کی تمیز ان میں باقی نہ رہی اور فتنہ و فساد برپا کرنے لگے جس سے اللہ نے اور ان رسولوں نے جو ان کی طرف بھیجے گئے تھے انہیں منع کیا تھا۔ پھر جب اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے از سرِ نو وہی دین حق بھیجا جسے وہ گم کر چکے تھے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اور اپنی پچھلی غلط کاریوں اور غلط فہمیوں ہی پر جمے رہے۔ حالانکہ اگر وہ اسے اختیار کر لیتے تو پھر ایک کتاب محکم، ایک مذہب صحیح، اور ایک قانونِ عدل کے پابند ہو جاتے۔

جس سے ان کے افکار اور اعمال دونوں کی اصلاح ہو جاتی اور فتنہ و فساد کا نام و نشان مٹ جاتا۔ اب اگر وہ دینِ حق کو نہیں مانتے تو انہیں اس امر کی آزادی تو دی جاسکتی ہے کہ بانخوت رہ کر اپنے غلط عقائد اور طریقوں پر قائم رہیں، لیکن اس امر کی آزادی نہیں دی جاسکتی کہ اپنے باطل قوانین کو نافذ کر کے اللہ کی زمین میں فتنہ و فساد برپا کریں۔

قتال کی غرض وغایت حتی یعطوا الجزیۃ میں اس قتال کی غایت کو صاف طور پر بیان کر دیا ہے۔ اگر حتی یسلموا کہا جاتا تو البتہ غایتِ قتال یہ ہوتی کہ انہیں تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جائے۔ لیکن حتی یعطوا الجزیہ نے بتلا دیا کہ ان کا اداۓ جزیہ پر راضی ہو جانا قتال کی آخری حد ہے اور اس کے بعد پھر ان کی جان و مال پر کوئی حملہ نہیں کیا جاسکتا خواہ وہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں، جیسا کہ صاحب بدائع نے لکھا ہے:

نھی سبحانہ وتعالی اباحۃ القتال الی غایۃ قبول الجزیۃ واذا انتھت الاباحۃ تثبت العصمۃ ضرورۃ (ج ۷ ص ۱۱)	اللہ تعالیٰ نے قبول جزیہ کو اباحت قتال کی حد مقرر کیا ہے پس جب اس غایت کے حصول پر اباحت ختم ہو گئی تو لازمی طور پر ذمیوں کے اعراض و اموال کا تحفظ بھی ثابت ہو گیا۔

اسی بنا پر ذمیوں کے متعلق سختی کے ساتھ تاکید ہے کہ ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی تمام حملوں سے حفاظت کی جائے۔ ان کے بچاؤ کے لئے جنگ کرنا اور اپنا خون بہانا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

انما قبلوا عقد الذمۃ لتکون اموالھم کاموالنا ودماؤھم کدمائنا	انہوں نے عقد ذمہ اسی لئے قبول کیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کی طرح اور ان کے خون ہمارے خون کی طرح محترم ہو جائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اوصیہ بذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ ان یوفی لھم بعھدھم وان یقاتل من ورائھم ولا یکلفوا الا طاقتھم	میں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ کا لحاظ رکھا جائے، اس طرح کہ ذمیوں سے جو عہد ہے اس کو پورا کیا جائے، ان کی حفاظت کے لئے جنگ کی جائے اور

ان کی طاقت سے زیادہ ان پر خراج کا بار نہ ڈالا جائے۔

حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ان کی جان کے احترام کی تاکید اس قدر سختی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ:

من قتل معاھدا لم یرح رائحۃ الجنۃ وان ریحھا لتوجد من مسیرۃ اربعین عاماً

جو کوئی کسی معاہد کو قتل کرے اُسے جنت کی خوشبو تک نصیب نہ ہوگی، حالانکہ اس کی خوشبو ۴۰ سال کی مسافت تک پہونچتی ہے۔

اس کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہوسکتا کہ یہ احترام جان و مال محض احترام عہد و پیمان کی بنا پر ہے، کیونکہ یہ حکم تمام ذمیوں کے لئے عام ہے اور عقد ذمہ کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ حکومت اسلامیہ کے ساتھ باقاعدہ صلح و معاہدہ ہو، بلکہ نص کے علاوہ دلالت بھی ایک رکن عقد ہے۔ اگر مسلمان کسی ملک کو بزور شمشیر فتح کریں اور اس کے باشندوں سے ان کا کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو تب بھی مفتوح غیر مسلموں کو ذمی ہی قرار دیا جائے گا اور مسلمانوں کا امام ان پر جزیہ عائد کرکے ان کو اللہ اور رسولؐ کے ذمہ میں لے لے گا۔ (دیکھو بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۱۰ و ۱۱۲)۔

اس سے ظاہر ہے کہ قتال کا یہ حکم کسی مذہبی عداوت کی بنا پر نہیں ہے، ورنہ یہ نہ ہوتا کہ اطاعت قبول کرنے سے پہلے جن کے ساتھ جنگ کرنا ضروری ہے انہی کی جان و مال اطاعت قبول کرنے کے بعد اس طرح قابل احترام ہوجائے۔ حالانکہ اطاعت کرنے والوں کے ساتھ مذہبی عداوت کی بھڑاس نکالنا زیادہ آسان ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یہ بات بھی بعید از عقل ہے کہ اس حکم قتال کا مقصد محض جزیہ حاصل کرنا ہو، کیونکہ چند درہم سالانہ کے عوض اتنی بڑی ذمہ داری اپنے اوپر لے لینا کہ ان کی حفاظت کے لئے ہر دشمن کے سامنے اپنا سینہ سپر کردیا جائے، کسی طمع پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ ایک کافر تو جزیہ دیکر اطمینان کے ساتھ اپنی تجارت، اپنے کاروبار، اپنے عیش و آرام، اور اپنے اہل و عیال کی معیت سے مستفید ہو اور مسلمان ملک کی حفاظت کے لئے میدان جنگ کی مصیبتیں اٹھائے، اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالدے، درآنحالیکہ اس کو یہ قدرت حاصل ہو کہ اسی کافر سے جزیہ بھی وصول کرے اور پھر اس سے جنگی خدمت بھی لے۔ پس اداے جزیہ پر قتال کی اباحت ختم کردینے اور

قبولِ جزیہ کے بعد قیامِ عدل و امن کی تمام ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ کا مقصد دراصل ان لوگوں کو فتنہ و فساد سے روکنا اور امن و آئین کا پابند بنانا ہے، اور اس کے لئے ان پر جزیہ کے نام سے ٹیکس عائد کرنا صرف اس لئے ہے کہ وہ اُس حفاظت و صیانت کے مصارف میں شرکت کریں جو انہیں بہم پہنچائی جاتی ہے، اور اطاعت و انقیاد پر قائم رہیں۔

جزیہ کی حقیقت | علامہ ابن تیمیہ نے حتی یعطوا الجزیۃ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ والمراد باعطائھا التزامها بالعقد، یعنی اس سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ عقد معاہدہ پر قائم رہیں جس طرح تمام حکومتوں کے قوانین میں ٹیکس دیتے رہنا وفاداری و پابندیٔ قانون کی دلیل ہے اور نہ ادا کرنا بےوفائی و غداری کی، اسی طرح جزیہ دیتے رہنا بھی پابندیٔ عہد کی دلیل ہے اور اس کا نہ ادا کرنا نقضِ عہد کا ہم معنی۔ یہی وجہ ہے کہ جزیہ صرف اہل قتال پر عائد کیا گیا ہے اور عورتیں، نابالغ بچے، مجانین، تارکِ دنیا زاہد، اندھے، اور اپاہج وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ بدائع الصنائع میں ہے:

کان الله سبحانه وتعالیٰ اوجب الجزیة علی من هو من اهل القتال لقوله تعالیٰ قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ الآیة. والمقاتلة مفاعلة من القتال فتستدعی اهلیة القتال من الجانبین فلا تجب علی من لیس من اهل القتال (ج ۷ ص ۱۱۱)

اللہ تعالیٰ نے جزیہ صرف ان لوگوں پر مقرر کیا ہے جو اہل قتال ہیں، جیسا کہ آیۂ قاتلوا الذین میں لفظ قاتلوا سے معلوم ہوتا ہے۔ مقاتلہ کے لئے جانبین سے قتال کی اہلیت شرط ہے۔ پس جن لوگوں میں یہ اہلیت نہیں ہے وہ قتال اور جزیہ دونوں سے مستثنیٰ ہیں۔

عن ید کا لفظ اس مضمون کی مزید تشریح کرتا ہے۔ ید سے مراد یہاں ہاتھ نہیں ہے بلکہ دراصل یہ کنایہ ہے اطاعت و انقیاد سے، چنانچہ کہتے ہیں اعطی فلان بیدہ اذا اسلم و انقاد پس حتی یعطوا الجزیۃ عن ید کے معنی یہ ہیں کہ وہ اطاعت پر آمادگی کے ساتھ جزیہ ادا کریں۔ اگر ان میں اس قدر پابندیٔ آئین اور اتنی امن پسندی موجود نہ ہو کہ اپنے واجب الادا ٹیکس کو رضامندی کے ساتھ ادا کریں، بلکہ اس پر انہیں مجبور کرنے کے لئے ہمیشہ تلوار کی قوت استعمال کرنے کی ضرورت رہے تو پھر

نہ اعطائے جزیہ کا اصلی منشا یعنی نظم و آئین کا قیام پورا ہو سکتا ہے، اور نہ عقد ذمہ ہی باقی رہ سکتا ہے جس کے لئے اطاعت و انقیاد لازمی شرط ہے۔

جزیہ کی رقم ایسی قلیل مقرر کی گئی ہے کہ اس کا دینا بار نہ ہو۔ اس کے وصول کرنے کے طریقوں میں بھی نرمی و رفق کی تاکید کی گئی ہے۔ قید اور سزا وغیرہ سے انہیں تکلیف دینا اور ان پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالنا جائز نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ اس کے متعلق کثرت سے تاکیدی احکام اور روایات موجود ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مرتبہ جزیہ کی ایک بڑی رقم لائی گئی۔ آپ نے اسے غیر معمولی دیکھ کر فرمایا "مجھے گمان ہوتا ہے کہ تم نے لوگوں کو برباد کر دیا"۔ محصلین نے جواب دیا "خدا کی قسم ہم نے بہت نرمی سے وصول کیا ہے"۔ آپ نے پھر پوچھا "بلا سوط ولا نوط؟" "بغیر مارے باندھے؟" انہوں نے عرض کیا بغیر مارے باندھے۔ تب آپ نے اس مال کو خزانہ میں داخل کرنے کی اجازت دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو عکبرا پر عامل مقرر کرتے ہوئے ہدایت فرمائی کہ "خراج کی تحصیل میں ان پر ایسی سختی نہ کرنا کہ وہ اپنے گدھے یا اپنی گائیں یا اپنے کپڑے یا دوسری چیزیں بیچنے پر مجبور ہو جائیں بلکہ ان کے ساتھ نرمی کرنا"۔ حضرت ابن حکیم رضی اللہ عنہ نے فلسطین کے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ تحصیل جزیہ میں سختی کرتے ہیں تو انہوں نے اس سے منع کیا اور کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "ان اللہ یعذب یوم القیامة الذین یعذبون الناس فی الدنیا، جو لوگ دنیا میں لوگوں کو تکلیف دیتے ہیں انہیں اللہ قیامت کے دن تکلیف دیگا"۔

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں پر جو جزیہ عائد کیا جاتا ہے وہ درحقیقت کوئی سزا نہیں ہے بلکہ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ وہ امن و آئین کے پابند ہوں، رضا و رغبت کے ساتھ قانون عدل کی اطاعت کریں، اور اپنی استطاعت کے مطابق اس حکومت کے مصارف ادا کریں جو انہیں پرامن زندگی بسر کرنے کا موقع دیتی ہے، ظلم و تعدی سے محفوظ رکھتی ہے، انصاف کے ساتھ حقوق تقسیم کرتی ہے، قوت والوں کو کمزوروں پر ظلم کرنے سے روکتی ہے، کمزوروں کو قوت والوں کا غلام بننے سے بچاتی ہے، اور تمام سرکش عناصر کو اخلاق و انسانیت کے حدود کا پابند بناتی ہے۔

وھم صاغرون کے الفاظ اس مطلب کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ ابن قیمؒ نے تصریح کی ہے:

الصغار ھو التزامھم بجریان احکام اللہ تعالیٰ علیھم واعطاء الجزیۃ ھو الصغار۔	اس آیت میں صغار سے مراد ان کا قانونِ الٰہی کے احکام کی تنفیذ پر راضی ہونا اور آئینِ عدل کی پابندی کرنا ہے۔ اس اطاعت و انقیاد کی علامت کے طور پر ان کا جزیہ دینا ہی صغار ہے۔

خود قرآن مجید میں مختلف مواقع پر جنگ کے مقصد اور اس کے مفید نتیجہ کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس سے صاغرون کا مطلب صاف طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کا اپنے قوانین باطلہ کی تنفیذ سے فتنہ و فساد برپا نہ کر سکنا۔ اور ان کا بدکاری و شرارت سے عاجز ہو جانا، اور قانونِ الٰہی کے تحت نظام عدل کا پابند رہنا ہی ان کا صغار ہے۔ قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ میں قتال کا مقصد یہ بتلایا ہے کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ حتی تضع الحرب اوزارھا میں اسی مقصد کو اس طرح بیان کیا ہے کہ جنگ و فساد کا زور ٹوٹ جائے۔ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں وہی مفہوم ان الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے کہ قریب ہے کہ اللہ کافروں کی قوتِ جنگ و جدال کو توڑ دے۔ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا میں اسی جنگ کا نتیجہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ کافروں کا بول نیچا ہوا اور اللہ کا کلمہ سربلند ہو گیا پس درحقیقت فتنہ کا باقی نہ رہنا، فساد کا مٹ جانا، باطل کے حامیوں کی قوتِ جنگ کا خاتمہ ہو جانا، کفر کی شیطانی طاقت کا اس حد تک ٹوٹ جانا کہ وہ دنیا کے امن و سکون کو برباد نہ کر سکے اور خلقِ خدا کی اخلاقی و روحانی اور مادی ترقی میں رکاوٹیں نہ ڈال سکے، نیز کافروں کے خود ساختہ قوانین کا منسوخ ہو جانا اور ان کی جگہ اللہ کے اس قانونِ عدل کا بول بالا ہونا جو تمام بنی نوعِ انسان میں ہر قسم کے شیطانی امتیازات کو مٹا کر صرف حق و باطل اور بدی و تقویٰ کا امتیاز قائم کرتا ہے اور ظالموں کے سوا ہر شخص کو امن و آزادی کی خوشخبری دیتا ہے، یہی کافروں کا "صغار" ہے اور آیت قتال میں حتی یعطوا الجزیۃ عن ید و ھم صاغرون سے

یہی صغار مراد ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں حکم قتال کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دنیا سے فتنہ و فساد کی آزادی چھین لی جائے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کو حقیقی اور انسانیت پرور آزادی عطا کی جائے، ایسی آزادی جو اخلاقی حدود کی پابندی پر مبنی ہو اور ناروا قیود اور ناروا بے قیدی دونوں سے پاک ہو۔ اسلام کی تلوار صرف ظلم و سرکشی اور فتنہ و فساد کے خلاف اٹھتی ہے، خواہ اس شیطانی قوت کے شکار مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ جب تک کوئی جماعت اس قوت کا استعمال ترک نہیں کرتی اس کے ساتھ اسلام کی جنگ برابر جاری رہتی ہے۔ مگر جس لمحہ وہ اس گناہِ عظیم کو ترک کر کے حق و انصاف کے قانون کی پابندی اختیار کر لیتی ہے، بیشک اسی لمحہ سے اس کا خون حرام ہو جاتا ہے، اس کے مال اور اس کے اغراض کی حفاظت مسلمانوں پر لازم ہو جاتی ہے، اور اسلام کی پرامن حکومت میں اس کو پوری آزادی دے دی جاتی ہے کہ تمام جائز طریقوں سے اپنی دولت، اپنی صنعت و تجارت، اپنے علوم و آداب، اپنے تہذیب و تمدن، غرض اپنی اجتماعی و انفرادی زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کرے اور انسانیت کے بلند سے بلند مدارج تک پہنچنے کے لئے جن جن وسائل کی ضرورت ہو انہیں آزادی کے ساتھ استعمال کرے۔ اس بارے میں اسلام کا قانون اہل ذمہ کو جو وسیع آزادی عطا کرتا ہے وہ دنیا کے قوانین میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اور قدرتی طور پر اس کا جواب ہو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ اسلام کے اور ان دنیوی قوانین کے نقطۂ نظر میں ایک بنیادی فرق ہے۔ یہ قوانین قیصریت کے اصول پر قائم ہیں۔ ان کے مطابق محکوم قوم حاکم جماعت کی ملکیت ہوتی ہے اور حاکم کے لئے محکوم کے وسائل حیات ایک جائداد کی حیثیت رکھتے ہیں جسے اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنا اور محکوم کو اس کے فائدہ سے محروم رکھنا اس کا قدرتی حق ہوتا ہے۔ اس لئے ان قوانین کی تنفیذ خواہ کتنی ہی فیاضی و فراخدلی کے ساتھ ہو بہر حال حاکم جماعت کا مفاد محکوم جماعت کے حقیقی مفاد سے کبھی متحد نہیں ہو سکتا اور لازمی طور پر کمزور کا مفاد طاقتور کے مفاد پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلامی قانون کی بنیاد فلاح انسانیت کے اعلیٰ اوس

شریف مقصد پر رکھی گئی ہے۔ اس میں حاکم و محکوم کا تعلق صحیح معنوں میں خادم و مخدوم کا سا تعلق ہوتا ہے۔ حاکم کا مفاد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ محکوم کے اصلی و حقیقی مفاد کی ترقی کے لئے کوشش کرے اس کو حکومت کا اختیار دیئے جانے کی غرض وغائت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ سوسائٹی کی اخلاقی و روحانی اور مادی زندگی کو تباہ کرنے والی برائیوں کے استیصال کی کوشش کرے اور اسے انسانیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچانے والی اچھائیوں کے عام کرنے میں اپنی تمام قوتوں کو استعمال کرے پس اسلام کا حاکم اپنے محکوم کو اخلاقی حدود کا پابند بنانے کے بعد اسے ہر قسم کی کامل آزادی عطا کرتا ہے۔ وہ اس کے راستے میں اپنی یا اپنی جماعت کی اغراض کے لئے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرتا، بلکہ اسے ایک بلند درجہ کا انسان بننے میں پوری مدد دیتا ہے۔

اسلام اور جہانگیریت بدقسمتی سے اس زمانہ میں مغرب کی بعض جہانگیر قوموں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ دنیا میں تہذیب و انسانیت کی ترقی، درماندہ قوموں کی اصلاح، اور امن و امان کے قیام کی خاطر جنگ کرتی ہیں۔ مگر اس زبانی دعوے کے برعکس ان کا عمل یہ ہے کہ کمزور قوموں کی آزادی پر ڈاکے ڈالتی ہیں اور تہذیب و انسانیت کی ترقی کے بجائے دنیا سے انسانیت اور انسانی شرافت کی تمام خصوصیات کو ایک ایک کرکے مٹا رہی ہیں۔ اس سے لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ کہیں اسلام کا دعویٰ بھی ایسا ہی نہ ہو کہ زبان پر اصلاح کا وظیفہ ہو اور ہاتھ میں فتنہ و فساد کی تلوار ہو۔ اس شبہ کو مغربی استعمار اور اسلامی جہادِ اصلاح کی یہ ظاہری مماثلت اور بھی زیادہ تقویت پہنچاتی ہے کہ جس طرح اسلام میں عالمگیر اصلاح کا جہاد صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے، اسی طرح مغربی مستعمرین بھی تہذیب و تمدن کی عالمگیر اشاعت کے مشن کو صرف اپنی قوم ہی کا ورثہ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ پچھلے مباحث کو بنظرِ غور مطالعہ کرنے سے یہ بدگمانی پیدا ہونے کی بہت کم گنجائش باقی رہتی ہے، لیکن جس قدر بھی باقی رہتی ہے بہتر ہے کہ اس کو سوءِ ظن کے لئے خالی چھوڑنے کے بجائے حقیقت کے علم و یقین سے پُر کر دیا جائے۔

جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے، جہانگیریت (امپیریلزم) کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک

خاص قوم اور ملک کے افراد کی حکومت کا نام ہے۔ انگریزی جہانگیریت جزیرۂ انگلستان کے باشندوں سے مخصوص ہے۔ جرمن جہانگیریت میں جرمن قوم کے سوا کسی کا حصہ نہیں ہے۔ اطالوی جہانگیریت میں جو کچھ ہے سب اٹلی کے باشندوں کا ہے۔ جس طرح دنیا کی دوسری قوموں کا انگریز، جرمن، یا اطالوی ہو جانا محال ہے، اسی طرح ان قوموں کی جہانگیریت میں بھی دوسروں کا حصہ دار ہونا محال ہے۔ انگریز مدا اشاعت تہذیب و تمدن، کے نام سے جہاں کہیں جائیں گے، انگریزی قومیت ساتھ جائے گی، حکومت کے اورنگ نشین ہونگے تو انگریز ہونگے، سیاست کے صدر انجمن ہونگے تو انگریز ہوں گے، اختیار و اقتدار کے مالک ہوں گے تو انگریز ہوں گے، دوسری نسل اور قوم کے لوگ خواہ انگریزی تہذیب میں کتنی ہی ترقی کریں، انگریزی سلطنت میں ان کو قدرت و اختیار حاصل ہونا قطعًا ناممکن ہے۔ یہی حال دوسری قوموں کی جہانگیریت کا بھی ہے۔ اس قسم کے نظام میں لازمی طور پر حکومت و فرمانروائی کا حق ایک ملک کے باشندوں اور ایک نسل کے افراد سے مخصوص ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ نسل و وطنیت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے کوئی شخص خود اختیار کر سکتا ہو، اس کا دائرہ بہرحال انہی لوگوں تک محدود رہتا ہے جنہیں قدرت کسی خاص نسل اور خاص ملک میں پیدا کرنا پسند کرتی ہے، اس لئے جہانگیریت کو اس نظام کا دروازہ غیر نسل و وطن کے لوگوں کے لئے ہمیشہ بند رہتا ہے اور ایک قوم کی سلطنت میں دوسری قوم کو صرف اس لئے کوئی حصہ نہیں مل سکتا کہ وہ حکمران قوم کی نسل سے نہیں ہے۔ پھر اسی چیز سے دوسری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ محکوم قوم من حیث القوم ذلیل ہو جاتی ہے، اس میں خودداری و شرافت کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اور اگر اس کے حکمران ظلم و ستم اور جور و استبداد کے ساتھ حکمرانی نہ کریں تب بھی اس میں دنائت و پستی کے وہ خصائل قدرتی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں جو ایک عرصہ تک حکومت خود اختیاری سے محروم رہنے کا لازمی نتیجہ ہیں اور روح ترقی کے لئے مہلک جراثیم کا حکم رکھتے ہیں۔

بخلاف اس کے اسلام، کسی نسل یا قوم یا وطن کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک قانون زندگی اور ایک نظام حیات ہے جس کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ عربی، عجمی، حبشی، چینی، ہندی، فرنگی، سب اس کو اختیار کر سکتے ہیں اور اختیار کر لینے کے بعد سب کے حقوق، اختیارات اور مراتب اس کے

نظام اجتماعی میں یکساں قرار پاتے ہیں۔ اس کو انسان کی نسل یا رنگ، یا وطنیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ انسان کو محض انسان ہونے کی حیثیت سے خطاب کرتا ہے اور اس کے سامنے زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ اور تنظیم حیات انسانی کا ایک قانون پیش کرتا ہے جو اس کے نزدیک بہترین ہے۔ اس طریقہ و قانون کو جو کوئی اختیار کرے وہ اسلامی حکومت میں برابر کا شریک ہے اور اس کی شخصی قابلیت اسے خلیفہ و امام کے منصب تک بھی پہنچا سکتی ہے۔ جس طرح دنیا کی حکومتوں میں فرمانروائی کی قابلیت کا معیار سول سروس یا اسی قسم کا کوئی اور امتحان پاس کرنا ہے، اسی طرح اسلام کی حکومت میں فرمانروائی اور منصبِ اصلاح و ہدایت کی اہلیت کا اصولی معیار اسلام کے نظامِ حیات کو اختیار کرنا اور اس کے قانونِ حق کی پابندی کرنا ہے۔ جو کوئی اس معیار پر پورا اترتا ہے وہ بلا لحاظ نسل و رنگ اس منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم بتائیں گے، اسلام میں نہ تو "حکومتِ قوم بر قومِ دیگر" کا کوئی سوال ہے اور نہ "حکومتِ قوم بر قوم خود" کا، بلکہ وہ "حکومتِ صالحہ" کا اصول پیش کرتا ہے اور اس کے نزدیک "صالح" اگر ایک حبشی غلام ہو تو کوئی چیز اسے شرفائے عرب پر حکومت کرنے سے نہیں روک سکتی۔ شارعِ اسلام کا صریح فتویٰ ہے:-

اسمعوا و اطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی کان رأسہ زبیبۃ

سنو اور اطاعت کرو، خواہ تمہارے اوپر ایک گنجا حبشی غلام ہی حاکم بنا دیا جائے۔

اسلام عرب میں پیدا ہوا۔ عرب ہی کو اس کا علم بلند کرنے کا شرف حاصل ہے۔ مگر اس نے کبھی حکومت و فرمانروائی کو عرب کے ساتھ مخصوص نہیں کیا۔ جب تک عرب "صالح" رہے انہوں نے آدھی دنیا پر حکومت کی جب ان میں صلاحیت باقی نہ رہی تو جن عجمی قوموں کو عربوں نے فتح کیا تھا، وہ اسلامی حکومت کی مسند نشین بن گئیں اور انہوں نے خود عرب پر حکومت کی۔ ترک اسلام کے شدید دشمن تھے، مگر جب وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے تو دنیائے اسلام کے آدھے سے زیادہ حصہ نے انہیں اپنا حکمران تسلیم کیا اور چاٹگام سے لیکر خرطاحہ تک ان کی فرمانروائی کے پھریرے اڑتے رہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آج مسلمان قوموں میں قومیت اور نسل کا امتیاز اچھا خاصا پایا جاتا ہے، مگر اس کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام نے

اپنی کسی تعلیم میں اور اپنے کسی حکم میں اس امتیاز کو ذرہ برابر بھی جگہ نہیں دی ہے۔

یہ تو اسلام اور جہانگیریت کا ظاہری فرق تھا معنوی فرق اس سے بھی زیادہ بیّن ہے بلکہ تباین کلی کا حکم رکھتا ہے۔ جہانگیریت دراصل ایک قوم کی خواہش توسیعِ مملکت وحصولِ مال و زر کا نام ہے۔ جب کوئی قوم اُس دولت اور حکومت پر قانع نہیں ہوتی جو اس کو خود اپنے ملک میں حاصل ہوتی ہے تو وہ دوسرے ملکوں پر حملہ کر کے ان کی دولت پر قبضہ کرتی ہے، ان کے باشندوں کو اپنا محکوم اور غلام بنا لیتی ہے، اور اپنی صنعت و تجارت کو ان کے خرچ پر فروغ دیتی ہے۔ یہ کام پہلے بھی ہوتا تھا اور ہمیشہ سے سرکش قومیں یہی کرتی آئی ہیں۔ مگر اب مغربی قوموں نے اس ملک گیری اور لوٹ مار کا نام ''تہذیب و تمدن کی اشاعت'' اور ''نوع بشری کی خدمت'' رکھا ہے۔ ان کے آئین ''تہذیب و تمدن'' کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ ''قوت حق ہے'' اور کمزور کو دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کمزور قوموں میں ''تہذیب'' کی اشاعت کا جو طریقہ انہوں نے ایجاد کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کو جہالت، افلاس، غلامانہ کمینگی، اور بے دینی و ضمیر فروشی کے ''جواہر'' سے مالا مال کر دیتی ہیں، اور ''نوع بشری کی خدمت'' کے لئے ان کی بہترین کوششوں کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب ان کی یہی قوتیں آپس میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر دنیا کے امن و امان کو غارت کر دیتی ہیں۔

اسلام کی مقدس تعلیم اس جہانگیری کے عیب سے پاک ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ عالم انسانی کو اس قسم کی سرکش قوتوں کے استیصال اور انکی جگہ ایک عادلانہ نظامِ حکومت کے قیام کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ حکومت و پادشاہی صرف اللہ کے لئے ہے، اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ بندوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ کے غلاموں کو اپنا غلام بنائیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس کے نائب یا ''خلیفہ'' کی حیثیت سے اس کے بندوں کی خدمت و اصلاح کریں اور جو قوت انہیں حاصل ہو اسے اپنی نفس پروری کے بجائے خلق اللہ کی فلاح و بہبود میں استعمال کریں۔ اس ''خلافت'' یا ''وراثت ارضی'' کی اہلیت کے لئے اولین شرط عمل صالح ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا ۔ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے

الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور-۷)	ہیں ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں زمین میں اسی طرح اپنا خلیفہ بنائیگا جس طرح ان سے پہلے کے لوگوں کو بنایا تھا
وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ (الانبیاء-۷)	اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھدیا کہ زمین کے وارث میرے نیکو کار بندے ہونگے۔ اس میں عبادت گذار قوموں کے لئے ایک پیغام عمل ہے۔

یہ "خلافت" و "وراثت ارضی" جن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے انہیں تاکید کے ساتھ جتا دیا جاتا ہے کہ بندگان خدا پر تمہیں جو قدرت عطا کی گئی ہے وہ اللہ کی امانت ہے، اس کو اپنی ذاتی ملک سمجھ کر نفسانی لذتوں کے حصول میں خرچ نہ کرنا۔ حضرت داؤد کو سلطنت عطا ہوتی ہے تو فرمان آتا ہے

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ (ص-۲)	اے داؤد! ہم نے تم کو زمین پر اپنا نائب بنایا ہے پس لوگوں میں راستی و صداقت کے ساتھ حکومت کرو اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں خدا کے راستہ سے بھٹکا دیگی۔ جو لوگ خدا کے راستہ سے ہٹ جاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے، کیونکہ وہ اس بات کو بھول گئے کہ ان کے اعمال کا ایک دن حساب بھی ہوگا۔

حکومت حاصل ہونے کے بعد انسان میں سب سے بڑا عیب یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے ایک بلند تر ہستی سمجھنے لگتا ہے اور اپنی حقیقت کو بھول کر اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جو لوگ اس کے زیر حکم ہیں وہ گویا اس کی بندگی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اسلام اس عیب سے بچنے کی سخت تاکید کرتا ہے اور حصول نجات کو اس سے پرہیز کرنے پر منحصر قرار دیتا ہے:۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۔ (القصص-۹)	اُس دار الآخرۃ کی نعمتوں کو ہم ان ہی لوگوں کے لئے مخصوص کردیں گے جو زمین میں تکبر اور فساد نہیں کرتے۔ آخرت کی کامیابیاں صرف پرہیزگاروں کے لئے ہیں۔

حکومت کے قیام کا اولین مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ انصاف صرف دو متخاصم فریقوں کے درمیان صحیح فیصلہ کرنے ہی کا نام نہیں ہے بلکہ حقیقی انصاف یہ ہے کہ حاکم اپنے محکوم کے ساتھ برتاؤ کرنے میں حق کو ملحوظ رکھے اور جہاں خود اس کی ذاتی منفعت اور حاکمانہ وقار کا سوال ہو وہاں بھی قدرت و اختیار رکھنے کے باوجود وہی فیصلہ کرے جو حق ہو، خواہ اس سے اس کی ذات کو نقصان پہنچے یا اس کے دوستوں کو یا عزیزوں کو۔ اسلام اس انصاف کی بہترین تعلیم دیتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (النساء-۲۰)

اے ایمان لانے والو! انصاف پر سختی کے ساتھ قائم رہنے والے اور خدا واسطے کی گواہی دینے والے ہو، خواہ یہ انصاف اور یہ گواہی تمہاری اپنی ذات ہی کے خلاف پڑے یا تمہارے والدین یا عزیزوں کے خلاف۔ دولتمند کی رضا جوئی یا فقیر پر رحم کھانے کا جذبہ تمہیں انصاف اور سچی شہادت سے نہ پھیرے، کیونکہ اللہ کی رضا مندی ان کی رضا مندی سے بہتر ہے تم اپنی خواہشات کی پیروی نہ کرو کہ عدل و انصاف سے پھر جاؤ۔ اگر تم نے اینچ پینچ کی بات کی یا حق سے کترائے تو جان لو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر وہ حکم دیتا ہے کہ جس قوم کے ساتھ تمہاری دشمنی ہو اس سے بھی انصاف کرو

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۔ (المائدہ-۲)

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم اس سے انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو، کیونکہ یہی پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔

قوت و طاقت حاصل کرنے کے بعد ایک قوم میں لازمی طور پر یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی مملکت کے حدود بڑھائے، اور کمزور قوموں کے ملک چھینے۔ یہی ملک و مال کا لالچ ظلم و سرکشی کی اصلی

بلباد ہے اور اسی کی خاطر قومیں رزم آرائیاں کیا کرتی ہیں۔ مگر اسلام اس کی سختی کے ساتھ مذمت کرتا ہے، وہ صرف اس سے پرہیز ہی کرنے کی تاکید نہیں کرتا بلکہ ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیتا ہے جو اس گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں جیسا کہ فتنہ و فساد کی تحقیق میں بہ تشریح بیان ہو چکا ہے۔

قرآن مجید کے علاوہ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی نہایت صاف اور واضح ہیں۔ حدیث صحیح ہے کہ:

من اقتطع شبرا من الارض ظلما طوقه اللہ ایاہ یوم القیمۃ من سبع ارضین (رواہ مسلم)

جس کسی نے ایک بالشت بھر زمین بھی ظلم سے حاصل کی اللہ اس کے گلے میں قیامت کے دن اس جیسی سات زمینوں کا طوق لٹکائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے:

ان ھذا المال حلوۃ من اخذہ بحقہ و وضعہ فی حقہ فنعم المعونۃ ھو۔ ومن اخذہ بغیر حقہ کان کالذی یاکل ولا یشبع

یہ مال و دولت ایک لذیذ چیز ہے، جس کسی نے اسے حق کے ساتھ حاصل کیا اور حق کی جگہ خرچ کیا اس کے لئے تو وہ بہترین توشہ ہے۔ مگر جس نے اسے بغیر حق کے حاصل کیا تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو کھائے مگر سیر نہ ہو سکے۔

قرآن مجید اور احادیث نبوی میں اسلام کے سیاسی اخلاق کی نہایت جزئی تفصیلات تک موجود ہیں۔ مگر یہ موقع اس قانون کی تفصیل کا نہیں ہے، مختصر یہ ہے کہ اسلام نے حکومت و اقتدار کی اُن تمام لذتوں کو حرام قرار دیا ہے جن کے لالچ میں انسان اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام کا حکمران نہ تو رعیت کے عام افراد سے ممتاز کوئی بالاتر ہستی ہے، نہ وہ عظمت و رفعت کے تخت پر بیٹھ سکتا ہے، نہ وہ اپنے آگے کسی سے گردن جھکوا سکتا ہے، نہ قانون حق کے خلاف ایک پتہ ہلا سکتا ہے، نہ اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنے کسی عزیز یا دوست یا خود اپنی ذات کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ہستی کے جائز مطالبہ سے بچا سکے، نہ وہ حق کے خلاف ایک حبہ لے سکتا ہے اور نہ ایک جپہ بھر زمین پر قبضہ کر سکتا ہے۔ اس پر ہر وقت یہ خوف غالب رہتا ہے کہ اس

کے اعمال کا سخت حساب لیا جائیگا اور اگر حرام کا ایک پیسہ، جبر سے لی ہوئی زمین کا ایک چپہ، تکبر و فرعونیت کا ایک شمہ، ظلم و بے انصافی کا ایک ذرہ، اور ہوائے نفسانی کی بندگی کا ایک شائبہ بھی اس کے حساب میں نکل آیا تو اسے سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔

اسلام میں حاکم یا فرمانروا کی اصلی حیثیت اور اس کی منصبی ذمہ داریوں کی صحیح کیفیت حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اپنے خطبہ میں بیان کی تھی۔ انہوں نے فرمایا:

یا ایھا الناس! قد ولیت امرکم ولست بخیر منکم۔ وان اقویکم عندی الضعیف حتی آخذ لہ بحقہ وان اضعفکم عندی القوی حتی آخذ منہ ایھا الناس ما انا الا کاحدکم فاذا رایتمونی قد استقمت فاتبعونی وان زغت فقوّمونی۔

لوگو! مجھے تمہاری حکومت کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ میرے نزدیک ضعیف آدمی تم میں سب سے زیادہ قوی ہے جبتک کہ اس کا حق اسے نہ دلوادوں۔ اور قوی آدمی تم میں سب سے زیادہ ضعیف ہے جبتک کہ اس سے حق وصول نہ کرلوں۔ لوگو! میری حیثیت تمہارے ایک معمولی فرد سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر تم مجھے سیدھی راہ چلتے دیکھو تو میری پیروی کرو اور اگر دیکھو کہ ٹیڑھا ہوگیا ہوں تو مجھے سیدھا کردو۔

اسی طرح خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں اسی کیفیت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں:-

انما انا و مالکم کولی الیتیم، ان استغنیت استعففت وان افتقرت اکلت بالمعروف لکم علی ایھا الناس خصال فخذونی بھا لکم علی ان لا اجتبی شیئا من خراجکم ولا مما افاء اللہ علیکم الا من وجھہ ولکم علی اذا وقع

تمہارے مال سے میرا تعلق وہی ہے جو یتیم کے مال سے اُس کے ولی کا ہوتا ہے۔ اگر میں خوشحال ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اور اگر تنگ دست ہونگا تو جو میرا جائز حق الخدمت ہوگا وہ لے لونگا۔ میرے اوپر تمہارے کچھ حقوق ہیں اور تم ان کا مجھ سے مطالبہ کر سکتے ہو۔ مجھ پر فرض ہے کہ تم سے خراج کی مدمیں اور اس مال

نی یدی ان لا یخرج منی الا فی حقه میں سے جو اللہ نے تمہیں فے میں عطا فرمایا ہے، کوئی ٹیکس بیجا وصول نہ کروں، اور تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ جو کچھ میرے ہاتھ میں آئے وہ جائز مصرف کے سوا کسی اور صورت سے نہ نکلے۔

اس طرح ہر قسم کی شاہانہ طمطراق، حاکمانہ مطلق العنانی، مال و دولت کی فراوانی، اور نفس کی تمام لذتوں اور راحتوں کو نکال دینے کے بعد حکومت کی ذمہ داریوں کا جو خشک اور بے مزہ حصہ باقی رہ جاتا ہے وہ شرع اسلام ہی کی زبان میں یہ ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج - ۶)

ان کو اگر ہم نے زمین میں قدرت و اختیار عطا کیا تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔

یہ اسلام کا صرف دعویٰ ہی دعویٰ نہیں ہے بلکہ داعیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور آپ کے خلفائے راشدینؓ نے اس کا پورا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا موضوع قانون کی تشریح ہے نہ کہ تاریخ کا استقصاء، تاہم جب ذکر چھڑ گیا ہے تو ہم چند مثالیں پیش کر کے یہ بتائیں گے کہ اسلامی حکومت کا معیار کیا ہے۔

بنی مخزوم کی ایک معزز عورت فاطمہ بنت اسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چوری کے الزام میں گرفتار ہو کر آتی ہے۔ قریش کو خوف ہوتا ہے کہ کہیں آپ عام لوگوں کی طرح اس کا بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم نہ دے دیں۔ سفارش کے لئے آپ کے سب سے زیادہ عزیز و محبوب شخص (اسامہ بن زیدؓ) کو بھیجتے ہیں۔ مگر آپ ان کی سفارش کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ تم سے پہلے کے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ وہ کم حیثیت لوگوں پر تو تعزیر کا حکم جاری کرتے تھے اور شریف و معزز لوگوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ پھر جوش میں آکر فرماتے ہیں کہ

والذی نفسی بیدہ لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یدھا (بخاری و ابن ماجہ)

اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا

جنگ بدر میں قریش کے دوسرے سرداروں کے ساتھ خود رسول اللہ کے داماد ابو العاص[1] گرفتار ہو کر آتے ہیں۔ عام قیدیوں کی طرح انہیں بھی بند کر دیا جاتا ہے۔ ان کے پاس فدیہ ادا کرنے کے لئے مال نہیں ہوتا تو حکم ہوتا ہے کہ گھر سے منگا کر دو ورنہ قید رہو۔ وہ اپنی بیوی یعنی رسول اللہ کی بیٹی حضرت زینبؓ کو پیغام بھیجتے ہیں اور ان کے پاس سے شوہر کے فدیہ میں ایک قیمتی ہار آتا ہے جو حضرت خدیجہ زوجۂ رسول اللہ صلعم نے ان کے جہیز میں دیا تھا۔ ہار کو دیکھ کر رسول اللہ کو اپنی رفیقۂ حیات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ تاہم خود اپنے اختیار سے فدیہ معاف نہیں کرتے۔ عام مسلمانوں سے اجازت مانگتے ہیں کہ اگر تم پسند کرو تو بیٹی کو اس کی ماں کی یادگار واپس کر دی جائے اور جب عام مسلمان اس کی اجازت دے دیتے ہیں اس وقت رسول اللہ کے اپنے داماد کو بغیر فدیہ کے رہائی نصیب ہوتی ہے۔ (طبری۔ ابو داؤد)

حدیبیہ کے مقام پر رسول خدا اور کفار قریش کا معاہدہ ہوتا ہے۔ صلح کی شرائط طے ہو چکی ہیں اور معاہدہ کی کتابت ہو رہی ہے۔ عین اس حالت میں ایک مسلمان ابو جندل بن سہیل کفار کی قید سے بھاگ کر آتے ہیں۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ بدن پر مار کے اتنے زخم ہیں کہ چور چور ہو رہا ہے۔ وہ آ کر مسلمانوں کے سامنے گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدارا مجھے ان کی قید سے نکالو۔ رسول اللہ کی رکاب میں ۱۴ سو تلوار بند مسلمان ہیں اور آپ کے ایک اشارہ میں ابو جندل کو رہائی مل سکتی ہے، مگر کفار سے شرط ہو چکی ہے کہ "قریش والوں میں سے جو شخص مسلمانوں کے پاس جائے گا وہ واپس کر دیا جائے گا اور مسلمانوں میں سے جو شخص مکہ جائے گا وہ واپس نہ کیا جائے گا" اس لئے رسول اللہ انہیں اپنی حمایت میں لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے زخم دکھا کر فریاد کرتے ہیں کہ کیا آپ مجھے پھر اسی ظلم کا تختۂ مشق بننے کے لئے واپس کرتے ہیں، مگر آپ فرماتے ہیں:

یا ابا جندل! اصبر واحتسب فانا لا نغدر وان اللہ جاعل لک فرجا ومخرجا (فتح الباری ج ۵ باب الشروط فی الجہاد)

ابو جندل! صبر کرو اور ضبط سے کام لو۔ ہم بد عہدی نہیں کر سکتے۔ اللہ تمہارے لئے رہائی کی کوئی صورت نکالے گا۔

[1] یہ حضرت زینبؓ بنت رسول اللہ کے شوہر تھے۔ بعد میں کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

جنگ یرموک کے موقع پر قیصر روم لاکھوں کی فوج مسلمانوں کے مقابلہ پر جمع کرتا ہے اور شام و فلسطین سے مسلمانوں کو نکال دینے، بلکہ ان کی قوت کو کچل دینے کا عزم کر لیتا ہے۔ اس فیصلے کی گھڑی میں اپنی قوت کے بچاؤ کے لئے مسلمانوں کو ایک ایک بیسہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ حمص کے باشندوں کو جمع کرتے ہیں اور جو خراج ان سے وصول کیا تھا اسے یہ کہہ کر واپس کر دیتے ہیں کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں اس لئے اب تم اپنا انتظام خود کرو۔ اس پر اہل حمص کہتے ہیں کہ "تمہارا عدل و انصاف ہم کو اس ظلم و جور سے زیادہ عزیز ہے جس میں ہم پہلے مبتلا تھے۔ ہم ہرقل کی فوج سے تمہارے عامل کی قیادت میں مقابلہ کریں گے"۔ (فتوح البلدان للبلاذری) یہ بات یاد رہے کہ ہرقل ایک عیسائی بادشاہ تھا، اور یہ لوگ بھی جو اپنے مسلمان حکمرانوں کی طرف سے اس کے خلاف لڑنا چاہتے تھے، عیسائی تھے اور صدیوں سے رومی سلطنت کے زیر حکومت تھے۔

جنگ صفین میں جاتے وقت خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کی زرہ کھوئی جاتی ہے۔ جنگ سے واپس آتے ہیں تو وہی زرہ دار الخلافہ کے ایک یہودی کے پاس پائی جاتی ہے۔ آپ اس سے زرہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے یہ تو میری ملک ہے اور ہمیشہ سے میرے ہی قبضہ میں ہے۔ خلیفۂ وقت کو یقین ہے کہ یہودی جھوٹ بول رہا ہے اور یہ وہی زرہ ہے جو کھوئی گئی تھی، مگر باوجود اس کے وہ اپنے شاہانہ اختیارات سے کام نہیں لیتے بلکہ ایک بے بس مدعی کی طرح قاضی شریح کی عدالت میں جا کر استغاثہ کرتے ہیں۔ قاضی ان کی جلیل القدر شخصیت کا لحاظ کر کے محض ان کے دعوے پر فیصلہ نہیں کر دیتا۔ کہتا ہے کہ آپ زرہ کی ملکیت کا ثبوت پیش کیجئے۔ وہ اپنے غلام قنبر اور اپنے بیٹے، رسول اللہ کے نواسے امام حسنؑ کو شہادت میں پیش کرتے ہیں۔ قاضی کہتا ہے امام حسنؑ کی شہادت معتبر نہیں کیونکہ وہ آپ کے بیٹے ہیں اور باپ کے دعوے پر بیٹے کی شہادت تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ یہ حال دیکھ کر یہودی با آواز بلند کلمۂ طیبہ پڑھتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ جس دین میں یہ انصاف ہے وہ ضرور سچا دین ہے۔ (سیوطی)

خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے پاس ان کا ایک عامل جزیہ کی کثیر رقم لے کر حاضر ہوتا ہے۔ آپ پوچھتے ہیں یہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "جزیہ ہے جو ذمیوں سے وصول کیا گیا ہے"۔ مال کی کثرت کو دیکھ کر آپ کو

گمان ہوتا ہے کہ جبراً وصول کیا گیا ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ "کہیں تم نے لوگوں کو تباہ تو نہیں کر دیا"۔ وہ کہتا ہے "خدا کی قسم! ہم نے نہایت نرمی سے وصول کیا ہے"۔ پوچھتے ہیں "بغیر مارے باندھے؟" وہ عرض کرتا ہے "واللہ بغیر مارے باندھے"۔ تب کہیں وہ رقم بیت المال میں داخل کی جاتی ہے (فتح البیان)۔ امام ابو یوسف اپنی کتاب الخراج میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے پاس جب عراق کا خراج آتا تھا تو دس فقہاء اور افسر کوفہ سے اور دس بصرہ سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور چار مرتبہ شرعی قسم کھا کر آپ کو یقین دلاتے تھے کہ یہ رقم حلال ہے اور کسی مسلمان یا ذمی سے ظلم کے ساتھ وصول نہیں کی گئی ہے۔

حضرت عمرؓ کے بیٹے ابو شحمہ شراب پیتے ہیں تو ایک معمولی مجرم کی طرح گرفتار کر لئے جاتے ہیں، خود حضرت عمرؓ اپنے ہاتھ سے انہیں ۸۰ کوڑے لگاتے ہیں اور ان کوڑوں کے صدمہ سے ان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ عمرو بن عاص گورنر مصر کے بیٹے عبداللہ ایک شخص کو مارتے ہیں۔ وہ دربار خلافت میں استغاثہ کرتا ہے اور حضرت عمرؓ خود اسی شخص کے ہاتھ سے عبداللہ کو کوڑے لگوا دیتے ہیں۔ خود عمرو بن عاصؓ کے متعلق خبر آتی ہے کہ ان کے پاس بہت دولت اکٹھی ہو گئی ہے۔ حضرت عمرؓ انہیں لکھتے ہیں کہ "گورنر ہونے سے پہلے تو تمہارے پاس اتنا ساز و سامان نہ تھا اب یہ کہاں سے آگیا"۔ وہ جواب دیتے ہیں "میرا صوبہ ایک زرخیز علاقہ ہے، اس لئے میرے پاس میرے خرچ سے بہت کچھ مال بچ رہتا ہے"۔ یہ جواب حضرت عمرؓ کو مطمئن نہیں کرتا۔ آپ محمد ابن مسلمہؓ کو پورے اختیارات دیکر بھیجتے ہیں وہ مصر پہنچکر ان کے مال کی جانچ پڑتال کرتے ہیں، ان کے پچھلے اثاثہ کا حساب کرتے ہیں، گورنری کے زمانہ میں اس مال پر جو معقول اضافہ ہو سکتا تھا۔ اس کا اندازہ لگاتے ہیں، اس کے بعد جو زائد مال بچتا ہے اسے ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیتے ہیں۔ مصر کا با اختیار گورنر جس کی حدود مملکت طرابلس تک پہنچی ہوئی تھیں، یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور دم نہیں مار سکتا۔ (بلاذری)

مغیرہ بن شعبہؓ والی بصرہ کے خلاف شکایت پہنچتی ہے کہ ان کا ایک عورت سے ناجائز تعلق ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ ابو موسیٰ اشعریؓ کو حکم دیتے ہیں کہ بصرہ میں شیطان نے آشیانہ بنا لیا ہے، تم وہاں کی گورنری کا جائزہ لے لو اور مغیرہؓ کو گواہوں سمیت مدینہ بھیجو۔ حکم کے مطابق مغیرہؓ مدینہ بھیجے جاتے ہیں۔

خود حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ جرح میں گواہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ شہادتوں میں شدید اختلاف واقع ہوتا ہے۔ جرم ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے مغیرہؓ کو رہائی دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "اگر شہادت پوری ہو جاتی تو میں یقیناً تم کو سنگسار کر دیتا" یہ مغیرہؓ رسول اللہ کے جلیل القدر صحابی تھے، عرب کے چار مشہور ترین مدبروں میں سے ایک تھے، اسلام کی بڑی بڑی سیاسی وجنگی خدمات انجام دی تھیں۔ مگر ان کی عظمت وشان، بیش قیمت خدمات، گورنری کی اعلیٰ پوزیشن، عرب میں ان کی شہرت وعزت، غرض کوئی چیز ان کے کام نہ آئی اور ایک معمولی مجرم کی طرح انہیں پیش ہونا پڑا۔ دنیوی حکومتوں میں کسی افسر کا بدکاری کرنا اس کا شخصی معاملہ ہے۔ بلکہ آج کل کی مہذب ترین حکومتوں کے قوانین میں زنا اگر طرفین کی رضامندی سے ہو تو کوئی قابل سزا جرم ہی نہیں ہے۔ لیکن جس حکومت کا اصلی مقصد انسانیت کی اصلاح اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر تھا اس میں کسی ایسے شخص کے لئے گنجائش نہ تھی جس کا ذاتی عمل درست نہ ہو۔

فارس کے علاقہ میں مسلمان ایک شہر (شہریانج) کا محاصرہ کرتے ہیں اور محصورین کی مزاحمت اس حد تک کمزور ہو جاتی ہے کہ شہر کا فتح ہونا بالکل یقینی ہو جاتا ہے۔ عین اس حالت میں اسلامی فوج کا ایک غلام شہر والوں کے نام امان نامہ لکھتا ہے اور اسے تیر میں باندھ کر شہر میں پھینک دیتا ہے۔ دوسرے دن جب اسلامی فوج شہر پر حملہ کرتی ہے تو اہل شہر دروازہ کھول کر باہر آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک مسلمان ہم کو امان دے چکا ہے، اب تم کیوں برسرپیکار ہو؟ امان نامہ دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک غلام کی تحریر ہے۔ اس معاملہ میں حضرت عمرؓ سے استصواب کیا جاتا ہے کہ اس امان نامہ کی کیا وقعت ہے؟ جواب میں آپ لکھتے ہیں "مسلمان غلام بھی عام مسلمانوں کی طرح ہے۔ اس کے ذمہ کی وہی قیمت ہے جو عام مسلمانوں کے ذمہ کی ہے۔ لہٰذا اس کی دی ہوئی امان نافذ کی جائے۔" (بلاذری ذکر کور فارس)

حضرت ابوبکر صدیق رسول اللہ کے انتقال کے بعد ملک عرب کی سلطنت کے بااختیار فرمانروا

[1] یہ واقعہ طبری اور ابن اثیر میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ بلاذری نے بھی تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔

منتخب کئے جاتے ہیں۔ انتخاب کے دوسرے دن حضرت عمرؓ انہیں دیکھتے ہیں کہ سر پر کپڑوں کے تھان لادے ہوئے بازار جارہے ہیں۔ حضرت عمرؓ عرض کرتے ہیں کہ "اب آپ مسلمانوں کے امیر ہیں، آپ کو یہ کام زیبا نہیں ہے" وہ جواب دیتے ہیں "پھر میں اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ کیونکر پالوں؟" حضرت عمرؓ تجویز کرتے ہیں کہ یہ کام آپ کے لئے ابو عبیدہؓ کر دیا کریں گے۔ چنانچہ ان سے خلیفۂ اسلام کا یہ معاملہ طے ہوتا ہے کہ وہ ان کی تجارت کا کام سنبھالیں اور ان کے اہل و عیال کے لئے ایک متوسط درجہ کے مہاجر کی خوراک اور گرمی جاڑے کا کپڑا مہیا کر دیا کریں۔ پھر بیت المال سے خلیفہ کے لئے ۵۰۰ درہم (آجکل کے حساب سے سو روپے سے کچھ زائد) ماہانہ تنخواہ مقرر ہو جاتی ہے۔ جب انتقال کا وقت قریب آتا ہے تو لوگوں سے کہتے ہیں کہ خلیفہ ہونے کے بعد سے میرے مال میں جو کچھ اضافہ ہوا ہو اس کا حساب کرنا اور وہ سب نئے خلیفہ کے سپرد کر دینا۔ چنانچہ انتقال کے بعد جب حساب کیا جاتا ہے تو ایک اونٹنی، ایک زنگی غلام، اور ایک پرانی چادر کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ (فتح الباری ج ۵۔ کتاب البیوع)

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کا سیلاب ایران سے لیکر شمالی افریقہ تک پھیل گیا تھا۔ غنائم اور اموال خراج کی اس قدر کثرت تھی کہ کروڑوں درہم سالانہ خزانہ میں داخل ہوتے تھے قیصر و کسریٰ کے سارے خزانے مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے تھے۔ مگر خود اس سلطنت کے فرمانروا کا یہ حال تھا کہ بدن پر بارہ بارہ پیوند لگے ہوئے کپڑے ہوتے تھے۔ پاؤں میں پھٹی ہوئی چپل اور سر پر بوسیدہ عمامہ پہنے ہوئے یتیموں، بیواؤں اور ضرورتمندوں کی خبر گیری کرتے پھرتے تھے روم و عجم کے لوگ آتے تو انہیں عام مسلمانوں میں فرمانروائے عرب کو پہچاننا مشکل ہوتا تھا۔ شام کا سفر کیا تو اس شان سے کہ لوگ خلیفۂ اسلام اور اس کے غلام میں تمیز نہ کر سکے۔ فتح بیت المقدس کے موقع پر شہر میں داخل ہوئے تو پیادہ پا تھے اور ایسے موٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو عیسائیوں کے خیال سے شرم آنے لگی۔ اونٹ کا دودھ، زیتون کا تیل، سرکہ اور گیہوں کی روٹی، یہ بہتر سے بہتر غذائیں تھیں جو انہیں نصیب ہوتی تھیں۔ جب انتقال ہوا تو گھر میں اتنا اثاثہ نہ تھا

کہ قرضے ادا کیئے جاتے، اس لیئے رہنے کا مکان بیچا گیا اور اس سے قرضے ادا کیئے گئے۔

یہ واقعات قصہ و افسانہ نہیں، تاریخ کے مستند حقائق ہیں۔ انہیں دیکھ کر بتاؤ کہ دنیا میں اس سے بہتر حکومت کا کوئی اور بھی نمونہ موجود ہے؟ جن لوگوں کا آئین حکمداری اس تقویٰ و طہارت، اس خدا ترسی، اس بے نفسی و بے غرضی، اس حریت و مساوات، اس عدل و انصاف، اس وفائے عہد اور اس دیانت و امانت پر قائم ہو، کیا ان کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ دنیا پر حکومت کرنا، یا بالفاظ صحیح تر دنیا کی خدمت کرنا صرف انہی کا حق ہے؟ اگر انہوں نے عجم کے عیش پرست اور ظالم حکمرانوں سے عجم کا تخت خالی کرا لیا، اگر انہوں نے روم کے سیہ کار اور جفا پیشہ فرمانرواؤں کو روم کی حکومت سے بیدخل کر دیا، اگر انہوں نے آس پاس کی تمام شیطانی حکومتوں کے تختے الٹ دیئے اور ان کی جگہ یہ منصفانہ حکومت قائم کی تو بتاؤ کہ یہ انسانیت پر ظلم تھا یا اس کی خدمت؟ ان کے مقابلہ میں مغرب کے ان جھوٹے مدعیوں کی کیا وقعت ہے جن کو تقویٰ و پرہیزگاری سے واسطہ نہیں، وفائے عہد کی ہوا تک نہیں لگی، عدل و انصاف اور دیانت و امانت سے بُعد تام ہے، اور جو جبر ملک گیری کی ہوس، مال و زر کی حرص، اور حصولِ اقتدار کی خواہش کے کسی اور جذبہ سے آشنا نہیں ہیں؟

ہم کو تسلیم ہے کہ بعد کے زمانوں میں مسلمانوں کی اکثر حکومتوں کا عمل اس اصولِ جہانبانی کے مطابق نہیں رہا ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ مگر یہ نقص اسلام کا نہیں، اس کے پیرووں کا ہے۔ اسلام تو ایک قانون ہے جو قرآن اور سنت رسول سے ماخوذ ہے جو حکومت اس قانون کے مطابق عمل کرتی ہے وہ اسلامی حکومت ہے اور جس کا عمل اس کے خلاف ہے وہ اسلامی حکومت نہیں ہے۔ ہمارے لئے مسلمان بادشاہوں کا عمل حجت نہیں ہے بلکہ اسلام کا قانون حجت ہے۔ اس میں اگر کوئی نقص ہو تو اسے پیش کیا جائے۔

اسلامی فتوحات کی اصلی وجہ آئندہ مباحث کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے یہاں ایک اور مسئلہ کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ اس کتاب میں بار بار یہ بیان کیا گیا ہے، اور آئندہ بھی اس

حقیقت کا جا بجا ذکر آئیگا کہ اسلامی شریعت میں ملک گیری کی غرض سے تلوار اٹھانا قطعاً حرام ہے۔ اس پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب یہ فعل حرام ہے تو آخر صحابۂ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کے اُن حملوں کی کیا توجیہ کی جائیگی جو انہوں نے عراق، شام، ایران، ارمینیا، مصر، اور شمالی افریقہ وغیرہ ممالک پر کئے؟ یہ اعتراض مخالفین اسلام نے بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کیا ہے، اور مسلمان مؤرخین و مصنفین نے اس کے نہایت مفصل جوابات بھی دیئے ہیں۔ لیکن اس پر کسی نے غور نہیں کیا کہ اس معاملہ میں اسلام اور غیر مسلموں کے نقطۂ نظر میں شدید اختلاف ہے۔ اسی لئے جن لوگوں نے غیر مسلموں کے نقطۂ نظر کی رعایت کر کے جواب دیا ہے انہوں نے اسلام کی غلط ترجمانی کی ہے، اور جنہوں نے اس سے بالکل بے پروا ہو کر جواب دیا ہے وہ مزید شکوک پیدا کر بیٹھے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام حکومت کے معاملہ میں "قومی" اور "اجنبی" کی کوئی تمیز نہیں کرتا، بلکہ "عدل" اور "ظلم" کو وجہ امتیاز قرار دیتا ہے۔ اگر ایک ملک کی حکومت خود اس کے اپنے باشندوں کے ہاتھ میں ہو، لیکن اس کے حکمراں بدکار، ظالم، نفس پرست، اور ناخدا ترس ہوں، تو اسلام کی نگاہ میں وہ اسی قدر نفرت کے قابل ہیں جس قدر ایک اجنبی حکومت کے ایسے ہی بدکردار عمّال ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ایک عجمی عرب پر حکومت کرتا ہے اور تمام امور میں انصاف، امانت، دیانت، اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتا ہے، مظلوموں کی دادرسی کرتا ہے، حق والوں کے حق دلواتا ہے، تکبر و تعلّی نہیں کرتا، نفس پروری و غرض پرستی سے احتراز کرتا ہے۔ اور رعیت کی اصلاح حال کے سوا کسی اور ذاتی غرض کے لئے اپنی قوتوں کو استعمال نہیں کرتا، تو اسلام کے نزدیک عرب کے لئے وہ عجمی اس عربی حکمراں سے بہتر ہے جو ان صفات سے عاری ہو۔ یہ خیال کہ ظالم عرب عربوں کے لئے عادل عجمی سے بہتر ہے، اور ترک خواہ کتنا ہی نیک اور صالح ہو مگر صرف اس لئے کہ وہ ترک ہے عراقی اسے قبول نہیں کر سکتے، ایک ایسا خیال ہے جسے اسلام اصلاً غلط اور کلیتہ باطل سمجھتا ہے۔ اس معاملہ کو وہ "قومیت اور وطنیت" کی نظر سے نہیں بلکہ خالص "انسانیت" کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ "صالح" انسان بہرحال "غیر صالح" کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے، اور انسانی خود بینی اپنے اور

پرائے، وطنی اور اجنبی، ہندی وعراقی، زنگی وفرنگی، کالے اور گورے کی تمیز کو دخل دینا اندھا تعصب ہے۔ اسلام کے اس عقیدہ کے مطابق حکومت کی اچھائی کا معیار نہ اس کا قومی اور خود اختیاری ہونا ہے، اور نہ اس کی برائی کا معیار اجنبی یا غیر خود اختیاری ہونا۔ اصل سوال صرف یہ ہے کہ حکومت کا نظام عادلانہ اور حق پرستانہ ہے یا نہیں؟ اگر پہلی صورت ہے تو اسلام اسکو مٹانے کی کوشش تو درکنار ایسے ارادہ کو بھی گناہ اور ظلم عظیم سمجھتا ہے لیکن دوسری صورت میں وہ ایک ظالمانہ نظام حکومت کو مٹا کر ایک سچا عادلانہ نظام حکومت قائم کرنا اولین فرض قرار دیتا ہے۔ قومی اور اجنبی کے سوال سے اس نے نفیاً یا اثباتاً کوئی تعرض نہیں کیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے نزدیک حکومت کے اچھے یا برے ہونے کے سوال پر اس کے قومی ہونے یا نہ ہونے کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ غیر قومی حکومت عموماً ظالم وجابر ہوتی ہے، کیونکہ ایک قوم دوسری قوم پر حکومت قائم ہی اس لئے کرتی ہے کہ اسے غلام بنا کر اپنی مصلحت کے لئے استعمال کرے۔ اور اس کے برعکس قومی حکومت میں اصلاح پذیری کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے لیکن باوجود اس کے یہ ضروری نہیں ہے کہ قومی حکومت ہر حال میں بہتر ہو اور غیر قومی حکومت کسی حال میں عادل نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ایک قوم پر خود اس کے اپنے سرکش فرزند شیطان کی طرح مسلط ہوجائیں اور اسے اپنی شخصی اغراض کا غلام بنا کر تباہ و برباد کردیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قوم کو غیر قوم کے نیک نفس اور بے غرض مصلحین ظلم و استبداد کے پنجہ سے چھڑائیں اور اس کے لئے مادی و اخلاقی ترقی کی راہیں کھولدیں پس حکومت کی خوبی کا اصلی معیار اس کا عادل وصالح ہونا ہے اور اس کی برائی کا اصلی معیار غیر عادل اور غیر صالح ہونا۔

اس سے یہ مطلب نکالنا صحیح نہیں ہے کہ اسلام قومی حکومت کا دشمن ہے۔ وہ ہر قوم کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے احوال کی اصلاح خود کرے۔ مگر جب کسی قوم کے اعمال بگڑجائیں، اس کی اخلاقی حالت خراب ہوجائے، اور وہ اپنے شریر و مفسد لوگوں کی پیروی و اطاعت اختیار کرکے ذلت و مسکنت کی پستیوں میں گر جائے، تو اسلام کے نزدیک اس قوم کو حکومت خود اختیاری کا حق باقی نہیں رہتا اور دوسرے لوگوں کو جو اس کے مقابلہ میں اصلح ہوں، اس پر حکومت کرنے کا حق

حاصل ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں نافرمان اور بدکار قوموں کو جگہ جگہ یہ دھمکی دی گئی ہے کہ :-

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (محمد-۴)

اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تمہارے بدلے دوسری قوم کو کھڑا کرے گا اور وہ لوگ تم جیسے نہیں ہونگے۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا (التوبہ-۶۰)

اگر تم راہ الٰہی میں جہاد کے لئے نہ نکلوگے تو اللہ تمہیں دردناک مصائب میں مبتلا کرے گا اور تمہارے بدلے دوسری قوم کو کھڑا کر دیگا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکوگے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ (النساء-۱۹)

لوگو! اگر خدا چاہے تو تمہیں ہٹا دے اور دوسرے لوگوں کو تمہاری جگہ لے آئے۔

اس معنی کی آیات قرآن میں بکثرت آئی ہیں۔ اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ حکومت اور بادشاہی کا حق صلاحیت کے ساتھ مشروط ہے، جو قوم صلاحیت کو کھو دیتی ہے وہ اس حق کو بھی کھو دیتی ہے، اور جو صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے وہ اس حق کو بھی حاصل کر لیتی ہے۔ اس صلاحیت کو محض قوت و طاقت کا ہم معنی نہ سمجھو۔ یہ جوہر خاص اُن لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو ایک خدا کی بندگی کرتے ہیں، بُرے اعمال سے روکتے ہیں، اچھے اعمال کا حکم دیتے ہیں، ہر عمل خیر کے انجام دینے پر مستعد رہتے ہیں، اور یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن انہیں اپنے اعمال کا پورا پورا حساب دینا پڑے گا

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (آل عمران-۱۱۲)

یہ صالح لوگ کسی ایک قوم یا ایک ملک کی جائداد نہیں ہیں بلکہ تمام نوع بشری اور کائنات انسانی کی مشترک جائداد ہیں۔ آدم کی ساری اولاد کو ان کی صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔ اور اگر وہ اپنی خدمات کو بلاضرورت کسی محدود جماعت یا قبیلہ کے لئے مخصوص کر دیں تو یقیناً یہ انسانیت پر ان کا ظلم ہو۔ اسلام نے ان کے لئے رنگ یا نسل یا جغرافی تقسیم کے قبیل سے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے، بلکہ بلاقید تمام روئے زمین کے لئے ان کی قابلیتوں کے فوائد کو عام کر دیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید

میں تبصریح ارشاد ہوتا ہے:-

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھدیا کہ "زمین"

أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (انبیاء) کے وارث میرے صالح بندے ہونگے۔

یہ حکومت وسلطنت کے متعلق اسلامی تعلیم کی اصلی رُوح ہے۔ اس کو سمجھ لینے کے بعد صحابہ کرامؓ کے اُن فاتحانہ اقدامات کی علت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے جن سے انہوں نے قیصر و کسریٰ کی بادشاہی کے تخت اُلٹ دیئے اور باطل کی فرمانروائی کے سارے طلسم کو درہم برہم کر دیا۔ انہوں نے اپنے ملک کی اصلاح سے فارغ ہو کر جب باہر کی دنیا پر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ تمام ہمسایہ ممالک پر ظالم بادشاہ اور جابر امرا مسلط ہیں۔ قوت والوں نے کمزوروں کو غلام بنالیا ہے۔ دولت والوں نے غریبوں کو خرید رکھا ہے۔ انسان، انسان کا خدا بن گیا ہے۔ عدل، انصاف، قانون، کوئی چیز نہیں ہے۔ بادشاہوں اور حاکموں کی چشم و ابرو کے اشارے پر لوگوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں، عزتیں لٹتی ہیں، گھر برباد ہوتے ہیں، اور قوموں کی قسمتوں کے فیصلے ہو جاتے ہیں۔ غریب محنتی لوگ اپنا خون پانی ایک کر کے جو دولت کماتے ہیں وہ طرح طرح کی زیادتیوں سے لوٹی جاتی ہے، اور امراء کی عیش پسندیوں میں اڑا دی جاتی ہے۔ حاکم لوگ خود پرلے درجے کے سیاہ کار، بدعمل اور ہوس پرست ہیں، اس لئے رعیت بھی ہر قسم کی معصیتوں میں مبتلا ہے۔ شراب، زنا اور جوئے کی عام اجازت ہے۔ رشوت اور خیانت کا بازار گرم ہے۔ نفس کی شرارتوں نے اخلاق وانسانیت کی تمام قیود کو توڑ دیا ہے۔ بہیمی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے انسان کسی قید سے آشنا نہیں رہا اور اس کے اخلاق کی دنائت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ اگر تمدن کی اوپری شان وشوکت کے پردے اٹھا کر اسے دیکھا جائے تو حیوانوں کو بھی اس کی حیوانیت پر شرم آنے لگے۔[1]

---

[1] ایران، روم اور مصر وغیرہ ممالک اس وقت سیاسی، اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے جس پستی کی حالت میں تھے اس کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ حرام کاری میں باپ بیٹی اور بھائی بہن تک کی تمیز نہ تھی۔ مذہبی پیشوا تک بدترین اخلاقی جرائم کے ارتکاب کرتے تھے۔ ایران میں مزدکی مذہب نے سوسائٹی کے سارے نظام کو درہم (باقی صفحہ ۱۱۸ پر)

انسانی برادری کو اس ذلیل حالت میں مبتلا دیکھ کر صالحین کی وہ سر فروش جماعت اصلاح کے لئے کمر بستہ ہو گئی۔ پہلے اس نے وعظ و تذکیر سے کام لیا اور کسرائے عجم، قیصر روم، اور مقوقس مصر کو دعوت دی کہ اسلام کے قانون عدل و حق پرستی کو اختیار کریں۔ جب انہوں نے اس دعوت کو رد کر دیا تو پھر مطالبہ کیا کہ حکومت و فرمانروائی کی مسند کو ان لوگوں کے لئے خالی کر دیں جو اس کے اہل ہیں۔ مگر جب اس مطالبہ کو بھی رد کر دیا گیا اور اس کے جواب میں تلوار پیش کی گئی تو مٹھی بھر انسانوں کی اس بے سروسامان جماعت نے بیک وقت دو عظیم الشان سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے اور سرحد ہندوستان سے لیکر شمالی افریقہ تک جو لوگ ان کے ظلم سے پامال ہو رہے تھے ان سب کو یک لخت آزاد کر دیا۔

تمہیں اختیار ہے کہ ان کے اس فعل کو جہانگیری سے تعبیر کرو یا زیادتی اور تعدی قرار دو۔ مگر تاریخ کے اس بیان کو تم نہیں جھٹلا سکتے کہ ان کی حکومت نے ان قوموں کو اس پستی سے نکالا جس میں وہ گری ہوئی تھیں۔ انہیں مادی، اخلاقی اور روحانی ترقی کی معراج پر پہنچایا۔ اور جو ملک تہذیب و تمدن کے لئے بالکل بنجر ہو گئے تھے اُن میں نئے سرے سے نمو اور زندگی کی وہ قوتیں پیدا کیں کہ آج تک عالم انسانی میں ان کے گلزار کی مہک باقی ہے۔ قوم پرستی کا مذہب تو شاید یہی فیصلہ کرے کہ ایران و روم چاہے مٹ جاتے مگر عرب کو ان پر حملہ کرنے کا حق نہیں تھا لیکن صداقت کا مذہب یہ کہتا ہے کہ انہوں نے اس طرح انسانیت کی سب سے بڑی خدمت انجام دی، اور درحقیقت یہ دنیا کی بدقسمتی تھی کہ اس کا ایک بڑا حصہ اُس جماعت کی خدمت سے محروم رہ گیا جس سے زیادہ صالح جماعت سورج کی آنکھ نے زمین کے چہرہ پر کبھی نہیں دیکھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) درہم برہم کر دیا تھا۔ روم میں امراء اور قیاصرہ کی نفس پرستیوں نے اخلاقی تنزل انتہا کو پہنچا دیا تھا۔ مصر و افریقہ کو رومیوں کی غلامی نے بدترین خصائل کا مجموعہ بنا دیا تھا۔ خود عرب سے متصل شام و عراق میں ان دونوں سلطنتوں کے اثرات نے مفاسد اخلاقی کا ایک طوفان برپا کر رکھا تھا۔ ان حالات کی تفصیل کے لئے میں اسلامی تاریخوں کے بجائے سرجان میلکم اور ایڈورڈ گبن وغیرہ یورپین محققین کی تصانیف پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ لیکی کی "ہسٹری آف یورپین مارلس" خصوصیت کے ساتھ اس عہد کے رومیوں کی اخلاقی حالت ظاہر کرتی ہے۔

باب چہارم

اشاعتِ اسلام اور تلوار

اسلامی جنگ کے مقاصد کی اس توضیح میں، جو سراسر قرآن مجید، احادیث نبوی اور معتبر کتب دینیہ کی تصریحات پر مبنی تھی، قارئین کرام نے دیکھ لیا کہ کسی جگہ بھی غیر مسلموں کو بزور شمشیر مسلمان کرنے کا حکم موجود نہیں ہے۔ بلکہ کسی حکم میں یہ معنی نکالنے کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے لوگوں کو اپنی حقانیت کا اقرار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسلام کے احکام جنگ میں ایسے کسی حکم کا موجود نہ ہونا بجائے خود اس الزام کی تردید کرتا ہے جو مخالفین نے اس پر لگایا ہے۔ لیکن متعصب مصنفوں اور ان کے جاہل مقلدوں نے اس معاملہ میں دنیا کو جس قدر دھوکہ دیا ہے، اور جس کثرت کے ساتھ غلط فہمیاں پھیلائی ہیں، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق بھی اسلام کے اصول و احکام کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔

قرآن مجید کی جن آیات میں احکام جنگ کی تشریح کی گئی ہے ان میں جنگ و خونریزی کی غرض و غایت بتلانے کے ساتھ اس کی ایک حد بھی مقرر کر دی گئی ہے اور اس سے آگے بڑھنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہ حد ایک، دو جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر نہایت روشن طریقہ سے کھینچی گئی ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں مسلمانوں کو قتال کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:-

قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (البقرہ - ۲۴)

ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔

یہاں حتیٰ کے لفظ نے ایک حد کھینچدی ہے کہ جب تک فتنہ باقی رہے اور ترقی دین کے راستہ میں رکاوٹیں موجود رہیں اس وقت تک جنگ کی جائے۔ اور جب یہ دونوں چیزیں دور ہو جائیں تو پھر حرب وقتال کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ چنانچہ آگے چل کر فرمایا:-

فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ ۲۴)

اگر وہ (فتنہ برپا کرنے سے) باز آجائیں تو جان لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی کے لئے سزا نہیں ہے۔

سورہ مائدہ میں اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں تبلایا ہے کہ انسانی جان کس صورت میں حرام ہے اور کس صورت میں حلال:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ - ۵)

جو کوئی کسی جان کو قتل کرے بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو، یا زمین میں فساد برپا کیا ہو، تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو صرف دو صورتوں میں قتل کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ اس نے کسی دوسرے انسان کو ناحق قتل کیا ہو۔ اور دوسرے یہ کہ اس نے زمین میں فساد پھیلایا ہو۔ ان دو صورتوں کے علاوہ کسی تیسری صورت میں اسے قتل کرنا صرف ناجائز ہی نہیں بلکہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ رب العالمین اسے تمام دنیا کے قتل کر دینے کے برابر سمجھتا ہے۔

سورہ توبہ میں جنگ وقتال کی آخری حد اداء جزیہ کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ (التوبہ - ۴)

اُن سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور اطاعت قبول کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب کفار جزیہ ادا کر کے احکام اسلامی کے اجراء پر رضامند ہو جائیں تو ان سے جنگ نہیں کی جا سکتی اور اجازت قتال کی حد ختم ہو جاتی ہے

سورۂ شوریٰ میں ایک جامع اصول بیان فرمایا ہے جو ایسے لوگوں کے خلاف جنگ وقتال کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں چھوڑتا جو بندگانِ خدا پر ظلم نہیں کرتے اور زمین میں ناحق سرکشی نہیں کرتے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۔ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (الشوریٰ-۴)

اور جو کوئی اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے بعد بدلہ لے اس پر کوئی راہ نہیں ہے۔ راہ صرف ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے دردناک سزا ہے

سورۂ ممتحنہ میں اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ مسلمانوں کی دشمنی صرف انہی کفار کے ساتھ ہے جو دینِ حق اور پیروانِ دینِ حق کے دشمن ہیں اور جو لوگ ایسے نہیں ہیں ان سے نیکی و احسان کرنے اور ان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرنے سے کوئی چیز مسلمانوں کو نہیں روکتی:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (الممتحنہ-۲)

اللہ تمہیں اس سے منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ان کے ساتھ احسان اور انصاف کرو، کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ تو تمہیں صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہیں نکالنے میں دشمنوں کی مدد کی ہے۔ انہیں جو کوئی دوست بنائے وہ ظالم ہے۔

ان احکام کا مطلب اس قدر واضح ہے کہ اس کے لئے کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی جنگ کا اصلی مقصد لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں ہے بلکہ انہیں ظلم و سرکشی اور فتنہ و فساد سے روک کر قانونِ عدل کا تابع بنا دینا ہے۔

اسلام کی تلوار ایسے لوگوں کی گردنیں کاٹنے کے لئے تو ضرور تیز ہے جو اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں، یا اللہ کی زمین میں فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں ـــ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس تیزی میں وہ حق بجانب نہیں ہے ـــ لیکن جو لوگ ظالم نہیں ہیں، جو بدکار نہیں ہیں، جو سد سبیل اللہ نہیں کرتے، جو دینِ حق کو مٹانے اور دبانے کی کوشش نہیں کرتے، جو خلق خدا کے امن و اطمینان کو غارت نہیں کرتے، وہ خواہ کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور ان کے دینی عقائد خواہ کتنے ہی باطل ہوں، اسلام ان کی جان و مال سے کچھ تعرض نہیں کرتا۔ ان کے لئے اس کی تلوار کند ہے اور اس کی نظروں میں ان کا خون حرام ہے۔

لا اکراہ فی الدین | حدودِ جنگ کی یہ تعیین بجائے خود فیصلہ کن ہے لیکن کتاب الٰہی کا کمال وضاحت یہ ہے کہ اس نے صرف دلالۃً ہی اس مسئلہ میں ہماری ہدایت کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ صراحۃً بھی ہم کو بتا دیا کہ اسلام کی تبلیغ میں جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں صاف فرمایا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ۔ ۳۴)

دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ سیدھی راہ غلط راہ سے ممتاز کرکے دکھائی جا چکی ہے، اب جو کوئی معبودانِ باطل کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لے آئے وہ ایک ایسے مضبوط رشتہ سے تعلق جوڑتا ہے جو ٹوٹنے والا نہیں ہے، اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

اس حکم کے الفاظ بالکل عام ہیں لیکن یہ جس موقع پر اترا ہے اسے پیشِ نظر رکھنے کے بعد اس کا مدعا اور بھی زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔ اہلِ یثرب کا قاعدہ تھا کہ جب ان میں سے کسی عورت کے بچے زندہ نہ رہتے تو وہ منت مانتی کہ اگر میرا کوئی بچہ زندہ رہے گا تو میں اس کو یہودی بنا دوں گی۔ مدینہ میں اس طریقہ سے انصار کے بہت سے بچے یہودی بنا دیئے گئے تھے۔ جب ۴ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر کو ان کی حرکات کی وجہ سے جلاوطن کیا تو ان میں انصار کے وہ بچے بھی شامل تھے جو یہودی مذہب کے پیرو تھے۔ انصار نے کہا کہ ہم اپنے بچوں کو نہیں چھوڑیں گے، ہم نے ان

کو اس وقت یہودی بنایا تھا جب ہم ان کے دین کو اپنے دین سے بہتر سمجھتے تھے، مگر اب جبکہ اسلام کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے اور تمام ادیان سے افضل دین ہمارے پاس ہے تو ہم اپنے بچوں کو یہودی نہ رہنے دیں گے اور انہیں اسلام پر مجبور کریں گے۔ اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ لا اکراہ فی الدین، انہیں جبراً مسلمان نہ بناؤ کیونکہ دین میں اکراہ نہیں ہے۔ اس واقعہ کو الفاظ و مضمون کے جزوی اختلاف کے ساتھ ابوداؤد اور نسائی نے اور ابن ابی حاتم اور ابن حبان نے نقل کیا ہے، اور مجاہد، سعید بن جبیر، شعبی، اور حسن بصری نے بالاتفاق کہا ہے کہ اس آیت کی شان نزول یہی ہے۔ ابن جریر نے بھی اپنی تفسیر میں اسے بیان کیا ہے اور ابن کثیر نے اسی شان نزول پر اعتماد کیا ہے۔

محمد بن اسحاق نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے ایک دوسری روایت بیان کی ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ انصار میں سے ایک شخص کے دو بیٹے نصرانی تھے، اس نے رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میرے بیٹے نصرانیت کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے، کیا میں انہیں مجبور کر سکتا ہوں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لا اکراہ فی الدین۔ یہ واقعہ اگرچہ پچھلے واقعہ سے مختلف ہے لیکن مدعا دونوں کا ایک ہی ہے، اور جیسا کہ علامہ ابن کثیر نے اپنی مشہور و مستند تفسیر میں لکھا ہے، اس شان نزول کی روشنی میں اسلام کی تعلیم صاف یہ معلوم ہوتی ہے کہ:-

لا تکرھوا احداً علی الدخول فی دین الاسلام فانہ بین واضح جلی دلائلہ و براھینہ لا یحتاج الی ان یکرہ احد علی الدخول فیہ بل من ھداہ اللہ للاسلام وشرح صدرہ و نور بصیرتہ دخل فیہ علی بینۃ ومن اعمی اللہ قلبہ و ختم علی سمعہ و بصرہ فانہ لا یفیدہ الدخول فی الدین مکرھا مقسورا

کسی شخص کو دین اسلام میں داخل ہونے پر مجبور نہ کرو کیونکہ وہ اس قدر بیّن و واضح ہے اور اس کے دلائل و براہین اس قدر روشن ہیں کہ کسی شخص کو اس میں داخل ہونے پر مجبور کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اللہ نے جس شخص کو ہدایت دی ہو اور جس کا سینہ قبول حق کے لئے کھول دیا ہو اور جس کو بصیرت کا نور عطا کیا ہو وہ دلیل واضح کی بنا پر اسے خود اختیار کرے گا۔ اور جن کی سماعت و بینائی پر مہر کر دی ہو اس کا مارے باندھے سے دین میں داخل ہونا بیکار ہے

زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں بھی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے اس قول کی تائید کی ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:

لم یجر اللہ امر الایمان علی الاجبار والقسر ولکن علی التمکن والاختیار ونحوہ قولہ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ای لو شآء لقسرھم علی الایمان ولکن لم یفعل وبنی الامر علی الاختیار

اللہ نے ایمان کے معاملہ میں جبر و زبردستی کو دخل نہیں دیا ہے بلکہ اسے تمکن و اختیار پر چھوڑ دیا ہے۔ اسی مضمون کو یہ ارشاد بھی واضح کرتا ہے کہ ولو شاء ربك لاٰمن الخ "اگر تیرا خدا چاہتا تو تمام روئے زمین کے باشندے ایمان لے آتے، کیا تو لوگوں کو مجبور کریگا کہ وہ ایمان لائیں"۔ یعنی اگر اللہ کی مصلحت یہی ہوتی کہ لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے تو وہ خود ہی لوگوں کو ایمان پر مجبور کر دیتا۔ مگر اس نے سارا معاملہ لوگوں کے اختیار پر ہی رکھا۔

امام رازی اپنی تفسیر میں اسی آیت کے متعلق ابو مسلم اصفہانی اور قفال کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

"اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دین کا معاملہ جبر اور سختی پر نہیں رکھا بلکہ تمکن اور اختیار پر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب توحید کے دلائل ایسے شافی اور قاطع طریقہ سے بیان کر دیئے کہ عذر کی گنجائش نہ رہی تو اس نے فرمایا کہ ان دلائل کی توضیح کے بعد کسی کافر کے لئے کفر پہ قائم رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے، اب بھی اگر وہ ایمان نہ لائے تو اس کو قائل کرنے کی صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ اسے بزور اس پر مجبور کیا جائے، مگر یہ اس دنیا میں جو امتحان و آزمائش کا گھر ہے جائز نہیں ہے، کیونکہ قہر و اکراہ سے دین پر مجبور کرنا امتحان کے مقصد کو باطل کر دیتا ہے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ "اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر پہ قائم رہے"۔ اور ایک دوسری جگہ فرمایا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ، "اگر تیرا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ ایمان لے آتے، کیا تو لوگوں کو مجبور کریگا

کہ مومن بن جائیں؟) - اور سورہ شعراء میں فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ - إِن نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ ، شاید تو اس رنج میں گھل گھل کر جان دے دیگا کہ وہ ایمان نہیں لاتے ، اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے ایک ایسی نشانی اتار دیں کہ اس کے آگے ان کی گردنیں جھک جائیں مگر ہم ایسا نہیں کرتے "

خود امام رازی اس قول کی تائید میں لکھتے ہیں :-

ومما يؤكد هذا القول انه تعالى قال بعد هذه الاية قد تبين الرشد من الغي ظهرت الدلائل ووضحت البينات ولم يبق بعدها الا طريق القسر والالجاء والاكراه وذلك غير جائز لانه ينافي التكليف -

اس قول کو یہ بات اور بھی زیادہ مضبوط کر دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے بعد ہی فرمایا ہدایت، گمراہی سے ممتاز کر کے دکھائی جا چکی ہے، یعنی دلیلیں ظاہر کر دی گئیں، حجتیں کھول کھول کر بیان کر دی گئیں اب صرف جبر و قہر اور اکراہ کا طریقہ باقی رہ گیا ہے، سو وہ جائز نہیں ہے کیونکہ وہ ذمہ داری کے منافی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس آیت کے مفہوم میں بہت کچھ کلام بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً بعض لوگ اس کو منسوخ کہتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ اس کا حکم صرف اہل کتاب کے لئے ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ صرف انصار کے حق میں ہے۔ اور بعض نے حد سے گذر کر کلام الٰہی کے ساتھ یہ مذاق بھی کیا ہے کہ دین میں کوئی زبردستی زبردستی نہیں ہے، یعنی تلوار کے نیچے جس کسی نے اسلام قبول کیا ہو تو یہ نہ کہو کہ اس نے بالاکراہ قبول کیا۔ لیکن یہ اقوال صرف کتابوں تک محدود ہیں، عمل کی دنیا میں انہوں نے ۱۳ سو برس کی طویل مدت کے اندر کبھی قدم نہیں رکھا، الّا ایک دو شاذ واقعات کے جن سے کوئی اصول نہیں بنتا۔ اگر حقیقت میں اسلام کی تعلیم یہی ہوتی کہ قبول اسلام پر لوگوں کو بزور شمشیر مجبور کیا جا سکتا ہے تو گذشتہ ۱۳ صدیوں میں کم از کم ایک ہی مرتبہ ملت اسلامیہ اس تعلیم کے مطابق لوگوں کو جبراً مسلمان بناتی۔ لیکن صرف یہی نہیں کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا بلکہ خلافت راشدہ کے عہد مبارک میں بھی، جبکہ اسلام اپنی اصلی شان میں جلوہ گر تھا، اور خود سرکار رسالت مآبؐ کے مقدس عہد حکومت میں بھی، جو قرآن اور اس کی تعلیم

کی عملی تفسیر تھا، کبھی اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ آنحضرت صلعم کو بارہا کفار پر قدرت حاصل ہوئی اور ان کی بڑی بڑی جماعتیں آپ کے قبضہ میں آئیں، لیکن آپ نے ان کی گردنوں میں زبردستی اسلام کا پھندا کبھی نہیں ڈالا بلکہ اپنی پاک تعلیم سے صرف ان کے دلوں کی گندگی ہی دور کرنے پر قناعت کی۔ دعوتِ اسلام کے لئے جو سرایا آپ بھیجتے اُن کو تاکید فرمایا کرتے کہ لوگوں پر سختی نہ کرنا۔ ابوموسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو یمن بھیجا تو فرمایا یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا (نرمی کرنا سختی نہ کرنا، خوش کرنا نفرت نہ دلانا)۔ مکہ معظمہ میں جب فاتحانہ داخلہ ہوا تو آپ نے ان کافروں کو جو آپ کے خون کے پیاسے تھے لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ کہکر آزاد چھوڑ دیا اور کسی کو قبول اسلام پر مجبور نہ کیا۔ (ان طلقاء میں سے دو ہزار آدمی آپ کے ساتھ غزوۂ حنین میں اپنی مرضی سے شریک ہوئے۔) نواح مکہ میں جو جماعتیں دعوت اسلام کے لئے بھیجیں انہیں آپ نے قتال سے منع فرما دیا، چنانچہ علامہ ابن جریر لکھتے ہیں کہ بعث النبی صلعم فیما حول المکۃ السرایا تدعوھم الی اللہ عز وجل ولم یامرھم بالقتال۔ قبیلۂ بنی جذیمہ میں حضرت خالدؓ نے جب رسول اکرمؐ کی اجازت کے بغیر کشت وخون کیا تو آپ نے علانیہ اظہار برأت کیا اور اس قبیلہ کے کتّوں تک کی دیت ادا کی۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ ورنہ رسولؐ اکرم کی ساری زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ آپ نے کسی شخص کو قتل کی دھمکی دیکر قبول اسلام پر مجبور کیا ہو، اور یہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ لا اکراہ فی الدین کے وہی معنی ہیں جو ظاہر الفاظ سے بصراحت معلوم ہوتے ہیں، ورنہ قرآن مجید کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس پر عمل کرکے آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں ایک مثال قائم نہ کردی ہو۔

اس سلسلہ میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جو امام احمدؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے روایت کی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ایک شخص سے فرمایا اسلم (اسلام قبول کرلے)۔ اس نے عرض کی کہ انی اجدنی کارھا (میں اپنے اندر کچھ کراہت محسوس کرتا ہوں)۔ آپ نے فرمایا وان کنت کارھا فان اللہ سیرزقک حسن النیۃ والاخلاص (اُس کراہت کے باوجود قبول کرلے پھر اللہ تجھے حسن نیت اور اخلاص بھی بخش دے گا) تعجب ہے کہ

اس حدیث کو اکراہ کے ثبوت میں کیونکر پیش کیا جا سکتا ہے، حالانکہ اس میں مُکرَہًا کا لفظ نہیں بلکہ کارِھًا کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اس سے وہ کراہت نفس مراد لی گئی ہے جو پوری آمادگی نہ ہونے کی ہم معنی ہے۔ اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ حضور نے اس شخص کو زبردستی اسلام کا حلقہ بگوش بنایا؟

قائلین نسخ کے پاس اپنے دعوے کے لئے اس کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے کہ وہ اس آیت کو احکام قتال کی آیات سے تطبیق نہیں دے سکتے، ورنہ کوئی صحیح روایت اس کے نسخ کی تائید نہیں کرتی۔ قطع نظر اس بحث کے کہ کسی آیت قرآنی کے نسخ کا دعویٰ کرنے کے لئے کن دلائل کی ضرورت ہے ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس آیت کا نسخ عہد رسالت کے بعد کی ایجاد ہے۔ عہد رسالت کے اکابر صحابہؓ اس سے واقف نہ تھے۔ اگر اس زمانہ میں بھی لوگوں کو اس کا علم ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے احکام شریعت کے نکتہ داں اپنے مملوک، اسبق کو قبول اسلام سے انکار کرنے کی آزادی ہرگز نہ دیتے۔ ابن ابی حاتم کی یہ روایت، دعوائے نسخ کے حق میں فیصلہ کن ہے۔

عن اسبق قال کنت فی دینہم مملوکا نصرانیا لعمر ابن الخطاب فکان یعرض علیّ الاسلام فآبی فیقول لا اکراہ فی الدین ویقول یا اسبق لو اسلمت لاستعنابک علی بعض امور المسلمین۔

اسبق نے بیان کیا: میں حضرت عمر ابن خطابؓ کا نصرانی غلام تھا۔ آپ مجھے اسلام کی دعوت دیتے تھے مگر میں انکار کر دیتا تھا۔ اس پر آپ فرماتے کہ لا اکراہ فی الدین، پھر آپ کہتے کہ اے اسبق اگر تو اسلام قبول کر لیتا تو ہم تجھ سے مسلمانوں کے بعض کاموں میں مدد لیتے۔

ا۔ ابن جریر طبری کا قول اس معاملہ میں امام رازی اور ابن کثیر وغیرہ سے ذرا مختلف ہے، مگر وہ تمام آثار و اقوال سلف کو نقل کرنے کے بعد نسخ کے بارے میں یہ فیصلہ دیتے ہیں:-

"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لا اکراہ فی الدین کے معنی یہ ہیں کہ جن سے جزیہ قبول کرنا جائز ہے وہ اگر جزیہ ادا کریں اور حکومت اسلام کی اطاعت پر راضی ہو جائیں تو اس کو ایمان

لانے پر مجبور نہ کیا جائیگا۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ آیت اجازت جنگ سے منسوخ الحکم ہوگئی ہے اس کا قول بے معنی ہے۔ اگر کہنے والا یہ کہے کہ پھر ابن عباسؓ نے جو یہ روایت کی ہے کہ "یہ آیت ان انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے اپنی اولاد کو اسلام پر مجبور کرنا چاہا تھا" اس کے متعلق تم کیا کہو گے؟ تو ہم کہیں گے کہ اس روایت کی صحت سے کسی کو انکار نہیں۔ یقیناً یہ آیت ایک خاص معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔ مگر اس کا حکم ان تمام صورتوں میں عام ہے جن کی نوعیت اس کی شان نزول سے ملتی جلتی ہو۔ ابن عباسؓ وغیرہ کی روایت کے مطابق جن لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے انہوں نے اسلام کا حکم جاری ہونے سے پہلے اہل توراۃ کا دین اختیار کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دین اسلام پر مجبور کرنے سے منع فرمایا۔ مگر ممانعت ایسے الفاظ میں فرمائی جن کا حکم ان تمام ادیان پر عادی ہے جن کے پیروؤں سے جزیہ قبول کیا جا سکتا ہے"۔

جو لوگ اس حکم کو اہل کتاب کے لئے مخصوص کرتے ہیں ان کے پاس بھی اپنے دعوے کے لئے کتاب و سنت کی تصریحات میں سے کوئی دلیل نہیں ہے۔ لا اکراہ کا حکم بالکل عام ہے۔ محض شان نزول کی خصوصیت اس کو خاص نہیں کرتی۔ ورنہ قرآن مجید کا کوئی حکم بھی ایسا نہ ملے گا جس کی کوئی خاص شان نزول نہ ہو اور پھر ہر حکم کو اسی طرح خاص کرنا پڑے گا۔ رہا یہ خیال کہ حکم جزیہ کی آیت نے اسے خاص کیا ہے سو اس کے متعلق یہ امر قابل لحاظ ہے کہ خود آیت جزیہ کے حکم کو بھی اوتوا الکتاب کی تخصیص کے باوجود آئمہ مجتہدین نے تمام کفار و مشرکین کے لئے عام قرار دیا ہے۔ اگرچہ جمہور احناف اس عام حکم سے مشرکین عرب کو جن کا وجود آیت جزیہ کے اترنے سے پہلے ہی ناپید ہو چکا تھا، مستثنیٰ کرتے ہیں، لیکن امام مالکؒ، ابو یوسفؒ اور امام اوزاعیؒ وغیرہ نے عرب کے صنم پرستوں تک کو اس دائرۂ رحمت میں شامل کر دیا ہے، اور اسی خیال کی بنا پر صدر اول سے لیکر اب تک مسلمانوں کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ انہوں نے کفار کی تمام اقسام سے جزیہ قبول کر کے انہیں خدا اور رسولؐ کے ذمہ میں داخل کر لیا ہے۔

پھر جب خود آیت جزیہ کا حکم الفاظ کی تخصیص کے باوجود عام قرار دیا گیا ہے تو یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دوسری آیت کو، جس میں الفاظ کی تعمیم بھی موجود ہے، بغیر کسی شرعی دلیل کے خاص کر دے

تمام اقسام کفر و سے جزیہ قبول کرنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ کسی شخص پر، خواہ وہ اہل کتاب سے ہو یا نہ ہو، قبول اسلام کے لئے جبر و اکراہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اعطائے جزیہ کے بعد عدم اکراہ فی الدین تو شرعاً ثابت ہے۔

دعوت و تبلیغ کا اصل الاصول حقیقت یہ ہے کہ آیتِ قتال یا آیتِ جزیہ کا مضمون لا اکراہ فی الدین کی مذہبی آزادی سے متعارض نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے، بلکہ وہ صرف اس آزادی کو جو ابتداءً بلا شرط عطا کی گئی تھی ایک ضابطہ اور ایک اصول کے تحت لے آتا ہے۔ اول اول جبکہ مسلمان ضعیف تھے اور ان میں وہ خدمت انجام دینے کی قوت پیدا نہیں ہوئی تھی جو امۃ وسطا اور خیر امۃ ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ ان سے لینا چاہتا تھا، مسلمان صرف لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ہی نہیں کہتے تھے بلکہ لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ بھی کہتے تھے۔ ان میں اتنی قوت نہ تھی کہ دنیا کو مفاسد اخلاقی سے بزور پاک کر دیں اور فتنہ و فساد کا نام و نشان مٹا دیں، اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں ایک ہی طریقہ پر ہوتے رہے۔ یعنی جس طرح رسول کریم اور آپ کے پیرو لوگوں کو توحید کے اقرار، رسالت کے اقرار، یوم آخرت کے اعتقاد، اور نماز کی اقامت کی دعوت دیتے تھے، اسی طرح زنا، چوری، قتلِ اولاد، قولِ زور، قطع طریق اور صد عن سبیل اللہ وغیرہ سے بھی صرف نفرت دلانے اور زبان سے روکنے ہی پر اکتفا کرتے تھے۔ لیکن جب مسلمان کمزوری و بے بسی کی حالت سے نکل گئے اور ان میں اپنے مشن کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت آ گئی تو مذہبی آزادی کا یہ اصول تو اپنی جگہ بدستور قائم رہا کہ کسی شخص کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جائے گا، لیکن یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ جہاں ہمارا بس چلے گا وہاں لوگوں کو بدکاری و شرارت، فتنہ و فساد، اور اعمال منکرہ کے ارتکاب کی آزادی ہرگز نہ دی جائے گی۔ پس اس وقت امر بالمعروف کا دائرہ نہی عن المنکر سے الگ ہو گیا۔ نہی عن المنکر میں تو دعوت و تبلیغ کے ساتھ تلوار بھی شامل ہو گئی اور اس نے تمام دنیا کو فتنہ و فساد سے پاک کر دینے کا بیڑا اٹھا لیا خواہ دنیا اس پر راضی ہو یا نہ ہو، لیکن امر بالمعروف کے دائرہ میں وہی لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ اور مَا اَنْتَ عَلَیْہِمْ بِجَبَّارٍ کا اصول برقرار رہا۔

ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں کہ اسلام کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت میں وہ دنیا کے لئے اللہ

کا قانون ہے۔ دوسری حیثیت میں وہ نیکی و تقویٰ کی جانب ایک دعوت اور پکار ہے۔ پہلی حیثیت کا منشاء دنیا میں امن قائم کرنا، اس کو ظالم و سرکش انسانوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچانا، اور دنیا والوں کو اخلاق و انسانیت کے حدود کا پابند بنانا ہے جس کے لئے قوت و طاقت کے استعمال کی ضرورت مسلّم ہے۔ لیکن دوسری حیثیت میں وہ قلوب کا تزکیہ کرنے والا، ارواح کو پاک صاف کرنے والا، حیوانی کثافتوں کو دور کرکے بنی آدم کو اعلیٰ انسان بنانے والا ہے جس کے لئے تلوار کی دھار نہیں بلکہ ہدایت کا نور، دست و پا کا انقیاد نہیں بلکہ دلوں کا جھکاؤ، اور جسموں کی پابندی نہیں بلکہ روحوں کی اسیری درکار ہے۔ اگر کوئی شخص سر پر تلوار چمکتی ہوئی دیکھکر لا الٰہ الا اللہ کہدے، مگر اس کا دل بدستور ماسوی اللہ کا بتکدہ و بنا رہے تو دل کی تصدیق کے بغیر یہ زبان کا اقرار کسی کام کا نہیں۔ اسلام کے لئے اس کی حلقہ بگوشی قطعاً بیکار ہے۔ دین حق تو خیر بڑی چیز ہے، دنیا کی معمولی تحریکیں بھی، جن کا منشا محض دنیوی مقاصد کا حصول ہوتا ہے، اپنی کامیابی کے لئے ایسے پیرووں پر کبھی بھروسہ نہیں کرسکتیں جو صرف زبان سے ان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوں مگر دل سے ان کے مؤید نہ ہوں۔ بددل، غیر مخلص اور جھوٹے پیرووں کو لیکر آج تک کسی تحریک نے کامیابی کا منہ نہیں دیکھا ہے، اور یقیناً ایسے گوشت پوست کے لوتھڑوں کو لیکر، جو صداقت کی روح سے بالکل خالی ہوں، کوئی شخص دنیا کے میدان مسابقت میں قدم رکھنے کی جراءت اور فوز و فلاح تک پہنچنے کی امید نہیں کرسکتا۔ پھر بھلا غور کرو کہ جس دین کے پیش نظر دنیا کی کامیابی نہیں بلکہ آخرت کی فوز و فلاح ہو، جو دین نیت اور اعتقاد کو عمل کی بنیاد قرار دیتا ہو، جو دین خلوص و صداقت کی روح کے بغیر عمل کی کوئی قیمت نہ سمجھتا ہو، جو دین تمام عالم البشری کی اصلاح کی عظیم الشان تحریک لے کر اٹھا ہو اور جس کی تحریک نے دنیا میں وہ کامیابی حاصل کی ہو جو آج تک کسی تحریک کو حاصل نہیں ہوئی، کیا ممکن تھا کہ وہ اپنی دعوت کا کام تلوار کی گونگی زبان کے سپرد کرتا؟ کیا یہ ہوسکتا تھا کہ وہ خلوص و صداقت کو چھوڑ کر مجبورانہ اطاعت اور بیچارگی کے اقرار پر قناعت کرتا؟ کیا وہ ایسے پیرو حاصل کرکے مطمئن ہوسکتا تھا جن کے دل خدا کے خوف سے خالی مگر تلوار کی ہیبت سے معمور ہوں؟ کیا ایسے بزدل اور بودے آدمیوں کو وہ کوئی

دنیا دے سکتا تھا جو محض جان بچانے کے لئے کسی عقیدے کو جس کی صداقت کے وہ قائل نہیں قبول کر لیں؟ اور اگر وہ ایسا ہوتا تو کیا اسے وہ کامیابی حاصل ہو سکتی تھی جو اس نے فی الحقیقت حاصل کی؟

انسان کی فطرت کو خود اس کے فاطر سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ اس نے اپنے حکیمانہ کلام میں جگہ جگہ اس مضمون کو نہایت بلیغ انداز سے سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اپنے رسول کو طریقہ طریقہ سے بتایا ہے کہ اقلیم دل کو فتح کرنے کا صحیح اور موثر طریقہ کونسا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ (حم السجدہ - ۵)

اے پیغمبر! نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں، تو بدی کو اس طریقہ سے دور کر جو بہت اچھا ہے پھر دیکھ کہ جس کے ساتھ تیری دشمنی ہے وہ تیرا گرم جوش دوست بن جائیگا

دوسری جگہ فرمایا:۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران - ۱۷)

یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تو ان کے لئے نرم دل بنایا گیا ہے۔ ورنہ اگر تو درشت کلام اور سنگدل ہوتا تو وہ تجھے چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔

ایک اور جگہ دعوت اسلام کا طریقہ یہ بتایا کہ:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل - ۱۹)

انہیں اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ وعظ و پند کے ساتھ بلا اور بحث ایسے طریقہ پر کر جو بہترین ہو۔

اس نرمی و رفق اور حسن کلام کی یہاں تک تاکید کی کہ کفار کے معبودوں اور پیشواؤں کو برا کہنے سے بھی روک دیا۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام - ۱۳)

تم ان کے معبودان باطل کو جنہیں یہ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہیں، گالیاں نہ دو ورنہ وہ جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دیں گے۔

ہدایت وضلالت کا راز | پھر مختلف مواقع پر یہ باریک نکتہ سمجھایا ہے کہ اگر خدا چاہے تو وہ اپنے بندوں کو ایمان لانے پر مجبور کر سکتا ہے، لیکن اُسے ایسا مجبورانہ ایمان درکار نہیں ہے جو طبعی خواہشات و جذبات کی طرح انسان کی جبلّت میں داخل ہو۔ ایسی ایمان لانے والی اور اطاعت وعبادت کرنے والی مخلوق تو اس کے پاس پہلے سے موجود تھی جس کی فطرت ہی یہ ہے کہ یفعلون ما یؤمرون۔ مگر وہ معبودیت کا اصلی لطف اُٹھانے کے لئے ایسی مخلوق چاہتا تھا جسے کوئی قوت اُس کی معرفت پر، اس کی اطاعت وبندگی پر، اور اسے ماننے پر مجبور کرنے والی نہ ہو، بلکہ وہ خود اپنی عقل سے اس کو پہچانے، خود اپنی جستجو سے اس کو پالے، خود اپنی آزاد خواہش سے اس کی بندگی وعبادت کرے، اور اس کے احکام کی اور مشیت کی خلاف ورزی کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرے۔ اسی مقصد کے لئے اللہ نے انسان کو پیدا کیا، ایک اجل مسمّٰی، ایک مدت مقررہ تک۔ اسے عقل کی روشنی میں آزاد چھوڑ دیا۔ اس کو اختیار دیا کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ، جو چاہے ایمان لائے، اور جو چاہے کفر کرے، اس کی طرف پے درپے ہادی ورہنما بھیجے تاکہ خود اس کے ہم جنس اسے حق کا راستہ گمراہی کے راستہ سے ممتاز کر کے دکھا دیں اور اس کے واسطے اس عذر کی گنجائش باقی نہ رہے کہ ہم بالکل تاریکی میں تھے، اور پھر اس کے واسطے ایک یوم حساب مقرر کیا تاکہ اس دن اُن لوگوں پر بے اندازہ الطاف وعنایات کی بارش کرے جنہوں نے اپنی عقل سے اس کو پہچانا اور اپنی مرضی سے اس کی بتلائی ہوئی سیدھی راہ کو اختیار کیا، اور کسی مجبوری سے نہیں بلکہ اپنا فرض سمجھ کر، اپنی بندگی کا مقتضا جان کر، اس کی اطاعت کی، اور اُن لوگوں کو دردناک عذاب دے جنہوں نے کھلی ہوئی نشانیوں کے باوجود گمراہی کو اختیار کیا، اس کے بھیجے ہوئے پیغام کو قبول کرنے سے انکار کیا اور اپنے فریضۂ عبودیت سے منہ موڑ کر اس کے احکام کی نافرمانی کی۔

دیکھو اس راز حقیقت کو کیسے حکیمانہ انداز سے کھولا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً	اگر تیرا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت
وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ	بنا دیتا مگر وہ اختلاف کرتے ہی رہیں گے، سوائے
وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ	ان لوگوں کے جن پر اللہ نے رحم کیا ہے، اور اسی کے

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (ہود - ۱۰)

لئے اس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اس طرح تیرے رب کی وہ بات پوری ہوگئی جو اس نے کہی تھی کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے بھر دونگا۔

دوسرے مقامات پر بھی اس راز کی پردہ دری مختلف طریقوں سے کی ہے۔ چنانچہ کہیں فرمایا:۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا (یونس - ۱۰)

اگر خدا چاہتا تو زمین کے جتنے رہنے والے ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔

کہیں فرمایا:۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا (انعام - ۱۳)

اگر خدا چاہتا تو وہ ہرگز شرک نہ کرتے۔

کہیں فرمایا:۔

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (انعام - ۱)

اگر ہم چاہتے تو ان پر آسمان سے ایسی نشانی اتارتے جسے دیکھ کر ان کی گردنیں مجبوراً جھک جاتیں،

کہیں فرمایا:۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (یونس - ۱۰)

کوئی شخص اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا، اور اللہ (عدم اذن) کی ناپاکی انہی لوگوں پر ڈالتا ہے جو اپنی عقل سے کام نہیں لیتے،

کہیں فرمایا:۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (القصص - ۶)

تو جسے چاہے ہدایت نہیں کر سکتا بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کون ہدایت قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔

پس جبکہ رب قدیر و خالق کائنات خود نہیں چاہتا کہ اپنے بندوں کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری پر مجبور کرے، بلکہ وہ ان کی آزادانہ بندگی و غلامی کو زیادہ محبوب رکھتا ہے، تو پھر کسی بندے کو یہ

حق کب پہنچتا ہے کہ اپنے جیسے بندوں پر اس کی بندگی و اطاعت کے لئے جبر کر کے مجبورانہ ایمان کا بے مزہ اور بے قیمت تحفہ اس کے حضور پیش کرائے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داعی اسلام علیہ السلام کو بار بار یہ سمجھایا ہے کہ دین میں جبر و اکراہ کا کام نہیں ہے، اور آپ کے لئے صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا کافی ہے:-

وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ (ق-۴)	تو ان کو (قبول ہدایت پر) مجبور کرنے والا نہیں ہے جو کوئی اللہ کی وعید سے ڈرنے والا ہو اس کو قرآن سے نصیحت کئے جا۔
فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیہ)	تو نصیحت کئے جا کیونکہ تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، تو اُن پر داروغہ نہیں ہے۔
أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (یونس-۱۰)	کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں (حالانکہ تیرا کام مجبور کرنا نہیں ہے۔
لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (البقرہ-۳۷)	اُن کی ہدایت تیرے ذمہ نہیں ہے۔ بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔
إِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (الرعد-۶)	تیرے اوپر پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ہے اور حساب لینے والے ہم خود ہیں۔

اشاعت اسلام میں تلوار کا حصہ۔ اس بحث سے یہ حقیقت تو اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اسلام اپنی صداقت پر ایمان لانے کے لئے کسی کو مجبور نہیں کرتا، بلکہ دلائل و براہین کی روشنی میں ہدایت کی راہ کو ضلالت کی راہ سے ممتاز کر کے دکھا دینے کے بعد ہر شخص کو اختیار دیتا ہے کہ چاہے غلط راستہ پر چل کر نامرادی کے گڑھے میں جا گرے، اور چاہے سیدھے راستہ پر لگ کر حقیقی اور دائمی فلاح و کامرانی سے بہرہ اندوز ہو۔ لیکن اس سلسلۂ کلام کو ختم کرنے سے پہلے ہم یہ بتلا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت کو تلوار سے ایک گونہ تعلق ضرور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک

تبلیغ دین الٰہی کی حد ہے، اس میں تلوار کا کوئی کام نہیں ہے۔ لیکن اس تبلیغ کے ساتھ کچھ چیزیں اور بھی ہیں جن کے تعاون سے دنیا میں اسلام کی اشاعت ہوتی ہے، اور وہ یقیناً تلوار کی اعانت سے بے نیاز نہیں ہیں۔

عموماً ہم دیکھتے ہیں کہ جب انسان بے قیدی کی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنی خواہشات کی پیروی میں کسی اخلاقی ضابطہ کا پابند نہیں ہوتا، تو اسے اپنی اس پُر الم مگر بظاہر پُر لطف زندگی میں ایک مزا آنے لگتا ہے اور اس مزے کو چھوڑنے کے لئے وہ برضا و رغبت آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ وعظ و نصیحت اور دلیل و برہان کی قوت سے اس کو اخلاقی حدود کی پابندی، حلال و حرام کی تمیز، اور نیک و بد کے امتیاز کی خواہ کتنی ہی تلقین کی جائے، وہ بہر حال سیدھا ہونے پر راضی نہیں ہوتا۔ اول تو اس کی عقل و وجدان پر مسلسل بدکاریاں کرتے رہنے کے باعث ایسا پردہ پڑ جاتا ہے کہ اس قسم کی اخلاقی تعلیم کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اور اگر اس کے ضمیر میں کچھ زندگی باقی بھی ہوتی ہے تو وہ اس کے نفس پر اتنی حاوی نہیں ہوتی کہ اس کے اثر سے وہ حق کو محض اس بنا پر کہ وہ حق ہے، بطوع و رغبت قبول کر لے، اور ان لذتوں سے دست بردار ہو جائے جو بے قیدی کی زندگی میں اسے حاصل ہوتی ہیں۔ بخلاف اس کے جب کسی اخلاقی تعلیم کی پشت پر وعظ و تذکیر کے ساتھ سیاست و تعزیر بھی ہوتی ہے اور بد کو بد کر کے دکھا دینے کے ساتھ بدی کو روک دینے والی قوت سے بھی کام لیا جاتا ہے، تو رفتہ رفتہ طبیعتوں میں نیک بننے کی صلاحیت پیدا ہونے لگتی ہے، حدود کی پابندی اور برے بھلے کی تمیز آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہے، اور آخر کار وہی انسان اس نیکی کی تعلیم کو دل میں جگہ دینے لگتا ہے جو بے قیدی کی زندگی میں اس کو سننے کا بھی روادار نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے لئے کسی ایسی سوسائٹی کا تصور کیجئے جس میں کوئی قانون نافذ العمل نہیں ہے، اس کا ہر فرد اخلاقی حدود کی پابندی سے مبرا ہے، جس پر بس چلتا ہے اسے لوٹ لیتا ہے، جس سے عداوت ہوتی ہے اسے مار ڈالتا ہے، جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اسے چرا کر یا چھین کر حاصل کر لیتا ہے، جو خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے اسے جس طریقہ سے چاہتا ہے پورا کر لیتا ہے، حلت و حرمت کی

اسے تمیز نہیں ہوتی، جائز و ناجائز کے فرق سے وہ ناواقف ہوتا ہے، حقوق و فرائض کے تخیّل سے اس کا دماغ خالی ہوتا ہے، اس کے سامنے بس اپنی خواہشات ہوتی ہیں اور انہیں پورا کرنے کے امکانی وسائل ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر کوئی اخلاقی مصلح کھڑا ہو اور لوگوں کو حلال و حرام کی تمیز سکھلائے، جائز و ناجائز کی حد بندی کرے، مقاصد میں حسن و قبح اور طریقوں میں نیک و بد کا فرق قائم کرے، چوری سے، حرام خوری سے، خون ناحق سے، زنا اور فواحش سے روکے، افراد کے لئے حقوق اور فرائض متعین کرے، اور ایک مکمل ضابطہ قوانین اخلاق ترتیب کرکے رکھدے، مگر اس قانون کی تنفیذ کے لئے اس کے پاس وعظ و پند اور دلیل و حجت کے سوا کوئی قوت نہ ہو، تو کیا یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ جماعت اپنی آزادی پر ان قیود کو بخوشی قبول کرے گی؟ کیا وہ اس کے منطق دلائل سے مغلوب ہوکر برضا و رغبت قانون کی پابند بن جائیگی؟ کیا وہ اس کی پے در پے نصیحتوں سے اتنی متاثر ہوگی کہ خود بخود اُن لذتوں سے کنارہ کش ہوجائے جو اس کو اس بے قیدی کی زندگی میں حاصل تھیں؟ ہر شخص جو انسانی فطرت کا راز داں ہے اس سوال کا جواب حرفِ نفی میں دیگا، کیونکہ دنیا میں ایسے پاک نفسوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے جو نیکی کو محض نیکی سمجھ کر اختیار کرتے ہیں، اور بدی کو صرف اس لئے چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کا بد ہونا انہیں معلوم ہوچکا ہے۔

لیکن اگر یہی سوال اس صورت میں کیا جائے جب کہ وہ معلم محض اخلاقی واعظ ہی نہ ہو بلکہ حاکم اور صاحب امر بھی ہو اور ملک میں ایک باضابطہ حکومت قائم کردے جس کی قوت سے وہ تمام برائیاں یک لخت دور ہوجائیں جو حیوانی آزادی سے پیدا ہوتی ہیں، تو یقیناً یہ نفی اثبات سے بدل جائے گی اور ہر شخص اس اصلاحی تعلیم کی کامیابی کا فتویٰ لگادیگا۔

اسلام کی اشاعت کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ اگر اسلام صرف چند عقائد کا مجموعہ ہوتا اور اللہ کو ایک کہنے، رسالت کو برحق ماننے، یوم آخر اور ملائکہ پر ایمان لانے کے سوا انسان سے وہ کوئی اور مطالبہ نہ کرتا، تو شاید شیطانی طاقتوں سے اس کو کچھ زیادہ جھگڑنے کی نوبت نہ آتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف ایک عقیدہ ہی نہیں بلکہ ایک قانون بھی ہے، ایسا قانون جو انسان کی

عملی زندگی کو اوامر و نواہی کی بندشوں میں کسنا چاہتا ہے، اس لئے اس کا کام صرف پند و موعظت ہی سے نہیں چل سکتا بلکہ اسے نوکِ زبان کے ساتھ نوکِ سنان سے بھی کام لینا پڑتا ہے اس کے عقائد سے سرکش انسان کو اتنا بعد نہیں ہے جتنا اس کے قوانین کی پابندی سے انکار ہے۔ وہ چوری کرنا چاہتا ہے اور اسلام اسے ہاتھ کاٹنے کی دھمکی دیتا ہے۔ وہ زنا کرنا چاہتا ہے اور اسلام اسے کوڑوں کی مار کا حکم سناتا ہے۔ وہ سود کھانا چاہتا ہے اور اسلام اس کو فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ کا چیلنج دیتا ہے۔ وہ حرام و حلال کی قیود سے نکل کر نفس کے مطالبات پورے کرنا چاہتا ہے اور اسلام ان قیود سے باہر نفس کے کسی حکم کی پیروی نہیں کرنے دیتا۔ اس لئے نفس پرست انسان کی طبیعت اس سے متنفر ہوتی ہے۔ اور اس کے آئینۂ قلب پر گناہ گاری کا ایسا زنگ چڑھ جاتا ہے کہ اس میں صداقتِ اسلام کے نور کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۳ برس تک عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، وعظ و تلقین کا جو مؤثر سے مؤثر انداز ہو سکتا تھا اسے اختیار کیا، مضبوط دلائل دیئے، واضح حجتیں پیش کیں، فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت سے دلوں کو گرمایا، اللہ کی جانب سے محیر العقول معجزے دکھلائے، اپنے اخلاق اور اپنی پاک زندگی سے نیکی کا بہترین نمونہ پیش کیا، اور کوئی ذریعہ ایسا نہ چھوڑا جو حق کے اظہار و اثبات کے لئے مفید ہو سکتا تھا، لیکن آپ کی قوم نے آفتاب کی طرح آپ کی صداقت کے روشن ہو جانے کے باوجود آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حق ان کے سامنے خوب ظاہر ہو چکا تھا۔ انہوں نے برأی العین دیکھ لیا تھا کہ جس راہ کی طرف ان کا ہادی انہیں بلا رہا ہے وہ سیدھی راہ ہے۔ اس کے باوجود صرف یہ چیز انہیں اس راہ کو اختیار کرنے سے روک رہی تھی کہ ان لذتوں کو چھوڑنا انہیں ناگوار تھا جو کافرانہ بے قیدی کی زندگی میں انہیں حاصل تھیں۔ لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیِ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی اور اَلَا کُلُّ مَأْثَرَۃٍ اَوْ دَمٍ اَوْ مَالٍ یُدَّعٰی فَھُوَ تَحْتَ قَدَمَیَّ ہَاتَیْنِ[1] کا اعلان کر کے تمام

[1] یعنی ہر موروثی امتیاز، ہر خون کا دعویٰ جس کی بنا پر ایک قبیلہ یا خاندان دوسرے قبیلے یا [illegible]

موروثی امتیازات کو ختم کر دیا، عزت و اقتدار کے تمام رسمی بتوں کو توڑ دیا، ملک میں ایک منظم اور منضبط حکومت قائم کر دی، اخلاقی قوانین کو بزور نافذ کر کے اس بدکاری و گناہگاری کی آزادی کو سلب کر لیا جس کی لذتیں ان کو مدہوش کئے ہوئے تھیں، اور وہ پُرامن فضا پیدا کر دی جو اخلاقی فضائل اور انسانی محاسن کے نشوونما کے لئے ہمیشہ ضروری ہوا کرتی ہے، تو دلوں سے رفتہ رفتہ بدی و شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا، طبیعتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے، روحوں کی کثافتیں دور ہو گئیں، اور صرف یہی نہیں کہ آنکھوں سے پردہ ہٹ کر حق کا نور صاف عیاں ہو گیا، بلکہ گردنوں میں وہ سختی اور سروں میں وہ نخوت بھی باقی نہیں رہی جو ظہور حق کے بعد انسان کو اس کے آگے جھکنے سے باز رکھتی ہے۔

عرب کی طرح دوسرے ممالک نے بھی اسلام کو اس سرعت سے قبول کیا کہ ایک صدی کے اندر چوتھائی دنیا مسلمان ہو گئی، تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام کی تلوار نے ان پردوں کو چاک کر دیا جو دلوں پر پڑے ہوئے تھے، اس فضا کو صاف کر دیا جس کے اندر کوئی اخلاقی تعلیم نہیں پنپ سکتی، ان حکومتوں کے تختے الٹ دیئے جو حق کی دشمن اور باطل کی پشت پناہ تھیں، ان بدکاریوں کا استیصال کر دیا جو دلوں کو نیکی و پرہیزگاری سے دور رکھتی ہیں، ان عادلانہ اخلاقی قوانین کو نافذ کیا جو آدمی کو حیوانیت کے درجہ سے نکال کر انسان بنا دیتے ہیں، اور پھر اسلام کو عملی پیکر میں پیش کر کے دنیا پر ثابت کر دیا کہ انسان کی اخلاقی و مادی اور روحانی ترقی کے لئے اس سے بہتر کوئی اور دستورِ عمل نہیں ہو سکتا۔ پس جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان بناتا ہے، اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تبلیغ اور تلوار دونوں کا حصہ ہے۔ جس طرح ہر تہذیب کے قیام میں ہوتا ہے۔ تبلیغ کا کام تخم ریزی ہے اور تلوار کا کام

بقیہ حاشیہ صفحہ سابق: خاندان سے انتقام لینے کا مدعی ہو) اور ہر مال کا دعویٰ [illegible]
پر قدم بدا میرے ان قدموں کے نیچے ہے (یعنی دین کے لئے سر اٹھانے کا اب کوئی موقع نہیں) ۱۲

قلبہ رانی۔ پہلے تلوار زمین کو نرم کرتی ہے تاکہ اس میں بیج کو پرورش کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے، پھر تبلیغ بیج ڈال کر آبپاشی کرتی ہے تاکہ وہ پھل حاصل ہو جو اس باغبانی کا مقصود حقیقی ہے۔ ہم کو دنیا کی پوری تاریخ میں کسی ایسی تہذیب کا نشان نہیں ملتا جس کے قیام میں ان دونوں عناصر کا حصہ نہ ہو۔ تہذیب کی کسی خاص شکل کا کیا ذکر ہے، خود تہذیب کا قیام ہی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک قلبہ رانی اور تخم پاشی کے یہ دونوں عمل اپنا اپنا حصہ ادا نہ کریں۔ کوئی شخص جو انسانی فطرت کا رمز شناس ہے اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہے کہ جماعتوں کی ذہنی و اخلاقی اصلاح کے سلسلہ میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب کہ قلب و روح کو خطاب کرنے سے پہلے جسم و جان کو خطاب کرنا پڑتا ہے۔

باب پنجم

اسلامی قوانین صلح و جنگ

گذشتہ ابواب میں جو کچھ بیان کیا گیا اس کا تعلق جنگ کے محض اخلاقی پہلو سے تھا۔ اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ جنگ کے عملی پہلو میں اسلام نے کس قدر عظیم الشان اصلاح کی ہے۔

ہر کام کے حسن و قبح کا فیصلہ دو چیزوں پر کیا جاتا ہے۔ ایک مقصد، دوسرے طریق حصول مقصد۔ اگر نفس مقصد مکروہ ہو تو خواہ اس کو کتنے ہی شریفانہ طریقہ سے حاصل کیا جائے وہ بہر حال مکروہ ہی رہیگا۔ اور اگر مقصد فی نفسہ نہایت اشرف و اعلیٰ ہو لیکن اسے حاصل کرنے کے طریقے پایۂ شرافت سے گرے ہوئے ہوں، تو ان سے خود مقصد کی شرافت بھی داغدار ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کا مقصد یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت اور بیوہ عورتوں کی پرورش ہے، مگر اس نیک کام کے لئے وہ چوری اور رہزنی کے ذریعہ روپیہ حاصل کرتا ہے، تو گو اس کا مقصد نہایت پاکیزہ ہے۔ لیکن قانون و اخلاق کی نظر میں وہ اسی طرح مجرم ٹھیرے گا جس طرح ایک چور اور رہزن ٹھیرتا ہے۔ بخلاف اس کے ایک دوسرا شخص حقیقت میں تو لوگوں کو ٹھگ کر روپیہ کمانا چاہتا ہے، لیکن عوام پر اپنا اعتماد قائم کرنے کے لئے مسجد میں بیٹھ کر علم دین کی تعلیم دیتا ہے، مواعظ و نصائح کے دریا بہاتا ہے، اور اپنا تمام وقت ذکر الٰہی میں صرف کر دیتا ہے۔ تو گو اس کے یہ افعال نہایت مقدس ہیں، مگر وہ گندا مقصد جس کے لئے اس نے یہ روپ بھرا ہے، اس کے حسن عمل کی پونجی کو نذر

برباد کر دیتا ہے، بلکہ اس پُر فریب دینداری سے اس کا جرم اور بھی زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔

یہی حال جنگ کا بھی ہے۔ اگر جنگ کا مقصد کمزور قوموں کی آزادی چھیننا، ملکوں کی دولت لوٹنا، اور بندگانِ خدا کو ان کے جائز حقوق سے محروم کرنا ہو، تو ایسی جنگ خواہ کتنے ہی ضبط و نظم کے ساتھ کی جائے، خواہ اس میں غیر مقاتلین کی عصمت، زخمیوں کی حفاظت، اموات کی حرمت، اور معابد کی عزت کا کتنا ہی لحاظ رکھا جائے، خواہ اس میں لوٹ مار، آتش زنی، تباہ کاری، قتلِ عام اور ہتک حرمات سے کتنا ہی پرہیز کیا جائے، بہرحال وہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے ایک ظالمانہ جنگ ہی رہے گی۔ اور اس انضباط و انتظام سے اس کی نوعیت میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہوگا کہ وہ ایک بدتر ظلم نہ رہے گی، خوش تر ظلم ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر جنگ کا مقصد نہایت شریف ہو، مثلاً وہ کسی جائز حق کی حفاظت یا دفع فساد و رفع شر کے لئے لڑی جائے، مگر اس کے طریقے ظالمانہ ہوں، اس میں کسی قسم کے اخلاقی حدود محفوظ نہ رکھے جائیں، اور لڑنے والوں کا مطمح نظر محض دشمن کو تباہ کرنا اور اس کو بتلائے عذاب کر کے جذبۂ انتقام کی آگ بجھانا ہو، تو ایسی جنگ بھی حق کے نام سے شروع ہوئی ہوگی، اور اس کے لڑنے والے اصلاً برحق ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ظالموں کی صف میں پہنچا دیں گے۔

پس ایک جائز اور خالص حق پرستانہ جنگ کی تعریف یہ ہے کہ اس کا مقصد اور طریق دونوں یا مقصد، دونوں پاکیزہ اور اشرف و اعلیٰ ہوں۔ اسلام کی تعلیم جنگ کے متعلق اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ صرف اس کے مقصد کی پاکیزگی اور شرافت و بزرگی کو ثابت کرتا ہے۔ اب بحث کا دوسرا پہلو باقی ہے، سو اس باب میں ہم یہ تحقیق کریں گے کہ طریق حصولِ مقصد کے لحاظ سے اسلام کی جنگ کس حد تک تہذیب و شرافت کے اس معیار پر پوری اترتی ہے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے طریق جنگ کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے ہم ایک نظر یہ بھی دیکھ لیں کہ زمانۂ قدیم میں غیر مسلم قوموں کا رویہ جنگ کے بارے میں کیا تھا۔ اس سے ہم اس اصلاح کی قدر و قیمت کا زیادہ صحیح اندازہ کر سکیں گے جو اس معاملہ میں اسلام نے کی ہے۔

۱- زمانۂ جاہلیت میں عرب کا طریق جنگ

عرب میں جنگ کی حیثیت ایک قومی پیشہ کی سی تھی۔ ذرائع معاش کی قلت، ضروریات زندگی کی کمیابی، اور اجتماعی ضبط و نظام کے فقدان سے عربوں میں جنگجوئی کی عادت اس قدر راسخ ہوگئی تھی کہ وہ قتل و خوں ریزی اور لوٹ مار کو اپنی خصوصیات، بلکہ مفاخر میں شمار کرنے لگے تھے۔ غالباً ابتدا میں صرف پیٹ بھرنے، یا پانی پینے، یا چراگاہوں میں جانور چرانے، یا انتقام لینے کے لئے اسکی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ لیکن صدیوں تک شمشیر زنی و مردم کشی کے کھیل میں مشغول رہنے کی وجہ سے ان کو خونخواری کا ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ خوں ریزی کسی غرض کے لئے نہیں، بلکہ مقصود بالذات بن گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ شقاوت، سنگدلی، انتقام جوئی، کینہ پروری، درندگی، وحشت اور وہ تمام خصائص بھی ان کی سیرت میں نمایاں ہوگئے تھے جو اس قسم کی زندگی بسر کرنے سے قدرتی طور پر نشو و نما پاتے ہیں۔ قبیلوں اور خاندانوں میں پشتہا پشت تک عداوتیں منتقل ہوتی تھیں۔ دشمن قبیلہ کو ہر طرح تباہ و برباد کیا جاتا تھا۔ آتش انتقام کو بجھانے کے لئے دشمن کو عذاب دینے اور بے حرمت کرنے کے نہایت وحشیانہ طریقے اختیار کئے جاتے تھے۔ محض اظہار فخر و شجاعت کے لئے بسا اوقات نوع انسان کا خون بے دریغ بہا دیا جاتا تھا۔

اہل عرب کا تصور جنگ عرب قدیم کے حالات معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس صرف دو ذریعے ہیں۔ ایک وہ داستانیں جو ایام العرب کے نام سے اہل عرب میں رائج تھیں۔ دوسرے شعرائے عرب کا کلام جس میں وہ اپنی سوسائٹی کی معاشرت، تہذیب، معاملات اور اعمال و عواطف کی صحیح تصویریں کھینچتے تھے۔ عجم کی طرح ان کی شاعری نازک خیالیوں اور مبالغہ آمیزیوں کا مجموعہ نہ تھی، بلکہ وہ اپنے گرد و پیش جو کچھ دیکھتے تھے اسی کو اپنی زبان میں بے تکلف ادا کرتے تھے۔ اس لئے ان کی شاعری نری شاعری ہی نہ تھی، بلکہ قومی سیرت کی تصویر بھی تھی۔ جنگ کے متعلق اہل عرب کا تصور کیا تھا؟ وہ اس کو کیا سمجھتے تھے؟ اُن کے لڑنے کے طریقے کیا تھے؟ دشمن کے ساتھ ان کا

برتاؤ کیسا تھا؟ کون کون سے محرکات ان کو جنگ پر ابھارتے تھے؟ کن اغراض و مقاصد کے لئے وہ جنگ کیا کرتے تھے؟ ان سب سوالات کا جواب ہمیں ان کے اشعار میں ملتا ہے۔ جن اصطلاحات تشبیہات اور استعارات کو وہ جنگ کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار کے لئے استعمال کرتے تھے وہ ان کے تصورِ جنگ کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہاں چند الفاظ و محاورات اور استعارات و تشبیہات کو نقل کرتے ہیں:-

حرب، جنگ کے لئے ایک عام لفظ ہے۔ لغت میں اس کے اصلی معنی غصہ کرنے کے ہیں۔

تحریب، غصہ دلانے اور بھڑکانے اور نیزہ تیز کرنے کو کہتے ہیں۔

حَرَب، کسی کے مال کو لوٹ لینا۔

حَرِیبہ، لوٹا ہوا مال جس پر آدمی زندگی بسر کرتا ہو۔

محروب، اور حریب، وہ شخص جس کا مال لوٹ لیا گیا ہو۔

اِحتراب، دشمن کا مال لوٹنے کے لئے کسی کی رہنمائی کرنا۔

رَوع، لڑائی کے لئے عام طور پر بولا جاتا ہے۔ اس کے اصلی معنی فزع اور خوف کے ہیں گویا جنگ کو ایک خوفناک چیز سے موسوم کیا گیا ہے۔ وداک بن ثمیل المازنی کہتا ہے:-

مقادیمُ وصّالون فی الروعِ خطوَھم

وہ آگے بڑھنے والے اور لڑائی کے خطرہ میں قدم ملا کر چلنے والے ہیں۔

وغیٰ، یہ بھی لڑائی کا ایک مشہور نام تھا۔ اس کے لغوی معنی شور و ہنگامہ کے ہیں۔ شاعر کہتا ہے:-

وما زال معروفاً لمُرّة فی الوغی   عللُ القنا وعلیهم انهالُها

"اور ہمیشہ سے بنو مرہ کی یہ صفت مشہور ہے کہ وہ جنگ میں بار بار دشمنوں کے خون سے اپنے نیزوں کی پیاس بجھاتے ہیں، اور کم از کم ایک مرتبہ ان کی تشنگی فرو کرنا تو ان پر فرض ہے"

شر، اصلی معنی بدی کے ہیں اور جنگ کے لئے مجازاً بکثرت بولا جاتا ہے۔ شاعر اپنے ممدوح

قبیلہ کی اس طرح تعریف کرتا ہے :۔

قوم اذا الشر ابدیٰ ناجذیہ لھم　　طاروا الیہ زرافات ووحدانا

" وہ ایسی قوم ہیں کہ جب لڑائی اپنی کچلیاں نکال کر ان کو ڈراتی ہے تو وہ گروہ در گروہ اور تنہا تنہا اس کے مقابلہ کے لئے دوڑ پڑتے ہیں "

کریہہ : یہ بھی اسمائے جنگ میں سے ہے اور اس کے اصلی معنی سختی، مصیبت اور بلائے ہیں۔ شاعر اپنے ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے :-

صعب الکریھۃ لا یرام جنابہ　　ماضی العزیمۃ کالحسام المقصل

" وہ جنگ کی مصیبت میں سخت ہے، اس کے احاطۂ مکان کا کوئی قصد نہیں کر سکتا، شمشیر براں کی طرح ارادہ کا پورا ہے "

ہیاج : برانگیختگی و خشم گرفتگی کے معنی میں آتا ہے اور مجازاً جنگ کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے :

کل امرئ یجری الیٰ　　یوم الہیاج بما استعدا

" ہر شخص لڑائی کے دن اسی سامان کے ساتھ جاتا ہے جو اس نے مہیا کیا ہے "

مغضبۃ : اصلی معنی غضبناکی اور خشم گرفتگی کے ہیں، اور عرف عام میں جنگ کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ ابن غنمہ کہتا ہے :

ان تدع زید بنی ذھل لمغضبۃ　　نغضب لزرعۃ ان الفضل محسوب

" اگر زید بنی ذہل کو جنگ کے لئے بلائیگا تو ہم بنی زرعہ کی طرف سے لڑیں گے، کیونکہ فضیلت محسوب ہوتی ہے "

شعرائے عرب نے جنگ کو مینڈھوں کے ٹکر لڑنے سے تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ اس کے لئے نطاح کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ سعد بن مالک کہتا ہے :-

والکر بعد الفر اذ　　کرہ التقدم والنطاح

"گریز کے بعد حملہ بہتر ہے جبکہ آگے بڑھنا اور دشمن سے ٹکر لڑنا پسند نہ ہو"
جنگ کو اونٹ کے سینے سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ اونٹ جب کسی چیز پر اپنا سینہ رکھ دیتا ہے تو وہ پس کر رہ جاتی ہے، اور اس لئے بھی کہ اونٹ ایک سخت کینہ پرور اور انتقام جو جانور ہے۔ شاعر کہتا ہے:-

انختم علینا کلکل الحرب مرۃ فنحن منیخوھا علیکم بکلکل

"تم نے ایک مرتبہ ہمارے اوپر جنگ کے سینہ کو رکھا ہے، اس لئے ہم بھی عنقریب تم پر اس کا سینہ رکھنے والے ہیں"
جنگ کو چکی سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ وہ بھی دشمن کو آٹے کی طرح پیس دیتی ہے۔ ابو الغول طہوی کہتا ہے:-

فوارس لا یملون المنایا اذا دارت رحی الحرب الزبون

"وہ ایسے شہسوار ہیں کہ موت سے نہیں گھبراتے جبکہ شدید جنگ کی چکی چلتی ہے"
عمرو بن کلثوم کہتا ہے:

متی ننقل الی قوم رحانا یکونوا فی اللقاء لہا طحینا

"جب ہم کسی قوم کی طرف اپنی چکی کو لے جاتے ہیں تو وہ لڑائی میں اس کا آٹا بن جاتی ہے"
جنگ کے لئے محض "چکر" کا بھی استعارہ مستعمل تھا۔ عنترہ بن شداد عبسی کہتا ہے:-

ولقد خشیت بان اموت ولم تکن للحرب دائرۃ علی ابنی ضمضم

"مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مرجاؤں اور ضمضم کے دونوں بیٹے لڑائی کے چکر میں نہ آئیں"
جنگ کو آگ سے بھی بکثرت تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ وہ بھی دشمن کو آگ کی طرح جھلس دیتی ہے۔ حارث بن حلزہ کہتا ہے:-

ما جزعنا تحت العجاجۃ اذ ولوا شلالا واذ تلظی الصلاء

"ہم گرد و غبار میں مضطرب نہ ہوئے جبکہ سوار متفرق ہو کر بھاگے اور جنگ کی آگ خوب بھڑکی"

سعد بن مالک کہتا ہے:

من صد عن نیرانها فانا ابن قیس لا براح

"کوئی جنگ کی آگ سے منہ موڑ جائے تو موڑ جائے، میں تو قیس کا بیٹا ہوں، ہرگز نہ ٹلوں گا"

بشامہ بن غدیر کہتا ہے:-

قومی بنو الحرب العوان بجمعهم والمشرفیة والقنا ایقادها

"میری قوم ساری کی ساری شدید جنگ کی حریف ہے، اور ان کے پاس مشرفی تلوار اور نیزہ، جنگ کی آگ کو بھڑکانے کا ایندھن ہے"

ابو الغول طہوی کہتا ہے:-

ولا تبلی بسالتهم وان هم صلوا بالحرب حینا بعد حین

"ان کی دلیری و مردانگی میں کمی نہیں آتی، اگرچہ وہ آتش جنگ میں پے در پے کودتے ہیں"

ان تمام تشبیہوں اور استعاروں اور مجازوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب کے تصور میں جنگ ایک ایسی چیز کا نام تھا جس میں لوٹ مار ہو، شور و ہنگامہ ہو، غضب و اشتعال ہو، جس کے خلاف لڑی جائے اس کو پیس دے، بھنس دے، تہس نہس کر دے، اور اس پر ایسی مصیبتیں وارد ہوں جن کے خوف سے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ لڑنے والے دشمنوں کی حیثیت ان کے تصور میں اس بھینسے کی مانند تھی جو غضبناک ہو کر اپنے حریف سے ٹکر لڑاتا ہے۔ اس جنگ میں شجاعت و بسالت کا جوہر تو ضرور ہے مگر انسانی فضیلت اور انسانی شرافت کا نام تک نہیں۔

عربی سیرت میں جنگ دلی کا اثر یہ جنگ اہل عرب کے قلب و روح کی سب سے زیادہ مرغوب چیز تھی۔ ان کے ہاں عام عقیدہ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص پلنگ پر پڑ کر مرتا ہے تو اس کی روح ناک سے نکلتی ہے، اور اگر میدان جنگ میں لڑ کر جان دیتا ہے تو اس کی روح اس کے زخم سے نکلتی ہے۔ ہر عرب کی تمنا تھی کہ اس کی روح اس کے زخم سے نکلے کیونکہ ناک سے روح کے نکلنے کو وہ سخت عار سمجھتا تھا۔

شعرائے عرب فخر کرتے ہیں کہ ان کے ہاں کوئی ناک کی موت نہیں مرتا۔ چنانچہ ایک شاعر اپنے قومی مفاخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

وما مات منا سید حتف انفہ

"ہم میں کا کوئی سردار ناک کی موت نہیں مرا"

جنگ کی صدا کان میں پڑتے ہی ہتھیار لیکر دوڑ جانا عربی سوسائٹی میں فرض کا درجہ رکھتا تھا۔ جنگ خواہ کیسی ہی ہو اس سے اجتناب کرنا بڑی بزدلی و نامردی کی بات سمجھی جاتی تھی اور اگر کسی کی قوم اس قسم کی بزدلی دکھاتی تو وہ اس پر بڑی شرم و غیرت کا اظہار کرتا تھا۔ ایک شاعر اسی کے متعلق کہتا ہے

لا یسألون اخاھم حین یندبھم فی النائبات علی ما قال برھانا

"بنو مازن کا حال یہ ہے کہ جب ان کا کوئی بھائی حوادث و مصائب میں ان کو مدد کے لئے پکارتا ہے تو وہ اس کے قول کی کوئی دلیل اور وجہ پوچھے بغیر جنگ میں کود پڑتے ہیں"

لکن قومی وان کانوا ذوی عدد لیسوا من الشر فی شئ وان ھانا

"مگر میری قوم کثیر التعداد ہونے کے باوجود ایسی ہے کہ جنگ سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھتی، خواہ وہ معمولی ہی سی جنگ ہو"

فلیت لی بھم قوماً اذا رکبوا شدوا الاغارۃ فرساناً و رکبانا

"کاش اس کے بجائے مجھے ایسی قوم ملتی جو گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو کر خوب غارتگری کرتی"

ایک دوسرا شاعر اپنے خاندان کے مفاخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

انی لمن معشر افنیٰ اوائلھم قیل الکماۃ الا این المحامونا

"میں اس قوم سے ہوں جس کے بزرگ بہادروں کے محض اس غیرت دلانے والے قول پر مر مٹے کہ ہاں! کہاں ہیں نسب کی حفاظت کرنے والے"

اس قسم کے جذبات سے عرب جاہلیت کا لٹریچر بھرا پڑا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے

کہ عرب جنگجوئی کو بڑے فخر کی چیز سمجھتے تھے، اور ان کی نگاہ میں خوں ریزی ایک بڑی ہی خوبی کا کام تھا۔

جنگ کے محرکات: غنیمت کا شوق اس خوفناک کام پر جو چیزیں اُن کو ابھارتی تھیں ان میں سے ایک مالِ غنیمت کا شوق تھا۔ ایک عرب جب ہتھیار سنبھالتا تھا تو پہلی تمنا جو اس کے دل میں پیدا ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ جنگ میں اسے خوب مالِ غنیمت اور لونڈی غلام ہاتھ آئیں۔ تجارت یا محنت و مشقت سے حاصل کیا ہوا مال اس کی نگاہ میں ذلیل مال تھا، اصلی عزت اس کے نزدیک اس "طیب" مال کے حاصل کرنے میں تھی جسے وہ میدانِ جنگ سے لوٹ کر لائے۔ رات دن مختلف قبیلے ایک دوسرے پر اسی غرض کے لئے چھاپے مارا کرتے تھے کہ بکریاں، اونٹ، لونڈی غلام اور مال و متاع لوٹ لائیں اور یہی شوق ان کو زیادہ تر جنگ پر اُبھارا کرتا تھا۔ ایک شاعر اپنے جذبۂ شوقِ غنیمت کو اس طرح ظاہر کرتا ہے:-

فلئن بقیت لارحلن لغزوۃ تحوی الغنائم او یموت کریم

"اگر میں زندہ رہا تو ایک ایسی جنگ پر جاؤں گا جس میں خوب غنائم ہاتھ آئیں: یا پھر ایک شریف کی سی موت مر جاؤں"

ایک دوسرا شاعر اپنے قبیلہ کی تعریف میں کہتا ہے کہ وہ لوٹ مار کے جوش میں خود اپنے بھائیوں کو بھی نہیں چھوڑتا۔

وکن اذا اغرن علی جناب واعوزهن نهب حیث کانا

"ہمارے گھوڑے جب قبیلہ جناب پر غارتگری کرتے ہیں اور وہاں کچھ لوٹ کا مال ہاتھ نہیں آتا تو وہ"

اغرن من الضباب علی حلول وضبة انه من حان حانا

"ضباب اور ضبہ پر جبکہ وہ اپنے گھروں میں ہوتے ہیں، تاخت کرتے ہیں، پھر جو مرے سو مر جائے اس کی پروا نہیں کرتے"

"واحیانا علی بکر اخینا اذا مالم نجد الا اخانا

"اور کبھی کبھی خود بکر پر بھی حملہ کر دیتے ہیں، جبکہ ہمیں اپنے بھائی کے سوا کوئی اور لوٹ مار کے لئے نہ ملے۔"

جب کوئی قبیلہ جنگ کے لئے نکلتا تو اس کی عورتیں اپنے مردوں کو قسم دے دیا کرتی تھیں کہ بغیر مال غنیمت لئے واپس نہ آنا۔ چنانچہ عمرو بن کلثوم کہتا ہے:۔

اخذن علی بعولتھن عھداً اذا لاقوا کتائب معلمینا

"انہوں نے اپنے شوہروں سے عہد لیا ہے کہ جب بہادری کے نشان لگائے ہوئے دشمن کے لشکر سے ملیں"

لیستلبن افراساً وبیضاً واسریٰ فی الحبال مقرنینا

"تو گھوڑے اور صیقل شدہ تلواریں لیکر لوٹیں، اور لونڈی غلام رسی میں بندھے ہوئے لیکر آئیں"

یہی شاعر دوسری جگہ اظہار فخر کے طور پر کہتا ہے:۔

فآبوا بالنھاب وبالسبایا وابنا بالملوک مصفدینا

"وہ لوٹے ہوئے مال اور لونڈی غلام لیکر واپس ہوئے، اور ہم بادشاہوں کو لے کر پلٹے جو بندھے ہوئے تھے"

خلاق اللمم کی جنگ میں طرفہ کے قبیلہ کو جو فتح حاصل ہوئی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:۔

یوم تبدی البیض عن اسوقھا وتلف الخیل افواج النعم

"وہ دن جبکہ چمکتی ہوئی تلواریں اپنی پنڈلیاں کھول رہی تھیں اور سوار اونٹوں کے غول کے غول جمع کرتے پھرتے تھے"

زہیر، آل ربیعہ پر اپنی فتح کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

وسبینا من تغلب کل بیضاء رقود الضحیٰ برود الرضاب

"ہم تغلب سے تمام گوری گوری لڑکیاں لوٹ لائے جو دن چڑھے تک سوتی رہتی ہیں، اور جن کا

لعاب دہن چوسنے سے ٹھنڈک پہنچتی ہے"

یوم مسحلان میں بنی شیبان کو بنی کلب پر جو فتح حاصل ہوئی تھی، اس کی کیفیت ایک شیبانی شاعر اس طرح بیان کرتا ہے:۔

عشیة ولّی جمعهم فتتابعوا فصار الینا نصبھا وعوانسھا

"اس رات ان کی جمعیت بھاگی اور بھاگے ہی چلی گئی۔ پھر ان کا مال اسباب اور ان کی دراز قد کنواری لڑکیاں ہمارے ہاتھ آگئیں"

اس غنیمت کے شوق میں اکثر ایسا ہوتا کہ جب کوئی فوج کسی قبیلہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلتی تو بہت سے مال غنیمت کے بھوکے محض لوٹ مار کے لئے اس کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ حارث بن حلزہ ایک قوم پر نعمان بن منذر کی چڑھائی کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

فتادت له قراضبة من کل حی کانهم الفاء

"اس کی مدد کے لئے ہر قبیلہ سے بھوکے لٹیرے جمع ہو گئے، گویا کہ وہ عقاب تھے"

آگے چل کر کہتا ہے:۔

ثم ملنا علی تمیم فاحرمنا وفیها بنات مر اماء

"پھر ہم بنی تمیم پر ٹوٹ پڑے اور ماہ حرام میں ان پر پہنچکر ان کی بیٹیوں کو لونڈیاں بنا لیا"

یہ لوٹ مار اہل عرب کی جنگ کے اولین مقاصد میں سے تھی، اور عقلاے عرب اس جنگ کو بیکار و بے نتیجہ سمجھتے تھے جس میں کچھ مال ہاتھ نہ آئے۔ اکثم بن صیفی جو اپنی قوم کا بڑا جہاندیدہ و فرزانہ شخص تھا، کہا کرتا تھا کہ اهنأ الظفر کثرة الاسری وخیر الغنیمة المال، بہترین فتح وہ ہے جس میں بہت سے قیدی ہاتھ آئیں، اور بہترین غنیمت وہ ہے جس میں اونٹ اور بکریاں ملیں۔

تفاخر حصول غنائم کے ساتھ دوسرا اہم محرک یہ جذبہ تھا کہ اپنی بزرگی و شرافت اور بہادری و شجاعت کی دھاک بٹھائی جائے۔ یہ تفاخر کا جذبہ دراصل عربوں کی فطری خصوصیات میں سے تھا، اور اپنے ہم جنسوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو طاقتور، ممتاز اور معزز ثابت کرنے کے

لئے وہ ہر قسم کے خطرات برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ ایک بدو کی بڑی سے بڑی تمنا یہ ہوتی تھی کہ اس کی چراگاہ میں دوسرے کا اونٹ نہ چر سکے۔ جس چشمہ سے وہ پانی پئے اس پر دوسرا نہ آنے پائے، جس منزل میں وہ ٹھیرے وہ دوسروں کے لئے تنگ ہو جائے، جو لباس وہ پہنے اس کے مثل کوئی دوسرا نہ پہن سکے، اس کے مقابلہ پر کسی کو بڑا اور بزرگ نہ سمجھا جائے، اس کے سامنے کسی کی تعریف نہ کی جائے، وہ جس کو چاہے قتل کر دے کوئی اس سے خون کا انتقام نہ لے سکے، اس کا ہاتھ سب پر رواں رہے۔ اس کی خدمت سے کسی کو عار نہ ہو، غرض یہ کہ ہر طرح اس کو دوسروں پر فضیلت حاصل رہے اور اس کے سامنے کوئی سر نہ اٹھا سکے۔ شعرائے جاہلیت کا سارا کلام اسی قسم کے جذبات سے بھرا پڑا ہے۔ ایک شاعر اپنے مفاخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

وقد علم القبائل من معد اذا قبب بابطحها بنینا

"تمام قبائل معد جب سے وہ زمین پر آباد ہیں یہ جانتے ہیں کہ"

بانا المانعون لما اردنا وانا النازلون حیث شئنا

"ہم جس چیز کو چاہتے ہیں روک دیتے ہیں، اور جس منزل میں چاہتے ہیں ٹھیرتے ہیں"

وانا التارکون اذا سخطنا وانا الآخذون اذا رضینا

"جب ہم ناراض ہوتے ہیں تو بے خوف چھوڑ دیتے ہیں اور جب ہم راضی ہوتے ہیں تو بے تکلف لے لیتے ہیں"

وانا العاصمون اذا اطعنا وانا العازمون اذا عصینا

"جب ہماری اطاعت کی جاتی ہے تو ہم بچانے والے ہوتے ہیں اور جب ہم سے نافرمانی کی جاتی ہے تو عازم جنگ ہو جاتے ہیں"

ونشرب ان وردنا الماء صفوا ویشرب غیرنا کدرا وطینا

"جب ہم کسی چشمہ پر پہنچتے ہیں تو صاف پانی پیتے ہیں اور غیروں کو گدلا کیچڑ ملا ہوا پانی

پینا پڑتا ہے "

قیس بن ثعلبہ کہتا ہے :-

بیض مفارقنا تغلی مراجلنا نأسو باموالنا آثار ایدینا

"ہمارے سر سفید ہیں[1] اور ہماری دیگیں جوش کھاتی ہیں[2] ہم اپنے ہاتھ کے پہنچائے ہوئے زخموں کا مداوا اپنے مال سے کرتے ہیں[3] "

ایک اور شاعر بنی دبر کی تعریف میں کہتا ہے :-

قوم اذا ما جنی جانیہم امنوا من لؤم احسابہم ان یقتلوا قودا

"وہ ایسی قوم ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی دست درازی کرنے والا کسی کو قتل کر دے تو وہ اس سے بے خوف رہتے ہیں کہ ان سے قصاص لیکر کوئی ان کے حسب کو بٹہ لگا سکے گا "

حجر بن خالد التغلبی فخر کے لہجہ میں کہتا ہے :-

منعنا حمانا واستباحت رماحنا حمی کل قوم مستجیر مراتعہ

"ہم نے اپنی محفوظ چراگاہ کو دوسروں کے لئے بند کر رکھا ہے، اور ہمارے نیزوں نے ہر قوم کی محفوظ چراگاہوں کو جن کے زبردست محافظ موجود ہیں، اپنے لئے مباح کر لیا ہے "

اخنس اپنی قوم کے مفاخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :-

اری کل قوم قاربوا قید فحلہم ونحن خلعنا قیدہ فہو سارب

"میں دیکھتا ہوں کہ ہر قوم نے اپنے اونٹ کی رسی چھوٹی کر رکھی ہے، مگر ہم نے اس کو کھلا چھوڑ دیا ہے اور وہ آزادی سے چرتا پھرتا ہے "

---

[1] یعنی ہمارے سر بکثرت عطر ملنے کی وجہ سے سفید ہو گئے ہیں۔

[2] یعنی ہم خوب دعوتیں کرتے اور کھانے کھلاتے ہیں۔

[3] یعنی اگر ہم کسی کو قتل کر دیں تو اس کے قبیلہ والوں کو ہم سے انتقام لینے کی جرأت نہیں ہوتی، در انحالیکہ ہم کو اپنے مقتولوں کی جان کے بدلے خونبہا قبول کرنا پڑتا ہے۔

ایامِ عرب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ جاہلیت میں جتنی ہولناک لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر اسی جذبۂ تفاخر کا نتیجہ تھیں۔ مشہور حربِ بسوس جو بنی تغلب اور بنی بکر بن وائل کے درمیان کامل ۴۰ برس تک جاری رہی، صرف اتنی سی بات پر ہوئی تھی کہ بنی تغلب کے سردار کلیب بن ربیعہ کی چراگاہ میں بنی بکر بن وائل کے ایک مہمان کی اونٹنی گھس گئی اور وہاں کلیب کے اونٹوں کے ساتھ چرنے لگی۔ کلیب کا قاعدہ تھا کہ وہ نہ اپنی چراگاہ میں کسی کے جانور چرنے دیتا، نہ اپنی شکارگاہ میں کسی کو شکار کھیلنے دیتا، نہ اپنے جانوروں کے ساتھ کسی کے جانوروں کو پانی پینے دیتا، حتی کہ اپنی آگ کے سامنے کسی کی آگ بھی جلتے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس نے جب غیر کی اونٹنی کو اپنے جانوروں کے ساتھ چرتے دیکھا تو غصہ میں آکر اس کے ایک تیر مارا جو اس کے تھن میں جا لگا۔ اونٹنی کے مالک نے جو اس کو زخمی دیکھا تو اس نے فریاد کی "وا ذلاہ" ہائے یہ کیسی ذلت ہے! اس پر بنی بکر میں آگ لگ گئی اور ان کے ایک نوجوان جساس بن مرہ نے جاکر کلیب کو (جو اس کا حقیقی بہنوئی تھا) قتل کر ڈالا۔ کلیب کے بھائی مہلہل کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ اپنے بھائی کا انتقام لینے کھڑا ہو گیا اور دونوں قبیلوں میں ایسی جنگ ٹھن گئی کہ جب تک دونوں تباہ نہ ہو گئے تلواریں نیام میں نہ گئیں۔[1]

ایک دوسری جنگ جو حربِ داحس کے نام سے مشہور ہے، محض گھوڑ دوڑ میں ایک گھوڑے کے آگے نکل جانے پر برپا ہوئی تھی۔ بنی عبس کے سردار قیس بن زہیر کے پاس داحس اور غبراء نامی دو گھوڑے تھے جن کی تیز رفتاری عرب میں مشہور تھی۔ بنی بدر کے سردار حذیفہ بن بدر کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ اس کے ایک ہم چشم کے گھوڑوں کو اتنی شہرت نصیب ہو۔ اس نے اپنے دو گھوڑوں سے ان کی شرط بدی اور فریقین کے درمیان یہ بات طے ہوئی کہ جس کے گھوڑے آگے آئیں وہ سو اونٹ لے۔ شرط کے مطابق دونوں کے گھوڑے دوڑائے گئے۔ جب داحس آگے نکلنے لگا تو حذیفہ کے ایک آدمی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار کر اسے ایک وادی کی طرف موڑ دیا۔ اس بات پر فریقین میں جھگڑا ہو گیا۔ قیس نے حذیفہ کے بیٹے ندبہ کو قتل کر دیا۔ حذیفہ نے قیس کے بھائی مالک کو مار ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنی عبس

---

[1] عقد الفرید ج ۳ ص ۴۷ - ۷۷۔ ابن اثیر ج ۱، ص ۳۸۴ - ۳۹۷۔

اور بنی ذبیان میں ایسی شدید جنگ برپا ہوئی جس کا سلسلہ نصف صدی تک جاری رہا اور اس وقت تک نہ رُکا جب تک فریقین کے گھوڑوں اور اونٹوں کی نسل منقطع ہونے کے قریب نہ پہنچ گئی۔[1]

اوس و خزرج کی مشہور لڑائیاں، جن کا سلسلہ کامل ایک صدی تک جاری رہا، تفاخر نسب ہی کے ایک نہایت ہی حقیر واقعہ سے شروع ہوئی تھیں۔ بنی سعد کا ایک شخص ایک خزرجی سردار مالک بن عجلان کے جوار میں رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے بنی قینقاع کے بازار میں دعویٰ کیا کہ میرا حلیف مالک بن عجلان سب سے زیادہ اشرف و افضل ہے۔ یہ بات اوس کے ایک شخص کو بہت بری معلوم ہوئی اور اس نے قائل کو قتل کر دیا۔ اس پر اوس اور خزرج کے درمیان قتل و خون کا ایسا خوفناک سلسلہ شروع ہو گیا کہ اگر اسلام نہ آتا تو دونوں قبیلے لڑ لڑ کر فنا ہو جاتے۔[2]

سوق عکاظ میں قبیلہ کنانہ کا ایک شخص بدر بن معشر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا اور پکار کر بولا کہ میں عرب کا سب سے معزز آدمی ہوں، جس کسی کو مجھ سے زیادہ معزز ہونے کا دعویٰ ہو وہ میرے پاؤں پر تلوار مارے۔ اس پر بنو دھمان کا ایک منچلا جوان آگے بڑھا اور اس نے بدر کے پاؤں پر تلوار مار دی۔ یہ چنگاری دونوں قبیلوں میں جنگ کی آگ بھڑکانے کے لئے کافی تھی۔ تلواریں کھنچ گئیں اور وہ جنگ برپا ہوئی جو پہلی حرب فجار کہلاتی ہے۔ اس کے بعد کنانہ اور ہوازن میں کبھی صفائی نہ ہوئی اور ان کی عداوتیں یہاں تک بڑھیں کہ دونوں قبیلوں کے حلیف قبائل بھی ان میں شریک ہو گئے۔

آخری حرب فجار بھی جس کے متعلق ابن اثیر کہتا ہے کہ ایام عرب میں اس سے زیادہ زبردست جنگ کوئی نہیں ہوئی، اسی جذبۂ فخر و غرور کا نتیجہ تھی۔ ۲۶ قبل بعثت میں نعمان بن منذر بادشاہ حیرہ نے اپنے ہاں سے ایک تجارتی قافلہ سوق عکاظ میں بھیجنے کا ارادہ کیا اور رؤسائے عرب سے پوچھا کہ کون اس کو اپنی حفاظت میں لے جانے کا ذمہ لیتا ہے؟ براض بن قیس کنانی نے کہا میں

---

[1] ابن اثیر ص ۲۴۴-۲۴۲۔ عقد الفرید کا بیان اس سے مختلف ہے، اور اغانی کا بیان دونوں سے مختلف، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ لڑائی کی بنا محض گھوڑ دوڑ تھی۔

[2] ابن اثیر ج ۱ ص ۴۹۴؛ ۵۱۱۔ ۳۔ عقد الفرید ج ۳ ص ۸۶۔

اسے بنی کنانہ سے محفوظ رکھنے کا ذمہ لیتا ہوں۔ ہوازن کے ایک سردار عروۃ الرحال نے کہا کہ میں اس کو تمام عرب سے محفوظ رکھنے کا ذمہ لیتا ہوں۔ براض اس ادعا کو برداشت نہ کر سکا اور جب عروہ قافلہ کو لیکر چلا تو راستہ میں اس نے عروہ کا کام تمام کر دیا۔ اس واقعہ سے کنانہ اور ہوازن کی عداوت پھر تازہ ہوگئی۔ دونوں قبیلوں میں جنگ چھڑی۔ قریش نے کنانہ کا اور ثقیف نے ہوازن کا ساتھ دیا۔ چار سال تک شدید خونریزی کا سلسلہ جاری رہا اور یوم شمطہ، یوم العبلاء، یوم شریبہ، اور یوم الحریرہ کے وہ ہولناک معرکے برپا ہوئے جنہوں نے عرب کے تمام پچھلے معرکوں کو بھلا دیا[1]۔

انتقام | ایک اور قوی و شدید محرک جس نے عرب کی تاریخ کو خون سے رنگین کر دیا تھا، انتقام کا جذبہ تھا۔ عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جب کوئی شخص قتل کیا جاتا ہے تو اس کی روح پرند بن کر اڑ جاتی ہے اور جب تک اس کا بدلہ نہیں لے لیا جاتا، اس وقت تک وہ کوہ و بیابان میں سقونی، اسقونی (مجھے پلاؤ، مجھے پلاؤ) پکارتی پھرتی ہے۔ ان کی اصطلاح میں اس پرندے کا نام ہامہ یا صداء تھا۔

بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جس مقتول کا انتقام لے لیا جاتا ہے، وہ زندہ رہتا ہے اور جس کا انتقام نہیں لیا جاتا وہ بے جان ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جب تک بدلہ نہ لے لیا جائے مقتول کی قبر میں اندھیرا رہتا ہے۔ اس قسم کے عقائد کی بنا پر مقتول کے رشتہ دار، اہل قبیلہ حتیٰ کہ اس کے قبیلہ کے حلیف تک، اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اس کے قاتل سے خون کا بدلہ لے کر اس کی روح کو مطمئن کر دیں۔ اگر قاتل اس کے درجہ سے کمتر درجہ کا آدمی ہوتا تو اس کے قبیلہ کے کسی ایسے آدمی کو قتل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی جس کا خون ان کے خیال میں مقتول کے خون کے برابر قیمت رکھتا ہو۔ اس طرح بسا اوقات ایک شخص کے قتل ہو جانے سے بڑے بڑے قبیلوں میں آگ لگ جاتی تھی، اور ایسی خونریزیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا کہ سالہا سال تک نہ تھمتا تھا۔ اگر کوئی شخص یا قبیلہ اپنے آدمی کے خون کا بدلہ (ثار) لینے میں کوتاہی کرتا، یا اس کے عوض خوں بہا قبول کر لیتا

---

[1] ابن اثیر ج ۱ ص ۴۴۹ - ۴۴۵

تو یہ بڑی ذلت کی بات سمجھی جاتی تھی، اور اس بزدلی سے اس کی شرافت کو بٹہ لگ جاتا تھا۔
شعرائے جاہلیت کے کلام میں جو مضامین بکثرت وارد ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہی ثار کا عقیدہ ہے۔ وہ اسی عقیدہ کی بنا پر قوموں کو جنگ کا جوش دلاتے تھے اور رجز میں اکثر اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ان کے قبیلہ نے کبھی اپنے کسی مقتول کا خون رائگاں نہ جانے دیا۔ سموال بن عادیا کہتا ہے:۔

وما مات منا سید حتف انفہ ولا طلّ منا حیث کان قتیل

"ہم میں کا کوئی سردار اپنی ناک کی موت نہیں مرا، اور جب ہمارا کوئی آدمی مارا گیا تو اس کا خون کبھی رائیگاں نہ گیا"

حارث بن حلزہ کہتا ہے:۔

ان نبشتم ما بین ملحۃ فالصّا قب فیھا الاموات والاحیاء

"اگر تم ملحہ سے صاقب تک قبریں کھودو گے تو دیکھو گے کہ کچھ مدفون مردہ ہیں (جنکا خون رائیگاں گیا اور وہ تم میں سے ہیں) اور کچھ زندہ ہیں (جنکا ثار لیا گیا اور وہ ہم میں سے ہیں)"
قیس بن عاصم اپنے قبیلہ کو جوش انتقام دلانے کے لئے کہتا ہے:۔

فما بال اصداء بفلج غریبۃ تنادی مع الاظلال یا لابن حنظل

"ان بیچارے "صداؤں" کا کیا حال ہے جو فلج میں چیختے پھر رہے ہیں کہ "ہائے! ابن حنظل کا بدلہ کسی نے نہ لیا"

صوادی لا مولی عزیز یجیبھا ولا اسرۃ تسقی بنانہا منھل

"وہ صدائیں جن کا جواب دینے والا کوئی مولی عزیز نہیں اور نہ کوئی رشتہ دار ہے جو ان کو گھاٹ پر سیراب کرے"

تابط شرا اپنے مفاخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

ھم الی الموت اذا خیّروا بین تباعات وتقتال

"وہ موت سے مشتاق ہوتے ہیں سبب ان کو خوں بہا لینے اور لڑنے کے درمیان انتخاب کا اختیار دیا جاتا ہے۔"

بنی اسد کا ایک شاعر اپنے قبیلہ کو وصیت کرتا ہے:

فلا تأخذوا عقلاً من القوم إنني　　　أرى العار يبقى والمعاقل تذهب

"میرے خون کے بدلہ میں اس قوم سے دیت نہ قبول کر لینا، کیونکہ عار باقی رہ جاتا ہے اور دیت کا مال خرچ ہو جاتا ہے۔"

بنو خزاعہ کا ایک شاعر اپنے قبیلہ کو انتقام کا جوش اس طرح دلاتا ہے:

ولا تطعمن ما يعلفونك إنهم　　　أتوك على قرباهم بالمثمّل

"جو کچھ وہ تجھے دیت میں دیتے ہیں اس کا خیال بھی نہ کر کیونکہ وہ باوجود قرابت کے تیرے پاس زہر ہلاہل لائے ہیں۔"

أبعد الإزار مجسداً لك شاهداً　　　أتيت به في الدار لم يتزيّل

"کیا تو وہ خون آلود ازار دیکھنے کے بعد بھی دیت لے گا، جو تیرے پاس لائی گئی، اور جس سے ابھی تک خون دور نہیں ہوا ہے۔"

أراك إذا قد صرت للقوم ناضحاً　　　يقال له بالغرب أدبر وأقبل

"اگر تو نے ایسا کیا تو میں سمجھتا ہوں کہ تو وہ آب کش اونٹ بن گیا ہے جس پر پکھال رکھ کر کہتے ہیں آگے بڑھ اور پیچھے ہٹ۔"

فخذها فليست للعزيز بخطة　　　وفيها مقال لامرئ متذلل

"اگر تو چاہے تو لے لے مگر یہ شریفوں کا چلن نہیں ہے اور اس میں تو ذلیل آدمی کو بھی کلام ہوگا۔"

کبشہ بنت معدیکرب اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے بنی زبید کو اس طرح ابھارتی ہے

أرسل عبد الله إذ حان يومه　　　إلى قومه لا تعقلوا لهم دمي

"عبداللہ کا جب آخری وقت آیا تو اس نے اپنی قوم کو بزبانِ حال سے کہلا بھیجا کہ ان سے میرے خون کی دیت نہ قبول کرنا"

ولا تاخذوا منهم افالا وابکرا   واترک فی بیت بصعدة مظلم

"تم ان سے بچے اور جوان اونٹ لیکر نہ بیٹھ جانا درآں حالیکہ میں صعدہ کی ایک تاریک قبر میں پڑا ہوں"

فان انتم لم تثأروا واتدیتم   فمشوا باذان النعام المصلم

"اگر تم نے میرے خون کا بدلہ نہ لیا اور دیت قبول کر لی تو تم کن کٹے شترمرغ کی طرح ذلیل پھرو"

ولا تردوا الا فضول نسائکم   اذا ارتملت اعقابهن من الدم

"اور نہ آؤ اپنی عورتوں کے پاس سوائے ایام کی حالت کے جبکہ ان کی ایڑیاں تک خون سے سنی ہوں"

یہ عرب کی قبائلی عداوتوں اور لڑائیوں کے اصلی محرکات ہیں۔ ان میں کسی شریف تر اور بلند تر نصب العین کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ وہی خالص بہیمی اور حیوانی داعیات جو ایک درندے کو اپنے مدمقابل کے پھاڑ کھانے پر ابھارتے ہیں، زیادہ ترقی یافتہ، مگر زیادہ خوفناک صورت میں، ان کے لئے بھی قتل و غارت گری کے محرک ہوتے تھے۔ اس طرح جنگ ان کی سیرت کے محض حیوانی پہلو سے تعلق رکھتی تھی اور انسانی وملکوتی پہلو سے اس کو کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ ان کے ذہن اس تصور سے بھی خالی تھے کہ جنگ کو بنی آدم کے اس برتر اخلاقی پہلو سے بھی کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔

جنگ کے وحشیانہ طریقے | جس طرح جنگ کے متعلق عرب جاہلیت کا تصور ادنیٰ تھا، اور جس طرح ان کے مقاصد جنگ ذلیل و ناپاک تھے، اسی طرح وہ طریقے بھی جن سے وہ جنگ کیا کرتے تھے انتہا درجہ کے وحشیانہ تھے۔ چونکہ ان کے ذہن میں جنگ کی خصوصیات ہی یہ تھیں کہ وہ ہولناک ہو، غیظ و غضب کا مظہر اتم ہو، بلاؤں اور مصیبتوں کا مجموعہ ہو، چکی کی طرح پیس دینے والی ہو، آگ کی طرح جھلسا دینے والی ہو، اونٹ کے سینہ کی طرح ہر چیز کو ریزہ ریزہ کر دینے والی ہو، اس لئے

جنگ میں ان کے اعمال بھی اسی تصور کے مطابق ہوتے تھے۔ کسی قوم کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے معنی ان کے نزدیک یہ تھے کہ جس طرح ممکن ہو اس کو تباہ و برباد اور ذلیل و خوار کیا جائے۔ ان کا جذبۂ نبرد آزمائی کسی قسم کی اخلاقی حدود سے آشنا نہ تھا، وہ صرف ایک چیز کو جانتا تھا اور وہ یہ تھی کہ دشمن پامال کرنے کے لئے ہے۔ اس غرض کے لئے جو جو طریقے اختیار کئے جاتے تھے ان کی تفصیلات ہم کو کلام جاہلیت اور ایام عرب میں بکثرت ملتی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

غیر مقاتلین پر تعدّی جنگ میں مقاتلین اور غیر مقاتلین کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا۔ دشمن قوم کے ہر فرد کو دشمن سمجھا جاتا تھا اور اعمال جنگ کا دائرہ تمام طبقوں اور جماعتوں پر یکساں محیط تھا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی، کوئی اس ہمہ گیر دست درازی سے مستثنیٰ نہ تھا، بلکہ دشمن قوم کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے عورتیں خصوصیت کے ساتھ جنگی کارروائیوں کی تختۂ مشق بنائی جاتی تھیں۔ مفتوح قوم کی عورتوں کو بے حرمت کرنا، ان کے پردے اٹھا دینا، ان کی تحقیر و تذلیل کرنا، فاتح کے مفاخر میں شمار ہوتا تھا اور شعراء بڑے فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے۔ ایک شاعر کہتا ہے:۔

وعقیلۃ یسعی علیھا قیم متغطرس ابدیت عن خلخالھا

"بہت سی شریف عورتیں، جن کے غیرت مند شوہر ان کی حفاظت میں پوری کوشش کرتے تھے، ان کے پازیب میں نے کھول دیئے"

ایک اور شاعر کہتا ہے:۔

والھم بیضات الخدود رھنائک لا النعم المراح

"اس وقت اصل مقصود گوری گوری پردہ نشین عورتیں ہوتی ہیں نہ کہ چراگاہ سے واپس ہونے والے اونٹ"

عمرو بن کلثوم جنگ میں بے جگری سے لڑنے کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ اس کے قبیلہ کو اپنی عورتوں کے بے حرمت ہونے کا کھٹکا لگا ہوا ہے، کہتا ہے:۔

علی آثارنا بیض حسان نحاذر ان تقسم او تھونا

"ہمارے پیچھے گوری گوری خوبصورت عورتیں ہیں، ہمیں خوف ہے کہ کہیں وہ تقسیم یا ذلیل نہ کی جائیں"

بسا اوقات شدت غضب میں دشمن کی حاملہ عورتوں کے پیٹ تک چاک کروائے جاتے تھے۔ چنانچہ عامر بن الطفیل جنگ فیف الریح میں اپنے قبیلہ کی فتح کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے،

بقرنا الحبالی من شنوءة بعدما خبطن بفیف الریح نہدا و خثعما

"ہم نے جوش میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالے، بعد اس کے کہ ہم فیف الریح میں نہد و خثعم پر کاری ضرب لگا چکے تھے"

آگ کا عذاب دشمن کو ایذا دینے اور ضرر پہنچانے کا حق غیر محدود تھا، یہاں تک کہ آگ کا عذاب دینے میں بھی تامل نہ کیا جاتا تھا۔ تاریخ عرب کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ یمن کے بادشاہ ذونواس نے ان لوگوں کو جو اس کے دین سے پھر گئے تھے پکڑ کر بھڑکتی ہوئی آگ کے الاؤ میں ڈلوا دیا۔ قرآن مجید میں اسی کے متعلق آیا ہے کہ قتل اصحاب الاخدود النار ذات الوقود اذھم علیہا قعود۔

منذر بن امراء القیس نے جنگ اوارہ میں جب بنی شیبان پر فتح پائی تو ان کی عورتوں کو زندہ جلانا شروع کر دیا اور بنی قیس کے ایک شخص نے بمشکل ان کی جاں بخشی کرائی۔ اعشی اسی واقعہ پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

سبایا بنی شیبان یوم اوارة علی النار اذ تجلی به فتیاتہا

"اس نے جنگ اوارہ میں بنی شیبان کے اسیروں کو چھڑا لیا، جب کہ ان کی جوان لڑکیاں آگ میں ڈالی جا رہی تھیں"

عمرو بن منذر نے ایک قصور کی بنا پر منت مانی تھی کہ بنی دارم کے سو آدمیوں کو زندہ جلاؤں گا، چنانچہ اس نے ان پر چڑھائی کی اور ۹۹ آدمی ہاتھ آئے جنہیں اس نے جلا دیا۔ اب منت پوری کرنے میں ایک کی کسر رہ گئی تھی۔ اتفاق سے اس وقت قبیلہ براجم کا ایک شخص ادھر سے گذر رہا تھا۔ وہ گوشت کی بو سونگھ کر سمجھا کہ کھانا پک رہا ہے، اس لئے عمرو کے لشکر کی طرف آ گیا۔ عمرو نے اپنی

منت پوری کرنے کے لئے اسی کو آگ کے الاؤ میں جھونک دیا۔ اسی واقعہ کے متعلق جریر کہتا ہے:

این الذین بنار عمرو احرقوا   ام این اسعد فیکم المسترضع

"کہاں ہیں وہ جو عمرو کی آگ میں جلائے گئے، اور کہاں ہے اسعد جو تمہارے درمیان پرورش پاتا تھا"

اسیران جنگ سے بدسلوکی اسیران جنگ کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا اور بسا اوقات جوش انتقام میں ان کو انتہا درجہ کی اذیتیں دے دے کر مارا جاتا تھا۔ عکل اور عرینہ کا قصہ احادیث میں مذکور ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہوں کو پکڑ کر لے گئے، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے، ان کی آنکھیں پھوڑیں، اور انہیں تپتی ہوئی ریت پر ڈال دیا، یہاں تک کہ وہ پیاس اور تکلیف سے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔

جنگ اوارہ کا واقعہ مشہور ہے کہ بنی شیبان کے جتنے اسیر منذر بن امرؤ القیس کے ہاتھ آئے ان سب کو اس نے کوہ اوارہ کی چوٹی پر بٹھا کر قتل کرانا شروع کیا اور کہا کہ جب تک ان کا خون بہ کر پہاڑ کی جڑ تک نہ پہنچ جائیگا، قتل کا سلسلہ بند نہ کروں گا۔ آخر جب مقتولوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہوگئی تو مجبوراً اس نے منت پوری کرنے کے لئے خون پر پانی ڈلوا دیا، اور وہ بہ کر پہاڑ کی جڑ تک پہنچ گیا۔[1]

امرؤ القیس کے باپ حجر بن حارث نے جب بنی اسد پر چڑھائی کی تو ان کے جتنے آدمی اس کے ہاتھ قید ہوئے ان سب کو اس نے قتل کرا دیا اور حکم دیا کہ انہیں تلواروں سے نہیں بلکہ ڈنڈوں سے مار مار کر ہلاک کیا جائے۔[2]

غفلت میں حملہ کرنا دشمن پر جنگ کا اعلان کئے بغیر غفلت کی حالت میں جا پڑنا مرغوب ترین جنگی چالوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس غرض کے لئے عموماً رات کے آخری حصہ میں اچانک حملے کئے جاتے تھے

[1] ابن اثیر ج ۱ ص ۴۰۹۔

[2] ابن اثیر ج ۱ ص ۳۷۶۔

اور یہ دستور ایسا عام ہو گیا تھا کہ لفظ "تصبیح" کے معنی ہی صبح کے وقت حملہ کرنے کے ہو گئے تھے۔ عمرو بن زبید کہتا ہے:-

نصبحهم بالجيش قيس بن عاصم — فلم يجدوا الا الاسنة مصدرا

"قیس بن عاصم ان پر صبح کے وقت لشکر لے کر جا پہنچا، مگر وہاں اس کے سوا کچھ نہ پایا کہ نیزوں کی انیاں سینوں سے پار ہوتی تھیں"

عباس بن مرداس سلمی کہتا ہے:-

فلم ار مثل الحي حيا مصبحا — ولا مثلنا يوم التقينا فوارسا

"میں نے اس قبیلہ جیسا قبیلہ کبھی نہیں دیکھا جس پر ہم نے صبح حملہ کیا، اور نہ ہم جیسا کوئی تھا جب کہ ہم نے شہسواروں کا مقابلہ کیا"

اسی بنا پر لوگ اپنے دوستوں کو دعا دیتے تھے کہ تم صبح کے وقت بخیریت رہو۔ عنترہ بن شداد اپنی معشوقہ سے کہتا ہے:-

يا دار عبلة بالجواء تكلمي — وعمي صباحا دار عبلة واسلمي

"اے عبلہ کے مکان کہ تو مقام جواء میں ہے، کچھ بول، اور صبح کے وقت غارت گری سے محفوظ رہ"

عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ دشمن کے سرداروں کو رات کے وقت حالت خواب ہی میں قتل کر ڈالتے تھے۔ اس فعل کا اصطلاحی نام "فتک" تھا، اور اس کے مرتکبین "فتاک" کہلاتے تھے۔ حارثہ بن ظالم المری، براض بن قیس الکنانی، سلیک بن سلکہ، تابط شرا عرب کے مشہور فتاک گزرے ہیں۔

مقتولوں کی تحقیر: جوش انتقام میں دشمن کی مردہ لاشوں تک کو نہ چھوڑا جاتا تھا۔ ان کے ناک، کان کاٹے جاتے تھے، ان کے اعضا قطع و برید کر کے زندوں کا بدلہ مردوں سے لیا جاتا تھا، اور بسا اوقات ایسی ایسی وحشیانہ حرکات کی جاتی تھیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جنگ احد کا مشہور واقعہ ہے کہ قریش کی عورتوں نے شہدائے اسلام کے ناک کان کاٹ کر ان کے

ہار بنائے تھے۔ ابوسفیان کی بیوی ہند سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ نکال کر چبا گئی تھی۔ یوم الیحامیم میں جب بنی جدیلہ کا سردار اسیع بن عمرو مارا گیا تو بنی سنبس کے ایک شخص نے اس کے دونوں کان کاٹ کر اپنے جوتے میں لگا لئے۔ ابو سروہ سنبسی اسی پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے :-

نخصف بالآذان منکم نعالنا

"ہم تمہارے کانوں کا پیوند اپنی جوتی میں لگاتے ہیں"

ایک اور سنبسی شاعر بنی جدیلہ کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ :-

فان تبغضونا بغضۃ فی صدورکم　　فانا جدعنا منکم وشرینا

"اگر تم اپنے سینوں میں ہمارے خلاف بغض رکھتے ہو تو بیجا نہیں ہے کیونکہ ہم نے تمہارے ناک کان کاٹے ہیں، اور تم کو پکڑ پکڑ کر بیچا ہے"

کبھی کبھی دشمن کی لاشوں کو ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹا جاتا تھا، چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے :-

وشدوا شدۃ اخری فجروا　　بارجل مثلھم ورموا جوینا

"انہوں نے ایک دوسرا حملہ کیا اور اپنے حریف کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹیں، اور جوین کو تیر مارا"

جب کسی شخص سے سخت دشمنی ہوتی تو قسم کھاتے تھے کہ اس کو قتل کر کے اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔ جنگ احد میں عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مسافع بن طلحہ اور جلاس بن طلحہ دو بھائی قتل ہوئے تھے۔ ان دونوں کی ماں سلافہ نے قسم کھائی کہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب پئے گی۔ جب مقام رجیع میں عاصم شہید ہوئے تو قریش کے لوگ ان کی تلاش میں نکلے تاکہ ان کا سر سلافہ کے ہاتھ بیچیں[1]۔ حرب الفساد میں جو ۲۵ سال تک جاری رہی، فریقین نے بکثرت ایک دوسرے کے مقتولوں کی کھوپڑیوں میں شراب پی تھی۔ جنگ بجاتہ میں بھی اس قسم کے واقعات پیش آئے ہیں[2]، چنانچہ ابو سروہ سنبسی انہی کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے :-

---

[1] یہ واقعہ طبقات ابن سعد، فتح الباری، اور اسد الغابہ میں مذکور ہے۔

[2] تبریزی نے حماسہ کی شرح میں اس کا ذکر کیا ہے۔

ونشرب کرھاً منکم فی الجماجم

"ہم بدمزگی کے ساتھ تمہاری کھوپڑیوں میں شراب پیتے ہیں"

دشمن کی لاشوں کو مردار خوار جانوروں کا طعمہ بنایا جاتا تھا اور یہ ان کے ہاں اظہار فخر کی بات تھی۔ عنترہ کہتا ہے:-

ان یفعلا ولقد ترکت اباھما　　جزر السباع وکل نسر قشعم

"اگر وہ مجھے گالیاں دیتے ہیں تو بیجا نہیں ہے کیونکہ میں نے ان کے باپ کو درندوں اور گدھوں کا طعمہ بننے کے لئے چھوڑ دیا ہے"

شریح عبسی کہتا ہے:-

واقسم لولا درعہ لترکتہ　　علیہ عواف من ضباع وانسر

"قسم کھا کر کہتا ہوں، اگر وہ زرہ پہنے ہوئے نہ ہوتا تو میں اس کو گدھوں اور بجوؤں جیسے مردار خوار جانوروں کے لئے پڑا چھوڑ دیتا"

عاتکہ بنت عبدالمطلب حرب فجار کے واقعات پر فخر کرتے ہوئے کہتی ہیں:

وعبدکما غادرنہ　　بالقاع تنھسہ ضباعہ

"ہمارے سواروں نے مالک کو زمین پر پڑا چھوڑ دیا، اسے بجو نوچ نوچ کر کھاتے تھے"

مہلہل، حرب بسوس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

قتلی تعاورھا النسور اکفھا　　ینھشنھا وحواجل الغربان

"ان مقتولوں پر کرگسوں اور گدھوں کے غول کے غول آتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کو نوچ نوچ کر کھاتے ہیں"

بدعہدی | حرب جاہلیت میں وفائے عہد کا بھی کوئی پاس و لحاظ نہ تھا۔ جب کبھی دشمن سے انتقام لینے کا کوئی اچھا موقع مل جاتا تو تمام عہد و پیمان توڑ کر رکھ دیئے جاتے تھے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کفار عرب کی بدعہدیوں کے واقعات نہایت کثرت سے

ملتے ہیں۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ سے رسول اللہ صلعم کے معاہدے ہو چکے تھے، لیکن تینوں نے وقت پر ان کو توڑ ڈالا۔ بنو نضیر نے خود آنحضرت صلعم کو قتل کرنے کی سازش کی۔ بنو قریظہ نے جنگ احزاب میں علانیہ اسلام کے خلاف شرکت کی۔ بنو قینقاع نے قریش کے بھڑکانے پر سب سے پہلے اعلانِ جنگ کیا۔ قبائل رعل و ذکوان نے خود ہی رسول اللہ صلعم سے چند آدمی مدد کے طور پر طلب کئے اور جب آپ نے ۷۰ صحابہؓ کی ایک جماعت ان کے پاس بھیجی تو انہوں نے بیر معونہ پر سب کو قتل کر دیا۔ بنو لحیان نے مقام رجیع میں حضرت خبیبؓ، زید بن دثنہؓ اور عبد اللہ بن طارق کو امان دی، اور جب انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو تینوں کو پکڑ کر باندھ لیا، ایک کو قتل کیا اور دو کو مکے لے جا کر بیچ ڈالا۔ اسی قسم کی بدعہدیوں کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ لا یرقبون فی مومنٍ الاًّ ولا ذمۃ، وہ کسی مسلمان کے ساتھ قرابت یا معاہدے کا لحاظ نہیں رکھتے۔

یہ تھا زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کا طریق جنگ۔ عربی فوج کی خصوصیات کو ایک شاعر نے جامعیت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:۔

فلست بحاضر ان لم تزر کم　　خلال الدار مشبلۃ طحون

"میں ایک مہذب شہری نہ ہوں اگر تمہارے عین گھروں کے سامنے ایک پھاڑنے اور پیسنے والا لشکر نہ آئے"

یدین بہا العزیز اذا راٰھا　　ولیسقط من مخافتہا الجنین

"اس کو دیکھتے ہی سے قوت والے مسخر ہو جاتے ہیں اور پیٹ والیوں کے حمل خوف سے گر جاتے ہیں"

تشیب الناھد العذراء منہا　　ویھرب من مخافتہا القطین

"جوان کنواری لڑکیاں اس کی ہیبت سے بوڑھی ہو جاتی ہیں، اور اس کے خوف سے وہ لوگ بھی بھاگ جاتے ہیں جو کبھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتے"

یطوف بہا من انجاد سعد　　کاُسد الغیل مسکنہا العرین

"اس میں بنی نجار کے شیر پھرتے ہیں، ان جنگلی شیروں کے مانند جن کا مسکن گھنی جھاڑی ہے"

یظل اللیث فیہا مستکینا لہ فی کل ملتفت انین

"جس میں شیر ہمیشہ خاموش رہتا ہے، اور سننے والا بس اس شخص کی ہائے ہی سنتا ہے جسے وہ پھاڑ ڈالے"

۲- روم و ایران کا طریق جنگ

یہ عرب تو خیر وحشی تھے۔ حضریت و مدنیت کا ان میں نام و نشان تک نہ تھا۔ علوم و تہذیب سے ناآشنا تھے۔ ان میں اس قسم کی درندگی و بہیمیت کا موجود ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اُس زمانہ میں جو قومیں تہذیب و تمدن کے آسمان پر پہنچی ہوئی تھیں، ان کا کیا حال تھا۔

تاریخ نے اس دور کی لڑائیوں کے متعلق بہت کچھ معلومات محفوظ رکھی ہیں۔ جن لوگوں نے ان کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ کم از کم اس اعتبار سے مہذب اور غیر مہذب دنیا کے طرز عمل میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ ایک قوم جب دوسری قوم پر چڑھائی کرتی تھی تو تہیہ کر لیتی تھی کہ اس کو مٹا کر چھوڑے گی۔ مقاتلین اور غیر مقاتلین کا امتیاز عملاً مفقود تھا۔ دشمن قوم کا ہر فرد گشتنی و گردن زدنی سمجھا جاتا تھا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، زخمی، بیمار، راہب، زاہد، سب پر اعمالِ جنگ کا دائرہ یکساں حاوی تھا۔ فوجوں کے اقدام میں دشمن کی فصلوں کو تباہ کرنا، باغات کو تہس نہس کرنا، عمارات کو مسمار کرنا، بستیوں کو لوٹنا اور جلانا ایک عام بات تھی۔ کسی شہر کا شدید مزاحمت کے بعد مفتوح ہونا گویا اس کے لئے پیام موت تھا۔ غضبناک فاتح جب اس میں گھستے تو بے اختیار قتل عام شروع کر دیتے اور جب خون سے بھی جوش انتقام فرو نہ ہوتا تو شہر میں آگ لگا دیتے۔ حد یہ ہے کہ اس معاملہ میں سکندر اعظم بھی عام کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھا۔ شام کے قدیم تجارتی مرکز صور (Tyre) کو جب اس نے ۷ مہینہ کے سخت محاصرہ کے بعد فتح کیا تو شدت غضب میں قتل عام کا حکم دے دیا اور اس وقت جس قوم کو دنیا کی مہذب ترین قوم ہونے کا فخر حاصل تھا اس نے ۸ ہزار بے پناہ انسانوں کو قتل کیا اور ۳۰ ہزار

۳۰ ہزار کو غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ اسیرانِ جنگ کے لئے اس زمانہ میں قتل اور غلامی کے سوا کوئی تیسری صورت نہ تھی۔ بعض اوقات دشمن کے سالارانِ افواج، اور خود بادشاہوں پر اگر قابو چل جاتا تو ان کو بدترین ذلت اور عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ سفراء کا احترام جنگ کے اہم ترین مصالح میں سے ہے، مگر اس عہد میں یہ جماعت بھی بسا اوقات تعدی سے محفوظ نہ رہتی تھی۔ فریق مخالف کی جانب سے کسی بادشاہ کے دربار میں کوئی ایسا پیغام لے جانا جس کو وہ اپنی توہین یا کسر شان سمجھتا ہو گویا خود اپنی موت کا پیغام لے جانا تھا۔ ایسے مواقع پر سفراء کا ذلیل و خوار ہونا اور قید میں پڑ جانا معمولی بات تھی، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ بے تکلف قتل کر دیئے جاتے تھے۔ سب سے زیادہ مصیبت مذہبی طبقہ پر آتی تھی۔ اگر بدقسمتی سے مفتوح ملک کے باشندے کسی دوسرے مذہب کے پیرو ہوتے تو فاتح کا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ ان کے معابد کو تباہ کرے، متبرک مقامات کی بے حرمتی کرے اور مذہبی پیشواؤں کو ذلیل و خوار کرے۔ اس میں بسا اوقات یہاں تک غلو کیا جاتا تھا کہ فاتح بزور شمشیر مفتوحوں کو مذہب بدلنے پر مجبور کرتا تھا۔

قدیم زمانے کی سب سے زیادہ مہذب سلطنتیں دو تھیں، ایک روم، دوسرے ایران۔ تہذیب و تمدن، علوم و آداب اور شان و شوکت، ہر اعتبار سے وہ اس دور میں دنیا کی تمام قوموں پر فوقیت و برتری رکھتی تھیں۔ اس لئے انہیں کی تاریخ پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے کہ جنگ میں ان کا طرز عمل کیا تھا۔

مذہبی مظالم

روم و ایران کے درمیان سیاسی اختلاف کے ساتھ مذہبی اختلاف بھی تھا، مجوسی ایران اور مسیحی روم میں جب کبھی لڑائی ہوتی اور ایک کو دوسرے کے ملک میں گھسنے کا موقع ملتا تو اس کے مذہب کو سب سے زیادہ ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا جاتا تھا۔ قباد کے زمانہ (۵۰۱ء تا ۵۳۱ء) میں جب حکومت ایران کے اشارہ سے حیرہ کے بادشاہ منذر نے شام پر چڑھائی کی تو اس نے انطاکیہ میں ۴۰۰ راہبات کو پکڑ کر عزیٰ کے بت پر بھینٹ چڑھا دیا[1]۔ خسرو پرویز نے جب قیصر ماریس کا بدلہ لینے کے بہانے سے سلطنتِ روم کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تو اپنے حدودِ مملکت میں مسیحیوں کے کلیسا مسمار کرا دیئے۔ ندم

[1] History of Persia, Sykes, Vol 1, P. 482.

کے اموال لوٹ لئے، اور تہذیب پرستوں کو آتش پرستی پر مجبور کیا[1] ۶۱۵ھ میں جب اس نے بیت المقدس کو فتح کیا تو وہاں کے بطریق اعظم زکریاہ کو گرفتار کر لیا، اصلی صلیب کو جس پر عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ چڑھائے گئے تھے چھین لیا، سینٹ ہیلنا اور قسطنطین کے عظیم الشان کنیسوں کو آگ لگادی، تین سو سال کی جمع شدہ مذہبی یادگاروں اور نادر و نیاز کی قیمتی چیزوں کو لوٹ لیا، اور ۹۰ ہزار عیسائیوں کو قتل و اسیر کیا[2]۔ اس کے جواب میں جب ہرقل نے شمال کی جانب سے ایران پر حملہ کیا تو مجوسیوں کے آتشکدوں کو برباد کرادیا، زرتشت کے وطن ارمیاہ کو پیوند خاک کر دیا، اور مجوسی مذہب کی توہین و تذلیل میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی[3]۔

رومیوں کی دشمنی میں خود ایران کی مسیحی رعایا پر انتہائی سختیاں کی جاتی تھیں۔ رومی سلطنت کے مسیحی مذہب اختیار کرنے سے پہلے تک ایران کے مسیحی مامون و محفوظ تھے، مگر قسطنطین کے بتپسمہ لیتے ہی ایران کا رویہ اپنی مسیحی رعایا کے ساتھ بدل گیا۔ ۳۳۹ھ میں شاپور ذوالاکتاف نے بشپ سائمیون اور ۱۰۵ دوسرے پادریوں کو قتل اور بہت سے مسیحی کنیسوں اور صومعوں کو منہدم کرا دیا۔ اس کے بعد ۴۰ سال تک مسیحیوں پر انتہا درجہ کی سختیاں جاری رہیں[4]۔

بہرام نے فرقہ مانویہ کو مٹانے کے لئے جو شدید کارروائیاں کیں وہ سب سے زیادہ ہولناک تھیں۔ مانی نے جب زرتشت کے مذہب کو چھوڑ کر اپنا الگ مذہب ایجاد کیا اور کثرت سے لوگ اس کے معتقد بننے لگے تو بہرام نے جدید مذہب کے پیرووں کو پکڑ پکڑ کر قتل کرانا شروع کر دیا اور خود مانی کو گرفتار کر کے قتل کرایا، اس کی کھال کھنچوا کر اس میں بھس بھروایا، اور اس کو جندی سابور کے دروازہ پر لٹکوا دیا۔ یہ دروازہ عرصہ تک باب مانی کے نام سے موسوم رہا[5]۔

---

[1] Gibbon, Roman Empire, Vol v, Ch, XLVI

[2] E. A Ford, Byzantine Empire. [3] Gibbon, Vol. I, Ch, XLVI

[4] Sykes. Vol I, P. 448

[5] علامہ بیرونی نے آثار الباقیہ میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے،

سفراء پر تعدی | نظری حیثیت سے سفراء کے احترام کا تصور اس زمانہ میں موجود تھا، اور سیاسی مفکرین اس احترام کے اہم مصالح کو سمجھتے تھے، لیکن عملاً اس کا چنداں لحاظ نہ رکھا جاتا تھا قیصر سلوریس اسکندر کے دربار میں اردشیر کے سفراء جب یہ پیغام لے کر پہنچے کہ "رومیوں کو صرف یورپ پر قناعت کرنی چاہئے اور شام و اناضول کو ایرانیوں کے لئے چھوڑ دینا چاہئے"، تو اس پر قیصر کو سخت غصہ آیا اور اس نے ان سفراء کو قید میں ڈلوا دیا[1]

نوشیرواں جیسے ممتاز بادشاہ کے دربار میں جب دیزبل ایلخانِ اتراک کے سفیر عقد محالفت کی تجویز لے کر آئے تو اس نے اقرار یا انکار کا صاف جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ ان کو زہر دیکر مار ڈالنا زیادہ مناسب سمجھا۔[2]

خسرو پرویز کے فاتحانہ اقدامات نے جب ایشیا اور افریقہ میں رومی سلطنت کا تقریباً خاتمہ کر دیا، شام، فلسطین، مصر اور پورا ایشیائے کوچک رومیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہاں تک کہ ایرانی فوجیں عین قسطنطنیہ کے سامنے قاضی کوئی (Chalcedon) تک پہنچ گئیں، تو ہرقل نے خسرو سے صلح کی التجا کرنے کے لئے اپنے سفیر بھیجے۔ مگر خسرو نے ہیئت سفراء کے رئیس کی جیتے جی کھال کھنچوا ڈالی، بقیہ ارکانِ سفارت کو قید کر دیا، اور ہرقل کو جواب میں ایک توبیخ نامہ لکھا جس کا عنوان یہ تھا:

"خسرو، خداوند بزرگ، فرماں روائے عالم کی جانب سے اس کے احمق اور کمینہ غلام ہرقل کے نام"[3]

بدعہدی | عہد و پیمان کے احترام پر حملہ کرنے میں بھی یہ مہذب قومیں چنداں کم حوصلہ نہ تھیں۔ ان کے نزدیک ضرورتِ وقت کے سامنے عہد کوئی چیز نہ تھا۔ تاریخ میں اس قسم کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں کہ جب کبھی قیاصرۂ روم یا اکاسرۂ فارس نے اپنے دشمن کو نازک حالت میں مبتلا دیکھا، بے تکلف معاہدات کو

---

[1] Sykes. Vol 1, P. 426

[2] Sykes. Vol. 1, P. 494

[3] Byzantine Empire, P. 101

بالائے طاق رکھکر اعلان جنگ کر دیا۔ اور تو اور خود نوشیروان اور جسٹنین بھی جو رومی و ایرانی تہذیب کے بہترین نمائندے تھے، بدعہدوں کی فہرست میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ نوشیروان کو جب اپنے اندرونی احوال کی اصلاح کے لئے امن کی ضرورت ہوئی تو اس نے جسٹنین کی خواہش صلح کو فوراً قبول کر لیا اور ایک معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ مگر جب اٹلی میں بلیساریوس کی کامیابیوں سے روم کی طاقت کو بڑھتے دیکھا تو حیرہ سے غسان پر حملہ کرا دیا اور پھر خود حیرہ کی مدد کو اٹھ کھڑا ہوا تاکہ روم بھی اپنے حلیف غسان کی مدد کرنے پر مجبور ہو جائے[1]۔

دوسری طرف جب ۵۷۱ئہ میں ایلخان اتراک نے نوشیروان سے ناراض ہو کر جسٹنین سے اتحاد کرنے کی خواہش کی تو اس نے بھی دولت ایران کو نیچا دکھانے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور معاہدۂ صلح کو توڑ کر ۵۷۲ئہ میں نوشیروان کے خلاف جنگ چھیڑ دی[2]۔

جنگ کے وحشیانہ طریقے | علمی و نظری حیثیت سے محاربین کے حقوق و فرائض کا ایک نہایت ابتدائی تصور زمانۂ قدیم سے دنیا میں موجود تھا۔ قدیم یونان کے مقننوں نے یہ قاعدہ بنایا تھا کہ جنگ میں جو لوگ مارے جائیں ان کو دفن کرنا چاہئے، مفتوح شہر کے جو لوگ معابد میں پناہ لیں انہیں قتل نہ کرنا اور کھلاڑی لوگوں یا معابد کے خادموں سے کوئی تعرض نہ کرنا چاہئے[3]۔ مگر اول تو یہ قواعد بین الملی لڑائیوں کے لئے نہ تھے بلکہ واضعین نے انہیں خود اپنی آپس کی خانہ جنگیوں کے لئے وضع کیا تھا۔ دوسرے عملی حیثیت سے سلطنتوں نے کبھی ان کو قانون کے طور پر نہ تو قبول کیا اور نہ ان کی پابندی کی۔ رومن سلطنت خصوصیت کے ساتھ غیر رومی سلطنتوں کے قانونی وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتی تھی اور ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں کسی فرض یا حق کا تصور سرے سے اس کے ہاں ناپید تھا۔ یہی حال ایران کا تھا۔ ان کے نزدیک غیر ایرانی قومیں وحشی اور ان کی سلطنتیں دراصل سلطنت ایران کی باغی تھیں۔ اس لئے

[1] Gibbon. Vol. V, Ch. XLV

[2] Sykes. Vol. 1, P. 49.

[3] Grote, History of Greece.

ان کے ساتھ جنگ کرنے میں وہ کسی قسم کے اخلاقی فرائض محسوس نہ کرتے تھے۔

روم و ایران کا فوجی نظام بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ اس میں اخلاقی حدود کی پابندی نہیں ہو سکتی تھی۔ان میں فوجی تربیت، آدابِ جنگ کی تعلیم، اور عسکری ضبط و نظم کے قائم رکھنے کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ جنگ کے موقع پر عام جنگجو باشندوں کا ایک انبوہ اُمنڈ کر آجایا کرتا تھا اور صرف یہ شوق ان کو قتل و خون کے کھیل میں شرکت کے لئے کھینچ لاتا تھا کہ ہمسایہ ممالک کو لوٹیں، مخالف قوموں کو تہس نہس کریں، خوش باشی کے لئے مال و دولت، خدمت کے لئے لونڈی غلام، اور شہوت رانی کے لئے خوبصورت لڑکیاں حاصل کریں۔ خود ان کے فرماں رواؤں کے سامنے بھی جنگ کا کوئی اخلاقی نصب العین نہ ہوتا تھا بلکہ وہ محض دشمن کو نیچا دکھانے یا تباہ کر دینے کے لئے تلوار اٹھایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ان کی فوجیں کسی ملک میں پیش قدمی کرتی تھیں تو بچے، بوڑھے، عورتیں، جانور، درخت، معبد، مندر، غرض کوئی چیز ان کی دست برد سے نہ بچتی تھی۔ جو لوٹا جا سکتا لوٹ لیا جاتا، اور جو نہ لوٹا جا سکتا، اس کو آگ کی نذر کر دیا جاتا تھا۔

روم سے افریقیہ کے ونڈالوں اور یورپ کے گاتھوں کی ہمیشہ جنگ رہتی تھی۔ ان کے ساتھ جو وحشیانہ برتاؤ کیا جاتا تھا اس کے ذکر سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ قیصر جسٹنین کے زمانہ میں جب ونڈالوں پر چڑھائی کی گئی تو ان کی پوری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ جنگ سے پہلے اس قوم میں ۱۶۰۰۰۰ ابہر آزما مرد تھے، اور ان کے علاوہ عورتوں، بچوں اور غلاموں کی بھی ایک تعداد کثیر موجود تھی۔ مگر رومی فاتحوں نے جب ان پر قابو پایا تو ان میں سے ایک متنفس کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ گبن کہتا ہے کہ سارا ملک ایسا تباہ کر دیا گیا تھا کہ ایک اجنبی سیاح اس کے ویرانوں میں سارے سارے دن گھومتا تھا اور کہیں آدمزاد کی شکل نہ دکھائی دیتی تھی۔ پروکوپیوس نے جب اوّل اوّل اس سرزمین پر قدم رکھا تھا تو اس کی آبادی کی کثرت اور تجارت و زراعت کی فراوانی دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔ مگر ۲۰ سال سے بھی کم عرصہ میں وہ تمام گہما گہمی ویرانی سے بدل گئی اور پچاس لاکھ کی عظیم الشان آبادی جسٹنین کے حملوں اور جفا کاریوں کی بدولت فنا کے گھاٹ اتر گئی۔[1]

[1] Gibbon. Vol. V, Ch. XLIII.

یورپ میں گاتھوں کے ساتھ بھی ایسی وحشیانہ سلوک ہوا، یہاں تک کہ ہم سنتے ہیں کہ ان کا بادشاہ ٹوٹیلا جب میدان جنگ سے زخمی ہوکر بھاگا اور ایک دور دراز مقام پر جاکر مرگیا تو رومی سپاہی اس کی تلاش میں نکلے، اس کی لاش کا سراغ لگایا، اس کو برہنہ کرکے ڈالدیا، اور اس کے خون آلود کپڑوں کو تاج سمیت قیصر جسٹنین کے پاس تحفتہً بھیجا۔[1]

سنہ ء میں ٹیٹوس رومی نے جب بیت المقدس فتح کیا تو سنتے ہیں کہ دراز قامت حسین لڑکیاں فاتح کے لئے چن لی گئیں، ۱۷ سال سے زیادہ عمر کے آدمی ہزار در ہزار پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لئے بھیجدیئے گئے، کئی ہزار آدمیوں کو گرفتار کرکے سلطنت کے مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ انہیں تھیٹروں اور کلوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے اور شمشیر زنوں سے کٹوانے یا خود آپس میں ایک دوسرے کو کاٹنے کے کام میں لایا جاسکے۔ دوران جنگ میں ۹۷ ہزار آدمی گرفتار کیئے گئے جن میں سے ۱۱ ہزار صرف اس وجہ سے مرگئے کہ ان کے نگہبانوں نے انہیں کھانے کو نہیں دیا۔ ان کے علاوہ جنگ اور قتل عام میں جو لوگ ہلاک ہوئے ان کی مجموعی تعداد ۱۳۳۷۴۹۰ بتائی جاتی ہے۔[2]

روم و ایران کی باہمی لڑائیوں میں بھی اسی قسم کی وحشیانہ حرکات کی جاتی تھیں۔ شاپور ذوالاکتاف نے جب الجزیرہ میں پیش قدمی کی اور امیدا (موجودہ دیار بکر) زیادہ شدید مزاحمت کے بعد فتح ہوا تو غضبناک فاتح نے شہر میں داخل ہوکر قتل عام کا حکم دے دیا اور اس کو ایسا اجاڑا کہ پھر نہ پنپ سکا۔ سنہ ۵۴۰ء میں جب نوشیروان نے شام پر چڑھائی کی تو اس کے دار الحکومت انطاکیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی، باشندوں کا قتل عام کیا، عمارتوں کو مسمار کیا، اور جب اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو شہر میں آگ لگادی۔ سنہ ۵۷۲ء میں نوشیروان نے پھر شام پر خروج کیا، فامیا اور انطاکیہ وغیرہ کو لوٹا، جلایا، ۲۹۲۰۰۰ شامیوں کو پکڑ کر ایران بھیجدیا، اور بہت سی خوبصورت لڑکیاں چن کر ایلخان اتراک کے پاس بھیجیں تاکہ اس کی ناراضی دور ہو اور وہ جسٹنین سے اتحاد چھوڑ دے۔ سنہ ۵۷۳ء میں اس سلسلے

[1] Gibbon. Vol. V Ch. XLIII.

[2] Ferrar, Early Days of Christianity, P.P. 488-89

آرمینیا پر حملہ کیا اور جب تھیوڈوسیوپولیس کو فتح نہ کر سکا تو کیپیڈوسیا دقباذق) میں گھس کر ہر چیز کو جو سامنے آئی تباہ کر دیا، یہاں تک کہ ملطیہ (Melitine) کو جلا کر خاک کر ڈالا۔ اخیر زمانہ میں خسرو پرویز کے جو زبردست حملہ سلطنت روم پر کیا تھا وہ شام، فلسطین اور ایشیائے کوچک کے لئے قیامت کا نمونہ تھا، تنہا بیت المقدس میں جو ستم ڈھائے گئے ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ دمشق انطاکیہ اور حلب وغیرہ شہروں کا حشر بھی کچھ اس سے کم مختلف نہ تھا۔[1]

یہ وحشیانہ حرکات بعض اوقات بدترین مکر و فریب اور بزدلانہ سازشوں کی شکل میں بھی ظاہر ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ اردشیر کا واقعہ مشہور ہے کہ جب وہ خسرو ارمنستان کو فوجی قوت سے مغلوب نہ کر سکا تو اس نے اپنی فوج کے ایک افسر کو خفیہ طریقہ سے بھیجکر اسے قتل کرا دیا[2]۔ روم و ایران کی تاریخ میں اس قسم کے واقعات شاذ نہیں ہیں۔

اسیران جنگ کی حالت | سب سے زیادہ بدتر سلوک جس جماعت کے ساتھ کیا جاتا تھا وہ اسیران جنگ کی جماعت تھی۔ قدیم رومی و یونانی اپنے سوا دوسری قوموں کو وحشی و بربرور (Barbarians) سمجھتے تھے اور انکے قانون میں اس بد قسمت مخلوق کیلئے قتل یا غلامی کے سوا کوئی تیسری صورت موجود ہی نہ تھی۔ ارسطو جیسا معلم اخلاق بے تکلف کہتا ہے کہ قدرت نے بربری کو محض غلامی کیلئے پیدا کیا ہے[3]۔ ایک دوسرے مقام پر وہ بعض ترددات کے جائز اور معتزل طریقے گنانے ہوئے کہتا ہے کہ ان قوموں کو غلام بنانے کیلئے جنگ کرنا بھی اُن میں شامل ہے جنہیں قدرت نے اسی غرض کیلئے پیدا کیا ہے[4]۔

ایک طرف ان عقائد نے رومیوں کے ذہن میں غیر قوموں کی جان و مال کو بے قدر کر دیا تھا، دوسری طرف رومی سوسائٹی کی پرورش کچھ ایسی بہیمیت کی فضا میں ہوئی تھی کہ لوگ اپنے کھیل تماشوں میں ہیبتناک نظارے دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور ان نظاروں میں مجاز کے بجائے حقیقت کو دیکھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اگر کسی گھر کو جلتے ہوئے دکھانا ہو تو وہ چاہتے تھے کہ فی الواقع ایک گھر جلا دیا جائے۔ اسی طرح کسی

---

[1] یہ تمام تفصیلات گبن، سائکس اور فورڈ کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

[2] Sykes, Vol. 1 PP. 427-28

[3] Politics. Bk. 1, Chs II, VI.

[4] Politics, Bk. 1, Ch. VIII

آدمی کا زندہ جلایا جانا، یا کسی مجرم کو شیروں سے پھڑواتے ہوئے دکھانا منظور ہوتا تو تماشائیوں کی تسلی اس کے بغیر نہ ہوتی تھی کہ ایک آدمی واقعی زندہ جلا دیا جائے اور ایک دوسرے آدمی کو واقعی شیروں کے پنجرے میں چھوڑ دیا جائے۔ اس کام کے لئے انہیں ہمیشہ ایسے آدمیوں کی ضرورت رہتی تھی جنہیں ان وحشیانہ کھیلوں کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ رومؔ کے آزاد شہری اس کے لئے موزوں نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا دوسرے ملکوں سے لڑائیوں میں جو قیدی پکڑے ہوئے آتے ان کو اس خونی تفریح کا سامان بنایا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ کھیل اتنے بڑے پیمانہ پر ہوتے تھے کہ کئی کئی ہزار آدمیوں کو بیک وقت تلوار کی نذر کر دیا جاتا تھا۔ ٹیٹوس نے جو "نسل انسانی کا دُلارا" (Darling of the human race) کہلاتا ہے، ایک دفعہ ۵۰ ہزار درندہ جانوروں کو پکڑوایا اور کئی ہزار یہودی قیدیوں کو ان کے ساتھ ایک احاطہ میں چھڑوا دیا۔ ٹراجانؔ کے کھیلوں میں گیارہ ہزار درندے اور دس ہزار آدمی بیک وقت لڑائے جاتے تھے۔ کلاڈیوس نے ایک دفعہ جنگی کھیل میں ۱۹ ہزار آدمیوں کو تلواریں دیکر ایک دوسرے سے لڑا دیا۔ قیصر آگسٹس نے اپنی وصیت کے ساتھ جو تحریر منسلک کی تھی اس میں لکھتا ہے کہ میں نے ۸ ہزار شمشیر زنوں اور ۳۵۱۰ جانوروں کے کھیل دیکھے ہیں۔ یہ سب تفریحات جنگی قیدیوں ہی کے دم قدم سے چل رہی تھیں۔

اس کے علاوہ اسیران جنگ کا دوسرا مصرف یہ تھا کہ آزاد رومیوں کی غلامی کریں۔ سوسائٹی میں ان کا درجہ سب سے نیچا تھا۔ ان کے کوئی متعین حقوق نہ تھے۔ ان کی جان کی کوئی قیمت نہ تھی۔ ان کی زندگی کا مقصد اپنے آقاؤں کی ہر خواہش کو پورا کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ فیررؔ کے بقول "وہ ذلت کے بچپن، مشقت کی جوانی، اور بیرحمانہ تغافل کے بڑھاپے میں پیدائش سے موت تک کے مراحل طے کرتے تھے"[1] رومی قانون میں غلاموں کے لئے اس قدر سخت قوانین تھے کہ اگر کوئی غلام اپنے آقا پر دست درازی کرتا تو اس کو اور بعض اوقات اس کے سارے خاندان تک کو موت کی سزا دے دی جاتی تھی[2]۔ ۶۱ء میں

---

[1] Ferrar, P. 2.

[2] Rev. Cutts, Constantine the Great, P. 57

جب ہرقل کی تخت نشینی کے تھوڑے عرصہ بعد اس کی بیوی یوڈوکسیا کا انتقال ہوا اور اس کا جنازہ قبرستان کی طرف چلا، تو اتفاق سے ایک لونڈی نے اس کی مشایعت کرتے ہوئے زمین پر تھوک دیا۔ اس قصور میں وہ فوراً گرفتار کر لی گئی اور اس کے قتل کا حکم دیا گیا۔[1]

فیرر کا بیان ہے کہ جب روم کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو نہایت کثرت سے اسیران جنگ مملکت میں آنے لگے اور ایک وقت میں ان کی مجموعی تعداد ۲ کروڑ تک پہنچ گئی تھی۔[2]

روم کی طرح ایران میں بھی اسیرانِ جنگ کے لئے کسی قسم کی رعایت نہ تھی۔ معمولی قیدی تو درکنار خود قیصرِ روم والیریان جب شاپور اول کے ہاتھ قید ہوا تو اسے زنجیروں سے باندھ کر شہر میں گشت کرایا گیا، عمر بھر اس سے غلاموں کی طرح خدمت لی گئی اور مرنے کے بعد اس کی کھال کھنچوا کر اس میں بھس بھروا دیا گیا۔[3] شاپور ذوالاکتاف کا واقعہ مشہور ہے کہ بحرین اور الحسا کے عرب اسیرانِ جنگ سے انتقام لینے کے لئے اس نے حکم دیا تھا کہ ان کے شانوں میں سوراخ کر کے ان کے اندر رسیاں پروئی جائیں اور سب کو ملا کر باندھ دیا جائے۔[4] اسی بنا پر تاریخ نے اس کو ذوالاکتاف کے نام سے یاد رکھا ہے۔

خونخواری کی یہ داستانیں اور بھی زیادہ ہولناک ہو جاتی ہیں جب ہم سنتے ہیں کہ نوعِ انسان پر یہ ظلم و ستم کسی اعلیٰ مقصد کے لئے نہیں کئے جاتے تھے بلکہ محض ناموری و شہرت کے حصول اور شاہانہ ہیبت و جلال کے اظہار کے لئے کئے جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا خون محض بادشاہوں کی ذلیل ترین نفسانی خواہشات کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا۔ خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ خسرو پرویز نے نعمان بن منذر کی بیٹی کے حسن کی تعریف سنی اور اس کو حکم دیا کہ اپنی لڑکی شاہی حرم میں داخل کرے۔ نعمان کی عربی غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا اور صاف انکار کر دیا۔

---

[1] Byzantine Empire, P. 99.

[2] Ferrar, P. 2

[3] Sykes, Vol 1.

[4] Sykes, Vol. 1.

اس پر خسرو نے فرمان صادر کیا کہ حیرہ کی ریاست ضبط کی جائے اور نعمان گرفتار کر لیا جائے۔ نعمان اپنے بال بچوں کو بنی شیبان کی حفاظت میں دے کر خود کسریٰ کے دربار میں پہنچا کہ عفو تقصیر چاہے۔ مگر کسریٰ نے اسے قتل کرا دیا اور ۴۰ ہزار کی زبردست فوج بھیجی تاکہ بنی شیبان سے نعمان بن منذر کے گھر والوں کو چھین لائے۔ ذوقار کے مقام پر اس فوج کی عربوں سے ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں طرفین کے ہزاروں آدمی مارے گئے اور صرف اتنی سی بات پر انسانی خون کی ندیاں بہ گئیں کہ ایک بادشاہ اپنے پہلو میں ایک حسین عورت کو دیکھنا چاہتا تھا۔

اس مختصر تاریخی بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس عہد میں جنگ کے اخلاقی حدود، محاربین کے حقوق و فرائض، عداوت میں ضبطِ نفس، اور لڑائی میں رحم و غضب کے امتزاج کا وجود کیا معنی؛ ذہنوں میں اس کا تصور تک نہ تھا، اور مہذب ترین قومیں بھی، جہاں تک جنگ کا تعلق ہے، وحشت و حیوانیت کے ابتدائی درجہ میں تھیں۔ اس زمانہ میں جنگ کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ ایک ہنگامۂ قتل و خون اور فتنۂ سلب و نہب ہے جو طاقتور کی ہر خواہش اور ضرورت کو پورا کرنے کے لئے برپا کیا جا سکتا ہے۔ شقاوت و سنگدلی، وحشت و بربریت، درندگی و سفاکی عین جنگ کی حقیقت میں داخل ہو گئی تھی۔ لفظِ جنگ بولتے ہی آدمی کا ذہن ایک ایسی چیز کی طرف منتقل ہو جاتا تھا جو اپنے اندر انسان کی جان لینے اور اس کی آبادیوں کو غارت کرنے کے ہر طریقہ کو متضمن تھی۔ صدیوں کے تعامل نے جنگ کے ساتھ وحشیانہ حرکات کا اس قدر گہرا تعلق قائم کر دیا تھا کہ انسان مشکل ہی سے کسی ایسی جنگ کا تصور کر سکتا تھا جس میں لوٹ مار، قتلِ عام، آتش زنی اور تباہ کاری نہ ہو، جس میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں، زخمیوں اور بیماروں کو قتل نہ کیا جاتا ہو، جس میں دوسرے مذہب و ملت کے معابد و آثار کی بے حرمتی اور تخریب نہ کی جاتی ہو اور جو اخلاقی حدود کی پابندی کے ساتھ لڑی جاتی ہو۔

۳- اسلام کی اصلاحات

یہ دنیا تھی جس میں اسلام نے اصلاح کا علم بلند کیا۔ اس نے حقیقتِ جنگ کو بدل کر بالکل ایک

نیا نظریہ پیش کیا جس سے اس وقت تک کی دنیا نا آشنا تھی۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ جنگ و قتال فی الاصل ایک معصیت ہے جس سے ہر انسان کو اجتناب کرنا چاہیئے، لیکن جب دنیا میں اس سے بڑی معصیت یعنی ظلم و طغیان اور فتنہ و فساد پھیل گیا ہو اور سرکش لوگوں نے خلق خدا کے امن و راحت کو خطرہ میں ڈال دیا ہو، تو محض دفع مضرت کے لئے جنگ کرنا ضروری اور ضروری ہی نہیں بلکہ فرض ہے۔

جنگ کا اسلامی تصور اس نظریہ کے مطابق چونکہ جنگ کا اصلی مقصد حریف مقابل کو ہلاک کرنا اور نقصان پہنچانا نہیں بلکہ محض اس کے شر کو دفع کرنا ہے، اس لئے اسلام یہ اصول پیش کرتا ہے کہ جنگ میں صرف اتنی ہی قوت استعمال کرنی چاہیئے جتنی دفع شر کے لئے ناگزیر ہو، اور اس قوت کا استعمال صرف انہیں طبقوں کے خلاف ہونا چاہئیے جو عملاً برسرِ پیکار ہوں، یا حد سے حد جن سے شر کا اندیشہ ہو، باقی تمام انسانی طبقات کو جنگ کے اثرات سے محفوظ رہنا چاہیئے، اور دشمن کی ان چیزوں تک بھی ہنگامۂ کارزار کو متجاوز نہ ہونا چاہیئے جن کو اس کی جنگی قوت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جنگ کا یہ تصور ان تصورات سے مختلف تھا جو عام طور پر غیر مسلم دماغوں میں موجود تھے، اس لئے اسلام نے تمام رائج الوقت اصطلاحات کو چھوڑ کر جہاد فی سبیل اللہ کی الگ اصطلاح وضع کی جو اپنے معنی موضوع لہ پر ٹھیک ٹھیک دلالت کرتی ہے اور وحشیانہ جنگ کے تصورات سے اس کو بالکل جدا کر دیتی ہے۔ لغت کے اعتبار سے جہاد کے معنی ہیں "کسی کام یا مقصد کے حصول میں انتہائی کوشش صرف کرنا"۔ اس لفظ میں نہ تو حرب کی طرح خشم اور سلب و نہب کا مفہوم شامل ہے، نہ روع کی طرح خوف و دہشت کا۔ نہ شر کی طرح بدی و شرارت کا، نہ نطاح کی طرح بہیمیت و حیوانیت کا، اور نہ کریہہ کی طرح مصیبت و شدت کا۔ برعکس اس کے وہ صاف صاف ظاہر کرتا ہے کہ مجاہد کا اصل منشا مضرت کو دفع کرنا ہے اور اس کے لئے وہ اتنی کوشش کرنا چاہتا ہے جتنی دفع مضرت کے لئے درکار ہو۔ مگر محض "کوشش" کا لفظ بھی ادائے مفہوم کے لئے کافی نہ تھا، کیونکہ اس سے جہت ظاہر نہیں ہوتی۔ "کوشش" نیکی کی جہت میں بھی ہو سکتی ہے اور بدی کی جہت میں بھی۔ اس لئے مزید تحدید کے لئے فی سبیل اللہ کی قید لگا دی تاکہ نفس کی کسی خواہش، کسی ملک کی تسخیر، کسی عورت کے وصال، کسی ذاتی عداوت کے انتقام، یا ان

دولت یا حکومت و اقتدار یا شہرت و ناموری کے حصول کی خاطر کوشش کرنا، اس میں داخل نہ ہوسکے اور صرف وہی کوشش مراد لی جائے جو محض اللہ کے لئے ہو، جس میں ہوائے نفس کا شائبہ تک نہ ہو، اور جس کو ایسے مقاصد کے حصول میں صرف کیا جائے جنہیں اللہ نے پسند کیا ہے۔

اس پاکیزہ تصور کے ماتحت اسلام نے جنگ کا ایک مکمل ضابطۂ قانون وضع کیا جس میں جنگ کے آداب، اس کے اخلاقی حدود، محاربین کے حقوق و فرائض، مقاتلین اور غیر مقاتلین کا امتیاز اور ہر ایک کے حقوق، معاہدین کے حقوق، سفراء اور اسیرانِ جنگ کے حقوق، مفتوح قوموں کے حقوق، تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہر ایک کے لئے قواعد کلیہ اور حسب ضرورت جزئی احکام مقرر کئے۔ ان کے ساتھ داعیٔ اسلام اور خلفائے راشدینؓ نے نظائر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بھی چھوڑا تاکہ قانون پر عملدرآمد کرنے اور قواعد کلیہ کو احوال جزئیہ پر منطبق کرنے کا طریقہ واضح ہو جائے۔

مقصدِ جنگ کی تطہیر | لیکن اس قانون سازی کا مدعا صرف اتنا ہی نہ تھا کہ کاغذ پر ایک ضابطۂ قوانین آجائے، بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ عملی خرابیوں کی اصلاح کی جائے اور جنگ کے وحشیانہ طریقوں کو مٹا کر اس مہذب قانون کو رائج کیا جائے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اس غلط تصور کو دلوں سے محو کرنے کی ضرورت تھی جو صدیوں سے جما ہوا تھا۔ لوگوں کی عقلیں یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ جب مال و دولت کے لئے جنگ نہ کی جائے، ملک و زمین کے لئے نہ کی جائے، شہرت و ناموری کے لئے نہ کی جائے، حمیت و عصبیت کے لئے نہ کی جائے، تو پھر جنگ کا اور کونسا مقصد ہو سکتا ہے جس کے لئے انسان اپنی جان جوکھوں میں ڈال دے؟ وہ ایسی جنگ کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے جس کو انسان کی خود غرضی اور نفسانیت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ لہٰذا داعیٔ اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے پہلا کام یہی کیا، کہ جہاد فی سبیل اللہ کے معنی، اور وہ حدود جو اسے جہاد فی سبیل الطاغوت سے ممتاز کرتے ہیں، پوری طرح واضح کر دیئے اور مختلف طریقوں سے جنگ کے اس پاک تصور کو لوگوں کے ذہن نشین کیا۔ اس بارے میں کثرت سے احادیث آئی ہیں جن میں سے چند کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔[1]

[1] اس باب میں جتنی احادیث نقل کی گئی ہیں، اکثر بخاری (کتاب الجہاد و کتاب المغازی) مسلم (کتاب الجہاد والسیر) ابو داؤد و نسائی سے ماخوذ ہیں

ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ:-

جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال، الرجل یقاتل للمغنم؛ والرجل یقاتل للذکر، والرجل یقاتل لیری مکانہ فمن فی سبیل اللہ؟ قال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ،

ایک شخص رسول اللہ صلعم کے پاس حاضر ہوا اور بولا کہ کوئی شخص مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے، کوئی شہرت وناموری کے لئے جنگ کرتا ہے، کوئی اپنی بہادری دکھانے کے لئے جنگ کرتا ہے، فرمائیے کہ ان میں سے کس کی جنگ راہِ خدا میں ہے؟ حضور نے جواب دیا کہ راہ خدا کی جنگ تو صرف اس شخص کی ہے جو محض اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے لڑے۔

یہی ابوموسیٰؓ روایت کرتے ہیں:-

جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ، القتال فی سبیل اللہ؟ فان احدنا یقاتل غضبا ویقاتل حمیۃ فرفع الیہ رأسہ فقال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ،

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور بولا کہ یارسول اللہ قتال فی سبیل اللہ کیا ہے؟ ہم میں سے کوئی جوشِ غضب میں لڑتا ہے اور کوئی حمیتِ قومی کی بنا پر۔ آپ نے سر اٹھایا اور جواب دیا کہ جو شخص اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے لڑتا ہے اسی کی جنگ راہ خدا میں ہے۔

ابوامامہ باہلیؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا ارایت رجلا غزا یلتمس الاجر والذکر، ماله؟ "اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو مالی فائدے اور ناموری کے لئے جنگ کرتا ہے؛ ایسے شخص کو کیا ملے گا؟" آنحضرت صلعم نے جواب دیا لا شئی له "اس کو کچھ ثواب نہ ملے گا۔" سائل کے لئے یہ بات عجیب تھی، پلٹ کر پھر آیا اور پھر یہی سوال کیا۔ آپؐ نے دوبارہ وہی جواب دیا۔ اس کا اطمینان اب بھی نہ ہوا، تیسری اور چوتھی مرتبہ پلٹ پلٹ کر آیا اور یہی سوال کرتا رہا۔

(بقیہ نوٹ ۱) (کتاب الامارۃ)، ابوداؤد (کتاب الجہاد وکتاب الفئ والامارۃ)، نسائی (کتاب الجہاد)، ابن ماجہ (ابواب الجہاد)، ترمذی (ابواب السیر وابواب الجہاد)، موطا امام مالک (کتاب الجہاد) سے ماخوذ ہیں۔

آخر آنحضرت صلعم نے اس کو مطمئن کرنے کے لئے فرمایا ان اللہ لا یقبل من العمل الا ما کان لہ خالصًا وابتغی بہ وجہہ۔" اللہ کوئی عمل اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک وہ خالص اسی کی خوشنودی ورضا کے لئے نہ کیا جائے"۔

عبادہ بن الصامت سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا من غزا فی سبیل اللہ ولم ینو الا عقالا فلہ ما نوی۔" جس نے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور صرف ایک اونٹ باندھنے کی رسی کی نیت کر لی تو بس اس کو وہ رسی ہی ملے گی، ثواب کچھ نہ ملے گا"۔

معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:-

الغزو غزوان، فاما من ابتغی وجہ اللہ واطاع الامام، وانفق الکریمۃ، واجتنب الفساد فان نومہ ونبہتہ اجر کلہ، واما من غزا ریاء وسمعۃ وعصی الامام و افسد فی الارض فانہ لا یرجع بالکفاف،

لڑائیاں دو قسم کی ہیں جس شخص نے خالص اللہ کی رضا کے لئے لڑائی کی اور اس میں امام کی اطاعت کی، اپنا بہترین مال خرچ کیا اور فساد سے پرہیز کیا تو اس کا سونا، جاگنا سب اجر کا مستحق ہے۔ اور جس نے دنیا کے دکھاوے اور شہرت و ناموری کے لیے جنگ کی اور اس میں امام کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد پھیلایا، تو وہ برابر بھی نہ چھوٹے گا (یعنی الٹا عذاب میں مبتلا ہوگا)

حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اول الناس یقضی لہم یوم القیامۃ ثلاثۃ، رجل استشہد فاتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفہا قال فما عملت فیہا قال قاتلت فیک حتی استشہدت قال کذبت ولکنک قاتلت لیقال فلان جری فقد قیل ثم امر بہ فسحب علی وجہہ حتی القی فی النار، الحدیث۔

قیامت کے دن سب سے پہلے تین قسم کے آدمیوں کا فیصلہ کیا جائیگا۔ پہلے وہ شخص لایا جائیگا جو لڑکر شہید ہوا تھا۔ خدا اس کو اپنی نعمتیں جتائیگا اور جب وہ ان کا اقرار کر لیگا، تو پھر خدا پوچھیگا کہ تونے میرے لئے کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے تیرے لئے جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ اس پر خدا فرمائیگا تو نے جھوٹ بولا، تو تو اس لئے لڑا تھا کہ لوگ کہیں کہ فلاں شخص بڑا جری ہے، سو تیرا یہ مقصد پورا ہو گیا پھر خدا اس کے لئے عذاب کا حکم دیگا اور

اسے منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائیگا، الخ

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

یجئی الرجل آخذا بید رجل فیقول یارب! ھذا اقتلنی، فیقول اللہ لہ لم قتلتہ؟ فیقول قتلتہ لتکون العزۃ لک فیقول انھا لی، ویجئی الرجل آخذا بید الرجل فیقول ان ھذا اقتلنی، فیقول اللہ لم قتلتہ؟ فیقول لتکون العزۃ لفلان فیقول انھا لیست لفلان فیبوء باثمہ۔

قیامت کے دن ایک شخص دوسرے شخص کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئیگا اور عرض کریگا کہ اے رب اس نے مجھے قتل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ دریافت کریگا کہ تونے اس کو کیوں قتل کیا؟ تو وہ کہے گا کہ میں نے اسے اس لئے قتل کیا تھا کہ عزت تیرے لئے ہو۔ اس پر خدا فرمائیگا کہ ہاں عزت میرے ہی لئے ہے۔ پھر ایک دوسرا شخص ایک شخص کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئیگا اور عرض کریگا کہ اس نے مجھے قتل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ تونے اسے کیوں قتل کیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے اس لئے قتل کیا کہ عزت فلاں کے لئے ہو۔ اس پر اللہ کہے گا کہ عزت اس کا حق تو نہ تھی پھر وہ اس کے گناہ میں پکڑا جائے گا۔

یہ تعلیم جنگ کو ہر قسم کے دنیوی مقاصد سے پاک کر دیتی ہے۔ شہرت و ناموری کی طلب، عزت و فرمانروائی کی خواہش، مال و دولت اور حصولِ غنائم کی طمع، شخصی و قومی عداوت کا انتقام، غرض کوئی دنیوی غرض ایسی نہیں ہے جس کے لئے جنگ جائز رکھی گئی ہو۔ ان چیزوں کو الگ کر دینے کے بعد جنگ محض ایک خشک و بے مزہ اخلاقی و دینی فرض رہ جاتی ہے جس کے مہالک و خطرات میں مبتلا ہونے کی از خود خواہش تو کوئی کر ہی نہیں سکتا، اور اگر دوسرے کی طرف سے فتنہ کی ابتدا ہو تب بھی صرف اس وقت مقابلہ کے لئے تلوار اٹھا سکتا ہے جب کہ اصلاح حال اور دفع ضرر کے لئے تلوار کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہ رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی فرما دیا ہے کہ

لا تتمنوا لقاء العدو وسلوا اللہ العافیۃ فاذا لقیتموھم فاصبروا واعلموا ان الجنۃ تحت ظلال السیوف،

دشمن سے مقابلہ کی تمنا نہ کرو، بلکہ اللہ سے امن وعافیت کی دعا کیا کرو، مگر جب دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو پھر جم کر لڑو، اور جان لو کہ جنت تلواروں کے

سایہ تلے ہے۔"

طریق جنگ کی تطہیر مقصد کی اصلاح کے ساتھ داعیٔ اسلام نے طریق حصول مقصد کی بھی اصلاح کی اور رفتہ رفتہ ان تمام وحشیانہ حرکات کو روک دیا جو جاہلیت کی لڑائیوں میں کی جاتی تھیں، اس کے متعلق انتناعی احکام بکثرت موجود ہیں جن میں مجموعاً و منفرداً تمام وحشیانہ افعال سے منع کیا گیا ہے۔

غیر اہل قتال کی حرمت اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ محاربین (Belligerents) کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا، ایک اہل قتال (Combatants) دوسرے غیر اہل قتال (Non-Combatants)۔ اہل قتال وہ ہیں جو عملاً جنگ میں حصہ لیتے ہیں، یا عقلاً و عرفاً حصہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں یعنی جوان مرد۔ اور غیر اہل قتال وہ ہیں جو عقلاً و عرفاً جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے، یا عموماً نہیں لیا کرتے، مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی، اندھے، مقطوع الاعضا، مجنون، سیاح، خانقاہ نشین، زاہد، معبدوں اور مندروں کے مجاور اور ایسے ہی دوسرے بے ضرر لوگ۔ اسلام نے طبقۂ اول کے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے، اور طبقۂ دوم کے لوگوں کو قتل کرنے سے منع کر دیا ہے۔

ایک مرتبہ میدان جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کی لاش پڑی دیکھی۔ ناراض ہو کر فرمایا کہ ما کانت ھٰذہ تقاتل فیمن یقاتل۔ یہ تو لڑنے والوں میں شامل نہ تھی۔ پھر سالار فوج حضرت خالدؓ کو کہلا بھیجا کہ لا تقتلن امرأۃ ولا عسیفاً "عورت اور اجیر کو ہرگز نہ قتل کرو"۔ ایک دوسری روایت کے مطابق اس کے بعد آپ نے عورتوں اور بچوں کے قتل کی عام ممانعت فرما دی، فنھی النبی عن قتل النسآء والصبیان۔

ایک حدیث میں آیا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

لا تقتلوا شیخا فانیا ولا طفلاً صغیراً ولا امرأۃ، ولا تغلوا وضموا غنائمکم واصلحوا واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین۔

نہ کسی بڈھے ضعیف کو قتل کرو، نہ چھوٹے بچے کو اور نہ عورت کو۔ اموال غنیمت میں چوری نہ کرو، جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے سب ایک جگہ جمع کرو، نیکی و احسان کرو کیونکہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر آپ نے پہلے سے ہدایت فرما دی کہ کسی زخمی پر حملہ نہ کرنا، جو کوئی جان بچا کر بھاگے اس کا پیچھا نہ کرنا، اور جو اپنا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے اسے امان دینا۔[1]

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم جب کہیں فوج بھیجتے تھے تو ہدایت کر دیتے تھے کہ معابد کے بے ضرر خادموں اور خانقاہ نشین زاہدوں کو قتل نہ کرنا، لا تقتلوا اصحاب الصوامع۔

ان مختلف جزئی احکام سے فقہائے اسلام نے یہ قاعدۂ کلیہ مستنبط کیا ہے کہ تمام وہ لوگ جو لڑنے سے معذور ہیں، یا عادۃً معذور کے حکم میں ہیں قتال سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن ان کا استثناء علی الاطلاق نہیں ہے، بلکہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ عملاً جنگ میں حصہ نہ لیں۔ اگر ان میں سے کوئی اعمالِ جنگ میں فی الواقع شرکت کرے، مثلاً بیمار، پلنگ پر لیٹے لیٹے فوجوں کو جنگی چالیں بتا رہا ہو، یا عورت غنیم کی جاسوسی کا کام کر رہی ہو، یا بچہ خفیہ خبریں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو، یا مذہبی طبقہ کا کوئی فرد دشمن قوم کو جنگ کا جوش دلا رہا ہو، تو اس کا قتل جائز ہو گا، کیونکہ اس نے خود اپنے آپ کو مقاتلین میں شامل کر کے غیر مقاتلین کے حقوق سے محروم کر لیا۔ اس باب میں اسلامی قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص جو اہلِ قتال میں سے ہے، اس کا قتل جائز ہے، خواہ وہ بالفعل لڑے یا نہ لڑے، اور ہر شخص جو اہلِ قتال سے نہیں ہے، اس کا قتل ناجائز ہے سوائے اس صورت کے کہ وہ حقیقۃً لڑائی میں شامل ہو، یا مقاتلین کے کام کرنے لگے۔[2]

اہلِ قتال کے حقوق | غیر اہلِ قتال کے حقوق بیان کرنے کے بعد یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اہلِ قتال جن پر تلوار اٹھانا جائز ہے، ان پر بھی دست درازی کا غیر محدود حق حاصل نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے بھی کچھ حدود ہیں، جن کی پابندی ضروری ہے۔ یہ حدود ایک ایک کر کے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

غفلت میں حملہ کرنے سے احتراز | اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ راتوں کو اور خصوصاً آخر شب میں جبکہ لوگ بے خبر ہوتے ہوں، اچانک جا پڑتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عادت کو بند کر دیا

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۷۔

[2] ہدایہ باب کیفیۃ القتال، فتح القدیر ج ۴ ص ۲۹۲ - ۲۹۰، بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۰۱۔

اور قاعدہ مقرر کیا کہ صبح سے پہلے کسی دشمن پر حملہ نہ کیا جائے۔ انس بن مالکؓ غزوۂ خیبر کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:-

کان اذا جاء قوما بلیل لم یغر علیھم حتی یصبح — آنحضرت صلعم جب کسی دشمن قوم پر رات کے وقت پہنچتے تو جبتک صبح نہ ہو جاتی حملہ نہ کرتے تھے۔

۲۔ آگ میں جلانے کی ممانعت | عرب اور غیر عرب شدتِ انتقام میں دشمن کو زندہ جلا دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلعم نے اس وحشیانہ حرکت کو بھی ممنوع قرار دیا۔ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:

لا ینبغی ان یعذب بالنار الا رب النار — آگ کا عذاب دینا سوائے آگ کے پیدا کرنے والے کے اور کسی کو سزاوار نہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے ہم لوگوں کو لڑائی پر جانے کا حکم دیا: اور ہدایت کی کہ اگر فلاں دو آدمی تم کو ملیں تو ان کو جلا دینا۔ مگر جب ہم روانہ ہونے لگے تو بلا کر فرمایا:-

انی امرتکم ان تحرقوا فلانا و فلانا وان النار فلا یعذب بھا الا اللہ، فان وجدتموھا فاقتلوھما، — میں نے تم کو حکم دیا تھا کہ فلاں فلاں اشخاص کو جلا دینا مگر آگ کا عذاب سوائے خدا کے کوئی نہیں دے سکتا، اس لئے اگر تم انہیں پاؤ تو بس قتل کر دینا۔

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے زنادقہ کو آگ کا عذاب دیا تھا، اس پر حضرت ابن عباسؓ نے انہیں روکا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم بیان کیا کہ لا تعذبوا بعذاب اللہ، آگ اللہ کا عذاب ہے اس سے بندوں کو عذاب نہ دو۔

۳۔ قتل صبر کی ممانعت | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کو باندھ کر قتل کرنے اور تکلیفیں دے دے کر مارنے کی بھی ممانعت فرمائی۔ عبید بن یعلی کا بیان ہے کہ ہم عبدالرحمٰن بن خالد کے ساتھ جنگ پر گئے تھے۔ ایک موقع پر ان کے پاس لشکر اعدا میں سے چار گبر پکڑے ہوئے آئے اور انہوں نے حکم دیا کہ انہیں باندھ کر قتل کیا جائے۔ اس کی اطلاع جب حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو ہوئی تو انہوں نے کہا۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے کہ آپ نے قتل صبر

نھٰی عن قتل الصبر فوالذی نفسی بیدہ لو کانت الدجاجۃ ما صبرتھا، فبلغ ذالک عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید فاعتق اربعۃ رقاب۔

ربا ندھکر مارنے سے منع فرمایا خدا کی قسم اگر مرغی بھی ہوتی تو میں اس کو اس طرح باندھ کر نہ مارتا۔ اس کی خبر جب عبد الرحمٰن بن خالد کو پہنچی تو انہوں نے چار غلام آزاد کر دیئے۔ (یعنی اپنی غلطی کا کفارہ ادا کیا)

۴۔ لوٹ مار کی ممانعت | جنگ خیبر میں صلح ہو جانے کے بعد جب اسلامی فوج کے بعض نئے رنگروٹ بے قابو ہو گئے اور انہوں نے غارتگری شروع کر دی تو یہودیوں کا سردار رسول اللہ صلعم کے پاس حاضر ہوا اور کرخت لہجہ میں آپ کو خطاب کر کے بولا یا محمد الکم ان تذبحوا حمرنا وتاکلوا ثمرنا وتضربوا نسائنا؟ اے محمد! کیا تم کو زیبا ہے کہ ہمارے گدھوں کو ذبح کرو، ہمارے پھل کھا جاؤ، اور ہماری عورتوں کو مارو؟ اس پر رسول اللہ صلعم نے فوراً ابن عوف کو حکم دیا کہ لشکر میں اجتمعوا للصلوٰۃ کی منادی کریں۔ جب تمام اہل لشکر جمع ہو گئے تو حضور کھڑے ہوئے اور فرمایا:۔

ایحسب احدکم متکئا علی اریکتہ قد یظن ان اللہ لم یحرم شیئا الا مافی ھذا القرآن؟ الا وانی واللہ قد وعظت وامرت ونھیت عن اشیاء انھا لمثل القرآن او اکثر، وان اللہ تعالیٰ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن ولا ضرب نساءھم ولا اکل ثمارھم اذا اعطوکم الذی علیھم،

کیا تم میں کا کوئی شخص تخت غرور پر بیٹھا یہ سمجھ رہا ہے کہ اللہ نے سوائے ان چیزوں کے جو قرآن میں حرام کی گئی ہیں کوئی اور چیز حرام نہیں کی؟ خدا کی قسم میں جو کچھ تم کو نصیحت کرتا ہوں اور جو امر و نہی کے احکام دیتا ہوں وہ بھی قرآن کی طرح یا اس سے زیادہ ہیں۔ اللہ نے تمہارے لئے یہ جائز نہیں کیا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں بلا اجازت گھس جاؤ، ان کی عورتوں کو مارو پیٹو، اور ان کے پھل کھا جاؤ، حالانکہ ان پر جو کچھ واجب تھا وہ تمہیں دے چکے۔

ایک دفعہ سفر جہاد میں اہل لشکر نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ان کا گوشت پکا کر کھانا چاہا۔ آنحضرت کو خبر ہوئی تو آپ نے آکر دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا ان النھبۃ لیست باحل من المیتۃ، لوٹ کھسوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے۔

عبداللہ بن یزید روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے لوٹے ہوئے مال کو حرام قرار دیا،

نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن النھبی والمثلہ۔

اگر راستہ میں دودھ دینے والے جانور مل جائیں تو ان کا دودھ دوہ کر پینے کی بھی اجازت نہیں دی گئی ہتا وقتیکہ ان کے مالکوں سے اجازت نہ لے لی جائے۔ شدید ضرورت کی حالت میں صرف اتنی اجازت ہے کہ با آواز بلند تین مرتبہ پکار دو تاکہ اگر کوئی مالک ہو تو آجائے، اور جب کوئی نہ آئے تو پی لو۔

۵۔ تباہ کاری کی ممانعت افواج کی پیش قدمی کے وقت فصلوں کو خراب کرنا، کھیتوں کو تباہ کرنا، بستیوں میں قتل عام اور آتش زنی کرنا، جنگ کے معمولات میں سے ہے۔ مگر اسلام اس کو فساد سے تعبیر کرتا ہے اور سختی کے ساتھ ناجائز قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے:۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۚ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ۔ (البقرہ۔ ۲۵)

جب وہ حاکم بنتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے اور فصلوں اور نسلوں کو برباد کرے مگر اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

حضرت ابوبکرؓ نے شام و عراق کی طرف فوجیں بھیجتے وقت جو ہدایات دی تھیں ان میں ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ بستیوں کو ویران نہ کرنا اور فصلوں کو خراب نہ کرنا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر جنگی ضروریات کا تقاضا ہو تو درختوں کو کاٹنے اور جلا کر میدان صاف کر دینے کی اجازت ہے، جیسا کہ بنی نضیر کے محاصرہ میں کیا گیا، لیکن محض تخریب کی نیت سے ایسا کرنا بالاتفاق ممنوع ہے۔

مخالفین نے غزوہ بنی نضیر کے واقعہ کو اس الزام کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ اسلام جنگ میں غارت گری کو جائز رکھتا ہے۔ بخود ہمارے محدثین میں سے بھی بعض نے اس کو حرق الدور والنخیل کے جواز کی دلیل سمجھا ہے۔ مگر واقعات کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ بنی نضیر کی کھجوروں کو کاٹنا اور جلانا محض جنگی ضروریات

ے لوٹ کے مال سے مراد وہ مال ہے جو دشمن کے ملک میں پیشقدمی کرتے ہوئے عام باشندوں سے چھین لیا جائے۔ اسکے علاوہ نہبہ اس مال غنیمت کو بھی کہتے ہیں جو باقاعدہ تقسیم سے پہلے لیا جائے۔

پر مبنی تھا، دشمن کو نقصان پہنچانا یا اس سے انتقام لینا ہرگز مقصود نہ تھا۔ اوّل تو جو درخت کاٹے گئے تھے وہ قرآنی تصریح کے مطابق ایک خاص قسم کی کھجور کے تھے جس کو لینہ کہتے ہیں: ما قطعتم من لینة او ترکتموھا (الحشر ۱) اور سہیلی کا بیان ہے کہ بنی نضیر اس کھجور کو غذا کے کام میں نہ لاتے تھے، بلکہ عجوہ اور برنی کو استعمال کرتے تھے۔ علامہ ابن حجر کہتے ہیں:-

قال السھیلی فی تخصیصھا بالذکر ایماء الی ان الذی یجوز قطعة من شجر العدو ما لا یکون معدا للاقتیات لانھم کانوا یقتاتون العجوۃ والبرنی دون اللینة۔[1]

سہیلی خاص طور پر لینہ کا ذکر کئے جانے سے یہ اشارہ نکالتے ہیں کہ دشمن کے درختوں میں سے صرف انہیں کو کاٹنا جائز ہے جو غذا کے کام میں نہ آتے ہوں، کیونکہ بنو نضیر عجوہ اور برنی کو کھایا کرتے تھے، لینہ کو نہیں کھاتے تھے۔

پھر واقعہ کی نوعیت بھی وہ نہیں ہے جو بیان کی جاتی ہے۔ عام راویوں نے تو یہ دیکھ کر کہ آنحضرت صلعم خود محاصرہ میں موجود تھے، اور آپ کی موجودگی میں فوجوں نے درخت کاٹے اور جلائے تھے، یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ یہ کام آپ ہی کے حکم یا اجازت سے کیا گیا، لیکن ابن عباسؓ نے صاف تصریح کی ہے کہ مسلمانوں نے محاصرہ کی ضروریات سے کاٹنا اور جلانا شروع کر دیا تھا، پھر ان کو خیال آیا کہ معلوم نہیں اس فعل کی شرعی حیثیت کیا ہے (ھل لنا فیما قطعنا من اجر وھل علینا فیما ترکنا من وزر؟)، چنانچہ انہوں نے جا کر رسول اللہ صلعم سے استفتا کیا اور اس پر یہ آیت اتری کہ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ، لینہ کے درختوں میں سے جو کچھ تم نے کاٹا اور جو کچھ چھوڑ دیا، سب اللہ ہی کے اذن سے تھا۔

جابر نے بھی یہی روایت کی ہے کہ درخت کاٹنے کے بعد لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پوچھتے ہوئے آئے کہ یا رسول اللہ ھل علینا اثم فیما قطعنا او علینا وزر فیما ترکنا؟ "یا رسول اللہ ہم نے جو کچھ کاٹ دیا یا چھوڑ دیا ہے، اس کا کوئی گناہ تو ہم پر نہیں ہے؟" اس پر یہ آیت اتری کہ ما قطعتم من لینة، الآیۃ۔

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۴

مجاہد نے اس قول کی تائید کرتے ہوئے آیت مذکورہ کی تفسیر یہ کی ہے کہ بعض مہاجرین درختوں کو کاٹنے لگے تھے اور بعض نے ان کو چھوڑ دیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر کے دونوں کے فعل کو درست قرار دیا۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ تم میں سے جنھوں نے محاصرہ کو مؤثر بنانے کی نیت سے لینہ کے درخت کاٹے وہ بھی حق پر ہیں، اور جنھوں نے اس فعل کو فساد سمجھ کر نہیں چھوڑ دیا وہ بھی حق پر ہیں، کیونکہ دونوں نے اللہ کے ایک ایک حکم کی پیروی کی۔

محمد بن اسحٰق کی تحقیق یہ ہے کہ غزوۂ بنی نضیر میں جب اس طرح درختوں کو کاٹا جانے لگا تو بنو قریظہ نے آپ کو کہلا بھیجا کہ اے محمد! تم تو فساد کو منع کرتے ہو اور کہتے ہو کہ میں اصلاح کرنے آیا ہوں، پھر یہ درخت کیوں کاٹ رہے ہو؟ کیا یہ اصلاح ہے؟ اس پر آنحضرت صلعم اور مسلمان متفکر ہوئے، اور اللہ نے اُن کی تسلی کے لئے یہ آیت نازل فرمائی کہ ما قطعتم من لینۃ الآیہ یعنی جو کچھ تم نے کاٹا اور جو کچھ چھوڑا سب اللہ کے اذن سے تھا۔

بہر صورت واقعات کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلعم نے قطع اشجار کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ فوج نے محاصرہ کی ضروریات سے مجبور ہو کر بلا اجازت چند درخت کاٹ لئے تھے، اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو اس بنا پر صحیح قرار دیا تھا کہ درخت کاٹنے والوں کی اصلی نیت تخریب و افساد کی نہ تھی۔ بعض فقہا نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ جواز صرف اسی موقع کے لئے تھا اور اس خاص حکم سے یہ عام جواز نہیں نکل سکتا کہ جب کبھی جنگی ضروریات پیش آئیں تو دشمن کے درختوں کو کاٹا اور جلا دیا جائے۔ چنانچہ امام اوزاعی، لیث اور ابو ثور اسی طرف گئے ہیں۔ لیکن جمہور محققین کا مذہب یہ ہے کہ اہم جنگی ضروریات کے لئے محض حسب ضرورت ایسا کرنا جائز ہے، رہا تخریب و غارتگری کی نیت سے کرنا تو اس کے حرام و ناجائز ہونے پر سب متفق ہیں۔ علامہ ابن جریر نے اوزاعی اور لیث کو جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:-

ان النھی محمول علی القصد لذالک	ممانعت تو دراصل عمداً تخریب کی گئی ہے، بخلاف
بخلاف ما اذا اصابوا ذالک فی خلال القتال	اس نقصان کے جو دوران قتال میں ان کو پہنچ جائے

كما وقع فی نصب المنجنیق علی الطائف: جیسا کہ طائف پر منجنیق سے سنگ باری کرتے وقت ہوا۔

امام احمد بھی یہی کہتے ہیں:-

تدنکون فی مواضع لا یجدون منه بدًّا فاما بالعبث فلا تحرق: یہ ایسے مواقع پر ہو سکتا ہے جبکہ کاٹنا اور جلانا بالکل ناگزیر ہو، ورنہ بلا ضرورت نہیں جلانا چاہیئے۔

اس قسم کی ناگزیر تباہ کاری پر کسی طرح اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ زمانہ کے قوانین جنگ میں بھی محاصرہ کو مؤثر بنانے اور محصورین کو درختوں اور عمارتوں کی آڑ میں پناہ لینے سے روکنے کے لئے درختوں کو کاٹنا، عمارتوں کو توڑنا حتی کہ بستیوں تک کو جلانا جائز رکھا گیا ہے[1]۔

۶۔ مثلہ کی ممانعت | دشمن کی لاشوں کو بے حرمت کرنے اور ان کے اعضا کی قطع و برید کرنے کو بھی اسلام نے سختی سے منع کیا۔ عبد اللہ بن یزید انصاری روایت کرتے ہیں کہ

نھی النبی صلی اللہ علیه و سلم من النھبی والمثلة: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوٹ کے مال اور مثلہ (قطع اعضا) سے منع فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فوجوں کو بھیجتے وقت جو ہدایات دیا کرتے تھے ان میں بتاکید فرماتے:-

لا تغدروا ولا تغلوا ولا تمثلوا: بدعہدی نہ کرو، غنیمت میں خیانت نہ کرو اور مثلہ نہ کرو۔

۷۔ قتلِ اسیر کی ممانعت | فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلعم جب شہر میں داخل ہونے لگے تو فوج میں اعلان کرا دیا تھا کہ:-

لا تجھزن علی جریح، ولا یتبعن مدبر، ولا یقتلن اسیر، ومن اغلق بابه فھو آمن۔ کسی مجروح پر حملہ نہ کیا جائے، کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے، اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ امان میں ہے۔

حجاج بن یوسف نے ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ ایک اسیر کو قتل کریں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے ہم کو اس کی تو اجازت نہیں دی: البتہ یہ حکم دیا ہے کہ جو قیدی

[1] Lawrence, Principles of Internatoinal Law, P. 441

[2] فتوح البلدان صفحہ ۴۷

گرفتار ہو کر آئیں ان سے یا تو احسان کا برتاؤ کرو، یا فدیہ لیکر رہا کر دو، ما امرنا بهذا يقول الله تعالیٰ حتی اذا اثخنتموهم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء۔[1]

۸۔ **قتل سفیر کی ممانعت** سفراء اور قاصدوں کے قتل کو بھی آنحضرت صلعم نے منع فرمایا مسیلمہ کذاب کا قاصد عبادہ بن الحارث جب اس کا گستاخانہ پیغام لیکر حاضر ہوا تو آپؐ نے فرمایا:۔

لولا ان الرسل لا تقتل لضربت عنقك

اگر قاصدوں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا

اسی اصل سے فقہا نے یہ جزئیہ نکالا ہے کہ جب کوئی شخص اسلامی سرحد پر پہنچ کر بیان کرے کہ میں فلاں حکومت کا سفیر ہوں اور حاکم اسلام کے پاس پیغام لیکر بھیجا گیا ہوں تو اس کو امن کے ساتھ داخلہ کی اجازت دی جائے، اس پر کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے، اس کے مال و متاع، خدم و حشم، حتی کہ اسلحہ سے بھی تعرض نہ کیا جائے، الا اس صورت میں کہ وہ اپنا سفیر ہونا ثابت نہ کر سکے۔ بعض فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ اسلامی حکومت میں رہ کر زنا اور چوری بھی کرے تو اس پر حد جاری نہ ہوگی۔

۹۔ **بدعہدی کی ممانعت** غدر، نقض عہد، اور معاہدین پر دست درازی کرنے کی برائی میں بے شمار احادیث آئی ہیں جن کی بنا پر یہ فعل اسلام میں بدترین گناہ قرار دیا گیا ہے۔ عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة وان ريحها لتوجد من مسيرة اربعين عاما۔

جو کوئی کسی معاہد کو قتل کرے گا اسے جنت کی بو تک نصیب نہ ہوگی، حالانکہ اس کی خوشبو ۴۰ برس کی مسافت سے بھی محسوس ہوتی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ:

اربع خلال من كن فيه كان منافقا خالصا من اذا حدث كذب، واذا وعد اخلف،

چار خصلتیں ہیں کہ جس میں پائی جائیں گی وہ خالص منافق ہوگا، ایک یہ کہ جب بولے تو جھوٹ بولے، دوسرے

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۱۱۶

واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر۔	یہ کہ جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔ تیسرے

یہ کہ جب معاہدہ کرے تو اس کو توڑ دے، چوتھے یہ کہ جب جھگڑے تو گالیاں دے۔

ایک اور حدیث میں ہے:۔

لکل غادر لواء یوم القیامۃ یرفع لہ بقدر غدرہ، الا ولا غادر اعظم غدرا من امیر عامۃ	ہر غدار (عہد شکن) کی بے ایمانی کا اعلان کرنے کے لئے قیامت کے دن ایک جھنڈا ہوگا، جو اس کے غدر کا ہم قدر ہوگا۔ اور یاد رکھو کہ جو سردار قوم غدر کرے اس سے بڑا کوئی غدار نہیں ہے۔

ایک مرتبہ امیر معاویہؓ بلادِ روم پر حملہ کرنے کے لئے جا رہے تھے حالانکہ ابھی معاہدہ صلح کی مدت ختم نہ ہوئی تھی۔ امیر معاویہؓ کا ارادہ تھا کہ مدت ختم ہوتے ہی حملہ کر دیں۔ مگر ایک صحابی عمرو بن عنبسہؓ نے زمانۂ صلح میں جنگ کی تیاری اور سرحدوں کی طرف فوج کی روانگی کو بھی بدعہدی سے تعبیر کیا اور امیر کے پاس دوڑتے ہوئے اور یہ پکارتے ہوئے پہنچے کہ اللہ اکبر، وفاء لا غدر۔ معاویہؓ نے سبب پوچھا تو کہا کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ:۔

من کان بینہ وبین قوم عھد فلا یحلن عھدا ولا یشدنہ حتی یمضی امدھا او ینبذ الیھم علی سواء۔	جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ کرے تاوقتیکہ اس کی مدت گذر نہ جائے۔ یا پھر اگر خیانت کا خوف ہو تو برابری کو ملحوظ رکھ کر اس کو ختم معاہدہ کا نوٹس دے دے۔

۱۰۔ **بدنظمی و انتشار کی ممانعت** اہلِ عرب کی عادت تھی کہ جب جنگ کو نکلتے تو راستہ میں جو ملتا اسے تنگ کرتے، اور جب کسی جگہ اترتے تو ساری منزل پر پھیل جاتے تھے۔ یہاں تک کہ راستوں پر چلنا مشکل ہو جاتا تھا۔ داعیِ اسلام نے آکر اس کی بھی ممانعت کر دی۔ ایک مرتبہ جب آپ جہاد کو تشریف لے جا رہے تھے تو آپ کے پاس شکایت آئی کہ فوج میں عہدِ جاہلیت کی سی بدنظمی پھیلی ہوئی ہے اور لوگوں نے منزل کو تنگ کر رکھا ہے۔ اس پر آپ نے منادی کرائی کہ من ضیق منزلا او قطع طریقا فلا جھاد لہ

وجو کوئی منزل کو تنگ کریگا یا راہ گیروں کو لوٹے گا، اس کا جہاد نہیں ہو گا۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ ان تفرقکم فی ھذہ الشعاب و الاودیۃ انما ذالکم الشیطان، تمہارا اس طرح وادیوں اور گھاٹیوں میں منتشر ہو جانا یہی شیطانی فعل ہے۔

ابو ثعلبہ خشنی کا بیان ہے کہ اس کے بعد یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ جب اسلامی فوج کسی جگہ اترتی تو اس کا گنجان پڑاؤ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ایک چادر تان دی جائے تو سب کے سب نیچے آجائیں گے۔

۱۱- شور و ہنگامہ کی ممانعت: عرب کی جنگ میں اس قدر شور و ہنگامہ برپا ہوتا تھا کہ اس کا نام ہی دغی پڑ گیا تھا۔ اسلام لانے کے بعد بھی عربوں نے یہی طریقہ برتنا چاہا، مگر داعیٔ اسلام نے اسکی اجازت نہ دی۔ ابو موسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں:-

کنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکنا اذا اشرفنا علی وادٍ ھللنا وکبرنا، ارتفعت اصواتنا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا ایھا الناس اربعوا علی انفسکم فانکم لا تدعون اصم ولا غائبا، انہ معکم، انہ سمیع قریب۔	ہم رسول اللہ صلعم کے ساتھ تھے اور جب کسی وادی پر پہنچتے تھے تو زور شور سے تکبیر و تہلیل کے نعرے بلند کرتے تھے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ لوگو! وقار کے ساتھ چلو، تم جس کو پکار رہے ہو وہ نہ بہرا ہے نہ غائب، وہ تو تمہارے ساتھ ہے، سب کچھ سنتا ہے اور بہت ہی قریب ہے۔

وحشیانہ افعال کے خلاف عام ہدایات: فوجوں کی روانگی کے وقت جنگی برتاؤ کے متعلق ہدایات دینے کا طریقہ، جس سے انیسویں صدی کے وسط تک مغربی دنیا نابلد تھی، ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے اُمی پیغمبر نے ایجاد کیا تھا۔ داعیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب آپ کسی سردار کو جنگ پر بھیجتے تو اسے اور اس کی فوج کو پہلے تقویٰ اور خوفِ خدا کی نصیحت کرتے، پھر فرماتے:-

اغزوا بسم اللہ فی سبیل اللہ، قاتلوا من کفر باللہ، اغزوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا	جہاد کرو اللہ کا نام لیکر اور اللہ کی راہ میں، لڑو ان لوگوں سے جو اللہ سے کفر کرتے ہیں، مگر جنگ میں کسی سے بدعہدی

ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدا۔ نہ کرو، غنیمت میں خیانت نہ کرو، مثلہ نہ کرو، اور کسی بچہ کو قتل نہ کرو۔

اس کے بعد فوج کو ہدایت کرتے کہ دشمن کے سامنے تین چیزیں پیش کرنا، اوّل اسلام، دوسرے جزیہ، تیسرے جنگ۔ اگر وہ اسلام قبول کرلے تو پھر اس پر ہاتھ نہ اٹھاؤ، اگر جزیہ دیکر اطاعت قبول کرلے تو اس کی جان و مال پر کسی قسم کی تعدی نہ کرو، لیکن اگر وہ اس سے بھی انکار کرے تو اللہ سے مدد مانگ کر جنگ کرو۔

خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ نے جب شام کی طرف فوجیں روانہ کیں تو ان کو دس ہدایتیں دی تھیں جن کو تمام مورخین و محدثین نے نقل کیا ہے۔ وہ ہدایات یہ ہیں:۔

(۱) عورتیں، بچے اور بوڑھے قتل نہ کئے جائیں،

(۲) مثلہ نہ کیا جائے،

(۳) راہبوں اور عابدوں کو نہ ستایا جائے، اور نہ ان کے معابد مسمار کئے جائیں،

(۴) کوئی پھلدار درخت نہ کاٹا جائے اور نہ کھیتیاں جلائی جائیں،

(۵) آبادیاں ویران نہ کی جائیں،

(۶) جانوروں کو ہلاک نہ کیا جائے،

(۷) بدعہدی سے ہر حال میں احتراز کیا جائے،

(۸) جو لوگ اطاعت کریں ان کی جان و مال کا وہی احترام کیا جائے جو مسلمانوں کی جان و مال کا ہے،

(۹) اموال غنیمت میں خیانت نہ کی جائے۔

(۱۰) جنگ میں پیٹھ نہ پھیری جائے۔

اصلاح کے نتائج: ان احکام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے جنگ کو ان تمام وحشیانہ افعال سے پاک کردیا جو اس عہد میں جنگ کا ایک غیر منفک جزبنے ہوئے تھے۔ اسیران جنگ اور

سفراء کا قتل، معاہدین کا قتل، مجروحین جنگ کا قتل، غیر اہل قتال کا قتل، اعضا کی قطع و برید، مُردوں کی بے حرمتی، آگ کا عذاب، لوٹ مار اور قطع طریق، فصلوں اور بستیوں کی تخریب، بد عہدی و پیمان شکنی، فوجوں کی پراگندگی و بدنظمی، لڑائی کا شور و ہنگامہ، سب کچھ آئین جنگ کے خلاف قرار دے دیا گیا اور جنگ صرف ایک ایسی چیز رہ گئی جس میں شریف و بہادر آدمی دشمن کو کم سے کم ممکن نقصان پہنچا کر اس کے شر کو دفع کرنے کی کوشش کریں۔

اس اصلاحی تعلیم نے ۸ سال کی قلیل مدت میں جو عظیم الشان نتائج پیدا کئے اُن کا بہترین نمونہ فتح مکہ ہے۔ ایک طاقت پر دوسری طاقت کی فتح، اور خصوصاً دشمن کے کسی بڑے شہر کی تسخیر کے موقع پر وحشی عرب ہی میں نہیں بلکہ متمدن روم و ایران میں بھی جو کچھ ہوتا تھا اسے پیش نظر رکھئے۔ اس کے بعد غور کیجئے کہ وہی عرب جو چند برس پہلے تک جاہلیت کے طریقوں کے عادی تھے، اُس شہر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں جس سے ۸ ہی برس پہلے ان کو بری طرح تکلیفیں دے دے کر نکالا گیا تھا، اور انہی دشمنوں پر فتح حاصل کرتے ہیں جنہوں نے ان فاتحوں کو گھر سے بے گھر کرنے ہی پر قناعت نہیں کی تھی بلکہ جس جگہ انہوں نے جا کر پناہ لی تھی وہاں سے بھی ان کو نکال دینے کے لئے کئی مرتبہ چڑھ کر آئے تھے۔ ایسے شہر اور ایسے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے، مگر کوئی قتل عام نہیں کیا جاتا، کسی قسم کی لوٹ مار نہیں ہوتی، کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سے تعرض نہیں کیا جاتا، پرانے اور کٹے دشمنوں میں سے بھی کسی پر انتقام کا ہاتھ نہیں اُٹھتا، تسخیر شہر کی پوری کارروائی میں صرف ۲۴ آدمی مارے جاتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جبکہ دست درازی میں پیش قدمی خود انکی طرف سے ہوئی۔ سالار فوج داخلہ سے پہلے اعلان کر دیتا ہے کہ جب تک تم پر کوئی ہاتھ نہ اٹھائے تم بھی ہاتھ نہ اٹھانا شہر میں داخل ہوتے ہی منادی کی جاتی ہے کہ جو کوئی اپنا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائیگا اسے امان ہے، جو کوئی ہتھیار ڈال دیگا اسے امان ہے، اور جو کوئی ابوسفیانؓ کے گھر میں پناہ لیگا اُسے بھی امان ہے۔ پھر تکمیل تسخیر کے بعد فاتح سردار کے سامنے وہ دشمن ایک ایک کر کے لائے جاتے ہیں جنہوں نے اسی شہر میں اس اکیس برس تک انتہائی اذیتیں پہنچانے کے بعد آخر جلاوطنی پر مجبور کیا تھا، اور جو گھر سے نکالنے کے بعد اس کو

اور اس کے دین کو دنیا سے مٹانے کے لئے بدر و احد اور جنگ احزاب میں بڑی بڑی تیاریاں کر کے گئے تھے۔ یہ دشمن گردنیں جھکائے ہوئے آکر کھڑے ہوتے ہیں۔ فاتح پوچھتا ہے "اب تم کیا امید کرتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کروں گا؟" مفتوح شرمساری کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ "تو فیاض بھائی ہے اور فیاض بھائی کا بیٹا ہے" (اخ کریم وابن اخ کریم)۔ اس پر فاتح کہتا ہے کہ "جاؤ تم آزاد ہو۔ آج تم سے کوئی بازپرس نہیں" (لا تثریب علیکم الیوم، اذهبوا فانتم الطلقاء)۔ یہ صرف جان ہی کی بخشش نہ تھی، صرف مال کی بھی بخشش نہ تھی، بلکہ اس کے ساتھ فاتح اور اس کی فوج نے ان جائدادوں کو بھی انہیں کے حق میں معاف کر دیا جو ۸ برس پہلے ان کی ملک تھیں۔

تاہم ان میں کچھ ایسے شدید دشمن بھی تھے جن کی ایذا رسانی حد برداشت سے بڑھی ہوئی تھی فاتح نے شہر میں داخل ہونے سے پہلے حکم دے دیا تھا کہ ان میں سے جو کوئی ملے اسے قتل کر دیا۔ مگر جب ان پر قابو چل گیا تو وہ بھی اس خلق عظیم و عمیم سے بے فیض نہ رہے۔ ہبار بن اسود جو فاتح کی جوان بیٹی سیدہ زینبؓ کا قاتل تھا، عاجزی کے ساتھ مسلمان ہوا اور معاف کیا گیا۔ وحشی بن حرب جس نے فاتح کے نہایت محبوب چچا کو قتل کیا تھا مسلمان ہوا اور بخشا گیا۔ ہند بنت عتبہ جو حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبا گئی تھی، اپنی انتہائی شقاوت کے باوجود فاتح کے غضب سے محفوظ رہی، اور آخر عفو درگذر کا دامن اس کے لئے بھی وسیع ہوا۔ سب سے بڑے دشمن اسلام ابوجہل کا بیٹا عکرمہ جو خود بھی بڑا دشمن اسلام تھا مسلمان ہو کر آیا اور جلیل القدر صحابہؓ کی صف میں شامل کیا گیا۔ ان کے علاوہ عبداللہ بن ابی سرح، سارہ اور کعب بن زہیر بھی جو سب کے سب فاتح کے جانی دشمن تھے معاف کئے گئے۔ صرف حویرث بن نقیہ، عبدالعزی بن خطل اور مقیس بن صبابہ قتل کئے گئے، سو وہ بھی دشمنی کے جرم میں نہیں بلکہ خون کے قصاص میں۔

یہ تھی وہ اصلاح جو صرف ۸ سال کے اندر دنیا کی سب سے زیادہ وحشی قوم میں کی گئی تھی۔ آج اس تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی دنیا کی مہذب ترین قومیں جب کسی دشمن کے شہر میں فاتحانہ داخل ہوتی ہیں تو سب کو معلوم ہے کہ مفتوح شہر پر کیسے کیسے مظالم توڑے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کی جنگ عظیم میں تہذیب مغرب کے علمبرداروں نے ایک دوسرے کے ملک میں گھس کر جو تباہیاں پھیلائیں، ان کا نظارہ

دیکھنے والی آنکھیں ابھی تک موجود ہیں۔ اس کے مقابلہ میں غور کرو کہ اب سے ۱۳ سو برس پہلے کے تاریک زمانہ میں، جبکہ دنیا کی تہذیب کا علم خسرو پرویز اور ہرقل جیسے بادشاہوں کے ہاتھ میں تھا، عرب کی ایک اَن پڑھ اور بادیہ نشین قوم نے اپنے بدترین دشمنوں کے شہر میں داخل ہوکر جو شریفانہ برتاؤ کیا وہ کیسی زبردست اصلاح، کیسی اعلیٰ اخلاقی تربیت، اور کیسے صحیح و مضبوط عسکری ضبط و نظم کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔

۴۔ جنگ کے مہذب قوانین

یہ تو ان چیزوں کا ذکر تھا جو دنیا میں رائج تھیں اور اسلام نے ان کو بند کیا۔ اب ہم ان چیزوں پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو دنیا میں نہ تھیں اور اسلام نے ان کو جاری کیا۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ اسلام نے جنگ کے غلط طریقوں کو موقوف کر کے خود کس قسم کے قوانین مقرر کئے۔ اس کے لئے ہم صرف ان اصولی احکام کو لیں گے جن پر قوانینِ جنگ کی بنیاد قائم ہے، باقی رہے فروعی احکام سو وہ ائمہ وقت اور فقہائے عصر پر چھوڑ دیئے گئے ہیں کہ اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق اصول و قواعد کلیہ سے مستنبط کر لیں۔ اس لئے جو جزئی تفصیلات فقہ کی قدیم کتابوں میں مذکور ہیں ان پر چنداں انحصار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اطاعتِ امام جنگ کو ایک ضابطہ کے تحت لانے کے سلسلہ میں اسلام کا پہلا کام یہ تھا کہ اس نے فوجی نظام میں مرکزیت پیدا کی اور فوج میں سمع و طاعت کا زبردست قانون جاری کیا۔ اسلام کے قواعدِ حرب میں اولین اور اہم ترین قاعدہ یہ ہے کہ کوئی خفیف سے خفیف جنگی کارروائی بھی امام کی اجازت کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ دشمن کو قتل کرنا، اس کے مال پر قبضہ کر لینا، اس کو قید کرنا، اس کے جنگی آلات کو برباد کر دینا، فی نفسہ جائز ہونے کے باوجود ایسی حالت میں سخت ناجائز بلکہ گناہ ہو جاتا ہے جبکہ امام کے حکم و اجازت کے بغیر ایسا کیا جائے۔ جنگ بدر سے پہلے جب عبداللہ بن جحشؓ نے آنحضرت کی اجازت کے بغیر قریش کی ایک جماعت سے جنگ کی اور کچھ مال غنیمت لوٹ لائے تو اس پر آنحضرت صلعم نے سخت ناراضی کا اظہار کیا اور ان کے مال غنیمت کو ناجائز قرار دیا۔ صحابہؓ کی جماعت نے ان کو یہ کہہ کر ملامت کی کہ صنعتم ما لم تومروا به تم نے وہ کام کیا ہے جس کا تمہیں حکم

نہیں دیا گیا تھا۔ حضرت خالدؓ بنی جذیمہ کی طرف دعوتِ اسلام کے لئے بھیجے گئے اور وہاں انہوں نے امام کی اجازت کے بغیر ایک غلط فہمی کی بنا پر قتل کا بازار گرم کر دیا۔ اس کی اطلاع جب رسولِ کریمؐ کو ہوئی تو آپؐ شدتِ غضب سے بیتاب ہو کر کھڑے ہو گئے، اور فوراً حضرت علیؓ کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ اجعل امر الجاہلیۃ تحت قدمیک تم اس جاہلیت کے کام کو جا کر مٹا دو[۱]،

اسلام نے اطاعتِ امام کو خود خدا اور رسول کی اطاعت کے برابر ضروری قرار دیا ہے، اور امام کی نافرمانی کو وہی درجہ دیا ہے جو رسولِ خدا کی نافرمانی کا ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔

الغزو غزوان۔ فاما من ابتغی وجه الله و اطاع الامام وانفق الکریمۃ واجتنب الفساد فان نومه ونبهه اجر کله، واما من غزا ریاء وسمعۃ وعصی الامام وافسد فی الارض فانه لا یرجع بالکفاف۔

لڑائیاں دو قسم کی ہیں۔ جس شخص نے خاص خدا کی خوشنودی کے لئے جنگ کی، امام کی اطاعت کی، اپنا بہترین مال خرچ کیا، اور فساد سے پرہیز کیا، اس کا سونا اور جاگنا سب اجر کا مستحق ہے۔ اور جس نے دکھاوے اور شہرت کے لئے جنگ کی، امام کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد پھیلایا تو وہ برابر بھی نہ چھوٹے گا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

من اطاعنی فقد اطاع الله ومن عصانی فقد عصی الله، ومن یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی۔

جس نے میری اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے مجھ سے نافرمانی کی اس نے خدا سے نافرمانی کی۔ پھر جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر سے نافرمانی کی اس نے گویا خود مجھ سے نافرمانی کی۔

ان تاکیدی احکام نے جنگ میں ایک باقاعدگی پیدا کر دی۔ وہ محض ایک خونی کھیل نہیں رہی کہ فوج کا ہر سپاہی فرداً فرداً لوگوں کی جان و مال کا مختار اور قتل و غارت گری کا مجاز ہو۔ زمانۂ جاہلیت میں فوجوں کے سپاہی آزادی کے ساتھ لوٹ مار کیا کرتے تھے اور دشمن کے ملک میں گھسنے کے بعد ہر

[۱] فتح الباری ج ۸ ص ۴۲۔

سپاہی کو اختیار ہوتا تھا کہ جس کو چاہے قتل کرے، جسے چاہے لوٹ لے، جس گاؤں اور جس کھیتی کو چاہے جلا دے، اور دشمن قوم کو تباہ و برباد کرنے کے لئے جو جی میں آئے کرے۔ خود سکندر کی فوج بھی جس کا ڈسپلن بہت مشہور ہے، اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھی۔ ایران میں پیشقدمی کرتے وقت اس کے سپاہیوں نے جس آزادی کے ساتھ ملک کو تباہ کیا تھا، اس کے حالات تاریخوں میں محفوظ ہیں، لیکن اسلام نے فوج کے لئے جو قواعد و ضوابط مقرر کئے ان میں افراد فوج کو اس قسم کی آزادی دینے سے قطعاً انکار کر دیا، کیونکہ اسلام کے نزدیک انسانی خون بہانے کی ذمہ داری ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے جس کا نہ ہر شخص متحمل ہو سکتا ہے اور نہ ہر شخص اس کے موقع و محل اور ضرورت و عدم ضرورت کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اسلامی قانون میں جنگ کے تمام اعمال کی ذمہ داری اور امر و نہی کے تمام اختیارات کا حامل ایک "امیر" کو بنایا گیا ہے اور فوج پر اس کی کامل اطاعت فرض کر دی گئی ہے، یہاں تک کہ کسی سپاہی کو اتنا اختیار بھی نہیں دیا گیا ہے کہ امیر کی اجازت کے بغیر دشمن کی سرزمین سے کسی درخت کے پھل توڑ کر کھالے۔

وفائے عہد | اسلامی قانون نے جنگ اور صلح دونوں حالتوں میں وفائے عہد کی سخت تاکید ہے۔ حقیقتہً اخلاقیات اسلام کے قواعد اصلیہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کو سخت سے سخت ضرورت کی حالت میں بھی اپنے عہد پر قائم رہنا چاہئے۔ بد عہدی سے خواہ کتنا ہی بڑا فائدہ پہنچتا ہو، اور وفائے عہد سے کتنا ہی شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، اسلام بہر صورت اپنے پیرووں کو تاکید کرتا ہے کہ اس فائدے کو چھوڑ دیں اور اس نقصان کو برداشت کریں، کیونکہ نہ بد عہدی کا بڑے سے بڑا فائدہ اس نقصان کی تلافی کر سکتا ہے جو اس سے انسان کے اخلاق و روحانیت کو پہنچتا ہے، اور نہ وفائے عہد کا کوئی بڑے سے بڑا نقصان اس اخلاقی و روحانی فائدے کو کم کر سکتا ہے جو اس کے ساتھ توام ہے۔ یہ قاعدہ کلیہ جس طرح انفرادی و شخصی زندگی پر حادی ہے اسی طرح اجتماعی و قومی زندگی پر بھی حادی ہے۔ آج کل دنیا میں یہ دستور ہو گیا ہے کہ جن کاموں کو ایک شخص اپنی ذاتی حیثیت میں سخت شرمناک سمجھتا ہے، انہیں ایک قوم اپنی اجتماعی حیثیت میں بے تکلف کر گذرتی ہے اور اسے کوئی عیب نہیں

سمجھتی۔ سلطنتوں کے مدبرین اپنی ذاتی حیثیت میں کیسے ہی اخلاق فاضلہ و تہذیب کاملہ کے مالک ہوں مگر اپنی سلطنت کے فائدے اور اپنی قوم کی ترقی کے لئے جھوٹ بولنا، بے ایمانی کرنا، عہد توڑ دینا، وعدہ خلافیاں کرنا بالکل جائز سمجھتے ہیں اور بڑی بڑی مدعیٔ تہذیب سلطنتیں ایسی بیباکی کے ساتھ یہ حرکات کرتی ہیں کہ گویا یہ کوئی عیب ہی نہیں ہے۔ لیکن اسلام اس معاملہ میں فرد اور جماعت، رعیت اور حکومت، شخص اور قوم میں کوئی امتیاز نہیں کرتا اور بدعہدی کو ہر حال میں ہر غرض کے لئے ناجائز قرار دیتا ہے، خواہ وہ شخصی فائدے کے لئے ہو یا قومی فائدے کے لئے۔

وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ۔

(النحل۔ ۱۳)

اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم کسی سے معاہدہ کرلو اور اپنی قسموں کو مضبوط کرنے اور اللہ کو ان پر ضامن کرنے کے بعد نہ توڑو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کا حال بالیقین معلوم ہے۔ تم اس عورت کی طرح نہ بن جاؤ جس نے اپنا ہی کاتا ہوا سوت محنت سے کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تم اپنی قسموں کو باہم دغا کے طور پر استعمال کرتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے مال و ثروت میں بڑھ جائے۔

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں بکثرت آئی ہیں۔ یہاں ان سب کا احاطہ مقصود نہیں ہے، احکام کی تصریح کے لئے صرف چند آیات نقل کی جاتی ہیں:۔

الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ، وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ ...... أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔

(الرعد۔ ۳)

جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور عہد و پیمان کو نہیں توڑتے، اور اللہ نے جس چیز کو جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے قائم رکھتے ہیں ...... ان کے لئے اچھا انجام ہے۔

بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ۔ إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ

کیوں نہیں جس شخص نے بھی اپنا عہد پورا کیا اور پرہیزگاری اختیار کی، اللہ ایسے پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے اور جو لوگ اللہ کے عہد

ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (آل عمران - ۸)

اپنی قسموں کی تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، یقیناً ان کے لئے آخرت میں کوئی عزت نہیں ہے، اللہ ان سے نہ کلام کریگا، نہ قیامت کے دن ان کی طرف توجہ کریگا، اور نہ ان کو پاکیزگی بخشے گا، ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (البقرہ - ۲۲)

اور وہ لوگ جو عہد کرنے کے بعد اسے پورا کرتے ہیں اور وہ جو سختی و تکلیف اور جنگ کی مصیبت میں ثابت قدم رہتے ہیں، وہی سچے لوگ ہیں، اور وہی پرہیزگار ہیں۔

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (انعام - ۱۹)

جب تم بولو تو انصاف کی بات بولو، خواہ وہ شخص جس کے خلاف تم کہہ رہے ہو تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو، اور اللہ کے عہد کو پورا کرو، اللہ نے اس کی تم کو نصیحت کی ہے۔ شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا (بنی اسرائیل - ۴)

عہد پورا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

اس تعلیم کا جو عملی نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیرت میں پیش کیا اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عہد کی کیا قیمت ہے۔ جنگ بدر میں جبکہ کفار کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی اور مسلمان اپنی جمعیت بڑھانے کے لئے ایک ایک آدمی کے حاجتمند تھے، حذیفہ بن الیمان اور ان کے والد حسیل بن جابر لشکر اسلام کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں کفار نے ان کو روک لیا اور کہا کہ تم ضرور محمد کی مدد کو جا رہے ہو۔ انہوں نے کہا کہ نہیں ہم تو مدینہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس پر کفار نے ان سے یہ عہد لیکر چھوڑ دیا کہ جنگ میں شریک نہ ہوں گے۔ یہ دونوں حضرات کفار کے پنجہ سے چھوٹ کر بدر کے میدان میں آنحضرت صلعم کے پاس پہنچے اور یہ قصہ دہرایا۔ آپ نے

سنے حکم دیا کہ انصرفا نفی لھم بعھدھم ونستعین اللہ علیھم۔ تم مدینہ چلے جاؤ، ہم عہد کو پورا کریں گے اور ان کے مقابلہ میں اللہ سے مدد مانگیں گے۔

صلح حدیبیہ میں جو شرائط کفار قریش سے طے ہوئی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اگر مکہ سے کوئی شخص بھاگ کر مسلمانوں کے پاس جائیگا تو مسلمان اس کو واپس کر دیں گے، اور اگر مسلمانوں کا کوئی آدمی مکہ جائیگا تو اسے واپس نہ کیا جائیگا۔ یہ معاہدہ ابھی لکھا ہی جا رہا تھا کہ ابوجندل بن سہیل کفار مکہ کی قید سے کسی طرح چھوٹ کر لشکر اسلام میں پہنچ گئے۔ پاؤں میں بیڑیاں تھیں، بدن پر مار کے نشان تھے، چہرے پر شدید مصائب کے آثار ہویدا تھے، رسول اللہ صلعم کے سامنے آکر فریاد کی کہ للہ مجھ کو اس مصیبت سے نکالئے۔ مسلمان ان کی یہ حالت دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ چودہ سو تلواریں رسول اللہ صلعم کے اشارہ کی منتظر تھیں اور اسلامی اخوت ایک مسلمان بھائی کو قید سے چھڑانے کے لئے مضطرب تھی۔ مگر شرائط صلح طے ہو چکی تھیں، معاہدہ لکھا جا رہا تھا، اس لئے اللہ کے رسول نے ابوجندل کو چھڑانے سے صاف انکار کر دیا، اور فرمایا تو یہ فرمایا:-

"ابوجندل، صبر کرو، اللہ تیرے لئے رہائی کی کوئی صورت ضرور نکالے گا۔"

مدینہ واپس ہوئے تو ایک اور صحابی ابوبصیرؓ کفار مکہ کی قید سے چھوٹ کر آپ کے پاس پہنچے۔ ان کے پیچھے پیچھے کفار بھی دو آدمی لیکر پہنچ گئے اور انہوں نے حاضر ہو کر ابوبصیرؓ کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ رسول اکرم کو معلوم تھا کہ مکہ میں مسلمانوں کے ساتھ کیسا ظالمانہ سلوک ہوتا ہے، اور خصوصاً بھاگ کر جانے والے قیدی کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا۔ مگر پاس عہد سب پر مقدم تھا۔ آپ نے مظلوم مسلمان کو ظالموں کے حوالہ کر دیا اور عہد کو توڑنا پسند نہ کیا۔

اس قسم کے بے شمار واقعات عہد رسالت اور عہد صحابہؓ کی تاریخ میں ملتے ہیں جن کا احاطہ یہاں مشکل ہے۔

غیر جانبداروں کے حقوق: اسلام میں غیر جانبداری (Neutrality) کی اصطلاح نہیں ہے بلکہ اس کو معاہدہ کے ذیل میں داخل کیا گیا ہے۔ اسلامی قانون تمام غیر مسلم قوموں کو دو جماعتوں

ہیں تقسیم کرتا ہے، ایک وہ جن سے معاہدہ ہے، دوسرے وہ جن سے معاہدہ نہیں ہے معاہدین جب تک شرائط معاہدہ پر قائم رہیں گے ان کے ساتھ شرائط کے مطابق معاملہ کیا جائے گا اور جنگ میں ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے گا یہی غیر جانبداری (نیوٹریلٹی) کا مفہوم ہے۔ باقی رہے غیر معاہدین، سو خواہ ان سے عملاً جنگ ہو یا نہ ہو، معنیٰ وہ برسر جنگ سمجھے جائیں گے کیونکہ غیر قوموں سے موادعت اور عدم موادعت کے بیچ میں کوئی درمیانی حالت اسلام نے تسلیم نہیں کی ہے۔

معاہدین کے ساتھ تمام معاملات شرائط معاہدہ کے تابع ہوں گے، مگر اسلام نے مسائل جنگ میں معاہدین کے لئے چند اصولی حقوق بھی متعین کر دیئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

(۱) جب تک معاہد قوم عہد پر قائم رہے اس کے ساتھ کسی قسم کا تعرض کرنا مسلمانوں کے لئے سخت ممنوع ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا، فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَى مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ۔ (التوبہ-۱)

مگر وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، اور جنہوں نے وفائے عہد میں کوئی کمی نہیں کی، اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی، ان کے ساتھ مدت معاہدہ کے ختم ہونے تک تم عہد پر قائم رہو۔ کیونکہ اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔

(۲) اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت کسی معاہد قوم کے ملک میں آباد ہو اور وہاں اس پر ظلم ہو رہا ہو، تو اسلامی حکومت ان مسلمانوں کی حمایت نہیں کر سکتی،

وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ، وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔ (الانفال-۱۰)

دار الکفر کے رہنے والے مسلمان اگر دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد تم پر فرض ہے۔ مگر اس قوم کے خلاف مدد نہیں دینی چاہئے جس سے تمہارا معاہدہ ہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھتا ہے۔

(۳) حالت جنگ میں معاہد قوم کے حدود پر کسی قسم کا تجاوز کرنا جائز نہیں ہے اگر دشمن بھاگ

کہ کسی ایسی قوم کے حدود میں پناہ لے تو اسلامی فوج وہاں اس کا تعاقب نہیں کر سکتی،

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا، اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ (النساء ۱۲)

اگر وہ باز نہ آئیں تو انہیں پکڑو اور جہاں پاؤ مارو، اور ان کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ، سوائے ان لوگوں کے جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔

یہ قواعد کلیہ غیر جانبداری کے قانون کی بنیاد ہیں۔ ان سے جزئی احکام حسب ضرورت مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔

اعلانِ جنگ جب کوئی قوم شرائط معاہدہ کی خلاف ورزی کرے اور اسلامی حکومت کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کرلے تو اس کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ اس کو باضابطہ الٹی میٹم دیا جائے اور ایفائے عہد کے لئے کافی مہلت دینے کے بعد جنگ چھیڑی جائے،

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ (الانفال - ۷)

اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت و بدعہدی کا خوف ہو تو ان کا معاہدہ برابری کو ملحوظ رکھکر ان کی طرف پھینک دو۔

برابری کو ملحوظ رکھکر معاہدہ کو پھینک دینے کا مطلب مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کو صاف طور پر مطلع کر دیا جائے کہ تمہارے معاندانہ افعال ایسے ہیں جن کی بنا پر ہمارا تمہارا معاہدہ باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد دیکھا جائے کہ وہ اپنے افعال سے باز آتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں تو ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے علامہ ابن جحر کہتے ہیں کہ:-

ای اطرح اليهم عهدهم و ذالك بان يرسل اليهم من يعلمهم بان العهد قد انتقض

یعنی ان کا معاہدہ ان کی طرف پھینک دو، اور یہ اس طرح کہ انہیں کسی کے ہاتھ کہلا بھیجو کہ عہد ٹوٹ چکا۔

علامہ ابن کثیر کہتے ہیں:-

ای اعلمهم بانك قد نقضت عهدهم حتى يبقى علمك وعلمهم بانك حرب لهم و

یعنی ان کو خبر کر دو کہ تم نے معاہدہ فسخ کر دیا ہے تاکہ اس علم میں تم اور وہ برابر ہو جائیں کہ تم ان کے دشمن ہو اور وہ

هم حزب لك والله لاغضن بينك و بينهم على السواء - اى تستوى انت وهم فى ذالك۔

تمہارے دشمن ہوگئے، اور اب تمہارے اور ان کے درمیان کوئی عہد باقی نہیں رہا۔

ازہری کا قول ہے:

اذا عاهدت قوما فخشيت منهم النقض فلا توقع بهم بمجرد ذالك حتى تعلمهم،

جب تمہارا کسی قوم سے عہد ہو اور تمہیں اس سے نقض عہد کا خوف ہو جائے تو یہ خوف ہونے کے دوران پر نہ ٹوٹ پڑو، بلکہ پہلے ان کو خبردار کر دو۔

فقہائے مجتہدین نے صرف اطلاع دینے کو بھی کافی نہیں سمجھا ہے بلکہ اس نقض عہد کرنے والی قوم کو ایک سال تک مہلت دینے کی بھی سفارش کی ہے تاکہ اگر وہ اپنے معاندانہ رویہ کی اصلاح کرنا چاہے تو کرلے۔ اس باب میں اسلامی قانون کی اصلی اسپرٹ صدر اول کے ایک واقعہ سے معلوم ہو سکتی ہے جس میں خوش قسمتی سے ہم کو بہت سے اکابر فقہا کے فتوے ملتے ہیں۔ عبد الملک بن صالح کے ایام ولایت میں جب قبرس کے لوگوں نے بدعہدی کی تو اس نے لیث بن سعد، مالک بن انس، سفیان بن عیینہ، موسیٰ بن اعین، اسمٰعیل بن عیاش، یحییٰ بن حمزہ، ابو اسحٰق فزاری وغیرہ ممتاز فقہا سے استفسار کیا کہ نبذ الیہم علی سواء کا حکم اس معاملہ میں جاری ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور ہو سکتا ہے تو کس صورت سے؟ اس پر فقہا نے جو جواب دیئے ان میں سے چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

لیث بن سعد نے لکھا:

"ان کو ایک سال کی مہلت دی جائے تاکہ باہم مشورہ کرلیں۔ جو کوئی ذمی بن کر بلاد مسلمین میں آنا چاہے یہاں آجائے، جو بلاد روم کی طرف ہجرت کرنا چاہے وہ وہاں چلا جائے، اور جو قبرس ہی میں رہ کر لڑنا چاہے اس سے تم لڑنے کے حق دار ہو۔"

امام مالکؒ نے لکھا:

"میری رائے میں فسخ معاہدہ میں جلدی نہ کرنی چاہئے، بلکہ ان پر اتمام حجت کرینی چاہئے۔ اللہ

کہتا ہے فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم پس اگر وہ تمہارے ڈھیل دینے پر بھی باز نہ آئیں اور بے وفائی پر اصرار کریں اور تم دیکھو کہ غدر ان پر ثابت ہے تو پھر تمہیں اختیار ہے کہ ان پر حملہ کردو"

موسیٰ بن اعین نے لکھا:۔

"اس سے پہلے جب کبھی ایسے واقعات پیش آئے ہیں تو حکام نے ہمیشہ مہلت دی ہے بہت ممکن ہے کہ اہل قبرس کے عوام اس فعل میں نہ شریک ہوں جو ان کے خواص کر رہے ہیں اس لئے میری رائے یہ ہے کہ ان سے عہد قائم رکھا جائے اور شرائط صلح پوری کی جائیں، گو ان میں کچھ مفسد لوگ موجود ہیں"۔

اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ عہد شکنی کرنے والے معاہدین کو کافی مہلت دینی چاہئے۔ ان کے عہد خلافت میں عمیر بن سعد نے لکھا کہ ہمارے علاقہ میں عرسبوس ایک مقام ہے جہاں کے لوگ دشمن کو ہماری خفیہ خبریں پہنچاتے ہیں اور ہم کو دشمن کی خبریں نہیں دیتے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ پہلے تم ان سے جا کر کہو کہ ہم تم کو ایک بکری کی جگہ دو بکریاں، اور ایک گائے کی جگہ دو گائیں، اور اسی طرح ہر چیز کے عوض دوگنی چیز دیں گے، تم اس جگہ کو چھوڑ دو۔ اگر وہ مان جائیں تو بہتر، ورنہ ان کو مطلع کر دو کہ ہمارا تمہارا عہد ختم ہوا۔ پھر انہیں ایک سال کی مہلت دو اور اس مدت کے ختم ہونے پر انہیں وہاں سے نکال دو[1]۔

اسیران جنگ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ اسلام نے اسیران جنگ کو قتل کرنے کی ممانعت کی ہے لیکن اسلامی قانون میں ان کے لئے صرف اتنی ہی رعایت نہیں ہے کہ وہ قتل نہ کئے جائیں بلکہ مزید برآں ان کے ساتھ انتہا درجہ کی نرمی و ملاطفت کا بھی حکم دیا ہے۔ قرآن مجید میں اسیر اور مسکین و یتیم کو کھانا کھلانے کی تعریف آئی ہے اور اسے نیکوکاروں کا فعل قرار دیا گیا ہے،

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ — وہ خاص اللہ کی خوشنودی کے لئے مسکین اور یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم تو محض اللہ کے لئے

[1] فتوح البلدان للبلاذری ص ۱۶۲، ۱۶۳۔

مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ، إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا	تمہیں کھلاتے ہیں کسی جزا یا شکریہ کے خواستگار نہیں ہیں
يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۔ (الدھر-۱)	ہم تو صرف اس تنگی کے دن سے ڈرتے ہیں جس میں شدت تکلیف سے چہرے بگڑ جائیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سبایا اور قیدیوں کے بارے میں ہمیشہ حُسنِ سلوک کی نصیحت فرماتے تھے۔ جنگ بدر میں جب وہ لوگ پکڑے ہوئے آئے جنہوں نے ۱۳ برس تک آپ کو اور مسلمانوں کو تکلیفیں دے دے کر جلاوطنی پر مجبور کیا تھا، تو آپ نے صحابہ کو تاکید فرمائی کہ ان کے ساتھ فیاضی کا برتاؤ کریں۔ اس حکم کی تعمیل صحابہؓ نے اس طرح کی کہ ان کو اپنے سے اچھا کھانا کھلایا اور اپنے سے زیادہ آرام دیا۔ بعض صحابہ خود کھجوریں کھاتے تھے اور قیدیوں کو روٹی سالن کھلاتے تھے۔ قیدیوں کے پاس کپڑے نہ رہے تو رسول اللہ صلعم نے اپنے پاس سے ان کو کپڑے پہنائے حالانکہ وہ وقت مسلمانوں پر بڑی انتہا تنگی کا تھا۔ ان قیدیوں میں سے ایک شخص سہیل بن عمرو بڑا فصیح اللسان تھا اور رسول اللہ صلعم کے خلاف زہریلی تقریریں کیا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اس کے دانت توڑ دیئے جائیں۔ مگر آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "اگر میں اس کا مثلہ کروں گا تو اللہ میرا مثلہ کریگا"۔ کچھ مدت قید رکھنے کے بعد آنحضرت صلعم نے آخر کار ان سب قیدیوں کو فدیہ لیکر رہا کر دیا[1]۔

---

[1] اسیرانِ جنگ بدر کے فدیہ کے متعلق احادیث اور تفسیر کی کتابوں میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ جب یہ لوگ قید ہو کر آئے تو آنحضرت صلعم نے صحابہؓ سے مشورہ لیا کہ ان کے معاملہ میں کیا کیا جائے؟ یہ وہ وقت تھا کہ مہاجرینؓ کے دلوں پر ان کے مظالم کے زخم تازہ تھے۔ دو برس پہلے انہیں لوگوں نے ان کو مکہ سے نکالا تھا اور اب اس لئے ان پر چڑھ کر آئے تھے کہ انہیں مدینہ میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیں۔ اس وجہ سے اکثر طبیعتوں میں ان کے خلاف سخت اشتعال تھا۔ علاوہ ازیں اس وقت مسلمانوں کی جمعیت بھی بہت تھوڑی تھی، کفار ان سے کئی گنی زیادہ طاقت لیکر میدان میں آئے تھے، اور ان کی تعداد میں ایک ایک آدمی کا اضافہ بھی مسلمانوں کے لئے مہلک تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر مسلمان یہ چاہتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو دشمن کی قوت کو توڑا جائے اور یہ ۷۰ آدمی جو ان میں سے کم ہو گئے ہیں دوبارہ ان سے مل کر ان کی فوجی قوت میں اضافہ نہ کر سکیں۔ تیسری بات یہ تھی کہ اس وقت مسلمانوں پر

اسیران جنگ کے متعلق اسلام کا قانون یہ ہے کہ اختتام جنگ پر انہیں یا تو بغیر فدیہ کے چھوڑ دیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۶) فاقوں پر فاقے گذر رہے تھے اور ان کے پاس خود اپنا پیٹ بھرنے کے لئے بھی کافی سامان موجود نہ تھا، اس لئے اسیران جنگ کو اختتام جنگ تک قید رکھنا اور ان کی خوراک کا بندوبست کرنا ان کی قدرت سے باہر تھا۔ ان تمام امور کو مدنظر رکھ کر حضرت عمرؓ نے یہ رائے دی کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ عبداللہ بن رواحہؓ نے کہا کہ گھنی جھاڑی میں آگ لگا کر ان کو اس میں پھینک دیا جائے۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے کہ سراسر لطف و رحم تھے اس کے خلاف یہ رائے دی کہ انہیں معاف کر دیا جائے۔ یہ مختلف رائیں سننے کے بعد رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ "اللہ بعض لوگوں کے دلوں کو اتنا نرم کر دیتا ہے کہ دودھ کی طرح ہو جاتے ہیں، اور بعض کے دلوں کو اتنا سخت کر دیتا ہے کہ پتھر بن جاتے ہیں۔ ابوبکرؓ کی مثال ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ کی سی ہے، اور عمرؓ کی مثال نوحؑ کی سی۔" پھر آپؐ نے یہ فیصلہ کیا کہ نہ تو انہیں قتل کرو اور نہ معاف کرو، بلکہ فدیہ لیکر رہا کر دو۔ چنانچہ ان سے فدیہ قبول کر لیا گیا۔

روایت مشہور کے مطابق اس پر عتاب الٰہی نازل ہوا اور یہ آیت اُتری کہ:۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ، تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ

(انفال ۹)

"کسی نبی کے لئے یہ سزاوار نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ اچھی طرح جنگ نہ کر لے۔ تم محض دنیا کی دولت چاہتے ہو مگر اللہ آخرت کو چاہتا ہے، اور وہی غالب حکمت والا ہے۔ اگر پہلے سے خدا کا نوشتہ نہ آچکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔"

بخلاف اس کے اہل علم کی ایک قلیل جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہ عتاب اسیروں سے فدیہ لینے پر نہ تھا بلکہ اس بات پر تھا کہ آسمانی اجازت لینے سے پہلے مسلمانوں نے مال غنیمت لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ امام ترمذی نے اپنی جامع کی کتاب التفسیر میں، امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اور امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں یہ روایت نقل کی ہے کہ:۔

فلما کان یوم بدر وقعوا فی الغنائم قبل ان تحل لھم، فانزل اللہ، لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ

جب بدر کا معرکہ ہوا تو مسلمان غنیمت کے حلال ہونے سے پہلے اس پر ٹوٹ پڑے، اس پر آیت اتری کہ لولا

جائے، یا فدیہ لیکر رہائی دے دی جائے، یا قید رکھ کر نیک سلوک کیا جائے۔

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (محمد - ۱)

جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو پہلے قتل کرو۔ یہاں تک کہ جب ان کو مغلوب کر لو تو پھر قید کی بندش مضبوط کرو اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ چاہے احسان کا معاملہ کرو یا فدیہ لیکر رہا کر دو۔

اس آیت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فدیہ لئے بغیر ہی اسیران جنگ کو رہا کر دیا کرتے تھے۔ جبال تنعیم میں مکہ کے ۸۰ آدمیوں نے لشکر اسلام پر حملہ کیا اور سب کے سب گرفتار ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انہیں پیش کیا گیا تو آپ نے سب کو فدیہ لئے بغیر چھوڑ دیا۔ یمامہ کا سردار ثمامہ بن اثال گرفتار ہو کر آیا اور اسے بھی بطریق احسان رہائی بخشی گئی۔ اس سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا۔ تاہم بعض اوقات فدیہ بھی لے لیا کرتے تھے، خصوصاً تنگی و عسرت کی حالت میں۔

غلامی کا مسئلہ اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے اسیران جنگ کو لونڈی غلام بنا کر رکھنے کی جو اجازت دی ہے اور جنگ سے پکڑی ہوئی عورتوں کے ساتھ تمتع کو جائز رکھا ہے اس کی کیا حیثیت ہے؟ اور اگر یہ مسئلہ فی الواقع اسلام میں موجود ہے تو یہ کہاں تک اس اسپرٹ کے مطابق ہے جو اسیران جنگ کے متعلق فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً کے قانون میں پیش کی گئی ہے؟ معترضین نے اس سوال کو جس رنگ میں پیش کیا ہے اور اسلام کے بعض وکیلوں نے اس کا جو جواب دیا ہے، اس سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) مَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ كتاب من الله (الآیۃ)

بہر حال جو صورت بھی ہو، یہ امر متفق علیہ ہے کہ یہ آیت جنگ بدر کے موقع پر اتری تھی اور اسی ہنگامہ سے متعلق تھی۔ اس سے کوئی عام اور دائمی قانون بنانا مقصود نہ تھا۔ اسیران جنگ کے متعلق اسلام کا اصلی قانون سورہ محمد کی اُس آیت میں بیان کیا گیا ہے جو متن میں درج ہے، کیونکہ اس کے الفاظ عام ہیں، کسی موقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اسی پر رہا ہے۔ ورنہ اگر جنگ بدر والی آیت کا حکم عام ہوتا تو کبھی کوئی اسیر رہا نہ کیا جاتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے مسئلہ کی حقیقت اور اس کے ما لہٗ و ما علیہ پر پوری طرح غور نہیں کیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اسلام میں "سبی" کا قاعدہ موجود ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ سبایا کو غلام بنا کر رکھنے اور لونڈیوں سے تمتع کرنے کی اجازت دی گئی ہے، لیکن اس کی علت اور اصلیت کو سمجھنے کے لئے چند مقدمات کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

اولاً اس عہد میں اسیرانِ جنگ کے تبادلہ کا دستور نہ تھا۔ جب مسلمانوں کے آدمی دوسری قوموں کے پاس قید ہوتے تو غلام بنا کر رکھ لئے جاتے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ دشمن قوموں کے جو لوگ گرفتار ہو کر آئیں انہیں وہ غلام بنا کر رکھ لیں۔ تاہم جہاں کہیں تبادلہ کا موقع آیا ہے مسلمانوں نے اس کو خوشی کے ساتھ منظور کیا ہے۔ فتح الباری میں علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ "اگر مسلمانوں کے پاس مشرکین کے قیدی ہوتے اور مشرکین کے پاس مسلمانوں کے قیدی ہوتے اور اپنے اپنے قیدیوں کو چھڑانے پر اتفاق ہو جاتا تو اس کا بندوبست کر لیا جاتا[1]۔" امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ اگر دشمن مسلمان اسیروں سے اپنے اسیروں کا تبادلہ کرنے پر راضی ہو تو تبادلہ کر لینا چاہئے[2]۔ خود رسول اکرمؐ سے تبادلۂ اساری کا ثبوت ملتا ہے۔ مسلمؒ، ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے دو مسلمانوں کے بدلہ میں ایک دفعہ مشرکین کے ایک آدمی کو رہا کیا۔

ثانیاً بعض اوقات لڑائیوں میں ایک شہر کے مردوں کا اکثر حصہ کام آجاتا تھا بلکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ایک بستی کے تمام ہتھیار اٹھانے کے قابل آدمی قتل ہو جاتے تھے۔ ایسی حالت میں لاوارث عورتوں اور بچوں کی پرورش کا انتظام اس کے سوا اور کسی صورت سے نہ ہو سکتا تھا کہ خود فاتح قوم اس کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ اور جب یہ کام فاتحین ہی کو کرنا تھا تو عورتوں کی حفاظت اور سوسائٹی میں ان کی وقعت قائم رکھنے کے لئے اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی کہ مسلمان مردوں کو ان سے ازدواجی تعلق قائم کرنے کی اجازت دیدی جاتی۔ اس صورت سے وہ اسلامی سوسائٹی کی رکن بن گئیں اور ان مفاسد کا دروازہ بند ہو

[1] ج ۶ ص ۱۰۱۔ [2] فتح القدیر ج ۴ ص ۳۰۶۔

گیا جو ہزاروں عورتوں کے بے شوہر رہ جانے سے لازمی طور پر پیدا ہوتے۔

ثالثاً، اسلام نے اسیرانِ جنگ کو غلام بنانے کی صرف اجازت دی ہے، حکم نہیں دیا ہے۔ اس اجازت سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا مسلمانوں کا اختیاری فعل ہے، بلکہ خلفائے راشدینؓ کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ فائدہ نہ اٹھانا افضل ہے۔ مصر، شام، عراق، افریقہ، آرمینیا اور فارس کی فتوحات میں بیشمار مقامات عنوۃً زیرِ دستِ شمشیر فتح ہوئے اور ان کے لاکھوں آدمی گرفتار کیے گئے، مگر ایک قلیل تعداد کے سوا کسی کو غلام نہیں بنایا گیا۔ متعدد مقامات پر ایسا ہوا ہے کہ کسی امیر فوج نے لوگوں کو غلام بنا لیا اور خلیفہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے رہائی کا حکم دے دیا۔ بلاذری لکھتا ہے کہ مصر کے بعض دیہات شدید مقابلہ کے بعد فتح ہوئے اور مسلمانوں نے ان کے باشندوں کو غلام بنا کر حضرت عمرؓ کے پاس مدینہ بھیج دیا، لیکن حضرت عمرؓ نے ان کو رہا کر کے ان کے وطن کی طرف واپس کر دیا اور حکم فرمایا کہ انہیں بھی عام قبطیوں کی طرح ذمّی بنا لیا جائے۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسیرانِ جنگ کو غلام بنانا نہ ضروری تھا نہ افضل و احسن، بلکہ تبادلۂ اساریٰ کا دستور نہ ہونے کے باعث اس کو ایک ناگزیر برائی کے طور پر قبول کیا گیا تھا۔

رابعاً، اسلام نے صرف ان لوگوں کو غلام بنانے کی مجبوراً اجازت دی ہے جو جنگ میں پکڑے ہوئے آئیں۔ باقی رہا آزاد لوگوں کو پکڑ کر بیچنا جو زمانۂ قدیم میں عموماً رائج تھا، سو اس کو اسلام نے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ثلثۃ انا خصمہم یوم القیامۃ، رجل اعطی بی ثم غدر، و رجل باع حرًا فاکل ثمنہ، و رجل استاجر اجیرًا فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہ	تین شخص ہیں جن کے خلاف قیامت میں میں خود مدعی بنوں گا۔ ایک وہ جس نے میرا ذمہ دے کر بدعہدی کی، دوسرا وہ جس نے آزاد انسان کو بیچا اور اس کی قیمت کھائی،

لہ اس مسئلہ پر مفصل بحث میں نے اپنے دوسرے مضامین میں کی ہے جس سے تمام ممکن شبہات کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں اس لئے محض اشارہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔

تلہ بلاذری کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔ فوقع سباؤهم بالمدینۃ فردهم عمر بن الخطابؓ وصیرهم و جماعۃ القبط اهل الذمۃ (فتوح البلدان طبع مصر، صفحہ ۲۲۳)

تیسرا وہ جس نے کسی مزدور سے پورا پورا کام لیا اور اس کی مزدوری نہ دی۔ لم یعط اجرہ، (بخاری کتاب البیوع)

امور مذکورہ صدر سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے جس طریقہ کو بعض اہم مجبوریوں اور مصلحتوں سے جائز رکھا تھا تاہم بہت ممکن تھا کہ اس طریقے کو مطلقاً جائز رکھنے سے مسلمانوں میں بھی غلامی کا وہی طریقہ رائج ہو جاتا جو عرب جاہلیت اور روم و ایران وغیرہ ممالک میں رائج تھا اور شاید ہندوستان کے شودروں کی طرح سبایا کی ایک نیچ ذات الگ بن جاتی لیکن اسلام کا قاعدہ یہ ہے کہ جن امور میں وہ بلا واسطہ اصلاح کو مشکل پاتا ہے ان کو قائم تو ضرور رکھتا ہے، مگر علیٰ حالہٖ قائم نہیں رہنے دیتا، بلکہ بالواسطہ اصلاح کے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن سے اس کی تمام مضرتیں اور خرابیاں دور ہو جاتی ہیں۔ غلامی کے مسئلہ میں بھی اس نے یہی کیا۔ غلامی کو مٹانا چند در چند وجوہ سے مشکل تھا۔ اس لئے اس نے صورت کو باقی رکھا اور بالواسطہ طریقوں سے مادہ کو اس طرح بدل دیا کہ وہ ایک شدید اجتماعی مضرت کے بجائے ایک شاندار انسانی منفعت بن گئی۔ اس غرض کے لئے اسلام نے بہت سے طریقے اختیار کئے ہیں جن میں سے تین اہم تر ہیں۔

۱۔ غلام کو آزاد کرنے اور آزادی کے حصول میں اسے مدد دینے کو بہت بڑا ثواب قرار دیا اور ہر طریقہ سے اس کی ترغیب دی۔ قرآن مجید میں آیا ہے:۔

وَمَا اَدْرٰاكَ مَا الْعَقَبَةُ ؟ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ۔ (البلد-۱)

اور تو کیا جانتا ہے کہ وہ نیکی کا دشوار گذار راستہ کونسا ہے؟ وہ یہ ہے کہ ایک گردن (یعنی غلام کی گردن) آزاد کی جائے یا بھوک کے دن میں کسی قریبی یتیم یا خاکسار مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ مختلف طریقوں سے اس کی فضیلت بیان فرمایا کرتے تھے جس سے مسلمانوں میں فکِ رقاب اور اعتاق عبید کا خاص شوق پیدا ہو گیا تھا ایک دفعہ ایک اعرابی حاضر ہوا اور بولا کہ یا رسول اللہ! کوئی ایسا عمل بتایئے جس سے میں جنت میں داخل ہو سکوں۔ آپ نے فرمایا: اعتق النسمۃ وفک الرقبۃ، غلام آزاد کر اور گردنوں کو غلامی سے چھڑا۔ ایک دوسری حدیث میں ہے

کہ آپ نے فرمایا من اعتق رقبۃ مسلمۃ کانت فکاکہ من النار عضوا بعضو، جو کوئی کسی مسلمان غلام کو آزاد کریگا اس کا ہر عضو اس غلام کے ہر عضو کے بدلے دوزخ سے بچ جائے گا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ من اعتق نفسا مسلمۃ کانت فدیتہ من جھنم۔ جس نے ایک نفس مسلمہ کو آزاد کیا تو وہ جہنم سے بچنے کے لئے اس کا فدیہ ہوگیا۔ ایک مرتبہ امام زین العابدین نے یہ حدیث سنی کہ جو شخص کسی غلام کو آزاد کریگا اس کا ہر ہر عضو اس غلام کے ہر ہر عضو کے بدلے بخشا جائیگا۔ آپ نے اسی وقت اپنے غلام مطرف کو جسے دس ہزار درہم میں خریدا تھا بلا کر آزاد کر دیا۔

غلاموں کو آزاد کرنے کا مزید شوق دلانے کے لئے آنحضرت صلعم نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ جتنا زیادہ قیمتی اور زیادہ پسندیدہ غلام آزاد کیا جائیگا اتنا ہی زیادہ ثواب ہوگا۔ حضرت ابوذرؓ نے پوچھا ای الرقاب افضل؟ "کیسے غلام کو آزاد کرنا افضل ہے"۔ فرمایا اغلاھا ثمنا وانفسھا عند اھلھا، "وہ جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو مالک کو زیادہ پسند ہو"۔ اسی طرح لونڈی کو عمدہ تربیت دیکر آزاد کرنے اور اس سے نکاح کر لینے کو بڑی نیکی کا فعل قرار دیا۔ من کانت لہ جاریۃ ادبھا واحسن تعلیمھا واعتقھا وتزوجھا کان لہ اجران "جس نے اپنی لونڈی کو اچھی طرح تعلیم و تربیت دیکر آزاد کیا اور اسے اپنے نکاح میں لے آیا اس کے لئے دوہرا ثواب ہوگا"۔

پھر مختلف گناہوں کے لئے جو کفارے مقرر کئے گئے ہیں ان میں غلام آزاد کرنے کو بہترین کفارہ قرار دیا گیا ہے۔ کسوف شمس اور دوسرے مواقع پر بھی بردہ آزاد کرنے کو دفع بلیات کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ بغرض ہر طریقہ سے اعتاق عبید کی ہمت افزائی کی گئی ہے۔

۲- دوسرا طریقہ یہ تھا کہ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور نرمی و ملاطفت کی سخت تاکید کی گئی۔ رسول اکرم صلعم نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ میں اپنی امت کو جو وصیت فرمائی تھی اس میں پہلے نماز کی تاکید تھی اور اس کے بعد غلاموں سے حسن سلوک کی، الصلوۃ وما ملکت ایمانکم[ل] عہد جاہلیت سے دماغوں

[ل] نہایہ میں ہے کہ ما ملکت ایمانکم سے یہاں غلام ہی مراد ہیں اور اس سے حضور کا مقصد احسان فی الرقیق کی تاکید فرمانا تھا۔ بعض لوگوں نے ما ملکت ایمانکم سے مراد زکوۃ بھی لی ہے مگر قول راجح یہی ہے کہ آپ نے دنیا سے رخصت

میں غلامی کا جو تصور رچا ہوا تھا، اس کے اثر سے کبھی کبھی صحابہؓ غلاموں کے ساتھ برا سلوک بھی کر بیٹھتے تھے۔ اس پر رسول اکرم صلعم نے بار بار اپنے معزز ترین اور محبوب ترین صحابیوں کو ڈانٹا ہے۔ معرور بن سوید نے ایک مرتبہ حضرت ابوذرؓ غفاری کو دیکھا کہ جو چادر وہ اوڑھے ہوئے ہیں ویسی ہی ان کے غلام کے بدن پر بھی ہے۔ پوچھا، اس کا سبب کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ میں نے ایک غلام کو گالی دی تھی اس نے جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، آپ سن کر ناراض ہوئے اور مجھے بلاکر فرمایا ابوذر! تم میں سے ابھی تک جاہلیت کی بو نہیں گئی۔ پھر فرمایا:

ان اخوانکم خولکم، جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس، ولا تکلفوھم ما یغلبھم فان کلفتموھم فاعینوھم

یہ تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں جنہیں اللہ نے تمہارا دست نگر بنایا ہے، پس جس کسی کا بھائی اس کے ماتحت ہو اسے چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے، اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے تم ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو اور اگر ایسی کوئی بھاری خدمت ان کے سپرد کرو تو خود ان کا ہاتھ بٹاؤ۔

ابو مسعود انصاریؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا، یکایک میں نے سنا کہ پیچھے سے کوئی کہہ رہا ہے اعلم ابا مسعود، اللہ اقدر علیک منک علیہ، "خبردار ابو مسعود، اللہ تجھ پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جو تجھ کو اس غلام پر حاصل ہے"۔ پلٹ کر دیکھا تو رسول اللہ صلعم تھے۔ میں نے فوراً عرض کیا ھو حر لوجہ اللہ، یہ خدا کے واسطے آزاد ہے۔ اس پر حضور نے فرمایا اما انک لو لم تفعل لمستک النار، اگر تو اس کو آزاد نہ کرتا تو آگ کے عذاب میں مبتلا ہو جاتا۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے حاضر ہو کر پوچھا کہ ہم کتنی مرتبہ اپنے خادم کو معاف کیا کریں، آپؐ نے جواب دیا اعفوا عنہ فی کل یوم سبعین مرۃ، اگر وہ روزانہ ستر بار بھی قصور کرے تو معاف کئے جاؤ۔

سوید بن مقرن کا بیان ہے کہ ہم سات بھائیوں میں ایک غلام تھا۔ ایک مرتبہ ہمارے چھوٹے بھائی نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تو رسول اللہ نے ہم کو حکم دیا کہ اسے آزاد کر دو۔

(بقیہ صفحہ ۲۱۲) ہدتے وقت عبادات میں نماز کی تاکید فرمائی اور معاملات میں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی۔

انہی سوید بن مقرن کے صاحبزادے معاویہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے ہاں کے ایک غلام کو تھپڑ مارا۔ والد کو خبر ہوئی تو انہوں نے ہم دونوں کو بلایا اور غلام سے کہا تو معاویہ سے بدلہ لے۔[1]
عرب میں دستور تھا کہ غلام کو عبدی (میرا بندہ) اور لونڈی کو اَمتی (میری بندی) کہکر پکارتے تھے اور اپنے آپ کو غلاموں سے رب کہلواتے تھے۔ آنحضرت صلعم نے اس کو منع کیا اور فرمایا کہ انہیں فتای (میرا لڑکا) اور فتاتی (میری لڑکی) کہکر پکارا کرو اور اپنے آپ کو سیدی یا مولائی کہلوایا کرو۔ اہل عرب غلام کو اپنے پاس جگہ دینا بھی عار سمجھتے تھے، مگر آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ان کو اپنے ساتھ ایک دسترخوان پر بٹھا کر کھلاؤ، اور اگر اتنا نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنے کھانے میں سے ایک دو لقمے ہی ان کو کھلا دیا کرو،
اذا اتی احدکم غلامہ بطعام فان لم یجلسہ معہ فلینا ولہ لقمۃ او لقمتین۔
ان سب باتوں سے یہی مقصود تھا کہ غلاموں کو عزت و آرام سے رکھا جائے اور وہ خاندان کے رکن بن کر رہیں۔

(۳) اسلامی قانون میں غلاموں کو وہ وسیع حقوق دیئے گئے جن سے وہ آزادوں کے لگ بھگ پہنچ گئے۔ فوجداری قانون ان کو اسی حفاظت کا مستحق قرار دیتا ہے جس کا استحقاق آزادوں کو حاصل ہے۔ ان کا مال چرانے والا، ان کو قتل کرنے والا، ان کی عورتوں کی آبرو ریزی کرنے والا، ان کو جسمانی نقصان پہنچانے والا، خواہ آزاد ہو یا غلام، بہرصورت اس کو وہی سزا دی جائیگی جو آزاد لوگوں کے ساتھ ان جرائم کا ارتکاب کرنے والے کے لئے مقرر ہے۔ اسی طرح دیوانی قانون ان کی املاک پر ان کے مالکانہ حقوق تسلیم کرتا ہے اور انہیں اپنے ذاتی اموال میں تصرف کرنے کے وسیع اختیارات دیتا ہے۔ از روئے قانون خود ان کے آقا کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ ان کے ذاتی مال میں ان کی مرضی کے خلاف تصرف کرے، یا ان کو کسی قسم کا جسمانی ضرر پہنچائے (سوائے تادیب کے جس میں رفق اور نرمی کی سخت تاکید ہے)، یا ان کی بہو بیٹیوں سے ناجائز علاقہ رکھے۔[2]

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی حق المملوک، ربانی برحاشیہ(؟)

[2] روم میں یہ عام دستور تھا کہ جب کسی غلام کی لڑکی بیاہی جاتی تو اس کو پہلی شب اس کے آقا کے پاس بسر کرنی پڑتی

قانون سے زیادہ اسلامی سوسائٹی نے ان کو اپنے اندر عملاً مساوات کا درجہ دیا ہے۔ اجتماعی زندگی میں غلاموں کی حیثیت کسی طرح آزادوں سے کم نہ تھی علم، سیاست، مذہب، معاشرت۔ غرض ہر شعبہ میں ان کے لئے ترقی کی تمام راہیں کھلی ہوئی تھیں اور غلام ہونا ان کے لئے کسی حیثیت سے بھی رکاوٹ کا باعث نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن سیدہ زینبؓ کو، جنہیں بعد میں ام المومنین ہونے کا شرف حاصل ہوا، اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ سے بیاہ دیا۔ امام حسینؓ کا نکاح ایران کی ایک شہزادی سے ہوا جو جنگ میں لونڈی بن کر آئی تھیں۔ امام زین العابدین انہی لونڈی کے بطن سے تھے جن کی اولاد اشرافِ اسلام میں سب سے بالاتر درجہ رکھتی ہے۔ سالم بن عبداللہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر جو فقہائے تابعین کی اولین صف میں ہیں دو لونڈیوں کے پیٹ سے تھے۔ امام حسن بصریؒ جو ائمہ تابعین کے سرخیل اور اصحاب طریقت کے پیشوا ہیں، ایک غلام کے بیٹے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ جو آج کروڑوں مسلمانوں کے مقتدا ہیں اور جن کو اسلامی دنیا امام اعظم کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ بنی تیم اللہ کے موالی میں سے بتائے جاتے ہیں مشہور محدث محمد بن سیرینؒ جن کا شمار اکابر تابعین میں ہوتا ہے، ایک غلام کے بیٹے تھے۔ ان کے باپ سیرینؒ اور ماں صفیہ دونوں مملوک تھے، مگر اس درجہ کے مملوک تھے کہ حضرت صفیہؓ کو تین امہات المومنین نے دلہن بنایا تھا اور سیرینؒ سے ان کا نکاح ابی بن کعبؓ جیسے جلیل القدر صحابی نے پڑھایا تھا۔ امام مالکؒ کے استاد نافعؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے غلام تھے۔ امام مالکؒ کو جس سلسلۃ الذہب پر ناز ہے، اس کی ایک کڑی یہی نافعؒ تھے۔ ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مبارکؒ جن کا شمار اکابر مجتہدین میں ہوتا ہے، ایک غلام مبارک نامی کے بیٹے تھے۔ عکرمہؒ جو ائمہ مفسرین میں ہیں خود غلام تھے۔ محمد بن اسحٰق مشہور صاحب سیرۃ کے دادا یسار معرکہ عین التمر سے پکڑے ہوئے آئے تھے۔ مکہ کے امام المحدثین عطاءؒ بن رباح، یمن کے امام طاؤسؒ بن کیسان، مصر کے امام یزیدؒ بن حبیب، شام کے امام مکحولؒ، الجزیرہ کے امام میمونؒ بن مہران، خراسان کے امام ضحاکؒ، کوفہ کے امام ابراہیم النخعی، سب کے سب غلاموں کے گروہ سے تھے۔ سلمان فارسیؓ غلام تھے، جنہیں حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ

(بقیہ صفحہ ۲۱۴) تھی۔ اس شرمناک ظلم سے عیسائی بشپ تک نہ بچ سکتے تھے۔ دیکھو امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۲۲۴۔

سلمان منا اھل البیت، سلمان تو ہم اہلبیت میں سے ہیں۔ بلال حبشیؓ غلام تھے جن کو حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ بلال سید نا و مولی سید نا، بلالؓ ہمارے آقا کا غلام اور ہمارا آقا ہے۔ صہیبؓ رومی غلام تھے، جنہیں حضرت عمرؓ نے اپنی جگہ مسلمانوں کی امامت کے لئے کھڑا کیا تھا۔ سالمؓ، ابو حذیفہ کے غلام تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے اپنے انتقال کے وقت فرمایا تھا کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو میں انکو خلافت کے لئے منتخب کرتا۔ اسامہؓ بن زید غلام زادے تھے جنہیں رسول اکرمؐ نے اپنے آخری وقت میں اس لشکر کا سردار بنایا تھا جس میں حضرت ابوبکرؓ جیسے جلیل القدر صحابی شریک تھے۔ اور جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادے عبداللہؓ سے کہا تھا کہ اسامہؓ کا باپ تیرے باپ سے اور اسامہؓ خود تجھ سے رسول اللہ کو زیادہ محبوب تھا۔ یہ تو قرون اولیٰ کی باتیں ہیں، بعد میں جبکہ اسلامی روح بہت کچھ کمزور پڑ گئی تھی، قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، اور غیاث الدین بلبن جیسے جلیل القدر غلاموں نے خود ہمارے ملک ہندوستان پر حکومت کی ہے۔ محمود غزنوی جو اپنے وقت میں دنیا کا سب سے بڑا فاتح تھا، نسلاً ترکی غلام تھا۔ مصر میں کئی صدی تک ممالیک کی حکومت رہی ہے اور ان کا نام خود کہتا ہے کہ وہ دراصل غلام تھے جنہوں نے بادشاہی کے تخت پر بار پایا۔

ان غلاموں کو کون غلام کہہ سکتا ہے؟ کیا آزادوں کے لئے ان سے کچھ زیادہ ترقی، عزت اور اقتدار حاصل کرنے کے مواقع تھے؟ کیا ان کی غلامی نے ان کو اجتماعی زندگی میں اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج تک پہنچنے سے روکا؟ اگر غلامی اسی چیز کا نام ہے اور وہ ایسی ہی ہوتی ہے تو آزادی کا نام غلامی رکھ دینے میں کیا ہرج ہے؟

یہ طریقے تھے جن سے اسلام نے غلامی کو گھٹاتے گھٹاتے آزادی سے جا ملایا، بلکہ دونوں میں کوئی فرق نہ رہنے دیا۔ لفظ "غلامی" تو بے شک باقی رہا، مگر غلامی کی حقیقت بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئی۔

غنیمت کا مسئلہ اسلام میں مال غنیمت کا جواز بھی ان مسائل میں سے ہے جن پر مخالفین نے بہت کچھ حاشیہ آرائیاں کی ہیں، اور جن کی خود موافقین نے بھی اکثر غلط وکالت کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غنیمت کے معاملہ میں بھی اسلام نے وہی تدریجی اصلاح کا طریقہ اختیار کیا ہے جو غلامی کے مسئلہ میں اختیار

گیا تھا عرب میں غنیمت کا شوق جس قدر بڑھا ہوا تھا اس کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے۔ مالِ غنیمت کا حصول وہ سب سے بڑا لالچ تھا جس کے لئے ایک عرب جنگ کے خطرات برداشت کرنے اور مرنے مارنے پر آمادہ ہوا کرتا تھا۔ عرب کی جنگ کے عین مفہوم میں لوٹ مار داخل تھی، حتیٰ کہ لفظ حرب کے مدلول کا تصور ہی اس وقت تک دماغوں میں مکمل نہ ہو سکتا تھا جب تک اسمیں لوٹ مار کا مفہوم شامل نہ ہو۔ جب اسلام آیا تو عرب اسی موروثی رغبت و شوق کو لیکر اس میں بھی داخل ہوئے، اور ناممکن تھا کہ ان صدیوں کی متوارث ذہنیت کو دفعتہً بدل دیا جاتا۔ جن نومسلم عربوں کی اصلاح کرنی تھی ان کا حال یہ تھا کہ بلا ارادہ جبلی طور پر غنیمت کی طرف کھنچتے تھے اور میدانِ جنگ میں اموالِ غنیمت کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکتے تھے۔ جنگِ بدر سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحش کو ایک جماعت کے ساتھ بطنِ نخلہ کی طرف بھیجا کہ دشمن کی اطلاعات فراہم کریں۔ راستہ میں قریش کے چند تاجروں سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی۔ مالِ غنیمت دیکھ کر اُن کے آدمی قابو سے باہر ہو گئے اور ان لوگوں کو قتل کر کے سامان لوٹ لائے۔ مؤرخین نے اس واقعہ کو جنگِ بدر کے فوری اسباب میں شمار کیا ہے۔[1] خود جنگِ بدر میں ایک طرف قریش کا تجارتی قافلہ شام کی جانب سے آ رہا تھا۔ اور دوسری طرف قریش کی فوجیں مکہ سے آ رہی تھیں، باوجودیکہ اس وقت غنیم کا زور توڑنا سب سے زیادہ ضروری تھا، مگر لشکرِ اسلام کی عام خواہش یہی تھی کہ پہلے قافلہ پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا جائے۔ اسی کے متعلق قرآن مجید میں آیا ہے:

وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّہَا لَکُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ وَیُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ۔ (الانفال-۱)	اور جبکہ اللہ وعدہ کر رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک پر تم کو غلبہ ہو گا، اور تم چاہتے تھے کہ کمزور اور غیر مسلح جماعت تمہارے ہاتھ آ جائے، حالانکہ اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

پھر جب لڑائی میں فتح ہوئی تو صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت کے لئے شوقِ غنیمت کو ضبط کرنا

[1] طبری، طبع مصر ج ۲ ص ۲۶۷، ابن اثیر طبع مصر ج ۲ ص ۴۲-۴۳۔

مشکل ہو گیا اور حکم الٰہی کا انتظار کئے بغیر غنائم کے لوٹنے میں مشغول ہو گئے۔ اسی کے متعلق آیت اتری[1]

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ (انفال - ۹) اگر پہلے سے خدا کا نوشتہ نہ آ چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔

جنگ اُحد میں اسی شوق غنیمت نے فتح کو شکست سے بدل دیا۔ قریش کے پاؤں اکھڑتے ہی صحابہؓ اموال غنیمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور اُن تیر اندازوں کو بھی عالم بیخودی میں سرکار رسالتمآب کا حکم یاد نہ رہا جنہیں آپ نے عقب کی حفاظت پر متعین فرمایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فوج پراگندہ ہو گئی اور لشکر کفار نے پلٹ کر ایسا حملہ کیا کہ خود رسول اللہ صلعم زخمی ہو گئے۔ حنین میں بھی یہی ہوا کہ پہلے حملہ سے دشمنوں میں ابتری پھیلی تو معاً جدید الاسلام اعراب غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور ان ہی پر بھی دیکھ کر بنی ہوازن کے تیر اندازوں نے ایسا حملہ کیا کہ بڑے بڑے جاں نثاروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بخاری میں براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ انا لما حملنا علیھم انکشفوا فاکببنا علی الغنائم فاستقبلنا بالسھام۔[2]

معاذاللہ یہ واقعات بیان کرنے سے صحابہ کرامؓ کی تنقیص مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ غنیمت کا شوق ایک فطری جذبہ تھا جو صدیوں کی روایات سے طبیعتوں میں اس قدر راسخ ہو گیا تھا کہ کسی انسانی جماعت، حتیٰ کہ صحابہ کرامؓ جیسی مقدس اور متاع دنیا کو حقیر جاننے والی جماعت کے لئے بھی اس کے اثرات کو دفعتہً دل و دماغ سے محو کر دینا غیر ممکن تھا۔ جب حال یہ تھا تو ایک حکیمانہ مذہب جو فطرت سے جنگ نہیں بلکہ اس کی اصلاح کرنا چاہتا تھا، اس سے بہتر طریقہ اور کیا اختیار کر سکتا تھا کہ نفس غنیمت کو حلال کر دیتا اور بالواسطہ طریقوں سے اس کے شوق کو گھٹانے اور اس کے حدود کو کم کرنے کی کوشش کرتا؟ یہی راستہ تھا جو اسلام نے اختیار کیا۔ اس نے جس وجہ سے غنیمت کو حلال کیا ہے اس کا حال ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس کو امام ابو یوسفؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کے حوالہ سے

---

[1] طبری ج ۲ ص ۲۶۰، کتاب الخراج ص ۱۲۲، ترمذی کتاب التفسیر

[2] بخاری کتاب المغازی باب قول اللہ تعالیٰ و یوم حنین، الخ

نقل کیا ہے۔

قال رسول اللہ صلعم لم تحل الغنائم لقوم سود الرؤس من قبلکم، کانت تنزل نار من السماء فتاکلها، فلما کان یوم بدر اسرع الناس فی الغنائم، فانزل اللہ عز وجل لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ تم سے پہلے کسی کالے سر والی قوم کے لئے غنیمت حلال نہیں کی گئی۔ ایک آگ آسمان سے اترتی اور مال غنیمت کو کھا جایا کرتی تھی۔ جب جنگ بدر واقع ہوئی تو لوگ غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ اس پر یہ آیت اتری کہ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے ہی سے نہ آچکا ہوتا تو تم پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔ خیر اب جو کچھ تم نے لوٹا ہے اسے کھاؤ کہ وہ تمہارے لئے حلال و پاک ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غنیمت پہلے حلال نہ تھی، مگر انسانی فطرت کے ناقابل تغیر رجحان کو دیکھ کر اسے حلال کر دیا گیا۔ تاہم محض فطرت کی رعایت ہی کر کے بس نہیں ڈال دی گئی، بلکہ اس رجحان کی اصلاح اور اس کی تعدیل کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے جنہوں نے رفتہ رفتہ دلوں سے شوق غنیمت کو کم کر دیا، اور جو تھوڑا بہت باقی رہ گیا اس کی اصلاح اس طرح کی گئی کہ اموال غنیمت پر متعدد اقسام کی پابندیاں عائد کر دی گئیں، اور خود اموال غنیمت کے دائرہ کو بہت محدود کر دیا گیا۔

اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ تین طریقے ایسے ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔

۱۔ اسلام نے غنیمت کی معنوی قیمت اس قدر گرا دی کہ دینی ذہنوں میں حصول غنائم کا شوق ہی باقی نہ رہا۔ پہلے کہا کہ جو شخص غنیمت حاصل کرنے کی نیت سے جنگ کریگا اس کو جہاد کا ثواب نہیں ملے گا، ثواب صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو دل کو دنیوی اغراض سے پاک رکھ کر خاص خدا کے لئے جنگ کریں۔ پھر جب دلوں میں غنیمت سے زیادہ حصول ثواب کی قدر پیدا ہو گئی تو بتایا کہ جو شخص دنیا میں اپنی جنگ کا فائدہ حاصل کر لے گا اس کے لئے آخرت کا ثواب کم ہو جائے گا اور جو دنیا میں فائدہ نہ اٹھائیگا اس کو

لہ یہ اشارہ ہے ایک واقعہ کی طرف جس کو حضرت ابو ہریرہؓ ہی نے ایک دوسری حدیث میں بیان کیا ہے، دیکھو بخاری کتاب الجہاد، باب قول النبی احلت لکم الغنائم۔

آخرت میں پورا ثواب ملے گا:-

ما من غازية تغزو في سبيل الله فيصيبون الغنيمة إلا تعجلوا ثلثي أجرهم من الآخرة ويبقى لهم الثلث، وإن لم يصيبوا غنيمة تمّ لهم أجرهم[1]

جس فوج نے اللہ کی راہ میں جنگ کی اور مالِ غنیمت پا لیا، اس نے اپنے آخرت کے ثواب میں سے دو تہائی حصہ یہیں پا لیا اور اس کے لئے صرف ایک تہائی باقی رہ گیا، اور جس نے غنیمت نہ پائی تو اس کو پورا اجر ملے گا۔

اس تعلیم نے مسلمانوں میں مالِ غنیمت کی آرزو سے بڑھ کر ثوابِ آخرت کی تمنّا پیدا کر دی اور وہی عرب جو کبھی غنائم کے انبار دیکھ کر بے قابو ہو جاتے تھے، چند ہی برس کے اندر متاعِ دنیا سے اس قدر بے نیاز ہو گئے کہ مالِ غنیمت ان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اور وہ انکار کر دیتے تھے۔ رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے آخری زمانہ میں جب غزوۂ تبوک کے لئے نفیرِ عام دی گئی تو واثلہ بن اسقعؓ نے لوگوں سے کہا کہ جو شخص مجھ کو اپنے ساتھ لے جائے گا میں اسے غنیمت میں سے آدھا حصہ دوں گا۔ انصار میں سے ایک صحابی نے یہ شرط قبول کر لی اور ان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ غزوہ میں لشکرِ اسلام کو جو کچھ مال ملا اس میں سے واثلہ کے حصہ میں چند نہایت عمدہ جوان اونٹ (قلائص) آئے جنہیں لے کر وہ ان انصاری شیخ کے پاس پہنچے اور کہا کہ یہ وہی مالِ غنیمت ہے جس کا حصہ دینے کی میں نے آپ سے شرط کی تھی۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ میرا مقصد غنیمت حاصل کرنا نہ تھا محض ثواب مطلوب تھا۔[2]

ایک دفعہ ایک بدوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک ہوا۔ دورانِ جنگ میں کچھ مالِ غنیمت آپ کے پاس آیا اور آپ نے دوسرے مجاہدین کی طرح اس بدوی کا حصہ بھی لگایا۔ اس کی اطلاع جب اس کو ہوئی تو اس نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے اس مال کے لئے آپ کی پیروی اختیار نہیں کی ہے، میں تو چاہتا ہوں کہ (حلق کی طرف اشارہ کر کے) اس جگہ تیر کھاؤں اور شہید ہو جاؤں۔[3]

[1] مسلم، کتاب الجہاد۔ نسائی، باب السریۃ التی تخفق۔

[2] ابوداؤد ج ۲۔ باب الرجل یکری دابتہ علی النصف او السہم۔

[3] نسائی، کتاب الجنائز، باب الصلوٰۃ علی الشہداء۔

۲- مال غنیمت میں محتاجوں، معذوروں اور مسکینوں کی پرورش اور عام قومی ضروریات کے لئے پانچواں حصہ مقرر کیا گیا:

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۔ (انفال-۵)

جان لو کہ جو کچھ مال غنیمت تم کو حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور اہل قرابت اور یتامیٰ و مساکین اور مسافروں کا حصہ ہے۔

اس طریقہ سے اموال غنیمت کا ایک معتدبہ حصہ نیک کاموں کے لئے الگ کر لیا گیا اور افراد فوج کے حصہ میں بہت کچھ کمی کر دی گئی۔

۳- مال غنیمت کا اطلاق پہلے ہر اس مال پر ہوتا تھا جو ایک فوج دشمن کے ملک سے لوٹ لے خواہ کسی طرح ہو۔ لیکن اسلام نے غنیمت صرف اس مال کو قرار دیا جو میدان جنگ میں دشمن کی افواج سے فاتح فوج کے ہاتھ آئے۔ اس سے ایک طرف عام سلب و نہب جو پر امن غیر فوجی آبادیوں میں کیا جائے غنیمت کی جائز حدود سے خارج ہو جاتا ہے، دوسری طرف وہ مال بھی غنیمت کی تعریف سے نکل جاتا ہے جو جنگ کے بغیر صلح یا امان کے ذریعہ مسلمانوں کے ہاتھ آئے، یا جس پر میدان جنگ کا معاملہ ختم ہونے کے بعد اسلامی فوج کا قبضہ ہو۔ اسلام نے اس دوسری قسم کے مال کو فوج میں تقسیم کرنے کے بجائے حکومت اسلامیہ کی ملک قرار دیا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:-

مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (الحشر-۱)

جو فئے کا مال اللہ نے اپنے رسول کو عطا کیا ہے اس پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے بلکہ اللہ اپنے رسول کو جس پر چاہتا ہے تسلط بخشتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ سو ایسا مال جو اللہ اپنے رسول کو فئے کے طور پر عطا فرمائے وہ اللہ اور اس کے رسول اور اہل قرابت اور یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کا حق ہے تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان نہ گردش کرتا پھرے

اس آیت نے یہ تصریح کر دی ہے کہ صرف وہ اموالِ مفتوحہ غنیمت کے تحت آتے ہیں جن کو اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑا کر، یعنی میدانِ جنگ میں لڑ کر، فوج نے حاصل کیا ہو۔ باقی رہے وہ اموال واملاک اور اراضی جو ایجافِ خیل و رکاب کا ماحصل و نتیجہ نہ ہوں، تو وہ حکومتِ اسلامیہ کی ملک ہیں، اور خدا و رسولؐ کے کاموں پر خرچ ہونے کے لئے ہیں۔

یہ حکم ابتداءً صرف رسول اللہ صلعم کی ذات کے لئے مخصوص سمجھا گیا تھا۔ مگر جب صحابۂ کرامؓ نے غور کیا تو نظر آیا کہ اس کے حقداروں میں چھ نام گنائے گئے ہیں، اللہ، رسولؐ، ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین، اور ابن سبیل۔ ان میں سے صرف ایک "رسولؐ" دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ باقی اللہ حی و لایموت ہے، اور ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین، اور ابن سبیل تا قیامِ قیامت موجود ہیں۔ پس تنہا رسولؐ کے رخصت ہو جانے سے یہ پانچ حقدار کیونکر بے حق ہو سکتے ہیں۔ پھر خود رسولؐ کا استحقاق بھی تنہا ان کی ذات کے لئے نہ تھا، بلکہ اس کام کے لئے تھا جو وہ اپنی زندگی میں کرتے تھے، اور وہ کام بدستور جاری ہے۔ اس لئے درحقیقت رسول اللہؐ کا حق بھی فوت نہیں ہوا۔ علاوہ بریں قرآن نے ان چھ حقداروں کا حق قرار دینے کی جو مصلحت بیان کی تھی وہ یہ تھی کہ یہ مال تنہا مالداروں ہی میں گردش نہ کرتا پھرے بلکہ قوم کے تمام طبقے اس سے مستفید ہوں۔ کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم۔ یہ مصلحت جس طرح رسولؐ کی زندگی میں تھی اسی طرح اب بھی باقی ہے، اور جب تک دنیا آباد ہے باقی رہے گی۔ اس بنا پر یہ قانون قرار دیا گیا کہ ایسے تمام مال خدا اور رسولؐ کے کاموں اور امت کے عام طبقوں کی خدمت کے لئے محفوظ رکھا جائے۔[لہ]

اسی قانون کے مطابق حضرت عمرؓ نے ممالکِ مفتوحہ کو فوج پر تقسیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور فوجوں کو صرف اس مال پر قناعت کرنی پڑی تھی جو لڑائیوں کے دوران میں غنیمت کے طور پر دشمن کی افواج سے حاصل ہوا تھا۔ اس بارے میں حضرت عمرؓ کا وہ خط جو انہوں نے سعد بن وقاصؓ کو لکھا تھا، اسلامی

لہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد تھا جس وقت فوج نے سوادِ عراق کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا تو آپ نے اس کی تردید میں یہی آیت دلیل کے طور پر پیش کی تھی اور کہا تھا کہ ھذہ عامۃ فی القریٰ کلھا، کتاب الخراج صفحہ ۱۵۔

قانون کو بالکل واضح کر دیتا ہے۔ بلاذری نے اس خط کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:۔

"تمہارا خط پہنچا تم بیان کرتے ہو کہ لوگ تم سے کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ ملک و مال اللہ تعالیٰ نے ان کو غنیمت میں عطا کیا ہے اس کو تقسیم کر دیا جائے۔ سو تم میرا خط ملنے کے بعد ایسا کرو کہ فوج نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑا کر جو مال، اسباب اور جانور لوٹے ہیں، ان کو خمس وضع کرنے کے بعد، اہل فوج میں تقسیم کر دو۔ باقی اراضی اور انہار کو کاشتکاروں کے پاس رہنے دو تاکہ مسلمانوں کی تنخواہوں کے کام آئیں، ورنہ اگر ان کو موجودہ زمانہ کے لوگوں میں تقسیم کر دو گے تو بعد میں آنے والوں کے لئے کچھ نہ بچیگا۔"[1]

حضرت ابو عبیدہؓ نے جب شام فتح کیا تو اس وقت بھی فوج نے تمام ملک کو غنیمت قرار دیکر یہ مطالبہ کیا تھا کہ اسے تقسیم کر دیا جائے۔ اس کی اطلاع انہوں نے حضرت عمرؓ کو دی اور حکم دریافت کیا۔ جواب میں آپ نے ایک طویل خط لکھا جس میں آیت مذکورہ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"فاقر ما افاء اللہ علیک فی اید ی اھلہ واجعل الجزیۃ علیھم بقدر طاقتھم"[2]

پس تم ان املاک کو جو اللہ نے تم کو "فے" میں عطا کی ہیں، اہل ملک کے ہاتھ میں رہنے دو اور ان پر ان کی طاقت کے مطابق ٹیکس لگا دو۔

اس طرح ایک طرف تو اسلام نے غنیمت کے شوق کو کم کیا، جو لوٹ مار اور غارتگری کا اصلی محرک تھا، دوسری طرف ایسے قوانین مقرر کئے جن سے غنیمت کا دائرہ گھٹ کر صرف ان اموال تک محدود رہ گیا جو جنگی اعمال کے سلسلہ میں غنیم کی شکست خوردہ افواج سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور تیسری طرف اس مال غنیمت میں سے بھی پانچواں حصہ نیک کاموں کے لئے لے لیا۔ اب اسلامی اصطلاح میں لفظ غنیمت جس چیز پر بولا جاتا ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جسے مغربی قانون میں "غنیمت جنگ"۔

[1] فتوح البلدان صفحہ ۲۶۴، امام ابو یوسف نے کتاب الخراج (صفحہ ۲۳-۲۴) میں بھی تھوڑے سے لفظی تغیر کے ساتھ اسے نقل کیا ہے۔

[2] کتاب الخراج صفحہ ۶۲۔

(Spoils of war) کہا جاتا ہے اور جسے تمام دنیا کے مقننوں نے فاتح کا فطری حق تسلیم کیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مغربی قانون تمام اموال غنیمت کو حکومت کا حصہ قرار دیتا ہے، اور اسلامی قانون ان میں سے پانچواں حصہ لیکر باقی چار حصے ان جانباز سپاہیوں میں تقسیم کر دیتا ہے جنہوں نے اپنا خون بہا کر انہیں حاصل کیا ہے۔

صلح و امان اسلامی جنگ کے شعائر میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمان کو ہر وقت صلح کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ چونکہ اسلام کی جنگ کا مقصد برائے جنگ نہیں ہے بلکہ اصلاح اور امن و سلامتی ہے، اس لئے اگر مصالحت کے ذریعہ یہ مقصد حاصل ہونے کی کوئی صورت موجود ہو تو ہتھیار اٹھانے سے پہلے اس صورت سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنگ کی آخری حد وجوہ نزاع کے ارتفاع اور جنگ کی ضرورت باقی نہ رہنے کو قرار دیا ہے۔ حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا اور حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ پس قرآن مجید ہم کو حکم دیتا ہے کہ اگر دشمن تم سے خود صلح کی درخواست کرے تو اسے کھلے دل سے قبول کر لو۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ، هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ۔

(انفال - ۸)

اگر وہ صلح کے لئے جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو کہ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ اور اگر وہ تمہیں دھوکہ دینے کا ارادہ رکھتے ہوں تو پروا نہ کرو کہ تمہارے لئے اللہ کافی ہے وہی ہے جس نے تم کو نصرت بخشی اور مومنوں کی کثرت سے تم کو تقویت دی۔

یہ بھی حکم ہے کہ اگر کوئی دشمن ہتھیار ڈال دے اور اپنی زبان سے، یا زبانِ حال سے امان مانگے تو پھر ہم کو اس پر ہاتھ اٹھانے کا حق باقی نہیں رہتا۔

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (النساء - ۱۲)

اگر وہ تم سے ہاتھ کھینچ لیں اور جنگ نہ کریں اور صلح کی خواہش کریں تو ایسی حالت میں اللہ نے تم کو ان پر دست درازی کی کوئی راہ نہیں دی ہے۔

اسی طرح اگر دشمن قوم کے افراد اکّے دُکّے مل جائیں اور امان مانگیں تو ان کو قتل کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ امن کے ساتھ ان کو رہنے دینا چاہئے اور جب وہ اپنے ملک کی طرف واپس جانا چاہیں تو خیریت سے پہنچا دینا چاہیے:-

وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ (التوبہ ۱۰)	اگر مشرکوں میں سے کوئی تمہاری پناہ میں آنا چاہے تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے، پھر اس کو اس کے مامن تک پہنچا دو، یہ اس لئے ہے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔

ابتداءً اس آیت کی غرض اشاعتِ اسلام تھی جیسا کہ ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ نے بیان کیا ہے۔ نا حتی یسمع کلام اللہ سے مراد یہ ہے کہ ان کو اپنی پناہ دیں لیکر اللہ کا کلام سناؤ، اگر وہ اس طرح وعظ ونصیحت حاصل کریں اور اسلام قبول کرلیں تو بہتر ہے۔ اور اگر ان کے دل اسلام کے لئے نہ کھلیں تو ان کو قتل نہ کرو بلکہ امن وعافیت کے ساتھ ان کو ان کے وطن تک پہنچا دو۔ لیکن چونکہ آیت کے الفاظ عام تھے اس لئے ائمہ مجتہدین نے اس سے یہ حکم نکالا کہ دارالحرب سے جو لوگ تجارت یا سیاحت یا حصولِ علم یا کسی اور غرض سے آنا چاہیں اور حکومت اسلامیہ کی پناہ میں رہنے کی درخواست کریں تو ان کو دارالاسلام میں آنے اور آزادی کے ساتھ نقل وحرکت کرنے کی اجازت دینی چاہیے۔[1] فقہائے حنفیہ نے اس کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کی ہے۔ اگر حربی مستامن کو دارالاسلام میں رہتے ہوئے ایک سال گذر جائے تو اس کو نوٹس دیا جائے گا کہ یا تو وہ واپس جائے یا اپنی قومیت (Nationality) بدل کر اسلامی رعیت بن جائے۔[2] تاہم حقوق کے اعتبار سے ذمی اور مستامن

---

[1] اس کے لئے ادنیٰ شرط یہ ہے کہ وہ امان لیکر داخل ہوں، ورنہ بغیر امان طلب کئے آنکی صورت میں ان کو جاسوس قرار دیا جائیگا، اور جاسوس کے لئے اسلامی قانون میں بھی تمام دوسرے قوانین کی طرح قتل کی سزا ہے۔

[2] کتاب الخراج صفحہ ۱۱۰۔ ہدایہ کتاب السیر باب المستامن۔ بعض فقہانے یہ بھی فتویٰ دیا ہے کہ خواہ نوٹس دیا جائے یا نہ دیا جائے بہر صورت ایک سال گذرنے کے بعد اس کی قومیت خود بخود بدل جائے گی، چنانچہ مبسوط کے الفاظ اسی پر دلالت کرتے ہیں

ہیں زیادہ فرق نہیں ہے۔ مستامن کے لئے شریعت نے یہ وسیع رعایات مقرر کی ہیں کہ اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب کرنے کے باوجود وہ امان جو اسے دی گئی ہے منسوخ نہ ہوگی، اگر وہ کسی مسلمان کو قتل کر دے، یا رہزنی کرے، یا مسلمان عورت سے زنا کرے تب بھی اسے عام مجرموں کی طرح سزا دی جائے گی۔ حد یہ ہے کہ اگر وہ دار الاسلام کی خبریں بھی دشمنوں کو خفیہ خفیہ بھیجتا ہو تو امان کا عہد نہ ٹوٹے گا۔ صرف جرم کی سزا دے دی جائے گی[1]۔ ان رعایات کے مقابلہ میں اس کے ساتھ صرف اتنی سختی برتی گئی ہے کہ اگر اسلامی رعایا کا کوئی فرد خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی، اس کو قتل کر دے تو قاتل سے قصاص نہ لیا جائے گا، محض دیت وصول کی جائے گی۔ مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اسلامی رعیت نہیں ہے، اور اجنبی کو اپنی رعیت کے برابر حقوق کوئی حکومت بھی نہیں دیا کرتی، خصوصاً جبکہ وہ اجنبی ایک ایسی قوم سے ہو جس کا اس حکومت سے نہ کوئی معاہدہ ہو اور نہ باضابطہ سیاسی تعلق۔

مفتوح قوموں کے ساتھ برتاؤ جنگ کے مسائل ختم ہوئے۔ اب ہم کو متعلقات جنگ پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہیئے۔ دشمن کے ساتھ ایسی حالت میں نیک سلوک کرنا جبکہ اس کے اندر مقاومت اور انتقام کی قوت موجود ہو، کسی نہ کسی حد تک "کلوخ انداز را پاداش سنگ است" کے خوف پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ مگر جب اس کی قوت مقابلہ بالکل ٹوٹ جائے اور وہ بے بس ہو کر اپنے آپ کو فاتح کے رحم پر چھوڑ دے، اس وقت اس کے ساتھ فیاضی کا سلوک کرنا اخلاص اور کامل نیکی ہے جو فاتح کے حسن نیت کو بالکل واضح کر دیتی ہے۔ مفتوح کے ساتھ فاتح کے برتاؤ کا انحصار درحقیقت فاتح کے مقصد فتح پر ہوا کرتا ہے۔ اگر اس نے مفتوح کو حصول دولت کے لئے فتح کیا ہے تو اس کی حاکمانہ سیاست پر استحصال بالجبر کا غلبہ ہوگا۔ اگر مذہبی عداوت کی بنا پر کیا ہے تو حکومت میں مذہبی تعصب و تشدد نمایاں ہوگا۔ اگر ملک گیری و فرمانروائی کی ہوس اس کی محرک ہوئی ہے تو حکومت کی ساری عمارت ظلم و جبر اور استکبار و استعباد پر قائم ہوگی۔ برخلاف اس کے اگر فاتح کا مقصد حقیقۃً اصلاح کے سوا کچھ نہ ہو تو نہ وہ مفتوح قوم کی دولت لوٹے گا،

[1] ردالمحتار ج۲ ص ۲۷۳۔

نہ بے جا تشدد برتے گا، نہ ظلم و جور کا برتاؤ کرے گا، اور نہ اس کو ذلیل و خوار کر کے اپنا غلام بنائیگا۔ اس کی حکومت عدل، رواداری، مساوات، اور فیاضی پر مبنی ہوگی۔ اس کی سیاست کا بنیادی اصول یہ ہوگا کہ مفتوح قوم کو فتنہ و فساد اور طغیان و سرکشی سے باز رکھے اور اپنے دامن عافیت میں اس کو امن کے ساتھ اخلاقی، مادی، اور روحانی ترقی کے مواقع بہم پہنچائے۔ اب اس معیار کے مطابق ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اسلام اپنی مفتوح قوموں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے؟ اس کا قانون مفتوحین کو کیا درجہ دیتا ہے؟ اس کی شریعت ان کے لئے کیا حقوق مقرر کرتی ہے؟ اور اس کی حکومت ان کے ساتھ ایک مصلح حکومت کا سا برتاؤ کرتی ہے یا مفسد حکومت کا سا؟

مفتوحین کی دو قسمیں اسلامی قانون نے تمام مفتوحین کو دو اقسام پر تقسیم کیا ہے: ایک وہ جو صلح کے ساتھ اطاعت قبول کریں، دوسرے وہ جو بزور شمشیر مغلوب ہوں۔ ان دونوں کے احکام میں تھوڑا سا فرق ہے، اس لئے ہم دونوں کے احکام الگ الگ بیان کریں گے۔

معاہدین جو لوگ جنگ سے پہلے یا دوران جنگ میں اطاعت قبول کرنے پر راضی ہو جائیں اور حکومت اسلامیہ سے مخصوص شرائط طے کر لیں ان کے لئے اسلام کا قانون یہ ہے کہ ان کے ساتھ تمام معاملات ان شرائط صلح کے تابع ہوں گے جو ان سے طے ہوئی ہیں۔ دشمن کو اطاعت پر آمادہ کرنے کے لئے چند خاص شرائط طے کر لینا اور پھر جب وہ پوری طرح قابو میں آجائے تو اس کے ساتھ مختلف برتاؤ کرنا آج کل کی مہذب قوموں کے سیاسی معمولات میں سے ہے، مگر اسلام اس کو ناجائز بلکہ حرام اور گناہ عظیم قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جب کسی قوم کے ساتھ کچھ شرائط طے ہو جائیں، خواہ وہ مرعوب ہوئی یا نہ ہوئی ہو، تو اس کے بعد ان شرائط سے یک سر مو بھی تجاوز نہ کیا جائے، بلا لحاظ اس کے کہ فریقین کی اعتباری حیثیت اور طاقت و قوت میں کتنا ہی فرق آ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

لعلكم تقاتلون قوما فتظهرون عليهم فيتقونكم باموالهم دون انفسهم وابنائهم (وفي حديث فيصالحونكم على صلح)

اگر تم کسی قوم سے لڑو، اور اس پر غالب آ جاؤ، اور وہ قوم اپنی اور اپنی اولاد کی جان بچانے کے لئے تم کو خراج دینا منظور کرے (ایک دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے

فلا تصیبوا منھم فوق ذالك فانہ لا یحل لکم[1] — ایک صلحنامہ طے کر لے، تو پھر تم اس مقررہ خراج سے ایک حبہ بھی زائد نہ لینا کیونکہ وہ تمہارے لئے درست نہ ہوگا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

الا من ظلم معاھدا او انتقصہ او کلفہ فوق طاقتہ او اخذ منہ شیئاً بغیر طیب نفس فانا حجیجہ یوم القیامۃ[2] — خبردار! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کریگا یا اس کے حقوق میں کمی کریگا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالیگا، یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کریگا؛ اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث بنوں گا۔

ان دونوں حدیثوں کے الفاظ عام ہیں اور ان سے یہ عام حکم مستنبط ہوتا ہے کہ معاہد ذمیوں کے ساتھ صلحنامہ میں جو شرائط طے ہو جائیں ان میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ نہ ان پر ٹیکس بڑھایا جا سکتا ہے، نہ ان کی زمینوں پر قبضہ کیا جا سکتا ہے، نہ ان کی عمارتیں چھینی جا سکتی ہیں، نہ ان پر سخت فوجداری قوانین نافذ کئے جا سکتے ہیں، نہ ان کے مذہب میں دخل دیا جا سکتا ہے، نہ ان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جا سکتا ہے، اور نہ کوئی ایسا فعل کیا جا سکتا ہے جو ظلم، یا انتقاص، یا تکلیف مالایطاق یا اخذ بغیر طیب نفس کی حدود میں آتا ہو۔ انہی احکام کی بنا پر فقہائے اسلام نے صلحاً فتح ہونے والی قوموں کے متعلق کسی قسم کے قوانین مقرر نہیں کئے اور صرف یہ عام قاعدہ بیان کر کے چھوڑ دیا کہ ان کے ساتھ ہمارا معاملہ بالکل شرائط صلح کے مطابق ہوگا۔ امام ابو یوسف لکھتے ہیں:۔

یوخذ منھم ما صولحوا علیہ ویوفی لھم ولا یزاد علیھم[3] — ان سے وہی لیا جائے گا جس پر ان کے ساتھ صلح ہوئی ہے، ان کے حق میں صلح کی شرائط پوری کی جائینگی اور ان پر کچھ زیادہ نہ کیا جائے گا۔

---

[1] ابو داؤد، کتاب الجہاد۔

[2] ایضاً

[3] کتاب الخراج صفحہ ۳۵۔

ظاہر ہے کہ صلحنامہ کے لئے قواعد و اصول معین نہیں کئے جا سکتے۔ وقت اور موقع کے لحاظ سے جیسی شرائط مناسب ہوں گی وہی طے کر لی جائیں گی۔ تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدینؓ نے مختلف قوموں سے جو صلحنامے کئے ہیں ان سے ہمیں کم از کم وہ عام اصول معلوم ہو جاتے ہیں جن پر اسلام اپنے دشمنوں سے مصالحت کرتا اور کر سکتا ہے۔ ان اصولوں کو واضح کرنے کے لئے ہم چند صلحنامے یہاں نقل کرتے ہیں۔

اہل نجران کی درخواست پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو صلحنامہ لکھ کر انہیں دیا تھا اس میں خراج کی رقم مقرر کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

ولنجران وحاشيتها جوار الله وذمة محمد النبي رسول الله على أنفسهم وملتهم وأرضهم وأموالهم وغائبهم وشاهدهم وعيرهم وبعثهم وأمثلتهم، لا يغير ما كانوا عليه، ولا يغير حق من حقوقهم وأمثلتهم لا يفتن أسقف من أسقفيته ولا راهب من رهبانيته ولا واقه من وقاهيته على ما تحت أيديهم من قليل أو كثير، وليس عليهم رهق ولا دم جاهلية، ولا يحشرون ولا يعشرون و

نجران کے عیسائیوں اور ان کے ہمسائیوں[۱] کے لئے اللہ کی پناہ اور اللہ کے رسول محمد نبی کا ذمہ ہے، ان کی جانوں کے لئے، ان کے مذہب، ان کی زمین، ان کے اموال، ان کے حاضر و غائب، ان کے اونٹوں، ان کے قاصدوں، اور ان کے مذہبی نشانات[۲] سب کے لئے جس حالت پر وہ اب تک ہیں اسی پہ بحال رہیں گے۔ ان کے حقوق میں سے کوئی حق اور نشانات میں سے کوئی نشان نہ بدلا جائیگا۔ ان کے کسی اسقف کو اس کی اسقفیت سے، اور کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے، اور کسی خادم کلیسا کو اسکی خدمت سے نہ ہٹایا جائے گا خواہ اس کے ہاتھ کے نیچے جو کچھ ہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ[۳]۔ ان پر عہد جاہلیت کے کسی خون

۱؎ ڈاکٹر اسپرنگر نے حاشیہ سے مراد یہودی لئے ہیں۔ (سیرۃ محمد، ج ۳ ص ۵۰۲) مگر دراصل اس سے مراد تمام وہ لوگ ہیں جو عیسائیوں کے ساتھ وہاں آباد تھے۔

۲؎ امثلہ سے مراد صلیبیں اور تصویریں وغیرہ ہیں جو کنیسوں میں رکھی جاتی ہیں۔

۳؎ اس عبارت سے معابد کے املاک و اوقاف کا تحفظ مقصود ہے۔

لا یطاء ارضھم جیش، من سأل منھم حقاً بینھم النصف غیر ظالمین ولا مظلومین بنجران ومن اکل منھم الربا من ذی قبل فذمتی منه بریئة ولا یوخذ منھم رجل بظلم آخر، ولھم علی ما فی ھذہ الصحیفة جوار اللہ و ذمة محمد النبیؐ ابداً حتی یاتی امر اللہ، ما نصحوا و اصلحوا فیما علیھم

یا عہد کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ ان کو فوجی خدمت یا دہ یکی ادا کرنے پر مجبور نہ کیا جائیگا اور ان کی زمین کو کوئی لشکر پامال[1] نہ کریگا۔ اگر کوئی شخص ان کے خلاف کسی حق کا دعویٰ کریگا تو فریقین کے درمیان انصاف کیا جائیگا نہ اہل نجران ظالم بن سکیں گے، نہ مظلوم۔ مگر جس شخص نے اس سے پہلے سود کھایا ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری[2] ہوں۔ ان میں سے کسی شخص کو دوسرے کے گناہ میں نہ پکڑا جائیگا اس صحیفہ میں جو کچھ ہے اس کے لئے اللہ کی ضمانت اور محمد نبی کا ذمہ ہے، ہمیشہ کے واسطے جب تک کہ اللہ کا حکم آئے، اور جب تک وہ خیر خواہ رہیں اور ان حقوق کو ادا کرتے رہیں جو اس معاہدہ کی رو سے ان پر عائد ہوتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں خالد بن ولیدؓ نے اہل حیرہ کو جو صلحنامہ لکھ کر دیا تھا اس میں انہوں نے تمام باشندوں پر مجموعاً صرف ۶۰ ہزار درہم یعنی محتاجوں اور مفلسوں کو الگ کر کے بقیہ آبادی پر ۱۰ درہم (ڈھائی روپیہ) فی کس کے حساب سے سالانہ خراج مقرر کیا، اور اس کے مقابلہ میں حکومت اسلامیہ کی جانب سے یہ عہد کیا کہ:-

لا یھدم لھم بیعة ولا کنیسة ولا قصر من قصورھم التی کانوا یتحصنون فیھا اذا نزل بھم عدو لھم، ولا یمنعوا

ان کا کوئی معبد اور گرجا منہدم نہ کیا جائیگا، نہ ان قلعوں میں سے کوئی قلعہ توڑا جائیگا جن میں وہ اپنے دشمنوں سے بچاؤ کے لئے پناہ گزین ہوا کرتے تھے، نہ انہیں ناقوس

[1] اس شرط کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ اسلامی لشکر ان کی زمین کو پامال نہ کریگا بلکہ یہ بھی ہے کہ تمام خارجی طاقتوں کے مقابلہ میں ان کی حفاظت و مدافعت کی جائے گی۔

[2] اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے معاہدہ سے پہلے سود پر رقم دی ہو، اور معاہدہ کے بعد وہ مدیون پر سود کا دعویٰ کرے تو ہم اس کو دلانے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ مگر یعقوبی نے جو معاہدہ نقل کیا ہے اس میں "اس سے پہلے" کے بجائے "اس سال کے بعد" لکھا ہے۔ دیکھو ج ۲ ص ۶۲

من ضرب النواقيس ولا من اخراج الصلبان في يوم عيدهم[1]

بجانے سے روکا جائیگا، اور نہ ان کو عید کے دن صلیبیں نکالنے سے منع کیا جائے گا۔

حضرت عمرؓ نے اہل بیت المقدس کو جو صلحنامہ لکھ کر دیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

اعطاهم امانا لانفسهم واموالهم ولكنائسهم وصلبانهم وسقيمها وبريئها وسائر ملتها انه لا يسكن كنائسهم ولا تهدم ولا ينتقص منها ولا من حيزها ولا من صلبهم ولا من شيئ من اموالهم ولا يكرهون على دينهم ولا يضار احد منهم[2]

ان کو امان دی ان کی جان و مال اور ان کے کنیسوں اور صلیبوں اور ان کے تندرستوں اور بیماروں کے لئے۔ یہ امان ایلیا کی ساری ملت کے لئے ہے۔ عہد کیا جاتا ہے کہ ان کے کنیسوں کو مسلمانوں کا مسکن نہ بنایا جائے گا، نہ ان کو منہدم کیا جائے گا، نہ ان کے احاطوں اور ان کی عمارتوں میں کوئی کمی کی جائے گی، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے اموال میں سے کسی چیز کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ ان پر دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہ کیا جائے گا اور نہ ان میں سے کسی کو ضرر پہنچایا جائے گا۔

اہل دمشق کو حضرت عمرؓ نے جو صلحنامہ لکھ کر دیا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

اعطاهم امانا على انفسهم واموالهم وكنائسهم وسور مدينتهم، لا يهدم ولا يسكن شيئ من دورهم لهم بذالك عهد الله وذمة رسوله ... ... لا يعرض لهم الا بخير اذا اعطوا الجزية[3]

ان کو امان دی ان کی جان و مال کے لئے اور ان کے کنیسوں اور ان کے شہر کی فصیل کے لئے۔ ان کے مکانات میں سے نہ کوئی توڑا جائے گا اور نہ مسلمانوں کا مسکن بنایا جائیگا۔ اس پر ان کے لئے اللہ کا عہد اور اس کے رسول کا ذمہ ہے ... ... ان کے ساتھ نیکی کے سوا کبھی کوئی اور برتاؤ نہ کیا جائے گا جب تک کہ وہ جزیہ ادا کرتے رہیں گے۔

---

[1] امام ابو یوسف کا بیان ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ نے اسی شرط پر صلحنامہ کو نافذ فرمایا۔ کتاب الخراج صفحہ ۸۲۔

[2] یہ صلحنامہ اس وقت لکھا گیا تھا جب اہل بیت المقدس کی قوت مقابلہ بالکل ٹوٹ چکی تھی۔

[3] یہ صلحنامہ اس وقت لکھا گیا تھا جب آدھا شہر بزور شمشیر فتح ہو چکا تھا۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے اہل عانات کو جو صلحنامہ لکھکر دیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

لا يهدم لهم بيعة ولا كنيسة وعلى ان يضربوا نواقيسهم في اي ساعة شاؤا من ليل او نهار الا في اوقات الصلوة وعلى ان يخرجوا الصلبان في ايام عيدهم۔

ان کا کوئی معبد اور کوئی گرجا منہدم نہ کیا جائے گا۔ وہ رات دن میں جس وقت چاہیں اپنے ناقوس بجائیں مگر اوقات نماز کا احترام ملحوظ رکھیں، ان کو حق ہوگا کہ اپنے ایام عید میں صلیبیں نکالیں۔

بعلبک کے لوگوں کو حضرت ابوعبیدہؓ نے جو صلحنامہ لکھکر دیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں۔

هذا كتاب امان لفلان ابن فلان واهل بعلبك رومها وفرسها وعربها، على انفسهم واموالهم وكنائسهم ودورهم داخل المدينة وخارجها وعلى ارحائهم ... من اسلم فله ما لنا وعليه ما علينا ولتجارهم ان يسافروا الى حيث ارادوا من البلاد التي صالحنا عليها وعلى من اقام منهم الجزية والخراج،

یہ امان کی تحریر ہے فلاں ابن فلاں[1] اور اہل بعلبک کے لئے عام اس سے کہ وہ رومی ہوں یا فارسی یا عرب۔ امان ہے ان کی جان، مال، کنائس اور عمارات کے لئے عام اس سے کہ وہ شہر کے اندر ہوں یا باہر۔ اور امان ہے ان کی چکیوں کے لئے ..... ان میں سے جو مسلمان ہو جائے گا اس کے وہی حقوق ہیں جو ہمارے ہیں اور اس پر وہی فرائض ہیں جو ہم پر ہیں۔ ان کے تاجروں کو حق ہوگا کہ جن ملکوں سے ہماری صلح ہو چکی ہے ان میں آزادی کے ساتھ آمد و رفت رکھیں۔ ان میں سے جو کوئی اپنے دین پر قائم رہے گا اس پر جزیہ اور خراج عائد ہوگا۔

اہل دبیل کے صلحنامہ میں حبیبؓ بن مسلمہ نے لکھا:۔

هذا كتاب من حبيب بن مسلمة لنصارى اهل دبيل ومجوسها ويهودها شاهدهم وغائبهم اني امنتكم على انفسكم واموالكم وكنائسكم وبيعكم

یہ تحریر ہے حبیبؓ بن مسلمہ کی جانب سے اہل دبیل کے لئے، عام اس سے کہ وہ عیسائی ہوں یا مجوسی یا یہودی، حاضر ہوں یا غائب۔ میں نے تم کو امان دی تمہاری جانوں اور مالوں اور کنیسوں اور معبدوں اور تمہارے

[1] غالباً یہاں حاکم بعلبک کا نام ہوگا۔

من سور مدينتكم فانتم آمنون و علينا الوفاء لكم بالعهد ما وفيتم و اديتم الجزية والخراج

شہر کی فصیل کے لئے پس تم امان میں ہو اور جب تک تم اپنے عہد پر قائم رہو اور جزیہ و خراج ادا کرتے رہو ہم پر فرض ہے کہ اس عہد کو پورا کریں۔

آذربائیجان کے صلحنامہ میں حذیفہ بن الیمانؓ نے لکھا:۔

الامان على انفسهم و اموالهم و مللهم و شرائعهم

امان ہے ان کی جان و مال اور ان کی ملتوں اور ان کی شریعتوں کے لئے۔

جرجان کے صلحنامہ میں انہی حذیفہؓ نے لکھا:۔

لهم الامان على انفسهم و اموالهم و مللهم و شرائعهم ولا يغير بشيء من ذالك

ان کی جان و مال اور ان کی ملتوں اور شریعتوں کے لئے امان ہے، ان میں سے کسی چیز میں تغیر نہ کیا جائے گا۔

ماہ دینار کے صلحنامہ میں انہوں نے لکھا:۔

لا يغيرون عن ملة ولا يحال بينهم و بين شرائعهم

ان کو مذہب بدلنے پر مجبور نہ کیا جائے گا اور نہ ان کے مذہبی قوانین میں مداخلت کی جائے گی۔

ہم نے اتنی تفصیل کے ساتھ یہ معاہدات اس لئے نقل کئے ہیں کہ ناظرین کو اسلام کے اندازِ مصالحت کا ایک عمومی تصور حاصل ہو جائے۔ ایک دو معاہدات کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہونا ممکن ہے کہ شاید کسی خاص حالت میں رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہؓ نے مجبوراً ایسی شرائط قبول کر لی ہونگی۔ لیکن یہاں عرب، شام، الجزیرہ اور فارس وغیرہ ممالک کے کئی عہد نامے آپ کے سامنے موجود ہیں، اور تاریخوں میں ان کے علاوہ بیسیوں اور عہد نامے مل سکتے ہیں جن کے اندر ایک ہی قسم کی فیاضانہ رنگ پائی جاتی ہے۔ ہم نے خصوصیت کے ساتھ ان معاہدات کو نقل کیا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے پوری طرح غالب آجانے کے بعد کئے تھے۔ نجران کا معاہدہ اس وقت ہوا تھا جب تمام عرب پر اسلام کی دھاک بیٹھ چکی تھی اور خود اہل نجران نے خوفزدہ ہو کر اپنے سید اور عاقب

کو مصالحت کے لئے بھیجا تھا۔ حیرہ کا معاہدہ اس وقت ہوا جب اس کے اردگرد کے مقامات کو خالد بن ولیدؓ کی بے پناہ تلوار فتح کر چکی تھی اور اہل حیرہ نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی تھی کہ خود آگے بڑھ کر اطاعت قبول کر لیں۔ دمشق اور بیت المقدس کے متعلق تو آپ کو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ وہ قریب قریب فتح ہو چکے تھے اور اگر مسلمان چاہتے کہ انہیں بزور شمشیر فتح کر لیں تو یہ ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ ایسی حالت میں صلح کرنا، اور ان شرائط پر کرنا جو اوپر کے معاہدات میں درج ہیں، کسی ایسی قوم کا فعل نہیں ہو سکتا تھا جس کا مقصد اپنے مذہب کی بجبر اشاعت کرنا ہوتا، یا جس نے غیر مذاہب کا نام و نشان مٹانے کے لئے تلوار اٹھائی ہوتی، یا جو محض لوٹ مار اور حصول ملک و مال کے لئے نکلی ہوتی۔

غیر معاہدین مفتوحین کی دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو آخر وقت تک مسلمانوں سے لڑتے رہے ہوں، اور جنہوں نے اس وقت ہتھیار ڈالے ہوں جب اسلامی فوجیں ان کے استحکامات کو توڑ کر ان کی بستیوں میں فاتحانہ داخل ہو چکی ہوں۔ ایسے مفتوحین کے بارے میں اسلام نے فاتح قوم کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان کے تمام ہتھیار اٹھانے والے مردوں کو قتل کر دے، ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالے اور ان کی املاک پر قبضہ کر لے۔ لیکن طریق اولیٰ یہ بتایا ہے کہ ان کو بھی ذمی بنا لیا جائے اور اسی حال پر رہنے دیا جائے جس پر وہ جنگ سے پہلے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس زمانہ کا عام دستور ہی یہ تھا کہ مفتوحوں کو غلام بنا لیتے، ان کی املاک پر قبضہ کر لیتے اور شہروں کی تسخیر کے بعد قتل عام کر کے ان کی جنگی طاقت کو فنا کر دیتے تھے۔ اسلام کے لئے اس عام وقتی ذہنیت کو دفعتہً بدل دینا مشکل تھا۔ وقت کی روح سے جنگ کرنا اس کے طریق اصلاح کے خلاف تھا۔ اس لئے اس نے ایک طرف رواجوں اور دستوروں سے متاثر دماغوں کو مطمئن کرنے کے لئے پچھلے طریقہ کو ظاہری شکل میں باقی رکھا، اور دوسری طرف رسول اکرمؐ اور آپ کے صحابہؓ نے اپنی رہنمائی سے مسلمانوں میں اتنی فراخ حوصلگی اور فیاضی کی اسپرٹ پیدا کر دی کہ انہوں نے خود ہی اس اجازت سے فائدہ اٹھانا پسند نہ کیا، اور رفتہ رفتہ ایک جوابی رواج ایسا پیدا ہو گیا جس نے پچھلے رواج کو منسوخ کر دیا۔ عہد رسالت اور عہد خلفائے راشدینؓ، بلکہ پورے عہد اسلامی کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے ہزاروں ملکوں اور شہروں کو عنوۃً فتح کیا، مگر

کسی ایک میں بھی نہ قتل عام کیا، نہ باشندوں کو غلام بنایا، اور نہ ان کی املاک ضبط کیں[1]۔ عہد رسالت میں خیبر عنوۃً فتح ہوا اور آنحضرت صلعم نے اس کے باشندوں کو ذمی بنا لیا۔ مکہ عنوۃً فتح ہوا اور نہ زمین فوج میں تقسیم کی گئی نہ باشندوں کو غلام بنایا گیا۔ غزوۂ حنین میں ہوازن مغلوب ہوئے اور آنحضرت صلعم کے حکم سے ان کی جاں بخشی کی گئی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب عراق و شام کے علاقے عنوۃً فتح ہوئے تو پہلی مرتبہ اسلامی فوج میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ حق فتح سے فائدہ اٹھا کر زمین تقسیم کر دی جائے اور باشندے غلام بنا لیئے جائیں، چنانچہ انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا:-

"ہم نے زمین کو اپنا خون بہا کر فتح کیا ہے۔ اس لئے آپ اسے ہمارے درمیان تقسیم کیجئے اور اس کے باشندوں کو غلام بنائیے"[2]

مگر حضرت عمرؓ نے اپنے زبردست دلائل سے ان کے دلوں کا رُخ پھیر دیا اور وہ قدیم ذہنیت ہمیشہ کے لئے بدل گئی۔ امام ابویوسفؒ نے وہ پورا مباحثہ نقل کیا ہے جو اس مسئلہ پر صحابہؓ کی کونسل میں ہوا تھا اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصلاح کا عمل کس طرح انجام پذیر ہوا۔ حضرت بلالؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا مطالبہ تھا کہ زمین فوج میں تقسیم کی جائے اور باشندوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے لیکن حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، اور انصار کے تمام اکابر اس کے مخالف تھے اور سب کی رائے یہ تھی کہ ملک کو تقسیم کرنے اور باشندوں کو غلام بنانے کی پالیسی کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ خود حضرت عمرؓ اس کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"میری رائے یہ ہے کہ زمین کو اس کے غیر مسلم باشندوں کے ہاتھ میں چھوڑ دوں، ان کی زمین پر خراج اور ان کی گردنوں پر جزیہ مقرر کر دوں، اور اس طرح یہ زمین مسلمانوں کے سپاہیوں اور بال بچوں اور آئندہ نسلوں کی بسر اوقات کے لئے "فے" کے حکم میں ہو جائے۔ اب کیا آپ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ ان علاقوں کو یونہی لوگوں کی ذاتی ملک بنا دیا جائے؟ کیا آپ کے نزدیک شام، الجزیرہ،

---

[1] بنی قریظہ کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے اور اس پر مفصل بحث آگے آتی ہے۔

[2] مصری مطبوعہ لیدن صفحہ ۲۴۹۷، فتوح البلدان صفحہ ۲۷۷۔

کیونکہ بصرہ اور مصر جیسے بڑے بڑے صوبوں کو فوج میں تقسیم کر دینا ضروری ہے؟ اگر ایسا کر دیا گیا تو پھر لوگوں کے وظائف اور غرباء کے روزینے کہاں سے آئیں گے؟"

اس پر پوری کونسل نے بالاتفاق حضرت عمرؓ کی تجویز منظور کر لی اور تمام اہل عراق ذمی بنائے گئے۔[1] شام کی فتح کے بعد بھی یہی جھگڑا اٹھا تھا اور اس وقت حضرت زبیر بن العوامؓ معارضین کے لیڈر تھے۔ مگر حضرت عمرؓ کے تدبر نے اس کا بھی وہی فیصلہ کیا جو مسئلہ عراق کا کیا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ ہندوستان سے لیکر اسپین تک یورپ، ایشیا اور افریقہ کی بےشمار زمینوں کو انہوں نے عنوۃً فتح کیا اور کسی جگہ بھی حق فتح کو استعمال نہ کیا۔

اس قسم کے مفتوحین کو جب ذمی بنایا جاتا ہے تو ان کو چند حقوق دیئے جاتے ہیں جن کی تفصیلات کتب فقہیہ میں موجود ہیں ذیل میں ان احکام کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جن سے ذمیوں کی اس جماعت کی آئینی حیثیت معلوم ہوتی ہے:۔

(۱) جب امام ان سے جزیہ قبول کرے تو ہمیشہ کے لئے عقد ذمہ قائم ہو جائیگا اور ان کی جان و مال کی حفاظت کرنا مسلمانوں پر فرض ہوگا، کیونکہ قبول جزیہ کے ساتھ ہی عصمت نفس و مال ثابت ہو جاتی ہے۔[2] اس کے بعد امام کو یا مسلمانوں کو یہ حق باقی نہیں رہتا کہ ان کی املاک پر قبضہ کریں یا انہیں غلام بنائیں۔[3] حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو صاف لکھا ہے کہ فاذا اخذت منهم الجزية فلا شیٔ لك عليهم ولا سبيل۔[4]

(۲) عقد ذمہ قائم ہو جانے کے بعد اپنی زمینوں کے مالک وہی ہوں گے، ان کی ملکیت ان کے ورثاء کو منتقل ہوگی، اور ان کو اپنی املاک میں بیع، ہبہ، رہن وغیرہ کے جملہ حقوق حاصل ہوں گے، حکومت

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۱۳، ۱۵۔

[2] بدائع الصنائع ج ۷، ص ۱۱۱۔

[3] کتاب الخراج ص ۸۲۔

[4] فتح القدیر ج ۴، ص ۳۵۹۔

اسلامیہ کو ان پر کسی قسم کے تصرف کا حق نہ ہوگا۔

(۳) جزیہ کی مقدار ان کی مالی حالت کے لحاظ سے متعین کی جائے گی۔ جو مالدار ہیں ان سے زیادہ، جو متوسط الحال ہیں ان سے کم، اور جو غریب ہیں ان سے بہت کم لیا جائے گا۔ اور جو کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رکھتے یا جن کی زندگی کا انحصار دوسروں کی بخشش پر ہے، ان پر جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ اگرچہ جزیہ کے لئے کوئی خاص رقم متعین نہیں، لیکن اس کی تعیین میں یہ امر مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ ایسی رقم مقرر کی جائے جس کا ادا کرنا ان کے لئے آسان ہو۔ حضرت عمرؓ نے مالداروں پر ایک روپیہ ماہانہ، متوسط الحال لوگوں پر آٹھ آنہ مہینہ اور غریب محنت پیشہ لوگوں پر چار آنہ مہینہ جزیہ مقرر کیا تھا۔

(۴) جزیہ صرف ان لوگوں پر لگایا جائیگا جو اہلِ قتال ہیں۔ غیر اہلِ قتال مثلاً بچے، عورتیں، مجانین، اندھے، اپاہج، عبادت گاہوں کے خدام، از کار رفتہ بوڑھے، فقرأ اور سنیاسی لوگ، ایسے بیمار جن کی بیماری سال کے ایک بڑے حصّہ تک ممتد ہو جائے، اور لونڈی غلام وغیرہ جزیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

(۵) عنوۃً فتح ہونے والے شہر کی عبادت گاہوں پر مسلمانوں کو قبضہ کر لینے کا حق ہے، لیکن اس حق سے استفادہ نہ کرنا اور بطریق احسان ان کو علیٰ حالہ قائم رہنے دینا اولیٰ اور افضل ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جتنے ممالک فتح ہوئے ان میں کوئی معبد نہ توڑا گیا اور نہ اس سے کسی قسم کا تعرض کیا گیا۔ امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے ترکت علی حالہا ولم تھدم ولم یتعرض لھم، ان کو بحال رکھا گیا، انہیں نہ توڑا گیا، اور نہ کسی قسم کا تعرض کیا گیا۔ قدیم معابد کو مسمار کرنا بہر حال ناجائز ہے۔

ذمیوں کے عام حقوق | اب ہم ذمیوں کے وہ حقوق بیان کریں گے جو تمام اہلِ ذمہ کے لئے عام ہیں خواہ وہ معاہد ہوں یا غیر معاہد، صلحاً فتح ہوئے ہوں یا عنوۃً۔

۱؎ کتاب الخراج ص ۳۶۔

۲؎ بدائع ج ۷، ص ۱۱۲-۱۱۱، فتح القدیر ج ۴ ص ۳۷۲-۳۷۳، کتاب الخراج ص ۷۰۔

۳؎ کتاب الخراج ص ۸۲ ۴؎ بدائع ج ۷، ص ۱۱۴۔

(۱) ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر ہے۔ اگر کوئی مسلمان ذمی کو قتل کریگا تو اس کا قصاص اسی طرح لیا جائیگا جس طرح مسلمان کے قتل کرنے کی صورت میں لیا جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کیا تو آپؐ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور فرمایا انا احق من وفی بذمتہ، اس کے ذمہ کو وفا کرنے کا سب سے زیادہ حقدار میں ہوں۔[1]

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قبیلۂ بکر ابن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ اس پر آپ نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالہ کیا جائے، چنانچہ وہ مقتول کے وارثا کو دے دیا گیا اور اس نے اسے قتل کر دیا۔[2]

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں خود عبید اللہ بن عمرؓ کے قتل کا فتویٰ دے دیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے ہرمزان اور ابولؤلؤ کی بیٹی کو اس شبہ میں قتل کر دیا تھا کہ شاید وہ حضرت عمرؓ کے قتل کی سازش میں شریک ہوں۔

حضرت علیؓ کے زمانہ میں ایک مسلمان پر ایک ذمی کے قتل کا الزام لگایا گیا۔ ثبوت مکمل ہونے کے بعد آپ نے قصاص کا حکم دے دیا۔ مقتول کے بھائی نے آکر عرض کیا کہ میں نے خون معاف کیا۔ مگر آپ مطمئن نہ ہوئے اور فرمایا لعلھم فزعوک او ھددوک، شاید لوگوں نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے۔ اس نے جواب دیا نہیں، مجھے خون بہا مل چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے قتل سے میرا بھائی واپس نہیں آجائیگا۔ تب آپ نے قاتل کو رہا کیا اور فرمایا کہ من کان لہ ذمتنا فدمہ کدمنا ودیتہ کدیتنا۔[3] جو کوئی ہمارا ذمی ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح ہے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے فرمایا، انما قبلوا عقد الذمۃ لتکون اموالھم کاموالنا ودماؤھم کدمائنا، انہوں نے عقد ذمہ قبول ہی اس لئے کیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کی طرح اور انکے خون ہمارے خون کی طرح ہو جائیں۔ اسی قول کی بنا پر فقہا نے یہ جزئیہ نکالا ہے کہ اگر مسلمان کسی ذمی

---

[1] عنایہ شرح ہدایہ ج ۸ ص ۲۵۶۔ دارقطنی نے یہی حدیث ابن عمرؓ کے حوالہ سے نقل کی ہے اور اس میں انا اکرم من وفی بذمتہ کہا ہے

[2] برہان شرح مواہب الرحمٰن ج ۳ ص ۲۸۷۔

[3] برہان ج ۳ ص ۲۸۷ میرے پیش نظر برہان کا وہ قلمی نسخہ ہے جو مدرسہ الٰہیہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

کو بلا ارادہ قتل کرے تو اس کی دیت بھی وہی ہوگی جو مسلمان کو خطأً قتل کرنے سے لازم آتی ہے[1]

(۲) تعزیرات میں ذمی اور مسلمان کا درجہ مساوی ہے۔ جرائم کی جو سزا مسلمان کو دی جائے گی وہی ذمی کو بھی دی جائیگی۔ ذمی کا مال مسلمان چرائے یا مسلمان کا مال ذمی چرا لے، دونوں صورتوں میں سارق کا ہاتھ کاٹا جائیگا۔ ذمی کسی مسلمان عورت سے زنا کرے، یا مسلمان کسی ذمی عورت سے زنا کرے، دونوں صورتوں میں سزا یکساں ہوگی[2]۔

(۳) دیوانی قانون میں بھی ذمی اور مسلمان کے درمیان کامل مساوات ہے۔ حضرت علیؓ کے ارشاد اموالھم کاموالنا کے معنی یہ ہیں کہ ان کے مال کی ویسی ہی حفاظت ہونی چاہئے جیسی مسلمانوں کے مال کی ہوتی ہے۔ اس باب میں ذمیوں کے حقوق کا اتنا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان ان کی شراب یا ان کے خنزیر کو بھی تلف کر دے تو اس پر ضمان لازم آئے گا۔ درالمختار میں ہے ویضمن المسلم قیمۃ خمرہ و خنزیرہ اذا اتلفہ (مسلمان اس کی شراب اور اس کے سور کی قیمت ادا کریگا اگر وہ اسے تلف کر دے[3])

(۴) ذمی کو زبان یا ہاتھ پاؤں سے تکلیف پہنچانا، اس کو گالی دینا، مارنا پیٹنا، یا اس کی غیبت کرنا، اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مسلمان کے حق میں ناجائز ہے۔ درالمختار میں ہے ویجب کف الاذی عنہ وتحرم غیبتہ کالمسلم[4]۔

(۵) عقد ذمہ مسلمانوں کی جانب ابدی الزام رکھتا ہے، یعنی وہ اسے باندھنے کے بعد پھر توڑ دینے کے مختار نہیں ہیں۔ لیکن دوسری جانب ذمیوں کو اختیار ہے کہ جب تک چاہیں اس پر قائم رہیں اور جب چاہیں توڑ دیں۔ بدائع میں ہے واما صفۃ العقد فھو لازم فی حقنا حتی لا یملک المسلمون نقضہ بحال من الاحوال، واما فی حقھم فغیر لازم[5]۔

---

[1] درالمختار ج ۳ ص ۲۷۳۔

[2] کتاب الخراج صفحہ ۱۰۹، ۱۰۸۔

[3] جلد ۳ صفحہ ۲۷۳۔

[4] جلد ۳ صفحہ ۲۷۳-۲۷۴۔

[5] جلد ۷ صفحہ ۱۱۲۔

(۶) ذمی خواہ کیسے ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرے، اس کا ذمہ نہیں ٹوٹتا حتیٰ کہ جزیہ بند کر دینا، مسلمان کو قتل کرنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا، یا کسی مسلمان عورت کی آبرو ریزی کرنا بھی اس کے حق میں ناقضِ ذمہ نہیں ہے۔ البتہ صرف دو صورتیں ایسی ہیں جن میں عقدِ ذمہ باقی نہیں رہتا، ایک یہ کہ وہ دار الاسلام سے نکل کر دشمنوں سے جا ملے، دوسرے یہ کہ حکومت اسلامیہ کے خلاف علانیہ بغاوت کر کے فتنہ و فساد برپا کرے۔[1]

(۷) ذمیوں کے شخصی معاملات ان کی شریعت (Personal law) کے مطابق طے کئے جائیں گے، اسلامی قانون ان پر نافذ نہیں کیا جائے گا۔ جن افعال کی حرمت ان کے مذہب میں بھی ثابت ہے ان سے تو وہ ہر حال میں منع کئے جائیں گے، البتہ جو افعال ان کے ہاں جائز اور اسلام میں ممنوع ہیں انہیں وہ اپنی بستیوں میں آزادی کے ساتھ کر سکیں گے، اور خالص اسلامی آبادیوں[2] میں حکومت اسلامیہ کو اختیار ہوگا کہ انہیں آزادی دے یا نہ دے۔ بدائع میں ہے:

ولا یمنعون من اظہار شیٔ مما ذکرنا من بیع الخمر والخنزیر والصلیب وضرب الناقوس فی قریۃ او موضع لیس من امصار المسلمین ولو کان فیہ عدد کثیر من اہل الاسلام۔ وانما یکرہ ذالک فی امصار المسلمین وہی التی یقام فیہا الجمع والاعیاد والحدود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واما اظہار فسق یعتقدون حرمتہ کالزنا وسائر الفواحش	جو بستیاں اور مقامات امصارِ مسلمین میں سے نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو شراب و خنزیر بیچنے، اور صلیب نکالنے اور ناقوس بجانے سے نہیں روکا جائیگا، خواہ وہاں مسلمانوں کی کتنی ہی کثیر تعداد آباد ہو۔ البتہ یہ افعال امصارِ مسلمین میں مکروہ ہیں جہاں جمعہ و عیدین اور حدود قائم کی جاتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رہا وہ فسق جس کی حرمت کے وہ بھی قائل ہیں، مثلاً زنا اور دوسرے تمام فواحش جو ان کے دین میں بھی حرام ہیں، تو اس کے

[1] بدائع ج ۷ ص ۱۱۳ ۔ فتح القدیر ج ۴ ص ۳۸۰ ۔ ۳۸۱ ۔

[2] خالص اسلامی آبادیوں سے مراد وہ مقامات ہیں جو اصطلاح شرع میں "امصارِ مسلمین" کہلاتے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق صرف انہی مقامات پر ہوتا ہے جن کی زمین مسلمانوں کی ملک ہو اور جنکو مسلمانوں نے اظہارِ شعائرِ اسلام کیلئے مخصوص کر لیا ہو

التی ھو امر فی دینھم۔ فانھم یمنعون من ذالک سواء کانوا فی امصار المسلمین او فی امصار ھم[1]۔	اظہار سے ان کو ہر حال میں روکا جائے گا، خواہ وہ امصار مسلمین میں ہوں۔ یا خود اپنے امصار میں۔

لیکن امصار مسلمین میں بھی ان کو صرف صلیبوں اور مورتیوں کے جلوس نکالنے اور علانیہ ناقوس بجاتے ہوئے بازاروں میں نکلنے کی ممانعت کی گئی ہے[2]۔ اپنے قدیم معابد کے اندر رہ کر وہ تمام شعائر کا اظہار کر سکتے ہیں، حکومت اسلامیہ اس میں دخل دینے کی مجاز نہیں ہے۔

(۸) امصار مسلمین میں ذمیوں کے جو معابد پہلے سے موجود ہوں ان سے تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ ٹوٹ جائیں تو انہیں اسی جگہ دوبارہ بنا لینے کا حق ہے۔ لیکن نئے معبد بنانے کا حق نہیں ہے[3]۔

(۹) جو مقامات امصار مسلمین نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو نئے معابد بنانے کی بھی عام اجازت ہے۔ اسی طرح جو مقامات "مصر" نہ رہے ہوں، یعنی امام نے ان کو ترک کر کے اقامت جمعہ و اعیاد اور اقامت حدود کا سلسلہ بند کر دیا ہو، ان میں بھی نئے معابد کی تعمیر اور اظہار شعائر کفر جائز ہے[4]۔ ابن عباسؓ کا فتویٰ یہ ہے کہ:-

اما مصر مصرتہ العرب فلیس لھم ان یحدثوا فیہ بناء بیعۃ ولا کنیسۃ ولا یضربوا فیہ بناقوس ولا یظھروا فیہ خمرا ولا یتخذوا فیہ خنزیرا وکل مصر کانت العجم مصرتہ ففتحہ اللہ علی العرب فنزلوا	جن شہروں کو مسلمانوں نے آباد کیا ہے ان میں ذمیوں کو یہ حق نہیں ہے کہ نئے معابد اور کنائس تعمیر کریں، یا ناقوس بجائیں، شرابیں پئیں اور سور پالیں۔ باقی رہے وہ شہر جو عجمیوں کے آباد کئے ہوئے ہیں اور جن کو اللہ نے عربوں (یعنی مسلمانوں) کے ہاتھ پر فتح کیا اور انہوں

---

[1] بدائع ج ۷ ص ۱۱۳۔

[2] امصار مسلمین میں یہ قیود عائد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے مواقع نہ پیدا ہوں۔ افسوس ہے کہ بعد کے لوگوں نے اس کا منشا کچھ اور سمجھا۔

[3] بدائع جلد ۷ ص ۱۱۴۔ [4] ایضاً ص ایضاً۔

علیٰ حکمهم فللعجم ما فی عهدهم وعلی العرب ان یوفوا لهم بذالک۔

نے مسلمانوں کے حکم پر اطاعت قبول کر لی، تو عجم کے لئے وہی حقوق ہیں جو ان کے معاہدہ میں طے ہو جائیں اور عرب پر ان کا ادا کرنا لازم ہے۔

(۱۰) جزیہ و خراج کی تحصیل میں ذمیوں پر تشدد کرنا ممنوع ہے۔ ان کے ساتھ نرمی اور رفق کی تاکید کی گئی ہے، اور ان پر ایسا بار ڈالنے سے منع کیا گیا ہے جسے اٹھانے کی ان میں قدرت نہ ہو۔

جزیہ کی مقدار مقرر کرنے میں بھی ذمیوں پر تشدد کرنا ممنوع ہے۔ حضرت عمرؓ کی وصیت ہے کہ لا یکلفوا فوق طاقتهم، یعنی جتنا مال دینا ان کی طاقت سے باہر ہو، اس کے ادا کرنے کی تکلیف نہ دو۔

جزیہ کے عوض ان کی املاک کا نیلام نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت علیؓ کا حکم ہے کہ لا تبیعن لهم فی خراجهم حمارا ولا بقرة ولا کسوة شتاء ولا صیفا، خراج میں ان کا گدھا یا ان کی گائے یا ان کے کپڑے نہ بیچنا۔ ایک اور موقع پر اپنے عامل کو بھیجتے وقت حضرت علیؓ نے فرمایا:

"ان کے جاڑے گرمی کے کپڑے اور ان کے کھانے کا سامان اور ان کے جانور جن سے وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں، خراج وصول کرنے کی خاطر ہرگز نہ بیچنا، نہ کسی کو درہم وصول کرنے کے لئے کوڑے مارنا، نہ کسی کو کھڑا رکھنے کی سزا دینا، اور نہ خراج کے عوض کسی چیز کا نیلام کرنا، کیونکہ ہم جو ان کے حاکم بنائے گئے ہیں تو ہمارا کام نرمی سے وصول کرنا ہے۔ اگر تم نے میرے حکم کے خلاف عمل کیا تو اللہ میرے بجائے تم کو پکڑ لیگا اور اگر مجھے تمہاری خلاف ورزی کی خبر پہنچی تو میں تمہیں معزول کر دونگا۔"

حضرت عمرؓ نے شام کے گورنر حضرت ابو عبیدہؓ کو جو فرمان لکھا تھا اس میں منجملہ دوسرے احکام کے ایک یہ

---

۱ کتاب الخراج ص ۱۰۱۔

۲ ایضاً ص ۸ و ۱۲۔

۳ فتح البیان ج ۴ ص ۹۳۔

۴ کتاب الخراج صفحہ ۹۔

بھی تھا کہ :۔

وامنع المسلمین من ظلمھم والاضرار بھم واکل اموالھم الا بحلّھا[1]   مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے اور انہیں ضرر پہنچانے اور ناجائز طریقہ سے ان کے مال کھانے سے منع کرنا۔

شام کے سفر میں حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کے عامل جزیہ وصول کرنے کے لئے ذمیوں کو سزائیں دے رہے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ان کو تکلیف نہ دو۔ اگر تم انہیں عذاب دو گے تو قیامت کے دن اللہ تمہیں عذاب دیگا، لا تعذب الناس فان الذین یعذبون الناس فی الدنیا یعذبھم اللہ یوم القیامۃ[2]۔

ہشام بن حکم نے حمص کے ایک سرکاری افسر کو دیکھا کہ وہ ایک قبطی کو جزیہ وصول کرنے کے لئے دھوپ میں کھڑا کر رہا ہے۔ اس پر انہوں نے اسے ملامت کی اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ان اللہ یعذب الذین یعذبون الناس فی الدنیا، اللہ عزوجل ان لوگوں کو عذاب دیگا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں[3]۔

فقہائے اسلام نے نادہندوں کے حق میں صرف اتنی اجازت دی ہے کہ انہیں تادیباً قید بے مشقت کی سزا دی جا سکتی ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے ولکن یرفق بھم ویحبسون حتی یودوا ما علیھم[4]

(۱) جو ذمی محتاج اور فقیر ہو جائیں انہیں صرف جزیہ ہی معاف نہیں کیا جائیگا بلکہ ان کے لئے اسلامی خزانہ سے وظائف بھی مقرر کئے جائیں گے۔ حضرت خالدؓ نے اہل حیرہ کو جو امان نامہ لکھ کر دیا تھا اس میں لکھتے ہیں :۔

وجعلت لھم ایما شیخ ضعف عن العمل   میں نے ان کے لئے یہ حق بھی رکھا ہے کہ جو کوئی شخص

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۸۲۔

[2] کتاب الخراج صفحہ ۷۱۔

[3] ابو داؤد کتاب الخراج والفئ والامارۃ۔

[4] کتاب الخراج ص ۷۰۔

اذا اصابتہ آفۃ من الآفات او کان غنیا فافتقر وصار اھل دینہ یتصدقون علیہ طرحت جزیتہ وعیل من بیت مال المسلمین ھو وعیالہ[1]	بڑھاپے کے سبب از کار رفتہ ہو جائے، یا اس پر کوئی آفت نازل ہو جائے، یا وہ پہلے مالدار تھا پھر فقیر ہو گیا یہاں تک کہ اس کے ہم مذہب لوگ اس کو صدقہ و خیرات دینے لگے، تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا اور اسے

اور اس کے بال بچوں کو مسلمانوں کے بیت المال سے خرچ دیا جائے گا۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک ضعیف العمر ذمی آدمی کو بھیک مانگتے دیکھا اور اس سے اس ذلیل حرکت کا سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ جزیہ ادا کرنے کے لئے بھیک مانگتا ہوں۔ اس پر آپ نے اس کا جزیہ معاف کر دیا، اس کے لئے وظیفہ مقرر کیا اور خزانچی کو لکھا:

"خدا کی قسم یہ ہرگز انصاف نہیں ہے کہ ہم اس کی جوانی میں اس سے فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں اس کو رسوا کریں[2]"

دمشق کے سفر میں بھی حضرت عمرؓ نے معذور ذمیوں کے لئے امدادی وظائف مقرر کرنے کے احکام جاری کئے تھے[3]۔

(۱۲) اگر کوئی ذمی مر جائے اور اس کے حساب میں جزیہ کا بقایا واجب الادا ہو تو وہ اس کے ترکہ سے وصول نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے ورثہ پر اس کا بار ڈالا جائے گا۔ امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں ان وجبت علیہ الجزیۃ فمات قبل ان تؤخذ منہ او اخذ بعضھا وبقی البعض لم یؤخذ بذالک ورثتہ ولم تؤخذ من ترکتہ[4]۔

(۱۳) مسلمان تاجروں کی طرح ذمی تاجروں کے اموالِ تجارت پر بھی ٹیکس لیا جائے گا، جبکہ ان کا راس المال

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۵۔

[2] کتاب الخراج ص ۷۲۔

[3] فتوح البلدان طبع یورپ ص ۱۲۹۔

[4] کتاب الخراج ص ۷۰۔

۲۰۰ درہم تک پہنچ جائے یا وہ ۲۰ مثقال سونے کے مالک ہو جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم زمانے میں فقہائے ذمی تاجر پر تجارتی محصول ۵ فیصدی تجویز کیا تھا اور مسلمان تاجر پر ۲½ فی صدی؛ لیکن یہ فصل قرآن وحدیث کی کسی نص پر مبنی نہ تھا بلکہ اجتہاد پر مبنی تھا اور وقتی مصالح اسی کے متقضی تھے۔ اس زمانہ میں مسلمان زیادہ تر جہاد اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت میں مشغول رہتے تھے اور تمام تجارت ذمیوں کے ہاتھوں میں آگئی تھی، اس لئے مسلمان تاجروں کی ہمت افزائی اور ان کی تجارت کے تحفظ کے لئے ان پر ٹیکس کم کر دیا گیا۔

(۴) ذمی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہیں اور دشمن سے ملک کی حفاظت کرنا تنہا مسلمانوں کے فرائض میں داخل کیا گیا ہے۔ چونکہ ان سے جزیہ اسی حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا جاتا ہے، اس لئے اسلام نہ تو ان کو فوجی خدمت کی تکلیف دینا جائز سمجھتا ہے اور نہ ان کی حفاظت سے عاجز ہونے کی صورت میں جزیہ وصول کرنا۔ اگر مسلمان ان کی حفاظت نہ کر سکیں تو انہیں ذمیوں کے اموالِ جزیہ سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ جنگ یرموک کے موقع پر جب رومیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ پر ایک زبردست فوج جمع کی اور مسلمانوں کو شام کے تمام مفتوح علاقے چھوڑ کر ایک مرکز پر جمع ہونے کی ضرورت لاحق ہوئی تو حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنے امراء کو لکھا کہ جو کچھ جزیہ و خراج تم نے ذمیوں سے وصول کیا ہے انہیں واپس کر دو اور ان سے کہو کہ "اب ہم تمہاری حفاظت سے عاجز ہیں، اس لئے ہم نے جو مال تمہاری حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے واپس کرتے ہیں[۳]" اس حکم کے مطابق تمام اجناد کے امراء نے جمع شدہ رقم واپس کر دی[۴]۔

اسلامی قانون سے یہ چند احکام صرف یہ دکھانے کے لئے نقل کئے گئے ہیں کہ اسلام نے اپنی مفتوح

---

[۱] کتاب الخراج صفحہ ۷۰۔

[۲] اس مسئلے کے صرف ایک پہلو سے یہاں بحث کی گئی ہے اس کے دوسرے پہلوؤں پر میں نے اپنے دوسرے مضامین میں روشنی ڈالی ہے۔

[۳] کتاب الخراج صفحہ ۱۱۱۔ [۴] (حاشیہ صفحہ ۲۶۱ پر دیکھیں)

قوموں کے ساتھ جس انصاف اور عدل و مساوات کا سلوک روا رکھا ہے، اس کی نظیر گذشتہ قوموں میں، اور اکثر حیثیات سے موجودہ زمانہ کی مہذب قوموں میں بھی نہیں ملتی۔ یہ قانون محض ایک کاغذی قانون نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عملی نفاذ کی ایک شاندار تاریخ بھی موجود ہے۔ چنانچہ ہم نے اس قانون کی ہر ہر دفعہ کے ساتھ حدیث و تاریخ کی مستند کتابوں سے متعدد نظائر بھی پیش کر دیئے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے کس طرح اس قانون کو عملی جامہ پہنایا۔ عہدِ رسالت مآب صلعم اور عہدِ صحابہؓ کے بعد بھی فقہائے اسلام ہمیشہ اس قانون کو ٹھیک ٹھیک نافذ کرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں، اور جب کبھی سرکش امراء نے اس کے خلاف عمل کیا ہے تو انہوں نے اس سے باز رکھنے یا کم از کم اس کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ولید بن عبد الملک اموی نے دمشق کے کنیسۂ یوحنا کو زبردستی عیسائیوں سے چھین کر مسجد میں شامل کر لیا۔ جب حضرت عمر بن عبد العزیز تختِ خلافت پر متمکن ہوئے اور عیسائیوں نے ان سے اس ظلم کی شکایت کی تو انہوں نے اپنے عامل کو حکم دیا کہ مسجد کا جتنا حصہ گرجا کی زمین پر تعمیر کیا گیا ہے اسے منہدم کر کے عیسائیوں کے حوالہ کر دو۔[1]

ولید بن یزید نے رومی حملہ کے خوف سے قبرس کے ذمی باشندوں کو جلاوطن کر کے شام میں آباد کیا تو اس پر فقہائے اسلام اور عام مسلمان سخت ناراض ہوئے اور اسے گناہ عظیم سمجھا۔ پھر جب یزید بن ولید نے ان کو دوبارہ قبرس میں لے جا کر آباد کر دیا تو اس کی عام طور پر تحسین کی گئی اور کہا گیا کہ یہی انصاف کا تقاضا ہے۔ اسمٰعیل بن عیاش کا بیان ہے کہ فاستفظع ذالک المسلمون واستعظمہ الفقہاء، فلما ولی یزید بن الولید بن عبد الملک ردھم الی قبرس فاستحسن المسلمون ذالک من فعلہ ورأوہ عدلاً۔[2]

(حاشیہ صفحہ ۲۴۵) بلاذری نے لکھا ہے کہ جب مسلمانوں نے حمص میں جزیہ کی رقم واپس کی تو وہاں کے باشندوں نے کہا کہ تمہاری حکومت کی انصاف پسندی ہم کو اس ظلم و ستم کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہے جس میں ہم مبتلا تھے، اب ہم ہرقل کے عامل کو اپنے شہر میں ہرگز نہ گھسنے دیں گے تاوقتیکہ ذکر مغلوب نہ ہو جائیں۔ فتوح البلدان طبع یورپ صفحہ ۱۳۷۔

[1] فتوح البلدان صفحہ ۱۳۲۔　[2] فتوح البلدان مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۵۶

بلاذری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ جبل لبنان کے باشندوں میں سے ایک گروہ نے بغاوت کردی۔ اس پر صالح بن علی بن عبداللہ نے ان کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی جس نے ان کے ہتھیار اٹھانے والے مردوں کو قتل کر دیا اور باقی لوگوں میں سے ایک جماعت کو جلاوطن کیا اور ایک جماعت کو وہیں آباد رہنے دیا۔ امام اوزاعی اس زمانہ میں زندہ تھے۔ انہوں نے صالح کو اس ظلم پر سخت تنبیہ کی اور ایک طویل خط لکھا جس کے چند فقرے یہ ہیں:۔

"جبل لبنان کے اہل ذمہ کی جلاوطنی کا حال تم کو معلوم ہے۔ ان میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے بغاوت کرنے والوں کے ساتھ کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ مگر باوجود اس کے تم نے کچھ کو قتل کیا اور کچھ لوگوں کو ان کی بستیوں کی طرف واپس بھیج دیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ عام لوگوں کو بعض خاص لوگوں کے جرم کی سزا کیونکر دی جا سکتی ہے اور کس بنا پر ان کے گھروں اور ان کی جائدادوں سے بے دخل کیا جا سکتا ہے، حالانکہ اللہ کا یہ حکم ہے کہ لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ؛ اور یہ ایک واجب التعمیل حکم ہے۔ تمہارے لئے بہترین نصیحت یہ ہے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو یاد رکھو کہ "جو کوئی کسی معاہد پر ظلم کرے گا اور اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا اس کے خلاف میں خود مدعی بنوں گا۔"[1]

یہ اور ایسی ہی بے شمار مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمۂ اسلام نے ہمیشہ اہل الذمہ کے حقوق کی حمایت کی ہے اور اگر کبھی کسی امیر یا بادشاہ نے ان پر جبر و ظلم کیا بھی ہے تو وہ اسلامی قانون کے صریح خلاف تھا جس سے اسلام بری الذمہ ہے۔

ذمیوں کے لباس کا مسئلہ ایک چیز البتہ اسلام میں ایسی ہے جس پر مخالفین کو بہت کچھ اعتراض کی گنجائش مل گئی ہے، اور وہ ذمیوں کے لباس کا مسئلہ ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ابتداءً اس کی جو حیثیت تھی اسے بعد میں غلط صورت دے دی گئی اور اسی سے لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع مل گیا کہ اسلام نے ذمیوں کی تحقیر و تذلیل کے لئے ایک مخصوص لباس اور ایک مخصوص وضع معاشرت مقرر کر دی ہے۔ اس میں

[1] فتوح البلدان صفحہ ۱۶۹۔

شک نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ کے بعض معاہدات میں اس قسم کی شرط موجود ہے کہ اہل الذمہ ایک خاص قسم کا لباس پہنیں اور مسلمانوں سے مشابہت نہ اختیار کریں۔ مثلاً حیرہ کے معاہدہ میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں۔

ولھم کل مالبسوا من الزی الا زی الحرب من غیر ان یتشبھوا بالمسلمین[1]	ان کو حق ہوگا کہ جیسا لباس چاہیں پہنیں، مگر فوجی لباس نہ پہنیں، اور مسلمانوں سے تشبہ نہ اختیار کریں۔

اسی طرح دمشق کے معاہدہ میں جس کی شرائط خود عیسائیوں کی طرف سے پیش کی گئی تھیں، یہ الفاظ موجود ہیں:۔

ولا نتشبہ بھم فی شیئ من ملابسھم فی قلنسوۃ ولا عمامۃ ولا نعلین ولا فرق شعر[2]	ہم مسلمانوں سے ان کے لباس میں کسی قسم کی مشابہت نہ اختیار کریں گے، نہ ٹوپی میں، نہ عمامہ میں، نہ جوتوں میں اور نہ مانگ نکالنے میں۔

ہماری کتب فقہیہ میں بھی اسی قسم کے احکام پائے جاتے ہیں، مثلاً بدائع میں ہے:۔

ان اھل الذمۃ یوخذون باظھار علامات یعرفون بھا ولا یترکون یتشبھون بالمسلمین فی لباسھم[3]	اہل ذمہ کو ایسی علامات اور نشانیاں رکھنی پڑیں گی، جن سے وہ پہچانے جاسکیں اور انہیں مسلمانوں سے مشابہت نہ اختیار کرنے دی جائے گی۔

امام ابو یوسفؒ نے بھی اپنی کتاب الخراج میں اس قسم کے احکام بیان کئے ہیں کہ ذمیوں کو مسلمانوں کے ساتھ وضع قطع میں مشابہت اختیار نہ کرنی چاہئے[4]۔

یہ سب احکام بلاشبہ ہمارے ائمہ سے منقول ہیں لیکن ان کا مقصد دراصل تحقیر نہیں ہے بلکہ مختلف

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۸۵۔

[2] ابن کثیر ج ۴ ص ۷۵۴۔

[3] بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۱۳۔

[4] یہ احکام تفصیل صفحہ ۷۲ سے ۷۳ تک بیان کئے گئے ہیں۔

ملتوں کے متبعین کو باہم خلط ملط ہونے سے روکتی ہے۔ چنانچہ جس طرح ذمیوں کو مسلمانوں کے ساتھ تشبہ اختیار کرنے سے روکا گیا ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی ذمیوں کے مشابہ بننے سے منع کر دیا گیا ہے۔ لباس کے تشابہ میں جو مفاسد پوشیدہ ہیں اُن سے اسلام غافل نہیں ہے۔[2] خصوصیت کے ساتھ محکوم قوموں میں اکثر یہ عیب پیدا ہو جایا کرتا ہے کہ وہ اپنے قومی لباس اور اپنی قومی معاشرت کو ذلیل سمجھنے لگتے ہیں اور حاکم قوم کا لباس اور طرزِ معاشرت اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ غلامانہ ذہنیت آج بھی دنیا کی محکوم قوموں میں موجود ہے۔ خود ہندوستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ بیشمار ہندی نژاد حضرات انگریزی لباس بڑے شوق کے ساتھ پہنتے ہیں اور اسے پہن کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ گویا ترقی کر کے کسی بہت ہی اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ گئے ہیں۔ حالانکہ کسی انگریز نے کبھی ہندوستانی لباس نہیں پہنا اور اگر خالص انگریزی سوسائٹیوں میں کبھی پہنا بھی ہے تو تفاخر کے لئے نہیں بلکہ تفنن اور مسخرہ پن کے لئے۔ نفسیاتِ محکومیت کے اس نکتہ کو ائمۂ اسلام خوب سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اہل الذمہ کو تشبہ بالمسلمین سے منع کر کے ان کی تذلیل و تحقیر نہیں کی بلکہ ان کی قومی عزت و شرافت کو برقرار رکھا۔ ممکن ہے کہ اس قسم کے قوانین بعض لوگوں کی نگاہ میں موجب حقارت ہوں، مگر ہمارے نزدیک اس میں کوئی تحقیر نہیں ہے، بلکہ ہم بہت خوش ہوتے اگر ہمارے انگریز حکمراں بھی ہم کو یورپین لباس اور طرزِ معاشرت اختیار کرنے سے حکماً منع کر دیتے۔

بڑی غلط فہمی ان احکام سے پیدا ہوتی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ ذمی زنار باندھیں، دوہرے تسمے کی جوتی پہنیں، اونچی باڑھ کی ٹوپی پہنیں اور ان کی زین کے آگے گول لکڑی ہو۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ احکام ذمیوں کے حق میں دائمی ہیں اور ان کے لئے یہ وضع اسلام نے مخصوص کر دی ہے۔ حالانکہ دراصل یہ احکام اصولی نہیں بلکہ فروعی ہیں۔ اصل حکم تو یہ ہے کہ ذمی اپنے قومی لباس پہنیں اور مسلمانوں کے ساتھ مشابہت

---

[1] بدقسمتی سے فقہائے متاخرین نے بھی اس کی غرض تحقیر ہی سمجھی ہے اور اسی لئے اپنی کتابوں میں لکھدیا ہے کہ [illegible] آثار الذلۃ علیہم۔ لیکن ائمہ سلف سے اس قسم کا کوئی قول منقول نہیں ہے۔ خود حضرت عمرؓ جو ان احکام کے واضع ہیں، اس باب میں بالکل خاموش ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ تشبہ سے منع کرنے کا مقصد ذمیوں کو ذلیل کرنا ہے۔

[2] تشبہ کے مسئلے پر میں نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام "لباس کا مسئلہ" ہے۔

اختیار نہ کریں۔ اب اس اصل سے فقہائے عصر نے فروع نکال لئے اور اسی لباس و وضع کو جو ان کے زمانہ میں عموماً عجم کے مجوسیوں اور شام کے عیسائیوں میں رائج تھی، ان کے لئے لازم کر دیا۔ اس سے یہ ہرگز مقصود نہیں ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک کے ذمی زنار باندھیں، لمبی ٹوپی اوڑھیں، اور دوہرے تسمے کی جوتی پہنیں۔ یہ احکام تو صرف اسی عہد کے لئے تھے آج کل کے فقہا اصل حکم یعنی منع تشبّہ بالمسلمین سے ایسے ہی دوسرے جزئی احکام مستنبط کر سکتے ہیں۔

۵ چند مستثنیات

جنگ اور متعلقاتِ جنگ کے متعلق اسلام نے جو قواعد و ضوابط اور حدود و قیود مقرر کئے ہیں، انہیں صفحاتِ بالا میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ مگر رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں بعض واقعات ایسے بھی پیش آئے ہیں جو بظاہر ان قوانین سے مختلف معلوم ہوتے ہیں اور ان سے ایک ناواقف اس شبہ میں پڑ سکتا ہے کہ شاید اسلام کے اصل احکام وہ نہیں ہیں جو بیان کئے گئے ہیں، یا اس کے احکام میں اختلاف اور تضاد ہے، یا رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ کا عمل اسلامی قوانین کے خلاف تھا۔ اس لئے اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان مستثنیٰ واقعات کی تشریح بھی کر دی جائے۔

بنو نضیر کا اخراج اس سلسلہ میں پہلا واقعہ بنو نضیر کے اخراج کا ہے۔ یہ یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا جو صدیوں سے یثرب میں آباد تھا۔ ہجرت کے بعد آنحضرت صلعم کا ان سے معاہدہ ہوا، اور جنگ بدر کے بعد آپ نے ان کو مدینہ سے نکال دیا۔ مخالفین اس واقعہ کو یہ معنی پہناتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے بنی نضیر کے ساتھ نعوذ باللہ مکر کیا، یعنی جب کمزور تھے تو ان سے معاہدہ کر لیا، اور جب طاقتور ہو گئے تو عہد توڑ کر انہیں جلاوطن کر دیا۔ لیکن یہ واقعہ کی محض ایک سادہ صورت فرض کر لینے کا نتیجہ ہے، ورنہ اگر اس کی تمام تفصیلات پر نظر کی جائے تو صورتِ واقعہ بالکل برعکس نظر آئے گی۔ عہد شکنی کے مجرم رسول اللہ صلعم نہیں بلکہ خود بنی نضیر نکلیں گے اور ان کے خلاف آنحضرت صلعم کی جنگی کارروائی ظلم نہیں بلکہ عین حق

ثابت ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے تو آپ نے یہودیوں کے دوسرے قبائل کی طرح بنو نضیر سے بھی ایک معاہدہ[1] کیا تھا جس کی بنیادی شرط یہ تھی کہ فریقین ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کارروائی نہ کریں گے، اور نہ ایک دوسرے کے دشمنوں کی امداد کریں گے۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ:-

وادعهم على ان لا يحاربوه ولا يمالئوا عليه عدوه[2]؛

ان سے مصالحت کی تھی اس بات پر کہ نہ وہ آپ سے جنگ کریں گے اور نہ آپ کے خلاف آپ کے دشمنوں کی اعانت کریں گے۔

اس معاہدہ کے بعد آنحضرت صلعم اور عام مسلمان ان کی طرف سے مطمئن ہوگئے تھے اور ان سے دوستانہ میل جول شروع کر دیا تھا لیکن شرائطِ معاہدہ کے بالکل خلاف وہ کفارِ قریش سے ساز باز کرتے رہے اور چپکے چپکے ان کو مسلمانوں کے متعلق خفیہ اطلاعات فراہم کرنے لگے۔ موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں لکھا ہے:-

كانت نضير قد دسوا الى قريش وحضوهم على قتال رسول الله صلى الله عليه وسلم ودلوهم على العورة[3]

بنی نضیر قریش سے سازشیں کرتے تھے، ان کو رسول اللہ صلعم کے خلاف جنگ پر ابھارتے تھے، اور انہیں خفیہ خبریں دیتے تھے۔

پھر انہوں نے اسی پر بس نہ کی بلکہ آنحضرت صلعم کو قتل کرنے کی بھی متعدد مرتبہ کوشش کی۔ ایک مرتبہ آپ کو کہلا کر بھیجا کہ آپ اپنے ساتھ تین آدمی لیکر آئیے اور ہم بھی اپنے تین عالم بھیجتے ہیں، ایک درمیانی مقام پر ان سے آپ کی بحث ہو۔ اور اگر آپ ان پر اپنے دین کی حقانیت ثابت کر دیں تو ہم آپ پر ایمان لے

[1] ابن ہشام نے سیرت میں اس معاہدہ کو تفصیل نقل کیا ہے۔

[2] فتح الباری ج ۷، ص ۲۳۱

[3] فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۲۔

آئیں گے۔ آنحضرت صلعم نے اس دعوت کو منظور کر لیا، مگر ابھی جائے معینہ کی جانب روانہ نہ ہوئے تھے کہ خود بنی نضیر کی ایک عورت نے اپنے بھائی کو جو مسلمان تھا، یہ اطلاع دی کہ یہودی خنجر لے کر آ رہے ہیں اور تمہارے نبی (صلعم) کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔[1]

ایک دوسرے موقع پر آنحضرت صلعم بنی عامر کے دو آدمیوں کی دیت کا معاملہ طے کرنے کے لئے بنو نضیر کے ہاں تشریف لے گئے۔ ان لوگوں نے بظاہر دوستانہ برتاؤ کیا اور آپ سے کہا کہ ہم مدد دینے کو حاضر ہیں، مگر آپس میں جا کر مشورہ کیا کہ "یہ شخص تم کو ایسی حالت میں پھر نہ ملے گا، بہتر ہے کہ تم میں کا ایک آدمی مکان کی چھت پر چڑھے اور اس پر ایک بھاری پتھر پھینک دے" چنانچہ یہ بات طے ہو گئی اور اس کام کے لئے عمرو بن جحاش بن کعب مقرر کیا گیا، مگر عین وقت پر آپ کو اطلاع ہو گئی اور آپ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔[2]

اب پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ مسلسل بدعہدیوں اور سازشوں کے باعث اندیشہ تھا کہ کہیں یہ آستین کے سانپ کسی بیرونی حملہ کے وقت مدینہ کی سلامتی کو خطرہ میں نہ ڈال دیں۔ یہی نہیں بلکہ یہاں تک اندیشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ خفیہ طریقہ سے آنحضرت صلعم کو شہید نہ کر دیں۔ مسلمان ان سے ایسے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ ایک مرتبہ جب ایک صحابی کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے اپنے عزیزوں کو وصیت کی کہ میرے مرنے کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے وقت نہ دینا، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ جنازہ کی شرکت کے لئے نکلیں اور کوئی یہودی آپ کو قتل کر دے۔[3] ایسی حالت میں ان عہد شکن دشمنوں سے مزید چشم پوشی نہیں کی جا سکتی تھی، مگر آنحضرت صلعم نے پھر بھی ان کے ساتھ رعایت کی اور دفعتہً ان پر حملہ کر دینے کے بجائے محمد بن مسلمہ کے ذریعہ ان کو یہ الٹی میٹم دیا کہ

"تم نے میرے ساتھ غدر کیا ہے، لہٰذا تم یا تو خود دس دن کے اندر مدینہ خالی کر دو، ورنہ میں مجبوراً

---

[1] اس واقعہ کو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ابو داؤد باب فی خبر النضیر اور فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۲ میں بیان کیا گیا ہے۔

[2] طبری مطبوعہ مصر ج ۳ ص ۳۰، فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۲، فتوح البلدان صفحہ ۲۴۔

[3] اسد الغابہ ج ۳ ص ۷۵، ذکر طلحہ بن براء۔

تم سے جنگ کرونگا"

دوسری طرف عبداللہ بن اُبی سردار منافقین نے انہیں کہلا بھیجا کہ تم ہرگز نہ نکلنا ہم تمہاری مدد کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرتؐ کے الٹی میٹم کا جواب یہ دیا کہ

انا لا نبرح دارنا فاصنع ما بدالک[1]　　ہم اپنا وطن نہ چھوڑیں گے تمہارا جو جی چاہے کر لو۔

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خلاف جنگ کرنے میں حق بجانب نہ تھے۔ آپ نے اتمامِ حجت کا پورا پورا حق ادا کر دیا تھا اور معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کے مقابلہ میں جو زیادہ سے زیادہ نرمی کی جا سکتی تھی وہ بھی کر چکے تھے۔ اب مجبوراً جنگ کے لئے نکلے اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ قبل اس کے کہ خون ریزی کی نوبت آتی صرف محاصرہ ہی کی شدت نے بنی نضیر کو بدحواس کر دیا۔ انہوں نے خود ہی تجویز پیش کی کہ آپ ہمارے خون معاف کر دیں، ہم مدینہ سے نکل کر اذرعات و شام، چلے جائیں گے، اور جو کچھ مال ہمارے اونٹ اٹھا سکیں گے وہ لے جائیں گے باقی سب کچھ یہیں چھوڑ جائیں گے[2] اس شرط کو آنحضرت صلعم نے منظور کر لیا اور بغیر کسی ادنیٰ ضرر کے بنو نضیر اسلامی علاقہ سے گذر کر شام کی طرف چلے گئے۔ اس مصالحت کے متعلق بلاذری لکھتا ہے:۔

ثم صالحوہ علی ان یخرجوا من بلدہ ولھم ما حملت الابل الا الحلقۃ والآلۃ[3]　　پھر انہوں نے اس شرط پر آپ سے صلح کر لی کہ وہ آپ کے شہر سے نکل جائیں گے اور سوائے اسلحہ اور زرہوں کے باقی جو مال ان کے اونٹ اٹھا سکیں گے وہ ان کا ہے

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:۔

فسئلوا ان یجلوا عن ارضھم علی ان لھم ما حملت الابل فصولحوا علی ذالک[4]　　پھر انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں اپنے علاقہ سے نکل جانے دیا جائے اور جو کچھ ہمارے اونٹ اٹھا سکیں وہ

---

[1] طبری، ج ۳ ص ۳۸؛ فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۳؛ فتوح البلدان ص ۲۴ –

[2] طبری ج ۳ ص ۳۸ –

[3] فتوح البلدان صفحہ ۲۴ –　　[4] فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۲ –

مال ہمارا ہو۔ چنانچہ اسی پیمان پر صلح ہو گئی۔

اب یہ ظاہر ہے کہ اعلانِ جنگ ہونے کے بعد، ایسی حالت میں جبکہ ان کو آسانی کے ساتھ مغلوب کر کے پورا پورا انتقام لیا جا سکتا تھا، ان کی شرائط مان لینا اور ان کو امن و سلامتی کے ساتھ صرف اپنی جانیں ہی نہیں بلکہ اپنا مال بھی لیکر نکل جانے دینا، بجز رحمدلی اور صلح پسندی کے اور کسی چیز کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف وہی شخص ایسا کر سکتا تھا جس کا مقصد خون ریزی و غارت گری نہ ہو بلکہ محض دفع شر ہو۔ مگر اس احسان کا جو بدلہ آنحضرت صلعم کو ملا وہ بہت ہی تلخ تھا۔ جن دشمنوں کو آپ نے قابو میں آجانے کے بعد محض رحم کھا کر چھوڑ دیا تھا انہوں نے مدینہ سے نکل کر تمام عرب میں آپ کے خلاف سازش کا جال پھیلا دیا اور دو ہی سال بعد وہ ۲۴ ہزار کا لشکر جرار اکٹھا کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ اگر آپ اسی وقت ان سانپوں کا سر کچل دیتے تو یہ طوفان ہرگز نہ اٹھتا لیکن رحمۃ للعالمین کی شان اس سے بالاتر تھی کہ کسی مغلوب دشمن کی التجائے رحم کو رد کر دیتے۔ آپ کو ان کے جذبۂ عناد کا حال خوب معلوم تھا، اور آپ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ فتنہ پرداز چین سے نہ بیٹھیں گے۔ مگر اس کے باوجود جب انہوں نے جاں بخشی کی درخواست کی تو آپ نے اسے قبول کر لیا۔

بنو قریظہ کا واقعہ بنو قریظہ کے قتل عام کو اس سے زیادہ اعتراضات کا مورد بنایا گیا ہے۔ یہ لوگ بھی مدینہ کے یہودی تھے اور بنو نضیر کی طرح مدینہ میں آباد تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے ان سے بھی دوسرے یہودی قبائل کی طرح وہی معاہدہ کیا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ پھر جب بنو نضیر سے جنگ ہوئی تو آپ نے دوبارہ بنو قریظہ کو معاہدہ کی دعوت دی اور قدیم معاہدہ کی تجدید کر لی۔ مگر جب جنگ احزاب میں انہوں نے کھلم کھلا دشمنوں کا ساتھ دیا تو آپ نے اُدھر سے فارغ ہو کر ان پر حملہ کیا، ان کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا، بچوں اور عورتوں کو غلام بنا لیا، اور ان کا مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ اس واقعہ کی بنا پر مخالفین نے آنحضرت صلعم پر بدعہدی اور شقاوت و سنگدلی کے شدید الزامات لگائے ہیں۔ مگر جب تفصیلات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس کی حقیقت بھی مخالفین کے زعم و بیان سے بالکل مختلف نظر

ـلـه ابو داؤد کتاب الخراج والفئ والامارہ، باب فی خبر النضیر

آتی ہے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بنو قریظہ سے دو مرتبہ معاہدہ ہوا تھا۔ ایک عام معاہدہ جو دوسرے یہودی قبائل کی معیت میں ہوا، دوسرا خاص معاہدہ جو بنی نضیر سے لڑائی کے موقع پر ان سے کیا گیا۔ ان دو معاہدات کے بعد بنو قریظہ کا فرض تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کارروائی میں حصہ نہ لیتے۔ لیکن جنگ احزاب میں جب بنو نضیر کی تحریک پر عرب کے بڑے بڑے قبائل اسلام کو مٹانے کے لئے متفق ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے، تو بنو قریظہ نے حیی بن اخطب نضری کے بھڑکانے سے علانیہ معاہدہ توڑ دیا اور جنگ میں شامل ہو گئے[1]۔ آنحضرت صلعم کو ان کے نقض عہد کی خبر ہوئی تو آپؐ نے سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہؓ کو ان کے پاس بھیجا اور وفائے عہد کی نصیحت کی مگر انہوں نے صاف کہدیا کہ ہمارا تمہارا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔

ان کے اس طرح عین وقت پر عہد توڑ دینے اور جنگ میں شریک ہو جانے سے مدینہ دو طرف سے محصور ہو گیا۔ ایک طرف قریش اور غطفان وغیرہ کی فوجیں تھیں، اور دوسری طرف بنو قریظہ کی۔ سب سے زیادہ خطرہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے جس قلعہ میں اپنی عورتوں کو حفاظت کے لئے بھیج دیا تھا وہ بنو قریظہ کی عین زد میں تھا اور یہ لوگ اس کا محاصرہ کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو انتہائی دہشت و پریشانی میں مبتلا کر دیا حتی کہ آنحضرت صلعم نے مجبور ہو کر یہ تہیہ کر لیا کہ مدینہ کی پیداوار کا تیسرا حصہ دیکر حملہ آوروں سے مصالحت کر لیں[2]۔ قرآن مجید میں اس پریشانی کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے:

إِذْ جَاءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا (احزاب ۲)

جبکہ وہ تم پر بالائے شہر اور پائین شہر کی جانب سے چڑھ آئے اور جبکہ تمہاری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور جبکہ دل منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے متعلق طرح طرح کی بدگمانی کرنے لگے۔

[1] ابن اثیر طبع مصر ج ۲ ص ۶۷، فتح الباری ج ۷ ص ۳۰۰۔

[2] ابن اثیر ج ۲ ص ۶۸۔ فتح الباری ج ۷ ص ۲۸۱۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں :-

"اس رات ہماری پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک طرف ابو سفیان اور اس کے ساتھی زبردست فوجیں لئے ہوئے اوپر سے آئے، اور دوسری طرف بنو قریظہ نیچے سے بڑھے، اور ان کے حملہ سے ہمارے بال بچوں کی سلامتی بھی خطرہ میں پڑ گئی"[1]

اس شدید اور خطرناک بدعہدی کے بعد ان لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا خود کشی کرنا تھا۔ چنانچہ جب احزاب کے دل بادل پھٹ گئے اور بیرونی حملہ کا خوف جاتا رہا تو آنحضرت صلعم نے فوراً بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ ۱۵ دن یا ۲۵ دن تک اسلامی فوجیں ان کے قلعہ کے گرد پڑی رہیں جب انہوں نے دیکھا کہ یہ قضا کا پیغام ٹل نہیں سکتا تو آنحضرت صلعم کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ سعد بن معاذ ہمارے حق میں جو فیصلہ کریں وہ ہمیں منظور ہے[2] بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ انہوں نے اپنی قسمت کا فیصلہ آپ پر چھوڑ دیا اور آپ نے اس خیال سے سعد بن معاذ کو حکم بنایا کہ وہ بنو قریظہ کے حلیف تھے، ان پر کبھی کوئی شک نہ ہو سکتا تھا کہ ان کے حق میں نا واجب فیصلہ کریں گے[3]۔ بہر حال جو صورت بھی ہو سعد بالاتفاق حکم بنائے گئے اور انہوں نے فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے بالغ مرد قتل کئے جائیں، عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنایا جائے، اور ان کا مال مسلمانوں میں بانٹ دیا جائے۔ چنانچہ یہی فیصلہ نافذ کیا گیا اور اس کے مطابق ان کے مرد قتل کر دیئے گئے۔

اب جہاں تک بدعہدی کے الزام کا تعلق ہے وہ تو صاف ہو چکا کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آنحضرت صلعم نے ان پر حملہ کرکے عہد شکنی کی لیکن دوسرا الزام یہ باقی رہ جاتا ہے کہ ان کے ساتھ انتقام بہت سخت لیا

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۲۸۱، ابن کثیر ج ۸ ص ۵۲۔

[2] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب جواز قتال من نقض العہد، فتوح البلدان صفحہ ۲۹۔

[3] زمانۂ جاہلیت میں حضرت سعدؓ کے قبیلہ اور بنی قریظہ کے درمیان حلف کا تعلق تھا، اور قدیم عرب میں حلف کا تعلق خونی رشتوں سے کچھ کم مضبوط نہ ہوتا تھا۔

گیا۔ مگر اس کو سختی اور سنگدلی سے تعبیر کرنے سے پہلے چند امور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

(۱) بنو قریظہ اور ان کے ہم قوم بنو نضیر کی بدعہدیوں کو دیکھکر یہ ناممکن تھا کہ ان سے از سر نو کوئی معاہدہ کیا جاتا اور یہ توقع قائم کی جا سکتی کہ پھر کسی نازک موقع پر وہ اسے نہ توڑ دیں گے۔

(۲) ان کے قلعے مدینہ سے بالکل متصل تھے، اور ایسی صریح غداری کے بعد ان کے اتنے قریب رہنے سے ہر وقت خطرہ تھا کہ کب کسی دشمن کو عین مسلمانوں کے گھروں پر چڑھا لائیں۔

(۳) ان کو جلا وطن بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ ان سے پہلے ان کے بھائی بنو نضیر کو جلا وطن کرنے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ انہوں نے مسلمانوں سے دور بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کیں اور فوجیں جمع کر کے مدینہ پر چڑھ آئے۔

(۴) ان باتوں کے باوجود آنحضرت صلعم نے خود ان کے لئے کوئی سزا تجویز نہیں کی بلکہ ان کی مرضی اور اتفاق سے ایک ایسے شخص کو حکم بنایا جو خود ان کا پشتینی حلیف تھا۔

(۵) ثالثی اور پنچایت کے متعلق یہ تمام دنیا کا مسلمہ قانون ہے کہ جب فریقین کے اتفاق سے کوئی شخص حکم، ثالث، یا پنچ بنایا جائے تو جو فیصلہ وہ کر دے اس کی پابندی فریقین پر لازم ہوتی ہے۔

(۶) سعد بن معاذؓ نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ توراۃ کے احکام کے مطابق تھا[۱]، اسی لئے کسی یہودی نے اس کے خلاف ایک لفظ نہ کہا۔

(۷) ان میں سے صرف وہ مرد قتل کئے گئے جو ہتھیار اٹھانے کے قابل تھے، کیونکہ انہیں سے جنگ و غدر کا اندیشہ تھا۔ باقی رہیں عورتیں اور بچے تو ان کے سر دھروں کے قتل ہو جانے کے بعد ان کی پرورش

---

[۱] "جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لئے پہنچے تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر۔ تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور، اور دروازہ تیرے لئے کھول دے، تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری باجگذار ہوگی، اور تیری خدمت کریگی۔ اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر۔ جب خداوند خدا تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور بچوں اور چارپایوں کو جو کچھ اس شہر میں ہو اپنے لئے غنیمت کے طور پر لے لے۔" (استثناء، باب ۲۰، آیت ۱۰-۱۴)

کا بجز اس کے اور کیا وسیلہ ہو سکتا تھا کہ مسلمان خود ان کے کفیل بنتے۔

ان وجوہ کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی روک باقی نہیں رہتی کہ بنو قریظہ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ عین انصاف کے مطابق تھا، اور اس کے سوا ان سے کوئی سلوک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

کعب بن اشرف کا قتل | عہد رسالت کا ایک اور واقعہ جس پر سخت اعتراضات کئے جاتے ہیں، یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنے ایک دشمن کعب بن اشرف کو خفیہ طریقہ سے قتل کرا دیا۔ مخالفین کا اعتراض یہ ہے کہ یہ وہی جاہلیت کا "فتک" تھا، اور بزدلی کے علاوہ آداب جنگ کے بھی خلاف تھا۔ لیکن اس واقعہ کے بھی چند مخصوص اسباب تھے جن کو معترضین نے نظر انداز کر دیا ہے۔

یہ شخص یہود بنی النضیر میں سے تھا اور اپنی قوم کے ساتھ اس معاہدہ میں شریک تھا جو ہجرت کے بعد رسول اللہ صلعم کے اور ان کے درمیان ہوا تھا۔ مگر اسے اسلام اور خاص کر داعی اسلام سے سخت عداوت تھی، آپ کی شان میں ہجویہ اشعار کہتا، مسلمان عورتوں کے متعلق نہایت گندے عشقیہ قصائد کہتا[1]، اور کفار قریش کو آنحضرت صلعم کے خلاف اشتعال دلاتا تھا[2]۔ جب جنگ بدر میں آنحضرت صلعم کو فتح ہوئی تو اس کو سخت رنج ہوا اور شدت غضب میں پکار اٹھا کہ:

واللہ لئن کان محمد اصاب ھولاء القوم،	خدا کی قسم اگر محمدؐ نے قریش کو واقعی شکست دیدی ہے
لبطن الارض خیر لنا من ظھرھا[1]؛	تو زمین کا پیٹ ہمارے لئے اس کی پیٹھ سے زیادہ بہتر ہے

پھر وہ مدینہ سے مکہ پہنچا اور وہاں نہایت درد انگیز طریقہ سے قریش کے مقتولوں کے مرثیے کہہ کہہ کر ان کے عوام اور سرداروں کو انتقام کا جوش دلانے لگا۔ اس کی یہ سب حرکات اس معاہدہ کے خلاف تھیں جو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا اور جس میں وہ بھی اپنی قوم کے ساتھ شریک تھا۔ تاہم انہیں کسی نہ کسی طرح معاف کیا جا سکتا تھا، لیکن ان سب سے گذر کر وہ اپنے جذبۂ عناد میں یہاں تک پہنچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جان تک لینے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے ایک سازش کی تیاری کی جس

---

[1] ابن اثیر جلد ۲ ص ۵۳ - فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۶ میں ہے کہ "تشبب بنساء المسلمین حتی اذاھم"۔

[2] ابو داؤد کتاب الجہاد باب کیف کان اخراج الیہود میں ہے "و یحرض علیہ کفار قریش"۔

کا مقصد آپ کو دھوکہ سے قتل کرنا تھا۔ علامہ ابن کثیر نے ابو مالک کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اس نے ایک جماعت کے ساتھ مل کر یہ انتظام کیا تھا کہ آنحضرت صلعم کو اپنے گھر بلائے اور چپکے سے قتل کرا دے۔ چنانچہ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ

اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ۔ (المائدہ ۲)
جبکہ ایک جماعت نے تم پر دست درازی کا قصد کیا اور اللہ نے ان کے ہاتھ تم پر بڑھنے سے روک دیئے۔

ابن حجرؒ بھی اس روایت کو فتح الباری میں لائے ہیں، مگر جس طریق سے انہوں نے اسے لیا ہے۔ وہ ضعیف ہے۔ تاہم یعقوبی نے جو ایک بڑا مؤرخ ہے بنو نضیر کا حال بیان کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ:۔

ہموا ان یمکر برسول اللہ
اس نے رسول اللہ صلعم کو دھوکہ سے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا

ان تمام بیانات سے اس واقعہ کی صداقت مسلم ہو جاتی ہے کہ اس کے جرائم کی فہرست کو اس سازش قتل نے مکمل کر دیا تھا اور اس کے بعد اس کے کشتنی ہونے کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایک شخص معاہدہ کو توڑتا ہے، مسلمانوں کے دشمنوں سے ساز باز کرتا ہے، مسلمانوں کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکاتا ہے، اور مسلمانوں کے امام کو قتل کرنے کی خفیہ سازشیں کرتا ہے۔ ایسے شخص کی سزا بجز قتل کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ تنہا اس کے فعل کی بنا پر اس کی قوم کے خلاف تو اعلان جنگ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کھلے میدان میں اس سے مقابلہ ہوتا اور اسے قتل کیا جاتا۔ خود اس کی قوم سے بھی یہ امید رکھنی فضول تھی کہ وہ اس کو ان حرکات سے روکے گی، کیونکہ ساری قوم کا رویہ اسی کی طرح عداوت و بغض سے بھرا ہوا تھا۔ پھر وہ دوسرے اعدائے اسلام کے ساتھ بھی ملکر کبھی کھلے میدان میں لڑنے کے لئے نہیں آیا، بلکہ ہمیشہ پردہ کے پیچھے بیٹھ کر ہی سازشیں کرتا رہا۔ اس لئے اس کے شر کے استیصال کی صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ پردہ کے پیچھے ہی اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے مجبوراً اسی آخری تدبیر کو اختیار کیا اور محمد بن مسلمہؓ کو بھیجکر اسے قتل کرا دیا۔

اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ خفیہ طریقہ سے دشمن کے سرداروں کو قتل کرا دینا اسلام کے قانون جنگ کی کوئی مستقل دفعہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً آنحضرت صلعم سب سے پہلے ابوجہل

اور ابوسفیان جیسے دشمنوں کو قتل کراتے اور صحابہؓ میں ایسے فدائیوں کی کمی نہ تھی جو اس قسم کے تمام دشمنوں کو ایک ایک کر کے قتل کر سکتے تھے۔ لیکن عہدِ رسالت و عہدِ صحابہؓ کی پوری تاریخ میں ہم کو کعب بن اشرف، اور ابو رافع[1] کے سوا کسی اور شخص کا نام نہیں ملتا جسے اس طرح خفیہ طریقہ سے قتل کیا گیا ہو، حالانکہ آپ کے دشمن صرف یہی دو شخص نہ تھے۔ پس یہ واقعہ خود اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ خفیہ طریقہ سے دشمن کو قتل کرنا اسلام کی کوئی مستقل جنگی پالیسی نہیں ہے بلکہ ایسے مخصوص حالات میں اس کی اجازت ہے جبکہ دشمن خود سامنے نہ آتا ہو اور پردے کے پیچھے بیٹھ کر خفیہ سازشیں کیا کرتا ہو۔

یہودِ خیبر کا اخراج عہدِ رسالت صلعم کے بعد عہدِ خلافت میں یہودِ خیبر کے اخراج کو خاص طور پر ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے۔ مخالفین کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلعم نے اہلِ خیبر سے پیداوار کے نصف حصہ پر معاملہ کر لیا تھا اور وہ مستقل طور پر اسلام کی رعایا بن چکے تھے تو حضرت عمرؓ کو انہیں جلاوطن کرنے کا کیا حق تھا؟ کیا اس طرح انہوں نے عہد شکنی اور اہل الذمہ کی حق تلفی نہیں کی؟ یہ اعتراض بظاہر بہت وزنی ہے، مگر تاریخ نے وہ تمام حقائق محفوظ رکھے ہیں جن سے اس اعتراض کا سارا تار و پود بکھر جاتا ہے۔

---

[1] ابو رافع کے متعلق صحیح بخاری میں صرف اتنا بیان کیا گیا ہے کہ کان ابو رافع یوذی رسول اللہ صلعم ویعین علیہ (ابو رافع آنحضرت صلعم کو اذیت پہنچاتا تھا اور آپ کے خلاف دشمنوں کی اعانت کرتا تھا۔ کتاب المغازی، باب قتل ابی رافع) لیکن ابن عائذ نے عروہ کے طریق سے یہ روایت نقل کی ہے کہ کان ممن اعان غطفان وغیرھم من مشرکی العرب بالمال الکثیر، اس نے غطفان وغیرہ مشرکین عرب کو رسول اللہ صلعم کے خلاف جنگ میں بہت روپیہ سے مدد دی تھی۔ (فتح الباری ج ص ۲۴۰)۔ طبری نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ کان حزب الاحزاب علی رسول اللہ، "اس نے رسول اللہ صلعم کے خلاف جنگِ احزاب میں فوجیں اکٹھی کی تھیں" (ج ۳ ص ۷)۔ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ قد اجلب فی غطفان ومن حولہ من مشرکی العرب وجعل لھم الحفل العظیم لحرب رسول اللہ، "اس نے غطفان اور دوسرے مشرکین عرب کی ایک بہت بڑی جمعیت رسول اللہ صلعم سے لڑنے کیلئے اکٹھی کی تھی" (ج ۲ ص ۶۶)۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ کان یظاھر کعب ابن اشرف علی رسول اللہ۔ وہ کعب بن اشرف کو رسول اللہ صلعم کے خلاف مدد دیتا تھا (ج ۲ ص ۱۱۲ طبع یورپ)۔ ان تمام بیانات کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو کہ وہ بھی کعب کی طرح

خیبر جب فتح ہوا تھا تو ابتداءً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہودیوں کی صلح اس شرط پر ہوئی تھی کہ آپ ان کی جان بخشی کردیں گے اور وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے لیکن صلح ہونے کے بعد جب زمین کے باقاعدہ بندوبست کا موقع آیا تو اہل خیبر نے آپ سے درخواست کی کہ:۔

"آپ ہم کو یہیں رہنے دیں اور ہم سے معاملہ کرلیں، کیونکہ ہم زراعت اور نخلستان کے کام سے خوب واقف ہیں"

آنحضرت صلعم نے ان کی یہ درخواست قبول کرلی اور ان سے عارضی طور پر معاملہ کرلیا۔ لیکن معاملہ کی شرائط تحریر کرتے وقت صاف طور پر یہ تصریح کردی کہ اقرکم ما اقرکم اللہ، میں تم کو برقرار رکھونگا جب تک اللہ تم کو برقرار رکھے گا۔[۲] اس کا مطلب یہ تھا کہ تم کو مستقل طور پر نہیں رکھا جائیگا، بلکہ جب تک احکام خداوندی کے مطابق ہمارے قومی مصالح تمہیں رکھنے کی اجازت دیں گے اس وقت تک تمہیں رہنے دیا جائیگا، اور جب تمہارا طرزِ عمل نامناسب ہوگا تو ہمیں آزادی ہوگی کہ اصل صلحنامہ کی شرائط کو نافذ کرکے تمہیں جلاوطن کردیں۔ ابن حجرؒ نے اس جملہ کی یہ تشریح کی ہے:۔

وان المراد بقوله ما اقرکم اللہ ما قدر اللہ انا نترککم فیہا، فاذا شئنا ناخرجنا کم تبین ان اللہ قدر اخراجکم۔[۳]	یہ جو آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "جب تک اللہ تم کو رکھیگا" تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک اللہ نے تمہارا یہاں رہنا مقدر کر رکھا ہے ہم تم کو رہنے دیں گے، اور جب ہم

تمہیں نکالنا چاہیں گے اور نکال دیں گے تو یہ فعل خود اس بات کی دلیل ہوگا کہ تمہارے اخراج کے لئے اللہ کی تقدیر پوری ہوچکی ہے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۰) خود کبھی کھلے میدان میں لڑنے نہیں آیا اور پردے کے پیچھے سے دشمنوں کو مال اور فوجوں سے مدد دے کر رسول اللہ صلعم کے خلاف استعمال کرتا رہا۔

[۱] فتوح البلدان ص ۲۹-۳۸، ابن ہشام ص ۷۷۹، ابن سعد ج ۲ ص ۷۹-۸۰۔

[۲] بخاری کتاب الشروط باب اذا اشترط فی المزارعۃ، فتوح البلدان صفحہ ۲۹۔

[۳] فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۷۔

ابوداؤد نے ایک اور روایت میں اس سے بھی زیادہ صاف تصریح کی ہے:۔

کان عامل خیبر علی ان نخرجھم اذا شئنا[1] آنحضرت صلعم نے ان سے اس شرط پر معاملہ کیا تھا کہ ہم جب چاہیں گے ان کو نکال دیں گے۔

اس سے یہ بات تو بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ان سے کوئی ایسا معاہدہ نہ تھا جس کے لحاظ سے ان کے اخراج کو بدعہدی کہا جا سکتا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس اصل معاہدہ ان کے اخراج ہی کا مقتضی تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ نصف خراج پر جو عارضی معاملہ ان سے کیا گیا تھا اسے کن وجوہ کی بنا پر فسخ کیا گیا؟ تو اس کی تحقیق کے لئے ذیل کے واقعات پیش نظر رکھنے چاہئیں:۔

صلح کو چند ہی روز گذرے تھے کہ ان میں ایک عورت نے آنحضرت صلعم کی دعوت کی اور اس میں آپ کو زہر کھلا دیا۔ بعد میں جب تحقیق کی گئی تو خود مجرم نے اعتراف جرم کیا اور اس فعل میں دوسرے یہودیوں کی سازش بھی ثابت ہو گئی۔[2]

آنحضرت صلعم ہی کے زمانہ میں انہوں نے عبداللہ بن سہل بن زید الانصاری کو قتل کر کے ایک نہر کے کنارے ڈال دیا۔[3]

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں وہ علانیہ برسر بغاوت ہو گئے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو سوتے میں پکڑ کر کوٹھے سے نیچے پھینک دیا جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔[4]

ابتدائی واقعات خاص لوگوں کے ساتھ مخصوص تھے، اس لئے عامۃ الناس کو ان کے جرم کا ذمہ دار نہ سمجھا گیا۔ مگر یہ آخری جرم کھلے بندوں کیا گیا تھا اور تمام قوم کا معاندانہ رویہ ظاہر نظر آ رہا تھا، اس لئے حضرت عمرؓ نے اس معاملہ کو صحابہؓ کی مجلس میں پیش کیا اور اس پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

---

[1] ابوداؤد باب ما جاء فی حکم ارض خیبر۔

[2] صحیح بخاری میں یہ واقعہ کئی جگہ مذکور ہے۔ غزوۂ خیبر کے بیان، اور کتاب الطب میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔

[3] اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۷۹۔

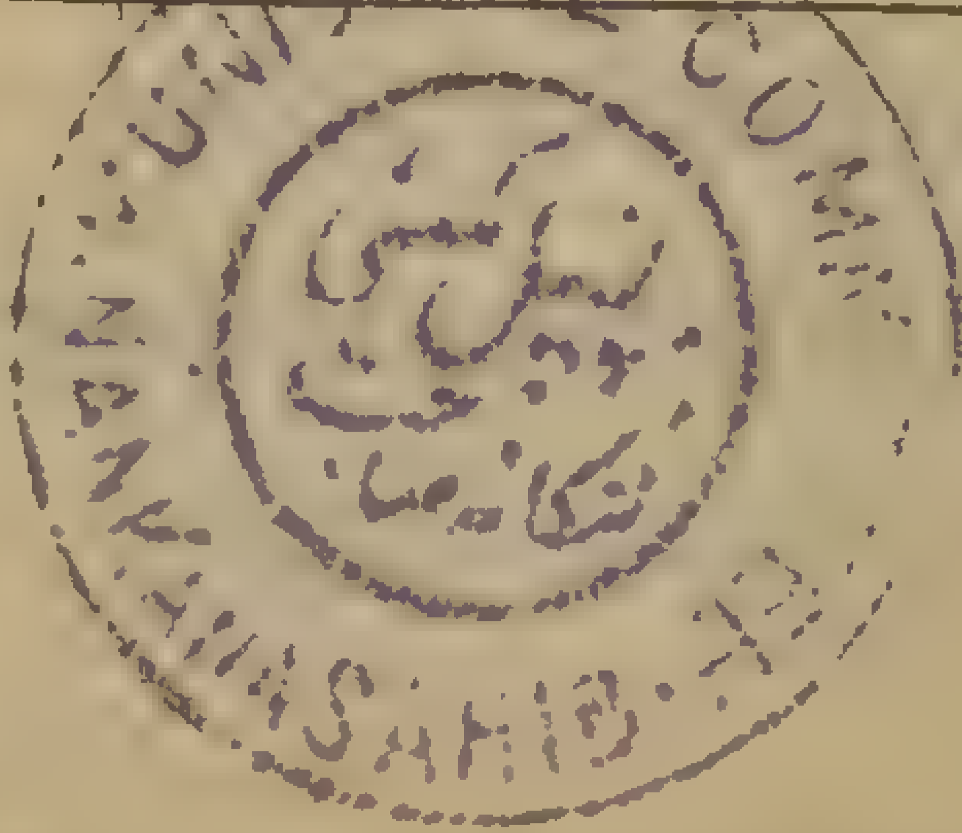
[4] فتوح البلدان صفحہ ۳۱، ابن ہشام صفحہ ۷۸۰۔

ان رسول اللہ صلعم کان عامل یہود خیبر علیٰ اموالھم وقال نقرکم ما اقرکم اللہ وان عبداللہ ابن عمر خرج الیٰ مالہ ھناک فعدی علیہ من اللیل ففدعت یداہ ورجلاہ ولیس لنا ھناک عدو غیرھم، ھم عدونا وتھمتنا، وقد رأیت اجلاءھم۔[1]

رسول اللہ صلعم نے یہودِ خیبر سے ان کے اموال پر معاملہ کیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ "ہم تمہیں برقرار رکھیں گے جبتک اللہ تم کو برقرار رکھے گا"، اب عبداللہ بن عمرؓ وہاں اپنی جائداد پر گئے تھے، رات کے وقت ان پر حملہ کیا گیا اور ان کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے گئے۔ اس وقت اس ملک میں ان کے سوا ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے، وہی ہمارے دشمن رہ گئے ہیں، اس لئے میری رائے میں ان کو جلاوطن کر دینا چاہیئے۔

حضرت عمرؓ کی اس تجویز سے تمام مجلس نے اتفاق کیا اور یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ ہو گیا لیکن ان مجرموں کو بھی اس طرح جلاوطن نہیں کیا گیا کہ ان کے اموال و اراضی پر قبضہ کر کے انہیں بیک بینی و دوگوش نکال دیا گیا ہو۔ جو کچھ وہ چھوڑ کر گئے اس کا پورا پورا معاوضہ ان کو بیت المال سے دیا گیا، سفر کی آسانی کے لئے اونٹ اور کجاوے دیئے گئے، یہاں تک کہ کجاوے باندھنے کی رسیاں تک حکومت کی طرف سے مہیا کی گئیں۔[2]

اس میں شک نہیں کہ بعض روایات میں ان کے اخراج کی یہ وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی کہ لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب، جزیرۂ عرب میں دو دین جمع نہ ہونے پائیں، تو آپ نے اس کی تحقیق کی اور صحیح ثابت ہو جانے کے بعد یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ کر لیا۔ بلاذری نے اس روایت کو ابن شہاب کے طریق سے نقل کیا ہے[3] اور امام زہری نے عبداللہ بن عتبہ کے طریق سے[4]۔ لیکن اس حدیث کا یہ منشا ہر گز نہ تھا کہ غیر مسلم قوموں کو بلا قصور عرب سے



[1] بخاری کتاب الشروط باب اذا اشترط فی المزارعۃ۔

[2] بخاری کتاب الشروط۔

[3] فتوح البلدان ص ۳۴۔

[4] فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۷۔

نکال دیا جائے۔ امام زہری نے اپنی روایت میں خود یہ تصریح کی ہے کہ جب اس حدیث کی صحت ثابت ہوگئی تو حضرت عمرؓ نے اعلان کرایا کہ:

من کان لہ من اھل الکتابین عھد فلیأت بہ، انفذہ لہ[1] — دونوں کتابوں (انجیل و توراۃ) کے متبعین میں سے جس کسی کے پاس کوئی معاہدہ ہو وہ لے آئے تاکہ میں اسے نافذ کروں۔

ظاہر ہے کہ اگر اس حدیث کا منشا یہ ہوتا کہ بلا امتیاز تمام غیر مسلم جزیرۃ العرب سے نکال دیئے جائیں تو حضرت عمرؓ یہ اعلان ہرگز نہ کراتے بلکہ تمام غیر مسلموں کو یک قلم خارج البلاد کر دیتے، خواہ ان سے معاہدہ ہوتا یا نہ ہوتا۔ مگر جب انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اہل معاہدہ سے ان کے عہد نامے طلب کئے اور وعدہ کیا کہ ان عہد ناموں کو نافذ کیا جائیگا، تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اس حدیث سے مطلقاً اخراج مقصود نہ تھا۔ بلکہ ایک عام پالیسی کی تعیین مقصود تھی، جس پر دوسرے واجبات کا لحاظ رکھتے ہوئے عمل درآمد کیا جانا چاہئے تھا۔ پس یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک ذمی قوم محض اس بنا پر ملک سے نکال دی گئی کہ عرب میں دو دینوں کا اجتماع مرغوب نہ تھا، بلکہ زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہود خیبر کی مسلسل بدعنوانیوں سے تنگ آکر حضرت عمرؓ نے انہیں جلاوطن کرنے کا خیال کیا ہوگا تو لازمی طور پر انہیں ایک ذمی قوم کے ساتھ یہ معاملہ کرنے میں تامل ہوا ہوگا، اور وہ کسی شرعی حجت کی تلاش میں ہوں گے، اسی دوران میں یہ حدیث ان کو پہنچی ہوگی اور اس کی اچھی طرح تحقیق کرنے کے بعد مطمئن ہو کر انہوں نے اپنی رائے کو عمل میں لانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ بعد میں راویوں نے اپنے اپنے رجحان طبع کے موافق اس ایک واقعہ کو دو الگ واقعے بنا لیا اور دو مختلف روایتوں کی صورت میں بیان کرنے لگے۔

اہل نجران کا اخراج: خلافت راشدہ کا دوسرا اہم واقعہ جو خیبر کے معاملہ سے بھی زیادہ طعن و ملامت کا ہدف بنا ہوا ہے، نجران کے عیسائیوں کا اخراج ہے۔ خیبر کے یہودی عنوۃً فتح ہوئے تھے اور ان سے ابتداءً جلاوطنی ہی کی شرط پر صلح ہوئی تھی، اس لئے مخالفین کو اس میں اعتراض کی زیادہ گنجائش نہ مل سکی۔ لیکن

[1] فتح الباری ج ۵، ص ۲۰۷۔

اہلِ نجران نے تو بغیر جنگ کے خود بخود اطاعت قبول کی تھی اور جزیہ دے کر آنحضرت صلعم سے باقاعدہ عہد نامہ لکھوایا تھا، اس لئے ان کے اخراج کو مخالفین اسلام صریح عہد شکنی قرار دیتے ہیں۔ ان کا سارا زور اس پر ہے کہ معاہدہ میں بغیر شرط امان دی گئی تھی اور حضرت عمرؓ نے ناجائز طور پر اس امان کو فسخ کیا مگر واقعات کی تحقیق سے یہ دعویٰ غلط ثابت ہوتا ہے۔

نجران سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو معاہدہ ہوا تھا اس میں نصاریٰ کو اس شرط کے ساتھ امان دی گئی تھی کہ جب تک وہ حکومتِ اسلامیہ کے وفادار رہیں گے، اور اپنے واجبات ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں گے، اس وقت تک انہیں اللہ کی پناہ اور رسول صلعم کی حفاظت حاصل رہے گی (بلاذری) اور امام ابو یوسفؒ نے جو معاہدہ نقل کیا ہے اس میں یہ صریح الفاظ موجود ہیں کہ

لهم ما في هذه الصحيفة جوار الله وذمة محمد النبي أبداً حتى يأتي أمر الله، ما نصحوا وأصلحوا فيما عليهم[1]

ان کے لئے جو کچھ اس عہدنامہ میں ہے اس پر اللہ کی پناہ اور محمد نبی صلعم کی دائمی حفاظت ہے تا وقتیکہ اللہ کا حکم آئے اور وہ خیرخواہ رہیں اور جو کچھ ان کے ذمہ واجب ہے اسے ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں۔

اسی طرح حضرت ابو بکرؓ نے منصبِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد جو عہد نامہ ان کو لکھ کر دیا تھا اس میں بھی رعایت کے ساتھ یہ شرط لگا دی تھی کہ

وعليهم النصح والإصلاح فيما عليهم من الحق[2]

ان پر واجب ہے کہ خیرخواہ رہیں اور جو حق ان پر واجب ہے اسے ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں۔

اس معاہدہ کی رو سے جس طرح اسلامی حکومت نے ان کی حفاظت کرنے اور ان کی قدیم حالت کو برقرار رکھنے کا عہد کیا تھا، اسی طرح اہلِ نجران سے بھی یہ عہد لیا تھا کہ وہ حکومتِ اسلامیہ کے وفادار رہیں گے، اور یہ وہ عہد ہے جو دنیا کی ہر حکومت اپنی رعایا سے لیتی ہے۔ مگر اہلِ نجران نے اس عہد کو

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۴۱، فتوح البلدان صفحہ ۷۰۔

[2] کتاب الخراج صفحہ ۴۱۔

کہاں تک پورا کیا؟ وہ ما انفصوا اصلحوا کی شرط پر کس حد تک عامل رہے؟ انہوں نے خیر خواہی اور وفاداری کا حق کہاں تک ادا کیا؟ تاریخ سے اس کا جواب ہم کو یہ ملتا ہے کہ انہوں نے گھوڑے اور اسلحہ جمع کر کے بغاوت کا سامان کیا اور حکومت اسلامیہ کے قلب کو خطرے میں ڈال دیا۔ امام ابو یوسف نے اپنی کتاب الخراج میں صاف لکھا ہے کہ

اجلاھم لانہ خافھم علی المسلمین وقد کانوا اتخذوا الخیل والسلاح فی بلادھم[1]	حضرت عمرؓ نے ان کو اس لئے جلاوطن کیا کہ آپ کو ان سے مسلمانوں کے خلاف بغاوت کا خوف ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے علاقے میں اسلحہ اور گھوڑے جمع کر لئے تھے۔

عرب کے نقشہ پر ایک نظر ڈالو تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ اہل نجران کی یہ تیاریاں کس قسم کے خطرات کا پیش خیمہ تھیں۔ ایک طرف ان کے عین شمال میں حکومت اسلامیہ کا مرکز حجاز واقع تھا اور دوسری طرف ان کے سامنے بحر احمر کے دوسرے ساحل پر حبش کی عیسائی سلطنت موجود تھی۔ اگر وہ اپنی تیاریاں مکمل کر کے حجاز پر حملہ کر دیتے اور اپنے ہم مذہب اہل حبش کو ابرہہ کا ناتمام منصوبہ پورا کرنے کے لئے اپنی مدد پر بلا لیتے تو ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کو کیسی شدید مصیبت کا مقابلہ کرنا پڑتا۔

ابن اثیر اور بلاذری نے بیان کیا ہے کہ امن و امان کی برکات سے ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے چالیس ہزار تک پہنچ گئی تھی اور دولت کی زیادتی نے ان میں خانہ جنگی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ ان کے مختلف گروہ حضرت عمرؓ کے پاس آکر ایک دوسرے کی شکایتیں کرتے تھے اور ہر پارٹی کے لوگ دوسری پارٹی کو نکال دینے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ اول اول حضرت عمرؓ نے اس فتنہ سے درگذر کیا۔ مگر جب ان کی روز افزوں قوت سے خود اسلامی حکومت کا قلب خطرے میں پڑ گیا تو آپ نے موقع کو غنیمت سمجھ کر ان کی جلاوطنی کا حکم صادر کر دیا[2]۔

تاہم ایک ایسی قوم جس کے خلاف بغاوت کی تیاری کا ثبوت بہم پہنچ چکا تھا، حکومت اسلامیہ

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۴۲

[2] فتوح البلدان صفحہ ۷۳، ابن اثیر ج ۲ ص ۲۱۱

کے حدود سے خارج نہیں کی گئی، بلکہ صرف عرب سے خارج کی گئی۔ اس کو "اللہ کی پناہ اور محمد نبی صلعم کے ذمہ" سے محروم نہیں کیا گیا، بلکہ اسی پناہ اور ذمہ میں ایک نامناسب مقام سے دوسرے مناسب مقام کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ نجران سے اس کے اخراج کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ حجاز اور حبش کے درمیان ایک نازک سیاسی و حربی پوزیشن پر قابض نہ رہے۔ اس سے زیادہ کوئی اور سزا دینی مقصود نہ تھی۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے ان کو نجرانِ یمن سے منتقل کر کے نجرانِ عراق کی طرف بھیج دیا۔ ان کی زمینوں کے بدلے زمینیں دیں، دو سال کا جزیہ معاف کیا، یمن سے عراق تک کے سفر کے لئے پوری آسانیاں بہم پہنچائیں اور اپنے عمال کو حکم دیا کہ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ امام ابو یوسف نے اس فرمان کو لفظ بلفظ نقل کیا ہے جس کے چند فقرے یہ ہیں:-

"شام و عراق کے افسروں میں سے جس کے پاس یہ جائیں وہ ان کو قابلِ کاشت زمین عطا کرے۔ جس زمین میں یہ کاشت کریں وہ ان کے لئے خدا واسطے کا صدقہ ہے اور اُس زمین کا عوض ہے جو یمن میں ان سے لی گئی ہے۔ اس زمین میں ان پر کوئی دست درازی اور مداخلت نہ کی جائے۔ ...... اگر کوئی شخص ان پر ظلم کرتا ہو تو ہر مسلمان جو وہاں موجود ہو لازم ہے کہ ان کی مدد کرے کیونکہ وہ ایسی قوم ہیں جو ہماری پناہ میں ہے۔ ان کا جزیہ ۲۴ مہینہ کے لئے معاف ہے[1]"

معترضین نے ان سب باتوں کو بھلا کر صرف اتنا یاد رکھا ہے کہ اہلِ نجران سے عہد تھا، عمر بن الخطاب نے اسے توڑا اور انہیں جلا وطن کر دیا۔ مگر ان تمام حالات کو دیکھ کر کوئی بتائے کہ اگر آج اس بیسویں صدی میں بھی کوئی قوم وہ روش اختیار کرے جو اہلِ نجران نے کی تھی اور اس کی سیاسی و جنگی پوزیشن وہی ہو جو اہلِ نجران کی تھی تو ایک مہذب حکومت، جو اپنی مملکت کے امن کو محفوظ رکھنا چاہتی ہو، اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟

۶- جدید قانونِ جنگ کی تدوین

اس باب میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شریعت اسلامیہ نے

[1] کتاب الخراج ص ۴۱-۴۲

جنگ کے عملی پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی ایک مضبوط قانون سے منضبط کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ اس نے جنگ کے وہ تمام وحشیانہ طریقے جو دنیا میں رائج تھے یک قلم موقوف کر دیئے، جنگ اور متعلقات جنگ کے متعلق نئے مہذب قوانین وضع کئے، پھر پرانے طریقوں کو وقت کی روح کے لحاظ سے ایک بدلی ہوئی شکل میں اگر باقی رکھا بھی تو ان کے اندر تدریجی اصلاح پذیری کی ایسی لچک پیدا کر دی کہ زمانہ کی ترقی اور حالات کے تغیر اور انسانی افکار کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ ان میں خود بخود اصلاح ہو جائے، اسی طرح کچھ نئے اصول بھی وضع کئے جن میں ترقی کی ایسی صلاحیت رکھ دی کہ ہر زمانہ کی ضروریات کے مطابق ان سے فروعی و جزئی احکام نکالے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ ایک ایسا نمونہ عمل چھوڑ گئے ہیں جو روح شریعت کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے اور اس روح کو پیش نظر رکھ کر ہم ہر نئی پیش آمدہ صورت میں یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلام اس میں عمل کا کونسا پہلو اختیار کرے گا۔ قرون اولیٰ میں فقہائے اسی مواد سے ایک مکمل ضابطہ قوانین جنگ مرتب کیا تھا جو مدت تک اسلامی سلطنتوں میں رائج رہا، مگر اس زمانہ کے قوانین جنگ بعینہٖ آج کے حالات کے لئے کافی نہیں ہیں۔ بہت سے فروع و جزئیات جو اس زمانہ میں مستنبط کئے گئے تھے، آج بیکار ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اصل ماخذ یعنی قرآن مجید اور احادیث نبوی کی طرف رجوع کریں، اور ان میں جو اصول و فروع موجود ہیں ان سے ایک نیا ضابطہ قانون مدون کر لیں۔ اس جدید قانون کی تدوین میں عام طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ جن مسائل میں فروع کی تفصیل ہم کو قرآن و حدیث سے ملتی ہے ان کو بجنسہٖ باقی رہنے دیں، جن مسائل میں صرف اصول ملتے ہیں اور فروع نہیں ملتے ان میں شریعت کی روح اور علمائے سلف کی تصریحات اور موجودہ عہد کی ضروریات کے مطابق نئے فروع نکالیں، اور جن مسائل میں شریعت نے ہم کو ترک و اختیار کا حق دیا ہے ان میں ایسی چیزوں کو ترک کر کے حرام و ناجائز کر دیں جنہیں موجودہ عہد کی دنیا چھوڑ چکی ہے۔ اس کام میں ہم کو نہ تو فقہائے قدیم کی لکھی ہوئی کتابوں پر ہی حصر کرنا چاہئے اور نہ ان سے بالکل بے نیاز ہو جانا چاہئے۔ ان بزرگوں نے جو کچھ تحقیقیں کی ہیں وہ نہ تو محض بیکار ہیں کہ ہم ان کو ردی سمجھ کر پھینک دیں، اور نہ اصول شریعت کی طرح اٹل ہیں کہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق

ہم ان کو بدل ہی نہ سکیں۔ ان دونوں طریقوں کے درمیان ہم کو ایک متوسط طریقہ اختیار کرنا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ ان کے مجتہدات میں سے جو چیزیں ہمارے موجودہ عہد کی اسپرٹ کے مطابق ہیں ان کو ہم باقی رکھیں، اور جو ماضی کے ساتھ پرانی ہو چکی ہیں ان کو چھوڑ کر براہ راست اصول شریعت سے فروع اخذ کریں۔

مثال کے طور پر قرآن و حدیث میں ہم کو اسیران جنگ، زخمیوں اور بیماروں اور غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض اور ایسے ہی دوسرے مسائل کے متعلق صرف اصول ملتے ہیں، فروع کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ اس عدم تفصیل اور بیان اصول پر اکتفا کے معنی یہ ہیں کہ شریعت ہر زمانہ کے مسلمانوں کو یہ حق دیتی ہے کہ اپنے عہد کی ضروریات کے مطابق خود فروع اخذ کریں۔ لہٰذا ہم کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ان فروع کے لئے پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کی لکھی ہوئی کتب فقہیہ کی طرف رجوع کریں اور ان میں جو کچھ تفصیلات ملیں ان کو بلا تامل قبول کر لیں۔ بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ خود اپنے زمانہ کے حالات کو دیکھ کر ان اصول شریعت سے ایسے قوانین مستنبط کر لیں جو موجودہ حالات کے لئے مناسب ہوں۔ بلکہ شریعت ہم کو یہ حق بھی دیتی ہے کہ موجودہ رائج الوقت قوانین جس حد تک روح شریعت کے مطابق ہوں ان کو ہم اختیار کر لیں، اور زمانۂ حال کی سلطنتوں کے درمیان جو معاہدتیں ہوں ان میں بھی احکام شرعیہ کو ملحوظ رکھ کر شریک ہو جائیں۔

اسی خیال سے میں نے اس باب میں شریعت کے اصلی ماخذ یعنی قرآن و حدیث سے وہ اصول و فروع نقل کر دیئے ہیں جو ایک مکمل ضابطۂ قانون کے لئے مواد مہیا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ جہاں جہاں علمائے سلف کی تصریحات عہد جدید کی اسپرٹ کے مطابق پائی گئی ہیں ان کو بھی نقل کر دیا ہے۔ اور ان مستثنیات کی بھی تشریح کر دی ہے جن کی ظاہری شکل کو دیکھ کر لوگوں کو اسلامی قانون کے اندر تناقض ہونے کا شبہ ہو سکتا ہے۔ اب اس تمام مواد کو پیش نظر رکھ کر فقہ کی جدید کتاب الجہاد مرتب کرنا فقہائے عصر کا کام ہے۔

باب ششم

جنگ دوسرے مذاہب میں

کسی چیز کے عیب و صواب کی جب تحقیق کی جاتی ہے تو پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ خود کیسی ہے؟ پھر یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ دوسری چیزوں کے درمیان اس کا درجہ کیا ہے جب ان دونوں حیثیتوں سے وہ بہتر ثابت ہو جائے تب ہی اسے پسندیدگی کی سند عطا کی جا سکتی ہے۔ اس طریق تحقیق کے لحاظ سے جہاں تک پہلے مرحلہ کا تعلق ہے اُس کو ہم طے کر چکے ہیں۔ اب دوسرا مرحلہ باقی ہے سو اس میں ہم پہلے اسلام کو دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں رکھ کر دیکھیں گے اور پھر جدید زمانہ کے قوانین سے اس کا موازنہ کر کے تحقیق کریں گے کہ مسئلہ جنگ میں ان کا طریقہ اسلام کے طریقہ سے کیا نسبت رکھتا ہے؟ اگر وہ جنگ کو جائز رکھتے ہیں تو ان کے مقاصد اور مناہج (Methods) اسلام سے بہتر ہیں یا بدتر؟ اور اگر جائز نہیں رکھتے تو اس باب میں ان کی تعلیم انسانی فطرت کے مطابق ہے یا اسلام کی؟

تقابل ادیان کے اصول ادیان کا مقابلہ درحقیقت ایک بہت مشکل کام ہے انسان جس عقیدے اور رائے پر ایمان رکھتا ہو، اس کے مخالف عقائد و آرا کے ساتھ بہت کم انصاف کر سکتا ہے۔ یہ کمزوری انسانی طبائع میں بہت عام ہے۔ مگر خصوصیت کے ساتھ مذہبی گروہوں میں تو اس نے تعصب

تنگ نظری کی بدترین شکل اختیار کرلی ہے۔ ایک مذہب کے پیرو جب دوسرے مذہب پر تنقید کرتے ہیں تو ہمیشہ ان کے تاریک پہلو ہی تلاش کرتے ہیں، اور روشن پہلو کو یا تو دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، یا اگر دیکھ بھی لیتے ہیں تو اسے دیدہ و دانستہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذہبی تنقید سے ان کا مدعا اصل حق کی تلاش نہیں ہوتا بلکہ محض اس رائے کو جسے وہ تحقیق سے پہلے اختیار کرچکے ہیں، درست ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اس طریقے سے تقابلِ ادیان کے تمام فوائد زائل ہوجاتے ہیں اور خود اس مذہب کو بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا جس کی تائید میں یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اگر تقابل کا مقصد حق کی تحقیق اور اس کے احقاق کے سوا کچھ اور نہیں ہے تو یقیناً اس مقصد کے حصول کا بھی یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ آدمی پہلے سے دوسرے مذاہب کے متعلق ایک مخالفانہ رائے قائم کرلے اور ان کا مطالعہ صرف اس نیت سے کرے کہ ان کی خوبیوں پر پردہ ڈالنا ہے اور ان کی برائیوں کو تلاش کرکے ان سے اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنی ہے۔ اس قسم کی بددیانتی اور فریب کاری سے کسی مذہب کی برتری کا اثبات نہ تو فی الحقیقت اس کی برتری کا اثبات ہوگا، نہ ایسی کامیابی کسی دینِ حق کے لئے باعثِ فخر ہوسکتی ہے، اور نہ حق و صداقت کی نظر میں اپنے مذہب کو کوئی وقعت حاصل ہوسکتی ہے۔ اگر اس طرح دھوکا کھاکر کوئی شخص اس کی حقانیت کا معتقد ہوجائے تو یہ اعتقاد بالکل ناقابلِ اعتماد ہوگا، کیونکہ اس کی بنیاد ہی غلط ہوگی۔

ان مفاسد سے احتراز کرکے تقابلِ ادیان کی بحث کو کسی صحیح نتیجہ تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے تقابل کے لئے چند اصول طے کرلئے جائیں اور ان کی سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔ ہماری رائے میں وہ اصول یہ ہونے چاہئیں:-

(۱) ایک مذہب کی تعلیم کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے مذاہب کی تعلیمات کو کلیۃً غلط ثابت کیا جائے، اور نہ یہ ضروری ہے کہ ایک مذہب میں حق و صداقت کے موجود ہونے سے دوسرے مذہب میں اس کا عدم لازم آئے۔ حق ایک کلی حقیقت ہے جس کے افراد خواہ کتنے ہی بدلتے رہیں اسی ایک کلی کے فرد رہتے ہیں۔ حال و مقام کے بدلنے سے ان کی حقیقت و اصلیت نہیں بدلتی۔ جو حق تھا وہ

مذہب میں پایا جاتا ہے، اسی کا دوسرے مذہب میں پایا جانا دونوں میں سے کسی مذہب کے بھی نقص کی دلیل نہیں ہے کہ اس پر خواہ مخواہ پردہ ڈالنے کی کوشش کی جائے، بلکہ دراصل وہ اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں کسی ایک مشترک سرچشمہ حق سے ماخوذ ہیں جس کا فیض دونوں کے پاس محفوظ رہا ہے پس حق کا جتنا اور جیسا حصہ ان میں کہیں موجود ہے اس کا مستحق ہے کہ اس کی قدر کی جائے نہ کہ خواہ مخواہ کھینچ تان کر اسے بے قدر ثابت کرنے پر زور صرف کیا جائے۔

(۲) جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حق اس کے مذہب کے سوا کہیں اور موجود ہی نہیں ہے، وہ دوسرے مذاہب ہی پر نہیں، خود حق پر بھی ظلم کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حق و صداقت کی روشنی کم و بیش سب جگہ موجود ہے۔ البتہ ارباب تحقیق جب کسی ایک مذہب کو دوسرے مذاہب پر ترجیح دیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی نگاہ میں وہ مذہب تجلیات حقیقت کا مظہر اتم ہوتا ہے پس تقابل ادیان کے کسی متعلم کو کبھی یہ پیشگی فیصلہ کرکے نہ بیٹھ جانا چاہئے کہ اس کے مرغوب مذہب کے سوا تمام مذاہب حق کی روشنی سے خالی ہیں، بلکہ اسے یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کے سامنے حق اور باطل دونوں ملے جلے آئیں گے اور اس کا کام یہ ہوگا کہ اپنی عقل اور قوت تمیز سے کام لیکر حق کو حق اور باطل کو باطل دیکھے اور ایک کو دوسرے سے مختلط نہ ہونے دے۔

(۳) مذہبی تحقیقات میں اس امر کا خاص اہتمام کرنا چاہئے کہ کسی مذہب کے متعصب مخالفین اور غالی متبعین، دونوں کی تصنیفات کا مطالعہ کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ ابتدائی تحقیقات میں اس قسم کے لوگوں کی تصنیفات کے مطالعہ سے ایک ناظر کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ زیر تحقیق مذہب کے اصلی چہرے کو دیکھنے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں پر ایک خاص رنگ کی عینک چڑھ جاتی ہے جس سے وہ اس مذہب کو اس کے اصلی رنگ میں نہیں دیکھ سکتا۔ اگر اس تحقیقات کو کسی صحیح نتیجہ تک پہنچانا ہو تو یہ ضروری ہے کہ کسی مذہب کو اس حیثیت سے نہ دیکھا جائے کہ دوسرے اس کو کس شکل میں دیکھتے ہیں بلکہ اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ خود اپنے آپ کو کس شکل میں دکھاتا ہے۔ اس کے لئے حتی الامکان ہر مذہب کے مآخذ اصلیہ کا مطالعہ کرنا چاہئے، اور ان کو پڑھ کر خود اپنی عقل سے فیصلہ کرنا چاہئے کہ وہ مذہب

کہاں تک صحیح اور کہاں تک غلط ہے۔ پھر جب آدمی خود ایک رائے قائم کرنے تو اس کے بعد دوسروں کی آراء و افکار کا مطالعہ کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں، کیونکہ اس وقت وہ حق اور باطل میں باسانی امتیاز کر سکے گا۔

آئندہ صفحات میں مسئلہ جنگ پر مختلف مذاہب کی تعلیمات پر جو گفتگو کی گئی ہے، اس میں بھی اصول ثلاثہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس امر کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ اپنے مذہب کی تائید و حمایت کے جذبہ سے خالی ہو کر حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کیا جائے۔

دنیا کے چار بڑے مذاہب | اس مختصر کتاب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ جنگ کے متعلق دنیا کے تمام چھوٹے بڑے مذاہب کی تعلیمات کا جائزہ لیا جائے۔ اس قسم کا احاطہ و استیعاب نہ تو آسان ہے اور نہ ضروری۔ عموماً تقابل ادیان کی بحثیں صرف ان مذاہب تک محدود رہتی ہیں جو اپنے پیرووں کی کثرت، اپنے اثرات کی وسعت، اور اپنی گذشتہ و موجودہ عظمت کے اعتبار سے دنیا کے بڑے مذہب شمار کئے جاتے ہیں۔ اسی قاعدہ کی پیروی کر کے ہم بھی اپنی بحث کو بڑے بڑے مذاہب تک محدود رکھیں گے۔

یہ مذاہب چار ہیں، ہندو مذہب، بودھ مذہب، یہودیت اور مسیحیت۔ مسئلہ جنگ کے لحاظ سے ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس نے جنگ کو جائز رکھا ہے اور اس میں ہندو مذہب اور یہودیت شامل ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس نے جنگ کو جائز نہیں رکھا، اور یہ بودھ مذہب اور مسیحیت پر مشتمل ہے۔ اس باب میں پہلے قسم اول پر بحث کی جائے گی اور اس کے بعد قسم دوم پر۔

ا۔ ہندو مذہب

اس مذہب سے بحث کرنے میں ایک شخص کو سب سے پہلے یہ مشکل پیش آتی ہے کہ وہ کس چیز کو ہندو مذہب قرار دے۔ ہندویت ان معنوں میں کوئی مذہب ہی نہیں ہے جن میں عموماً یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مذہب کیلئے ضروری ہے کہ اس کا ایک مرکزی عقیدہ ہو جس پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہو، مگر ہندو

رگ وید | رگ وید کے وہ منتر جن میں جنگ کا مضمون پایا جاتا ہے حسب ذیل ہیں:-

"اے اندرا! وہ دولت لا جو مسرت بخشے، فتح کی دائمی فاتحانہ دولت جو ہماری خوب مدد کرے، جس کے ذریعہ سے ہم دست بدست لڑائی میں اپنے دشمنوں کو دفع کرسکیں۔" (۱:۸:۱،۲)

"اے روشن آگ! تو جس پر متبرک تیل ڈالا جاتا ہے ہمارے دشمنوں کو جلا دے جن کی حفاظت خبیث روحیں کرتی ہیں۔" (۱:۱۲:۵)

"اندرا اور وارونا کی نصرت سے ہم دولت کا بڑا خزانہ جمع کرلیں اور اس کے کتنے ہی ڈھیر لیں، کافی اور بچا رکھنے کے قابل۔ اے اندرا اور وارونا! تم کو میں دولت کے لئے متعدد صورتوں سے پکارتا ہوں، ہم کو تم متمول رکھو۔" (۱:۱۷:۶،۷)

"ہر بدگو کو قتل کردے، اور جو کوئی ہم کو خفیہ طریقوں سے اغا تیا یا دوسرے تکلیف پہونچائے اسے برباد کر۔ اے اندرا! ہم کو خوبصورت گھوڑے اور گائیں دلوا ہزاروں کی تعداد میں، اے بڑے دولت مند!" (۱:۲۹:۷)

"تو آریوں اور دسیوؤں[1] کے درمیان امتیاز کر، جو ادھرمی ہیں ان کو سزا دے اور انہیں ان کے حوالہ کردے جس کی گھانس (دیوتاؤں کے نذرانے کے لئے) کٹی رکھی ہے۔" (۱:۵۱:۸)

۱؎ ڈاکٹر راجندر لال مترا نے اپنی کتاب Indo Aryans میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دسیو سے خود آریوں کے نابکار قبائل مراد ہیں (جلد اول صفحہ ۱۲۰)۔ لیکن خود ویدوں کے مطالعہ سے یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ آریہ حملہ آور اس لفظ سے ہندوستان کے ان اصلی باشندوں کو یاد کرتے تھے جن سے ان کی جنگ تھی۔ یہ صرف میرا اپنا احساس ہی نہیں ہے بلکہ وید کے دوسرے مطالعہ کرنے والوں نے بھی یہی محسوس کیا ہے۔ گرفتھ لکھتا ہے:

"یہ نام اکثر ان دیسی اقوام کے لئے مستعمل ہوا ہے جو آریوں کی پیش قدمی میں مزاحم ہوئی تھیں۔ بعد میں یہ لفظ ان تمام لوگوں کیلئے بولا جانے لگا جو ویدک عبادت اور مخصوص برہمنی رسوم ادا نہیں کرتے تھے۔" (ترجمہ اتھروید ج ۱ ص ۱)

پروفیسر بلومفیلڈ لکھتا ہے:-

"ایک نامعلوم زمانہ میں جو آجکل کے تخمینہ کے مطابق ۳۰۰۰ قبل مسیح میں شروع ہوا تھا، مگر جو ممکن ہے کہ

"ان خوبصورت شعلوں اور موم کے بھیس کے قطروں سے خوش ہو کر ہمارے گھوڑوں اور گایوں کے افلاس کو دور کر دے۔ ان قطروں کے باعث اے اندر! دسیوں کو منتشر کر دے، اور ان کی نفرت سے خوش ہو کر ہم وافر سامان خوراک حاصل کر لیں۔ اے اندر! ہم کو خوب دولت اور خوراک جمع کر لینے دے ...... ہم بہادروں کی سی طاقت پیدا کر لیں جو مواشی اور گھوڑے حاصل کرنے کا خاص وسیلہ ہے۔" (۱: ۵۳: ۴، ۵)

"پس اے اندر! ہم کو بڑھنے والی شوکت عطا کر، ہم کو وہ قہر اور طاقت عطا کر جو قوموں کو مغلوب کرے، ہمارے دولت مند سرداروں کو برقرار رکھ، ہمارے راجاؤں کی حفاظت کر، ہم کو دولت اور خوراک، شریف اولاد کے ساتھ عنایت کر۔" (۱: ۵۴: ۱۱)

"اے اگنی! تیرے مالدار پجاری خوراک حاصل کریں اور امرا تیری عمریں پائیں، ہم اپنے دشمنوں سے لڑائی میں مال غنیمت حاصل کریں اور دیوتاؤں کو ان کا حصہ نذر کریں۔ اے اگنی! ہم تیری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۶) اس سے بھی زیادہ قدیم تاریخ سے شروع ہوا ہو۔ آریہ قبائل نے اپنے ایران کی بلندیوں سے، جو کوہستان ہندوکش کے شمال میں ہیں، شمالی مغربی ہندوستان یعنی دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کی سرزمین میں ہجرت شروع کی۔ ملک کے اصلی غیر آریہ باشندے، جو آریوں سے ممیز کرنے کے لئے دسیو کہے جاتے ہیں، آسانی سے مغلوب ہو گئے۔" (Encyclopaedia of Religions, Vol. VIII, P. 107)

پروفیسر میکڈانل لکھتا ہے:-

"رگ وید میں داس اور دسیو کی اصطلاحیں عموماً ان سیاہ رنگ قدیم باشندوں کے لئے استعمال کی گئی ہیں جنہیں فاتح آریوں نے مغلوب کیا تھا۔" (Encyclopaedia of Religions, Vol. XII, P. 616)

ولیم کروک لکھتا ہے:-

"بڑے بڑے دیوتا اپنے پجاریوں کے فیاض مربی ہیں۔ وہ دسیو یا سیاہ رنگ دیسی باشندوں کے خلاف جنگ کرنے میں ہندو آریہ کی قیادت کرتے ہیں۔" (Encyclopaedia of Religions, Vol. VI, P. 691)

کر دیا اور پورو کتا کی مدد کی" (۶: ۲۰: ۱۰)

" اے اندر ہم کو وہ دولت دے جو دشمن کو جنگ میں اس طرح مغلوب کر دے جیسے آسمان

(حاشیہ صفحہ ۲۷۹) دسیو کی طرح لفظ داس بھی ان لیبی قوموں کے لئے بولا جاتا تھا جو آریہ حملہ آوروں سے برسر پیکار تھیں۔ بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ داس اور دسیو سے مراد ارواح خبیثہ ہیں۔ مگر یہ تاویل محتاج دلیل ہے۔ گرفتھ کہتا ہے :

" یہ اصطلاح اصلاً ان خاص بد روحوں کے لئے وضع کی گئی تھی جو اندر اور انسانوں کی دشمن سمجھی جاتی تھیں، مگر بالعموم اس سے وہ وحشی لوگ مراد لئے جاتے تھے جو اس ملک کے اصلی باشندے تھے اور جن سے ابتدائی آریہ مہاجرین کی جنگ تھی"

دوسری جگہ یہی مصنف " داسم ورنم" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

" اس سے مراد وہ وحشی بدشکل باشندے ہیں جنہیں آریہ مہاجرین نے بطور رعیت کی جماعت میں شامل کر دیا تھا"

(گرفتھ کا ترجمہ اتھرو وید جلد اول صفحہ ۴۴۷)

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم شیطان کا لفظ اصلاً جن کے لئے استعمال کرتے ہیں لیکن جب کبھی شیاطین کا لفظ انسانوں کے لئے بولا جائے گا جن کے متعلق ہم بری رائے رکھتے ہیں تو سیاق و سباق سے خود ہی معلوم ہو جائیگا کہ یہاں شیاطین سے مراد انسان ہیں نہ کہ جن۔ ایسے مواقع پر یہ کہنا کہ شیاطین کے اصل معنی شیاطین جن کے ہیں، ایک بیجا تاویل ہوگی۔

داس اور دسیو کے مسمی کی تعیین میں اسوقت کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی جب ہم خود رگ وید میں ان کے انسان ہونے کے متعلق بین شہادتیں دیکھتے ہیں۔ انکو جگہ جگہ بے دین اور ادھرمی کہا گیا ہے۔ وہ دیوتاؤں کو نہ ماننے والے، آریہ قوانین کی پابندی کرنے والے اور عقل سے محروم قرار دیئے گئے ہیں۔ ان کے پاس گائے بیل اور مویشی کی کثرت ہے۔ انکے پاس قلعے ہیں جنکو آریہ فتح کرتے ہیں سان سب سے زیادہ روشن دلیل یہ ہے کہ انکی ناکیں چپٹی، ان کے جبڑے چوڑے اور رنگ کالے بتائے گئے ہیں جو بعینہٖ قدیم دراوڑین نسل کے لوگوں میں ہم کو آج بھی نظر آتے ہیں۔ رگ وید میں ایک جگہ لکھا ہے۔

" اے بہادر تو نے لڑائیوں میں بیل جیسے جبڑے والے داسوں کے جادو ٹونے تک کو مغلوب کر لیا" (۷: ۹۹: ۴)

دوسری جگہ دسیو کا حلیہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے :

" تو اپنے ہتھیار سے نکٹے دسیوں کو قتل کرتا ہے" (۵: ۲۹: ۱۰) (باقی دیکھو صفحہ ۲۸۱)

زمین پر چھایا ہوا ہے، وہ دولت جو ہزاروں مال لاتی ہے، جو غلہ پیدا کرنے والی زمینیں فتح کرتی ہے وہ دولت جو دشمن کو شکست دیتی ہے" (۶ : ۲۰ : ۱)

"اے دیوتاؤ! ہم ایک ایسے ملک میں آپہنچے ہیں جو چراگاہوں سے خالی ہے، ایسی سرزمین جو وسیع ہونے کے باوجود ہمیں پرورش کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اے برہسپتی! مواشی حاصل کرنے کے لئے جنگ میں مدد کر۔ اے اندر! اس بھجن گانے والے کے لئے ایک راہ نکال۔ روز بروز وہ ان کی (یعنی آریوں کی) جائے سکونت سے اس سیہ رو مخلوق کو دور بھگا رہا ہے۔ اس بہادر نے ان کمینے چیری چیرنے والے داسوں یعنی ورچین اور شامبر کو دریاؤں کے سنگم پر قتل کر ڈالا" (۶ : ۷ : ۲۰-۲۱)

"تیر کمان کی مدد سے ہم مواشی حاصل کریں، تیر کمان کی مدد سے ہم لڑائی جیتیں، تیر کمان کی مدد سے اپنی گھمسان کی لڑائیوں میں فتحمند ہوں، تیر کمان دشمنوں کو غمگین کرتی ہے، اس سے مسلح ہو کر ہم تمام ممالک فتح کریں" (۶ : ۵۷ : ۱-۲۔ نیز یجر وید ادھیائے ۲۹ منتر ۳۹)

"اے اندر! جب میدان جنگ گرم ہو تو ہمارے دشمنوں کو، ان فانی لوگوں کو جو ہماری ہجو کرتے ہیں ہلاک کر دے۔ بدگوؤں کی بددعائیں ہم سے دور رکھ، ہمارے پاس مال و دولت کے جمع کئے ہوئے خزانے لا، ہمارے فانی حریفوں کے ہتھیار توڑ دے، ہمیں عظیم الشان شہرت اور مال و دولت عطا کر، ہمارے حریفوں کو آسانی کے ساتھ مغلوب ہو جانے والا بنا دے۔ اے بہادر، ہم فتح مند ہوں۔ مال غنیمت حاصل کریں۔ اس طرح اے اندر! قیمتی چیزوں سے ہم کو مطمئن کر، ہم تیری بلند پایہ مہربانی حاصل کریں، ہمارے بہادروں کو بکثرت سامان خوراک اور بہادر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۰) ایک اور جگہ داسوں کے غلامی میں دیئے جانے کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے:-

"یادو اور تورد انے بھی ہم کو خدمت کیلئے دو داس دیئے ہیں، اور بہت سی گائیں" (۱۰ : ۶۲ : ۱۰)

پھر ایک جگہ داس عورتوں کے بھی غلامی میں دیئے جانے کا ذکر ہے جن میں ایک شخص تراسا دسیو کو ہم پچاس لونڈیوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں (۸ : ۱۹ : ۳۶)۔ ان تین شہادتوں کی موجودگی میں خواہ مخواہ یہ تاویل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ یہ لوگ آدمی نہ تھے بلکہ بھوت پریت تھے۔

اولاد حاصل ہو" (۷: ۲۵: ۲-۳-۵-۶)
"اے اگنی! ہمارے دشمنوں کو بھگا دے، مال و دولت کی فتح کو آسان کر، تو مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے لڑائی میں ہمارا اچھا محافظ بن" (۷: ۳۲: ۲۵)
"اے بہادر! ہم تیری دوستانہ معیت میں اس شخص کا مقابلہ کریں جو ہمارے خلاف غصہ سے بھڑک رہا ہے اور اس قوم کے ساتھ لڑائی میں ثابت قدم رہیں جو کثرت سے گائیں رکھتی ہے" (۸: ۲۱: ۱۱)
"تو گھن کھائے درخت کو ریزہ ریزہ کر دے، داسوں کی قوت کا قلع قمع کر دے۔ ہم اندر کی مدد سے وہ سب خزانے بانٹ لیں جو انہوں نے جمع کئے ہیں" (۸: ۴۰: ۶)
"اے اگنی! اے دیوتا! لوگ قوت حاصل کرنے کے لئے تیری حمد کے ترانے گاتے ہیں۔ تو دشمن کو ڈرا دے دیکر پریشان کر دے۔ اے اگنی! کیا تو مواشی حاصل کرنے اور دولت فتح کرنے میں ہماری مدد نہیں کرے گی؟" (۹: ۴: ۶-۱۰-۱۱)
"ہم جنگ میں ایسے ہو جائیں کہ تیری کرپا کے یقینی مستحق ہوں۔ دیوتاؤں کے لئے متبرک نذرانوں اور مناجاتوں سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہم مال غنیمت حاصل کر سکیں" (دال کھیلہ ۵: ۷)
"اے اندر! خزانوں کے خزانچی! ہم نے خزانوں کی خواہش سے تیرا سیدھا ہاتھ تھام لیا ہے کیونکہ ہم تجھ کو جانتے ہیں۔ اے بہادر! مویشیوں کے مالک! ہم کو زبردست درخشاں زر و مال عطا کر۔ نامور رشیوں کے ساتھ مضبوط ہو کر ہمارے دشمنوں کو مغلوب کر کے ہمیں زبردست درخشاں زر و مال عطا کر۔ سچے اندر! قلعوں کو مسمار کر کے، دسیوں کو قتل کر کے، ہم کو زبردست درخشاں زر و مال عطا کر" (۱۰: ۴۷: ۱-۳-۴)
"ہمارے گرد وہ دسیو ہیں جن کا کوئی دھرم نہیں ہے، عقل سے محروم، انسانیت سے خارج، غیر مانوس قوانین کے پابند ہیں" (۱۰: ۲۲: ۸)
"دشمنوں کو قتل کرنے والے ورترا! دسیو کو ہلاک کرنے والے! تو ہمارے پاس ہر قسم کی

دولت اور خزانے لا" (۱۰: ۸۳: ۳)

"تو ہمارے دشمنوں کو قتل کر، ان کی جائداد املاک بانٹ دے، اپنی قوت کے کرشمے دکھا، اُن لوگوں کو منتشر کردے جو ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ اے مینو! ہم سے لڑنے والوں پر غالب آ، تو نے جا قتل کئے جا، دشمنوں کو کچلے جا" (۱۰: ۸۴: ۲-۳)

"لڑ، اے صداقت سے مضبوط ہو کر لڑنے والے۔ تو لڑائی لڑ۔ اور ہم کو اُس دولت سے حصہ دلوا جو ابھی تک تقسیم نہیں ہوئی ہے" (۱۰: ۱۱۲: ۱۰)

"اے اندر! تو سوریہ کے ساتھ داس قوموں پر غالب آ" (۱۰: ۱۱۲: ۱۰)

"مجھ کو اپنے ہمسروں میں سانڈ بنا۔ مجھ کو اپنے حریفوں کا فتح کرنے والا بنا۔ مجھ کو اپنے دشمنوں کا قتل کرنے والا، بااختیار حکمراں، مویشیوں کا مالک بنا" (۱۰: ۱۶۵: ۱)

یجر وید | یجر وید ابعض میں ہم کو جنگ کے متعلق حسب ذیل منتر ملتے ہیں:-

"اے اگنی ہم کو وسیع مکان اور آرام و آسائش بخشے اور ہمارے دشمنوں کو ہمارے آگے مارتی بھگاتی چلے، وہ مال غنیمت حاصل کرنے کی جنگ میں مال غنیمت لوٹے، وہ اپنی فاتحانہ پیش قدمی میں دشمنوں کو زیر کرے" (۹: ۴۴)

"اے اگنی! ہماری مزاحمت کرنے والی جماعتوں کو مغلوب کر، ہمارے دشمنوں کو بھگا دے۔ اے اجیت! دیوتاؤں کو نہ ماننے والے حریفوں کو قتل کر اور اپنے پوجاری کو عظمت و شوکت نصیب کر" (۹: ۳۷)

"اے دسیوں کے حق میں سب سے زیادہ تباہ کن! تجھ کو پاخیانے روشن کیا ہے، تو ہر لڑائی میں مال غنیمت حاصل کرتی ہے" (۱۱: ۳۴)

"جو شخص ہم کو نقصان پہنچانے کی فکر کرتا ہے، جو ہم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور جو کوئی ہم پر تہمت لگائے اور ہمیں ایذا دے، اسے تو جلا کر راکھ کر دے" (۱۱: ۸۰)

"اے آگ! تو جس کے شعلے تیری طرح تیز ہو رہے ہیں، ہمارے آگے آگے پھیل، ہمارے

دشمنوں کو جلا دے۔ اے بھڑکتی ہوئی آگ! جس نے ہمارے ساتھ بدی کی ہے تو اس کو سوکھی لکڑی کی طرح بالکل بھسم کر دے۔ اے اگنی! اٹھ۔ ان لوگوں کو بھگا دے جو ہمارے خلاف لڑتے ہیں اپنی آسمانی طاقت کا مظاہرہ کر۔" (۳:۱۲-۱۳)

"درندہ جانور اس کے ہتھیار ہیں، مردم خوار درجانور، اس کا چمکیلا ہتھیار ہے، ان درندوں کو سلام ہو، وہ ہماری حفاظت کریں، وہ ہم پر رحم کھائیں، ہم اس آدمی کو ان کے منہ میں ڈال دیں جس سے ہم نفرت کرتے ہیں اور جو ہم سے نفرت کرتا ہے۔" (۱۵:۱۵)

"اے اندر! تو کہ اپنی طاقت کے لئے مشہور ہے، مضبوط ہے، زبردست لڑنے والا ہے، تُند و خونخوار ہے، فتح مند اور ہر ایک کو زیر کرنے والا ہے۔ فتح و کامرانی کا بیٹا ہے، گائیں لوٹنے والا ہے، تو آدمیوں اور بہادروں سے نکل کر اپنی فتح کی گاڑی پر سوار ہو۔ اصطبلوں کا کھوسنے والا، گائیں لوٹنے والا، اس صاعقہ سے مسلح ہے جو ایک پوری فوج کو شکست دیتی ہے اور طاقت سے اس کو تباہ کر دیتی ہے۔ بھائیو! اس کے پیچھے پیچھے آؤ۔ اپنے تئیں بہادروں کی طرح آزاد چھوڑ دو، اور اس اندر کی طرح اپنی شجاعت اور جسارت کا اظہار کرو۔ ہمارے دشمنوں کے حواس باختہ کرنے والے اپوا![1] تو ان کو پکڑ لیجا۔ ان پر حملہ کر، ان کے دلوں کو آگ پر رکھ کر انہیں جلا دے، اس طرح ہمارے دشمن ہمیشہ تاریکی میں رہیں گے۔" (۱۷:۱:۳۷-۳۸-۴۴)

سام وید | سام وید کے جن منتروں میں جنگ کا مضمون آیا ہے وہ یہ ہیں:-

"اندر! ہماری مدد کے لئے ایسی کارآمد دولت دے جو ہنرمند ہوشیار لوگوں پر حکومت کرنے والی ہو۔ ہاں، وہ قوت والا ہم کو اقتدار کی دولت دے۔ اندر اور پوشن کو ہم دوستی اور خوشحالی کے لئے پکاریں اور مال غنیمت لوٹنے کے لئے۔" (حصہ اول ۳:۱:۶۱-۹)

"ہم شعرا تجھے پکارتے ہیں تاکہ ہم اپنے لئے دولت اور اقتدار حاصل کریں۔ اے اندر! اے

[1] وبائی امراض کی دیوی کا نام ویدک دیوتاؤں میں "اپوا" ہے۔ یہاں غالباً وہ بیماریاں مراد لی گئی ہیں جو لڑائی کے وقت فوجوں میں پھیلتی ہیں (گرفتھ کا ترجمہ یجر وید صفحہ ۱۵۴)

بہادروں کے سردار لوگ جنگ میں تجھ کو پکارتے ہیں، گھوڑ دوڑ میں تجھکو پکارتے ہیں۔ عملی آدمی اپنے سچے حلیف پورندھی کے ساتھ مال غنیمت حاصل کر یگا۔" (۲:۱:۵:۲-۲)

"جب ہم رس نکالتے ہیں تو اے اندر! بڑے بہادر! ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں حتیٰ کہ مال غنیمت لوٹتے وقت بھی۔ ہمیں خوش حال بنا۔ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ہم خاص تیری حفاظت میں فتح حاصل کریں۔ اے اندر! ہم تیرا سیدھا ہاتھ پکڑتے ہیں۔ تو کہ دولت کا مالک تو ہی ہے، ہم تجھ سے خزانوں کی خواہش کرتے ہیں۔ چونکہ ہم تجھ کو بہادر، مویشیوں کا مالک جانتے ہیں، ہم کو زبردست درخشاں زر و مال عطا کر۔ لڑائی اور عظمت و شان کے ہیرو! ہم کو مویشیوں کے تھان کا ایک حصہ بخش دے۔" (۴:۱:۱۴:۴-۵-۶:)

"نذر و نیاز کے ساتھ گا، اس کی حمد و ثنا کر جو خوش کرتا ہے، جس نے رجیوان کے ساتھ مل کر کالے غولوں[1] کو بھگا دیا۔" (۴:۲:۴:۱۱)

"اے بہادر! افراط کے ساتھ گائیں رکھنے والی قوم کے خلاف جنگ میں تو ہمارا دوست ہو، اور ہم اس شخص کا مقابلہ کریں جو اپنے غصہ میں ہم پر بھڑکتا ہے۔" (۵:۱:۲:۵)

"غضبناک، چمکتے ہوئے، اپنی چال میں تھکے بغیر، وہ کالے رنگ والوں کو بھگاتے ہوئے سانڈوں کی طرح آگے بڑھے۔ اے سوم رس! تو دشمنوں کو تسکار کرتا ہوا ابلتا ہے۔ اے عقل اور مسرت بخشنے والے! تو دیوتاؤں کو نہ ماننے والے لوگوں کو بھگا دے۔" (۶:۱:۱:۵-۶)

"گاڑیوں کے آگے آگے بہادر سپہ سالار مالِ غنیمت تلاش کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے، اس کی فوج خوشیاں مناتی ہے۔" (۶:۱:۵:۱)

"مالِ غنیمت لوٹتے وقت ہم پر اُس بہترین زر و مال کے دریا بہا دے جس کی سینکڑوں تمنا کرتے ہیں۔" (۶:۲:۱:۵)

[1] یہ اور اس کے بعد والا منتر جن کالے رنگ کے لوگوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اُن سے وہی ملک کے اصلی باشندے مراد ہیں جن کو داس اور دسیو کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

"اس کے ساتھ فتح حاصل کرنے کی کوشش میں ہم دشمن سے تمام مال و دولت لے لیں۔ ہاں، آدم زاد کی تمام عظمت و شان حاصل کر لیں" حصۂ دوم ۱:۱:۸:۳)

"اُس سے ہم ایسے مالِ غنیمت کے طالب ہیں جو سامانِ خوراک سے مالا مال ہو جس میں سینکڑوں ہزاروں گائیں ہوں" (۱:۱:۱۳:۲)

"اے دیوتاؤں کے محبوب! اپنے اچھے مسرت بخش رس کے ساتھ ابل، بذات پاپیوں کو قتل کرتے ہوئے، دشمنوں کو ان کی نفرت سمیت ہلاک کرتے ہوئے، روزبروز زور پکڑتے اور مالِ غنیمت حاصل کرتے ہوئے اُبل۔ تو گھوڑوں اور گایوں کا حاصل کرنے والا ہے"

(۲:۱:۱۵:۱-۲)

"اندر کی عنایات قدیم ہیں۔ اس کی حمایت و حفاظت کبھی بند نہیں ہوتی۔ جب وہ اپنے پوجاری کو گایوں سے بھرا ہوا مالِ غنیمت عطا کرتا ہے" (۲:۱:۳)

"اے مگھون! اے کڑکنے والے! اپنی حیرت انگیز اعانتوں کے ساتھ ہم کو کسی گایوں سے بھرے ہوئے باڑے پر لے چل" (۲:۲:۱۱:۲)

"اے چابکدست بہادر! کنوا کے بیٹوں کے ساتھ بے دھڑک ہو کر ہزار در ہزار مالِ غنیمت لوٹ۔ اے سرگرم کار مگھون! پرشوق دعاؤں کے ساتھ ہم زرد رنگ کے مال[1] اور گایوں کے ایک بڑے گلے کی تمنا کرتے ہیں" (۲:۲:۱۲:۳)

"سچے دیوتاؤ! ہم تم سے وافر سامانِ خوراک حاصل کریں اور ایک سکونت کی جگہ۔ اے مترو! ہم تمہارے اپنے ہو جائیں۔ اے مترو! ہماری حفاظت کرو، اپنی حفاظتوں کے ساتھ ہمیں بچاؤ۔ اے مشاق محافظو! ہم دسیو کو اپنے ہاتھ سے زیر کر لیں" (۳:۲:۸:۲-۳)

"اے بہادر! اے مالِ غنیمت لوٹنے والے! تو آدمی کی گاڑی کو تیز چلا۔ اے فاتح! ایک مشتعل جہاز کی طرح بے دین دسیوں کو جلا دے" (۶:۳:۲۰:۳)

[1] زرد رنگ کے مال سے مراد سونا ہے۔ عربی میں بھی اکثر سونے اور چاندی کا نام لینے کے بجائے صفراء اور بیضاء بولتے ہیں۔

"وہ سندر جب ہمارے گیت سنتا ہے تو اپنی گایوں کی کثیر دولت کو ہم سے بچا کر نہیں رکھتا۔ وہ اپنی قوت سے ہمارے لئے گایوں کا باڑہ کھول دے، خواہ وہ کسی کا ہو جس کی طرف دسیوں کو قتل کرنے والا جاتا ہے" (۸: ۲: ۴: ۲-۳)

"اندر اور اگنی! تم دونوں نے ایک زوردار کارروائی سے ۹۰ قلعوں کو سر کر لیا جو داسوں کے قبضہ میں تھے" (۸: ۲: ۱۷: ۳)

اتھر وید | اتھر وید میں جنگ کا مضمون بکثرت آیا ہے۔ اس میں سے چند منتروں کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

"اے اگنی! تو یاتو دھانوں[1] کو یہاں باندھ کر لا اور پھر اندر اپنی کڑک سے ان کے سروں کو پاش پاش کر دے" (۱: ۷: ۷)

"اے سوم رس پینے والے! یاتو دھانوں کی آل اولاد کو کھینچ لا اور ہلاک کر دے۔ اقراری گناہگاروں کی دونوں آنکھیں سر سے باہر نکال لے" (۱: ۸: ۳)

"اے منیو[2]! طاقتور سے زیادہ طاقتور ہو کر ادھر آ اور اپنے غضب سے ہمارے تمام دشمنوں کو ہلاک کر دے۔ دشمنوں اور وِرتیروں اور دسیوں کو قتل کرنے والے! تو ہمارے پاس ہر قسم کی دولت اور خزانے لا" (۴: ۳۲: ۱-۳)

"پچی طاقت بخشے ہوئے راجہ! اس کو جلا دے جو ہم کو دکھ اور تکلیف دے اور جو ہم سے دشمنوں کا سا سلوک کرے۔ جو کوئی دکھ پائے بغیر ہمیں تکلیف دے یا دکھ پا کر ہم کو ستائے ہم اس کو میں آگ اور دیس وناس کے دو طرفہ عذاب میں رکھ دوں" (۴: ۳۶: ۱-۲)

"میں پشاچوں[3] کو اپنی قوت سے فتح کروں اور ان کی دولت چھین لوں۔ جو کوئی ہم کو ایذا دے اسے

---

[1] یہ لفظ کبھی ارواح خبیثہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی غیر آریہ دشمنوں کے لئے جیسا کہ ڈاکٹر بیڈیل کنجہ کہتا ہے یہ تمیز کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ القاب کس جگہ غیر آریہ دشمنوں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اور کس جگہ ارواح خبیثہ کیلئے۔ تاہم انداز بیان سے کہیں کہیں اس کا پتہ چل جاتا ہے۔

[2] غضب کا دیوتا۔

[3] پشاچ عموماً کچا گوشت کھانے والے بھوتوں کو کہتے ہیں، مگر یہاں صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ سے انسانی دشمن مراد ہیں۔

میں قتل کر دوں اور میرے ارادے کو کامیابی ہو۔" (۴ : ۳۶ : ۴)

"رودر! تمہاری گردنیں توڑ دینے کے لئے اٹھا چوپ! اور تمہاری پسلیاں چور چور کر دے اسے یا تو دھانو! یہاں ہم شان کے ساتھ رہیں۔ اے متر! اے اور ونا! تو حریص راکشسوں کو مار بھگا، ان کو کوئی جائے پناہ اور کوئی اطمینان کی جگہ نہ ملے، بلکہ وہ سب پھوٹ پھوٹ کر اکٹھے موت کے منہ میں چلے جائیں۔"

(۲:۳۲:۶)

"ہمارے یہ دشمن بے ہاتھ کے ہو جائیں، ہم ان کے سست بازوؤں کو بیکار کر دیں، اور اس طرح، اے اندر! ہم ان کی ساری دولت آپس میں بانٹ لیں۔" (۶ : ۶۶ : ۳)

"ان کو بیل کی کھال میں سی دو، ان کو ہرن کی طرح بزدل بنا دو، دشمن بھاگ جائیں اور ان کے مواشی ہمارے پاس آجائیں۔" (۶ : ۶۷ : ۳)

"ہم اندر کی مدد سے دشمن کے تمام جمع کئے ہوئے خزانہ کو بانٹ لیں، اور میں وارونا کے قانون کے مطابق تیرے غرور اور تیری شرارت کا سر نیچا کر دوں۔" (۷ : ۹۰ : ۲)

"اے آگ کے دیوتا! تو یاتو دھانوں کی کھال میں گھس جا، تیرا تباہ کن تیر (یعنی شعلہ) ان کو بھسم کر ڈالے۔ اے جات ویدا! ان کے جوڑوں کو کھول ڈال، کچا گوشت کھانے والا اور گوشت کی تلاش کرنے والا اس کو ہلاک کر دے۔" (۸ : ۳ : ۴)

"اے آگ کے راجہ! جہاں کہیں تو کسی یاتو دھان کو کھڑے ہوئے یا پھرتے ہوئے دیکھے، یا اس کو جو ہوا میں اڑتا ہے، تو غصہ سے مشتعل ہو کر اسے تیر سے چھید ڈال۔" (۸ : ۳ : ۵)

"یاتو دھانوں کے دلوں کو تیر سے چھید ڈال اور ان کے بازوؤں کو جو تجھ پر حملہ کرنے کے لئے اٹھیں توڑ دے۔ ان شیطانوں کے سامنے بھڑک کر اے اگنی! انہیں مار گرا۔ سردار خوار چتکبرے گدھ اسے کھائیں۔ اس پلید کو آدمیوں میں سے آدم خور کی طرح تاک کر اس کے تینوں اوپر کے اعضا کو توڑ ڈال۔ اپنے شعلوں سے اس کی پسلیوں کو کچل دے۔ اے اگنی! اس کے نیچے کے اعضا کو تین ٹکڑے کر دے۔" (۸ : ۳ : ۶ - ۷ - ۱۰)

"اندر اور سوما! تو خبیث دشمن کو جلا دے، تباہ کر دے۔ اے دیوتاؤ! جو رنج پر رنج پہنچاتے ہیں انہیں نیچا دکھا، ان احمقوں کو نیست و نابود کر دے، جلا ڈال، ذبح کر دے، ہمارے پاس سے دفع کر اور ان بندۂ شکم کشٹسوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے" (۳:۴:۱ رگ وید ۱:۸۷:۵:۱۰)

"پس اے دیوی گائے! برہمن پر ظلم کرنے والے، مجرم بخیل، دیوتاؤں کی مذمت کرنے والے کو اپنی سو گرہوں والی بان سے، جو استرے کے پھل کی طرح تیز ہے، ہلاک کر، اس کے سر کو کندھوں سے الگ کر دے، اس کے سر کے بال نوچ ڈال، اس کے بدن کی کھال کھینچ لے، اس کے پٹھے کھینچ لے، اس کے ڈھانچ پر سے گوشت کی بوٹی بوٹی اتار لے، اس کی ہڈیوں کو کچل دے، اس کے سر سے بھیجا نکال لے، اور اس کے سب اعضا اور جوڑوں کو الگ کر دے" (۱۲:۵:۶۵-۷۱)

"قلعہ شکن، دولت کے مالک اندر نے دشمنوں کا ناس کر دیا، اور بجلی کی سی کڑک کے ساتھ داسیوں کو مغلوب کر لیا۔ اس نے اپنی قوت، اپنی ہر ایک پر غالب آنے والی جرأت، اپنی حیرت انگیز مہارت فن سے بار بار طن دسیو کو کچل ڈالا۔ اس نے سونے کے خزانے فتح کئے، اس نے دسیو کو نہس نہس کر دیا، اور آریہ نسل کے لوگوں کو محفوظ کر دیا" (۲۰:۱۱:۱-۲-۹)

ویدوں کی تعلیم جنگ پر ایک نظر اوپر جنگ کے متعلق چاروں ویدوں کے منتر لفظ بلفظ نقل کر دیئے گئے ہیں اور ان کی اصلی اسپرٹ کو ظاہر کرنے کے لئے ایک ایک مضمون کے کئی کئی منتر نقل کئے گئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے جن اہم نکات پر روشنی پڑتی ہے وہ مختصراً یہ ہیں:-

۱۔ آریوں کی جنگ ایک ایسی قوم سے تھی جو رنگ، نسل، مذہب، اور وطن میں ان سے مختلف تھی۔ آریہ ان کے ملک پر حملہ آور ہوئے تھے اور ان کی جگہ خود بسنا چاہتے تھے۔

۲۔ وہ اس قوم کو بھوت پریت، شیطان اور ارواح خبیثہ سمجھتے تھے۔ انہیں داس یا دسیو، راکشس، یاتودھان، اور پشاچ وغیرہ نفرت انگیز ناموں سے یاد کرتے تھے۔ ان کو انسانیت سے خارج، عقل و شعور سے عاری، اور آریہ نسل کے مقابلہ میں ذلیل و کمینہ خیال کرتے تھے۔ انہیں خیالات نے

ماتحت انہوں نے اپنے اُن دشمنوں کو وہ درجہ دینے سے انکار کر دیا جو برابر کے اپنائے نوع کو دیا جانا چاہئے

۳۔ ان کے پیش نظر جنگ کا کوئی بلند اخلاقی مقصد نہ تھا۔ انہیں دولت اور خزانوں کی تلاش تھی وہ گائے بیل گھوڑے اور دوسری قسم کے مویشیوں کی افراط چاہتے تھے۔ زرخیز زمینوں اور آرام دہ مکانوں اور سامانِ خوراک سے بھرپور ذخائر کے خواہشمند تھے۔ ان کے اندر قوموں کو مغلوب کرنے، ہمسروں میں شجاعت و بہادری کی شہرت حاصل کرنے، اور ملکوں پر دبدبہ و شوکت کے ساتھ حکمرانی کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ ویدوں میں کہیں ہم کو ان مقاصد سے بہتر اور بلند تر مقصدِ جنگ کا نشان نہیں ملا۔

۴۔ غیر آریہ قوم کے لوگوں سے ان کی جنگ کسی قابلِ تصفیہ نزاع پر مبنی نہ تھی، بلکہ ایک ایسی نزاع پر مبنی تھی جو فریقین میں سے کسی ایک کے کلیتہً مٹ جانے یا پامال و مغلوب ہو جانے کے سوا کسی اور صورت سے ختم نہ ہو سکتی تھی۔ ان کی جنگ اس بنا پر تھی کہ یہ قومیں آریہ نہ تھیں اور آریوں کے دیوتاؤں کی پرستش نہ کرتی تھیں۔ پہلی وجہ کا رفع ہونا تو بداہتہً ناممکن تھا کیونکہ نسل کوئی بدلنے کی چیز نہیں ہے۔ اب رہی دوسری وجہ، تو وہ بھی اس لئے رفع نہ ہو سکتی تھی کہ آریوں کا مذہب تبلیغی مذہب نہ تھا۔ ویدوں سے کہیں اشارۃً بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آریوں نے غیر آریہ قوموں کو کسی مذہبی عقیدہ و مسلک کی دعوت دی ہو اور ان کے سامنے یہ بات پیش کی ہو کہ اگر تم فلاں فلاں اصول قبول کر لو تو ہم مساویانہ حیثیت سے تم کو اپنی سوسائٹی میں لے لیں گے۔ برعکس اس کے ہمیں اس امر کی بیّن شہادتیں ملتی ہیں کہ آریہ ورن کے لوگ غیر آریہ لوگوں کو فطرۃً ذلیل و نجس سمجھتے تھے اور اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ وہ ان کی مذہبی عبادات میں شریک ہو سکیں یا ان کی دینی کتابوں کو ہاتھ لگا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں حریفوں کی جنگ اس وقت تک ختم نہ ہوئی جب تک ملک کے اصلی باشندوں نے شودر بن کر رہنا یا جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف نکل جانا قبول نہ کر لیا۔

۵۔ ویدوں کے منتروں سے یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ آریہ حملہ آور اپنے دشمنوں کے ساتھ جنگ میں فی الواقع کیا سلوک کرتے تھے، مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں ان لوگوں کو سخت ہولناک عذاب دینے کی خواہش موجود تھی۔ زندہ آدمی کی کھال کھینچنا، اس کی بوٹیاں کاٹنا، اسے آگ میں جلانا، اس کے اعضا کا مثلہ کرنا، اس کو درندہ جانوروں سے چِروانا، اسے جانوروں کی کھال میں

تی دینا، اس کے بال بچوں تک کو ذبح کر ڈالنا، یہ وہ مرغوب سزائیں ہیں جو وہ چاہتے تھے کہ ان کے دیوتا ان کے دشمنوں کو دیں۔ یہ آرزوئیں جن دلوں میں پرورش پا رہی ہوں ان کے عمل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

گیتا کا فلسفہ جنگ[1]

ہندو مذہب میں گیتا کو جو عظمت حاصل ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ سری کرشن جیسے ممتاز مذہبی پیشوا کی طرف منسوب ہے۔ مسٹر تلک کے بقول وہ "بھاگوت دھرم کا سب سے بڑا گرنتھ ہے"۔ اس میں ہندو مذہب کے فلسفہ کو جس وضاحت اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس کی مثال پورے سنسکرت لٹریچر میں نہیں ملتی۔ گو اس میں ہندو تصوف کے بیسیوں مسائل زیر بحث آئے ہیں، لیکن اس کا اصل مرکزی نقطہ جنگ ہی ہے، کیونکہ وہ ایک پست ہمت سپاہی کو جنگ پر ابھارنے اور اس کے خوں ریزی سے بیزار دل میں رزم آرائی کا شوق پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔

تاریخ ہند کا یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ جب ہندوستان میں قدیم آریہ تہذیب پورے عروج پر تھی تو ہستناپور کے شاہی خاندان میں دولت و اقتدار کی خواہش نے پھوٹ ڈال دی۔ کورو اور پانڈو دو متقابل فریق بن گئے اور دونوں کی تائید میں ہندوستان کے بڑے بڑے امراء و اعیان کھڑے ہو گئے۔ اول اول سمجھوتے کی کوششیں کی گئیں مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر دونوں نے قاضی شمشیر کو حکم بنایا اور میدان جنگ کی عدالت میں اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہو گئے۔ کرشن جی اس جنگ میں پانڈوؤں کے حامی تھے۔ پانڈوؤں کا سردار ارجن ان کا چیلا تھا۔ اس کی فوج کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لئے کرشن جی نے خود اس کے رتھ کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے لی تھیں۔ جب میدان کارزار میں دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوئیں اور ارجن نے اپنی آنکھوں سے اپنے دوستوں، عزیزوں اور بھائیوں کو آمادۂ قتال دیکھا تو اس کا دل ٹوٹنے لگا۔ اس نے محبت کے لطیف جذبات سے متاثر ہو کر ارادہ کیا کہ جنگ سے پھر جائے۔ اس پر کرشن جی نے اس کو ایک طویل اپدیش دیا جو جنگ کے فلسفے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر

[1] میرے پیش نظر گیتا کی دو مستند اور اعلیٰ المتن شرحیں ہیں۔ ایک مسٹر بال گنگا دھر تلک کی مشہور شرح جس کا ترجمہ مسٹر شانتی نرائن لاہوری نے کیا ہے۔ دوسری مسٹر کے ٹی تیلنگ کی شرح جو سلسلۂ کتب مقدسہ شرق (Sacred Books of the East Series) میں آکسفورڈ سے شائع ہوئی ہے۔

خاص تھا یہی اپدیش بھگوت گیتا[1] ہے۔

اس اپدیش کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ جب ارجن کا دل اپنے عزیزوں کو دیکھ کر جنگ سے بیزار ہونے لگا تو اس نے غمزدہ ہو کر کرشن جی سے کہا:۔

ہے کرشن! جنگ کرنے کی خواہش سے جو لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں ان رشتہ داروں کو دیکھ کر میرے اعضاء بے حس و حرکت ہوئے جاتے ہیں، منہ خشک ہو رہا ہے، جسم پر لرزہ چڑھ کر میرا رواں رواں کھڑا ہو گیا ہے، کمان میرے ہاتھ سے گری پڑتی ہے ...... ہے کیشوا! مجھے تمام اپ شگن نظر آ رہے ہیں۔ اپنے عزیزوں کو مار کر مجھے کوئی بھلائی حاصل ہوتی نظر نہیں آتی۔ ہے کرشن! مجھے فتح کی خواہش نہیں، نہ راج چاہیے اور نہ سُکھ۔ ہے گووندا! راج بھوگ اور زندگی ہی سے ہمیں کیا لطف مل جائے گا؟ جن کے لئے راج کی، عیش و عشرت کے سامان کی، اور سُکھ کی خواہش کی جاتی ہے وہی لوگ زندگی اور خوش حالی کی امید چھوڑ کر یہاں جنگ کے لئے کھڑے ہوئے ہیں ...... اگرچہ یہ ہمیں مارنے کے لئے کھڑے ہیں، مگر پھر بھی اے مدھوسودن!

---

[1] یہ اپدیش دراصل زبانی دیا گیا تھا۔ مہابھارت کے مصنف نے اس کے معرضِ تحریر میں آنے اور عام طور پر شائع ہونے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جب کوروؤں کے بزرگ حضرت دھرت راشٹر نے اپنی آنکھوں سے اپنے خاندان کی تباہی کا منظر دیکھنا پسند نہ کیا تو ویاس جی نے ایک رتھبان کو جس کا نام سنجے تھا، اس کے پاس مقرر کر دیا تاکہ وہ جنگ کی مفصل کیفیت من و عن بیان کرتا جائے۔ اس نے پوری کیفیتِ جنگ کے سلسلہ میں اس گفتگو کا بھی پورا حال حضرت دھرت راشٹر کو سنا دیا جو پانڈوؤں کے لشکر میں کرشن جی اور ارجن کے درمیان ہوئی تھی، اور وہ اپدیش بھی نقل کر دیا جو ارجن کی ہمت افزائی کے لئے کرشن جی نے ارشاد فرمایا تھا۔ بعد میں یہی سنجے کی روایت مہابھارت کی چوتھی "بھیشم پرب" میں نقل کر دی گئی اور اس کا نام "بھگوت گیتا" رکھا گیا (دیکھو تیلنگ کا مقدمہ بھگوت گیتا صفحہ ۲، اور تلک کی شرح گیتا حصہ چہارم صفحہ اوّل)۔ اس سے معلوم ہوا کہ کرشن جی کا یہ اپدیش براہِ راست اُن سے یا اُن کے حامیوں کے کیمپ سے نقل ہو کر نہیں آیا ہے بلکہ مخالف کیمپ کے ایک راوی نے اسے غالباً بطریقِ الہام اُن کی طرف سے روایت کیا ہے۔

تین لوک کے راج کے لئے بھی میں انہیں مارنا پسند نہیں کرتا، پھر اس دنیا کی تو ہستی ہی کیا ہے۔

...... خود اپنے رشتہ دار کوروؤں کو مارنا ہمارے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہے، کیونکہ اے مادھو! اپنے عزیزوں کو مار کر ہم کس طرح سکھی ہو سکیں گے؟ .... ہمیں وہ خرابیاں صاف نظر آ رہی ہیں جو خاندان کی تباہی سے پیدا ہوتی ہیں، اس لئے کیونکر ممکن ہے کہ ہمارے دل میں اس پاپ سے بچنے کا خیال نہ آئے؟ ...... خاندان کی تباہی سے تمام پرانے خاندانی دھرم تباہ ہو جاتے ہیں اور خاندان کے ان دھرموں کے مٹ جانے سے تمام خاندان پر ادھرم کی دھاک جم جاتی ہے۔ ..... ہے جناردن! ہم ایسا سنتے آئے ہیں کہ جن انسانوں کے خاندانی دھرم غائب ہو جاتے ہیں وہ یقینی طور پر نرک ہو جاتے ہیں۔ دیکھو تو سہی، ہم شاہانہ عیش کے لالچ سے اپنے عزیزوں کو مارنے کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ ہم نے بڑا پاپ کرم کرنے کی طیاری کی ہے۔ اس سے تو میرے لئے یہ زیادہ بہتر ہو گا کہ اپنے ہتھیار پھینک دوں، انہیں کچھ روک ٹوک نہ کروں، اور ہتھیار بند کورو مجھے میدانِ جنگ میں مار ڈالیں" (ادھیائے ۱، اشلوک ۲۸-۴۶)

ارجن کے ان پاکیزہ اور لطیف خیالات کو سن کر کرشن جی نے تعجب کے ساتھ پوچھا:-

"ہے ارجن! اس نازک موقع پر تیرے من میں یہ غلط خیال کہاں سے آگیا جس کی طرف اعلیٰ انسانوں نے کبھی توجہ نہیں کی اور جو ذلیل حالت کو پہنچانے والا اور بدنامی کا باعث ہے؟ ہے پارتھ! ایسا نامرد نہ بن۔ یہ تیری شان کے شایاں نہیں۔ دل کی کمزوری کو چھوڑ اور کھڑا ہو جا (۲: ۲-۳)

اس پر ارجن نے کہا:-

"ان مہاتما کوروؤں کو مارنے سے اس دنیا میں بھیک مانگ کر پیٹ بھر لینا اچھا ہے، کیونکہ اگر ان مال و دولت کے لوبھی بزرگوں کو میں نے مار لیا تو مجھے ان کے خون سے رنگے ہوئے سامان عیش و عشرت کو اس دنیا میں استعمال کرنا پڑے گا...... جن کو مار کر پھر ہمیں زندہ رہنے کی خواہش نہیں ہو سکتی وہی کورو ہمارے سامنے صف آرا ہیں۔ (۲: ۵-۶)

ارجن کی اس تقریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خانہ جنگی تھی جس میں ایک خاندان کے دو

فریقِ حکومت و پادشاہی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ ارجن کے دل نے اس برادر کشی اور حرصِ جاہ کے خلاف اسے ملامت کی اور ضمیر کی اس سرزنش سے متاثر ہو کر وہ شریف سپاہی جنگ سے متنفر ہونے لگا۔ مگر کرشن جی نے اس کے ان خیالات کی تردید کی اور اس کے سامنے ایک جدید فلسفہ پیش کیا جسے گیتا کے راوی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:۔

"ارجن کا شوک نہیں کرنا چاہئے تو انہیں کا شوک کر رہا ہے اور پھر گیان کی باتیں بھی بگھارتا ہے۔ حالانکہ چاہے کسی کی جان جائے یا رہے گیانی اس کا کچھ افسوس نہیں کرتے .... جس طرح جسم میں رہنے والے کو اسی جسم میں بچپن، جوانی، بڑھاپا حاصل ہوتا ہے، اسی طرح آئندہ دوسرا جسم بھی ملا کرتا ہے، اس لئے گیانی لوگ اس بارے میں کچھ مودہ نہیں کرتے" (۲: ۱۱-۱۳)

"جسم کی مالک آتما غیر فانی اور ناقابل ادراک ہے، اور اس کو حاصل ہونے والے اجسام فانی ہیں، اس لئے اے ارجن! تو جنگ کر۔ جو شخص سمجھتا ہے کہ آتما مارتی ہے یا آتما ماری جاتی ہے، اس کو سچا گیان حاصل نہیں ہے، کیونکہ یہ آتما نہ تو مارتی ہے اور نہ ماری جاتی ہے۔ یہ آتما نہ کبھی پیدا ہوتی ہے اور نہ مرتی ہے۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ ایک مرتبہ ہونے کے بعد کبھی پھر نہ ہوتی ہو۔ یہ کبھی بوڑھی نہ ہونے والی، دائم، مسلسل اور قدیم ہے۔ اس لئے جسم کے مارے جانے سے یہ نہیں ماری جاتی رہے پارتھ! جس نے یہ جان لیا کہ یہ آتما غیر فانی، دائم، کبھی نہ بوڑھی ہونے والی، اور کبھی نہ مٹنے والی ہے وہ ایک انسان کو کیسے مار ڈالے گا یا مروا دیگا؟ جس طرح کوئی شخص پرانے کپڑوں کو اتار کر نئے کپڑے پہن لیتا ہے، اسی طرح جسم کی مالک آتما بھی پرانے جسم کو چھوڑ کر نیا جسم اختیار کر لیتی ہے۔ اس آتما کو ہتھیار نہیں کاٹ سکتے، آگ نہیں جلا سکتی، نہ اسے پانی تر کر سکتا ہے، اور نہ ہوا خشک کر سکتی ہے .... اس لئے اس آتما کو اس طرح کا سمجھ کر اس کے لئے افسوس کرنا تجھے مناسب نہیں ہے" (۲: ۱۸-۲۵)

"اگر تو یہ خیال کرتا ہے کہ آتما دائمی نہیں ہے، جسم کے ساتھ ہی پیدا ہوتی اور اس کے ساتھ ہی مر جاتی ہے، تب بھی، اے مہا باہو! اس کے لئے افسوس کرنا تجھے مناسب نہیں، کیونکہ

جو پیدا ہوا ہے اس کی موت یقینی ہے، اور جو مرتا ہے اس کا پیدا ہونا لابد ہے، اس لئے اس اٹل بات پر افسوس کرنا تیرے شایان شان نہیں ہے" (۲: ۲۶-۲۷)

"سب کے جسموں میں رہنے والی جسم کی مالک آتما کو کبھی کوئی نہیں مار سکتا، اس لئے اے بھارت! کسی جاندار کے لئے افسوس کرنا تجھے مناسب نہیں" (۲: ۳۰)

آگے چل کر کرشن جی نے ایک اور فلسفہ بیان کیا جس کی تقریر خود ان کے الفاظ میں نقل کی جاتی ہے:-

"اگر تو سب پاپیوں سے بھی زیادہ پاپ کرنے والا ہو تب بھی اس گیان کی کشتی سے ہی تو پاپوں کو پار کر جائے گا جس طرح روشن کی ہوئی آگ تمام ایندھن کو جلا کر خاک کر دیتی ہے، اسی طرح اے ارجن! یہ گیان روپ کی آگ بھی سب کاموں کی نیکی و بدی کی قیود کو جلا ڈالتی ہے" (۴: ۳۶-۳۷)

"اے دھننجے! اس آتم گیانی شخص کو کرم اپنی قیود میں نہیں پھنسا سکتے جس نے کرم یوگ کے سہارے سے کرموں کی قیود کو ترک کر دیا ہے، اور جس کے سب شکوک و شبہات گیان سے دور ہو گئے ہیں اس لئے تیرے دل میں اگیان (عدم عرفان) سے جو شبہ پیدا ہو گیا ہے اسے تو گیان روپ کی تلوار سے کاٹ دے اور کرم یوگ کا سہارا لیکر جنگ کے لئے کھڑا ہو جا" (۴: ۴۱-۴۲)

"جو کرم یوگ میں لگ گیا، جس کا دل پاک ہو گیا، جس نے اپنے من اور اپنے حواس پر قابو پا لیا، اور سب جانداروں کی آتما ہی جس کی آتما ہو گئی، وہ سب کام کرنے کے باوجود کرموں کے عذاب و ثواب سے غیر متاثر رہتا ہے" (۵: ۷)

"جو برہم کے ارپن کر کے اور کرم کے تعلق سے بالاتر ہو کر کام کرتا ہے، اس کو اسی طرح پاپ نہیں لگتا جس طرح کمل کے پتے کو پانی نہیں لگتا" (۵: ۱۰)

گیتا کے فلسفہ پر نظر | کرشن جی کی اس تعلیم کا ماحصل صاف الفاظ میں یہ ہے:-

(۱) چونکہ عقیدۂ تناسخ کی رو سے انسان ایک دفعہ مر کر پھر دوسرے جنم میں آجاتا ہے، اس لئے اسے قتل کر دینا کوئی بری بات نہیں ہے۔ مرنے کے بعد وہ پھر جنم لے گا اور اس کی غیر فانی روح پر قتل کا

کوئی اثر نہ ہوگا۔

(۲) روح کے لئے جسم کی حیثیت وہی ہے جو جسم کے لئے کپڑوں کی ہے۔ لہٰذا کسی کے جسم و روح کا تعلق قطع کر دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی کے پرانے کپڑے پھاڑ دیئے۔ اس انقطاع کو موت سے تعبیر کرنا اور اس پر رنج کرنا جہالت ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرتا ہے تو اسے مار نہیں ڈالتا بلکہ صرف روح پر سے جسم کا لبادہ اتار دیتا ہے، اور یہ کوئی افسوس کی بات نہیں ہے

افسوس کی بات تو اس وقت ہوتی جب قتل سے روح پر بھی موت واقع ہوتی۔

(۳) جو چیز حادث ہے، اس کا فنا ہو جانا یقینی ہے۔ پھر جب انسان کو ایک دن مرنا ہی ہے تو اسے مار ڈالنے میں کیا برائی ہے؟ جو اٹل بات ہے وہ ہو کر رہے گی، خواہ ہمارے ہاتھ سے ہو یا قدرت کے ہاتھ سے۔ کل قدرت تو اسے مارنے والی ہے ہی، پھر آج اگر ہم نے اسے مار ڈالا تو آخر مضائقہ کیا ہے؟

(۴) جس شخص کو گیان حاصل ہو اس کے لئے نیکی اور بدی کی کوئی قید باقی نہیں رہتی۔ اس کے لئے تمام اعمال مباح ہو جاتے ہیں۔ اعمال میں نیک و بد کا امتیاز صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو گیانی نہیں ہیں۔ بس گیان حاصل کر لو، پھر کوئی بدتر سے بدتر فعل بھی تمہارے لئے گناہ نہیں ہے۔

اس تعلیم کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ انسان کے دل میں انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت ہی باقی نہ رہے۔ جس کا جی چاہے اپنے دوسرے بھائی کے جسم کو پرانا کپڑا سمجھ کر پھاڑ دے اور جب باز پرس ہو تو جسم کی فنا پذیری اور روح کی دائمی زندگی کا مسئلہ پیش کر کے قتل کی ذمہ داری سے بری ہو جائے۔ پھر جو شخص گیانی ہونے کا مدعی ہو اس کے لئے تو قتل کیا معنی، کوئی جرم جرم اور کوئی گناہ گناہ ہی نہیں رہتا۔ وہ آزادی کے ساتھ ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کر کے بھی بے جرم و بے قصور رہ جاتا ہے۔

ایک طرف گیتا نے اس قدر آزادی کے ساتھ جنگ کی تلقین کی ہے دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے پورے ۱۸ ابواب میں ایک جگہ بھی اس نے یہ نہیں بتایا کہ جس خوں ریزی پر وہ اس طرح انسان کو اکسا رہی ہے اس کا مقصد کیا ہے؟ کن اغراض کے لئے وہ بنی نوع انسان کا خون بہانا یا ارواح و اجساد کے تعلق کو قطع کرنا جائز سمجھتی ہے۔ جنگ کے مسئلہ میں مقصد جنگ کا سوال درحقیقت

ایک بنیادی سوال ہے۔ کیونکہ اس خطرناک کام کو اگر کوئی چیز مقدس بنا سکتی ہے تو وہ صرف مقصد کی پاکی و طہارت ہی ہے۔ ورنہ ناجائز مقاصد کے لئے تو خواہ کتنی ہی شرافت کے ساتھ جنگ کی جائے بہر حال وہ ناجائز ہوگی اور قانونِ اخلاق کی نظر میں درندگی و بہیمیت کے سوا کچھ نہ ہوگی لیکن گیتا نے اس بنیادی سوال کو صاف نظر انداز کر دیا ہے اور اس باب میں انسان کی رہنمائی کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرشن جی کے زمانہ میں عالمِ انسانی کا اخلاقی شعور ترقی کے اُس درجہ تک نہیں پہنچا تھا جہاں افعال کے جواز و عدمِ جواز کا فیصلہ صرف ضرورت و عدمِ ضرورت پر نہیں ہوتا بلکہ مقصد کے صلاح و فساد پر منحصر ہوتا ہے۔

تاہم بعض اشلوکوں کے اندازِ بیان سے اتنا ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ مقصدِ جنگ کے بارے میں گیتا کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ ایک جگہ کرشن جی فرماتے ہیں:

"ہے ارجن! یہ جنگ ایک سورگ کا دروازہ ہے جو تیرے لئے خود بخود کھل گیا ہے۔ ایسا موقع خوش قسمت کشتریوں ہی کو ملا کرتا ہے۔ لہٰذا اگر تو اپنے دھرم کی پیروی میں یہ جنگ نہ کرے گا تو اپنے دھرم اور شہرت کو برباد کر کے پاپ جمع کرے گا بلکہ سب لوگ تیری کبھی نہ ختم ہونیوالی مذمت کے گیت گاتے رہیں گے۔ یہ مذمت و بدنامی انسان کے لئے موت سے بدتر ہے"

(۲: ۳۲-۳۴)

"رسب مہارتھی یہ سمجھیں گے کہ تو خوفزدہ ہو کر میدانِ جنگ سے بھاگ گیا ہے۔ جن کی نظروں میں آج تو نہایت تعظیم کے قابل بنا ہوا ہے، وہ تجھے ناقابل سمجھنے لگیں گے۔ اسی طرح تیرے زور و طاقت کی مذمت کر کے تیرے بدخواہ اور دشمن ایسی ایسی بہت سی باتیں کہیں گے جو نہ کہی جانی چاہئیں پھر اس سے بڑھ کر دکھ کی بات اور کیا ہوگی؟ اگر تو مر گیا تو سورگ کو جائے گا اور اگر فتحیاب ہوا تو دنیا کے راج کو بھوگے گا۔ اس لئے جنگ کرنے کا مستقل ارادہ کر کے اٹھ" (۲: ۳۵-۳۷)

"علاوہ بریں اگر تو اپنے دھرم کی طرف بھی دیکھے تو اس وقت ہمت ہارنا تجھے مناسب نہیں ہے؛ کیونکہ دھرم کی رو سے حق بجانب جنگ سے بڑھ کر اور کوئی بات کشتری کے لئے بھلائی کی

نہیں ہو سکتی[1]" (۲: ۳۱)

"میں لوگوں کا خاتمہ کرنے والا اور بڑھا ہوا کال ہوں، یہاں لوگوں کا ناش کرنے آیا ہوں، تو اگر نہ ہو تب بھی فوجوں کی صفوں میں یہ جتنے جنگ آزما کھڑے ہیں، سب تباہ ہونے والے ہیں، اس لئے تو اٹھ، نیکنامی حاصل کر اور دشمنوں کو مغلوب کر کے وسیع سلطنت کا لطف اٹھا، میں نے انہیں پہلے ہی مار دیا ہے۔" (۱۱: ۳۲-۳۳)

یہ خیالات ان عام خیالات سے کچھ بھی مختلف نہیں ہیں جو جنگ کے موقع پر ہمیشہ سپاہیوں کو لڑنے کی ترغیب دینے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ نہ یہ مقاصد جنگ ان مقاصد سے کچھ بلند ہیں جن کے لئے اہل دنیا اپنے ابنائے نوع کا خون بہایا کرتے ہیں۔ وہی مال و زر کی خواہش، وہی شہرت و ناموری کا شوق، وہی حکومت و سلطنت کی طلب، وہی شکست کی ذلت و بدنامی کا خوف، یہاں بھی جنگ کی تحریک کر رہا ہے جو عام دنیا پرست لوگوں میں جنگ کا جوش اور قتل و غارتگری کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ اس میں کوئی بلند پایہ تعلیم نہیں ہے، کوئی اعلیٰ اخلاقی ہدایت نہیں ہے، کوئی بہتر نصب العین نہیں ہے، حیوانی خواہشات و جذبات سے بلند تر کسی جذبہ و خواہش کی طرف انسان کی رہنمائی نہیں کی گئی ہے۔

---

[1] صرف یہی ایک فقرہ گیتا میں ہم کو ایسا ملا ہے جو جنگ کے ایک بلند اخلاقی مقصد کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر افسوس ہے کہ اس کی کوئی تشریح گیتا میں نہیں کی گئی کہ "حق بجانب جنگ" سے اس کی مراد کیا ہے۔ اگر حق بجانب جنگ کا مطلب صرف یہی ہے کہ ایک خاندان کی دو شاخیں اگر تخت کی مدعی ہوں اور بادشاہی نظام کے دستور و آئین کی رو سے ایک شاخ کو راج کا حق پہنچتا ہو تو اس کا برادر کشی کے لئے اٹھنا اور لڑ کر تخت حاصل کرنا "حق بجانب جنگ" ہے، تو اس فقرے کی ساری اخلاقیت ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی حق بجانب لڑائیاں تو شاہی خاندانوں میں ہمیشہ ہوتی ہی رہی ہیں اور کسی معقول آدمی نے کبھی یہ گمان نہیں کیا ہے کہ تخت و تاج کے لئے اپنے ہی بھائی بندوں سے لڑنا اور ہزارہا دوسرے انسانوں کی زندگیاں اپنی شاہانہ خود غرضیوں پر قربان کرانا کوئی پاکیزہ اخلاقی فعل ہے۔

منو کے احکام جنگ[1] منو کی دھرم شاستر ہندوؤں کے مذہبی قوانین کا بہترین مجموعہ ہے، اور تقریباً ہزار برس سے اس کے احکام ہندو قوموں اور سلطنتوں میں معمول بہ ہیں۔ اس کے مصنف کی شخصیت بڑی حد تک تاریکی میں ہے۔ اس کی تصنیف کا زمانہ بھی متعین نہیں[2] ہے۔ مگر یہ حقیقت مسلّم ہے کہ وہ آریہ قوم کے اس عہد کی تصنیف ہے جب اس کا نظام تمدن زیادہ ترقی کر چکا تھا اور سلطنتوں کے معاملات کی تنظیم کے لئے باقاعدہ مرتب کئے ہوئے دساتیر عمل کی ضرورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس مقصد کے لئے منو کے علاوہ اور بھی بہت سی شاستریں اور سمرتیاں لکھی گئی ہیں، مگر ان سب پر منو کو ترجیح حاصل ہے، کیونکہ دوسری کتابیں یا تو منو کی خوشہ چین ہیں، یا اس سے نقیض واقع ہونے کی صورت میں ہندو علماء نے ان کو رد کر دیا ہے۔ مذہبی کتابوں میں عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ "جو کچھ منو کہتا ہے وہی صحیح ہے" اور "جو سمرتی منو کے خلاف ہے وہ معتبر نہیں ہے"۔ پس ہندو مذہب کے قوانین معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

چونکہ یہ مجموعہ ایک ایسے زمانہ میں مرتب ہوا ہے جبکہ ہندوستان میں آریہ قوم کی باقاعدہ سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں اور تہذیب و تمدن کی ترقی نے اس کو اپنے معاملات کے اجراء میں ایک مخصوص ضابطہ کی پابندی کرنا سکھا دیا تھا، اس لئے ہم کو اس میں جنگ کے تمام ضروری پہلوؤں کے متعلق احکام و قوانین

---

[1] میرے پیش نظر منو کے دو انگریزی ترجمے ہیں۔ ایک سر ولیم جونز کا ترجمہ جو ۱۷۹۴ء میں ڈبلیو ایچ ایلن کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر برنل کا ترجمہ مع شرح ہے جسے پروفیسر ہاپکنس نے ایڈٹ کر کے ۱۸۹۲ء میں شائع کیا۔ ان میں سے اول الذکر ترجمہ گورنمنٹ کے حکم سے ہوا تھا اور آج تک نہایت معتبر سمجھا جاتا ہے۔

[2] سر ولیم جونز کا خیال ہے کہ اس کی تدوین ۱۲۵۰ ق م تا ۵۰۰ ق م کے درمیان ہوئی ہے۔ پروفیسر مونیر ۵۰۰ ق م کا اندازہ لگاتا ہے۔ جرمن مستشرق پروفیسر ہاپکنس کی رائے میں ۳۵۰ ق م اس کی صحیح تاریخ ہے۔ شلیگل کی رائے ہے کہ ۱۰۰۰ ق م کے قریب اس کی تصنیف [illegible] ہے۔ پروفیسر [illegible]ک کہتا ہے کہ وہ ۱۰۰ عیسوی سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔ مگر ڈاکٹر برنل کی تحقیق یہ ہے کہ وہ [illegible] ۵۰۰ء تک کسی زمانہ میں مدون ہوئی ہے اور غالباً چالوکیہ خاندان کے کسی راجہ نے اس کو اپنی سلطنت کا دستور العمل بنانے کے لئے لکھوایا تھا۔

ملتے ہیں۔

جنگ کا مقصد | سب سے پہلا سوال مقصدِ جنگ کا ہے۔ منو نے اس پر کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کی ہے تاہم حسبِ ذیل تصریحات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کن مقاصد کے لئے جنگ کو جائز رکھتا ہے:

"روئے زمین کے جو حکمراں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے (یا قتل کرنے) کی خواہش سے اپنی تمام قوت کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور کبھی منہ نہیں موڑتے۔ وہ مرنے کے بعد سیدھے بہشت کی طرف جاتے ہیں" (۷: ۸۹)

"جس راجہ کی فوجیں ہر وقت جنگ کے لئے تیار رہتی ہیں، اس سے تمام دنیا خوف زدہ و مرعوب رہتی ہے۔ پس ایسے راجہ کو اپنی مستعد فوج کے ساتھ تمام مخلوقات کو اپنا تابع فرمان بنانے کی کوشش کرنی چاہئے" (۷: ۱۰۳)

"اس طرح فتح کی تیاری کرنے کے بعد اپنے تمام مخالفین کو یا تو صلح و رضا کے ساتھ اپنا تابع فرمان بنانا چاہئے یا (اگر وہ بخوشی اطاعت قبول نہ کریں تو) دوسرے ذرائع اختیار کرنے چاہئیں یعنی رشوت، توڑ جوڑ، اور جنگی طاقت" (۷: ۱۰۷)

"کامیابی کے ان چاروں ذرائع میں سے عقلمند لوگ سلطنت کی توسیع کے لئے صلح و رضا اور جنگی طاقت کو زیادہ پسند کرتے ہیں" (۷: ۱۰۹)

"اس طرح جب راجہ دھرم کے مقرر کئے ہوئے تمام فرائض ادا کرلے تو اس کو اُن علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو ابھی تک اس کے قبضہ میں نہ آئے ہوں اور اپنے مقبوضہ ممالک کی خوب حفاظت کرنی چاہئے" (۹: ۲۵۱)

"دھرم کے مطابق عمل کرنے والے راجہ کا خاص فرض یہ ہے کہ وہ ممالک فتح کرے اور جنگ سے کبھی نہ ٹلے" (۱۰: ۱۱۹)

ان اشلوکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصد کے سوال میں منو کی پرواز فکر بھی کرشن جی سے کچھ زیادہ اونچی نہیں ہے۔ سلطنت کی توسیع، ممالک کی فتح و تسخیر، اور ہمسایہ قوموں اور حریف طاقتوں کو نیچا دکھانے

کی جہانگیرانہ خواہش سے بلند تر کسی اخلاقی نصب العین تک اس کی بھی رسائی نہیں ہوئی۔ عام دنیاداروں کی طرح وہ بھی حکومت و بادشاہی کو طاقتوروں کا منتہائے مقصود سمجھتا ہے اور انہیں ترغیب دیتا ہے کہ وہ اپنی قوت کو ہر وقت اسی ملک گیری کے کام میں صرف کرتے رہیں۔ فرماں روائی کے استحقاق اور قوت کے مصرف کا یہ تصور ہرگز کسی اخلاقی بلند نظری و پاکیزہ خیالی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اخلاق کی نظر میں بادشاہوں کی حرص جہانگیری سے انسان کا خون، قوموں کی آزادی، اور ملکوں کا امن و سکون زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ کسی کی حرص و ہوس کا پورا کرنا کبھی اخلاق کا مقتضیٰ نہیں ہو سکتا۔ اخلاق تو بنی نوع انسان کی مجموعی صلاح و فلاح کا خواہشمند ہے اور جنگ جیسے مہلک عمل کی اجازت صرف اسی صورت میں دے سکتا ہے جبکہ انسان کی آزادی، روحانی اور اخلاقی زندگی کو حریص طاقتوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچانے کے لئے اس کے سوا کوئی دوسری صورت باقی نہ رہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریہ تک منو یا کسی ہندو فلسفی اور مقنن کی رسائی بھی نہیں ہوئی۔ اور جنہوں نے کچھ اونچے اٹھنے کی کوشش کی وہ حد اعتدال سے گذر کر اہنسا کی سرحد پر پہنچ گئے جو انسان کی مجموعی صلاح و فلاح کے لئے خونریزی کی کھلی اجازت سے کچھ کم نقصان رساں نہیں ہے۔ بلکہ عملاً دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے، یعنی قوموں اور ملکوں کی تباہی اور شریر و مفسد لوگوں کا غلبہ و تسلط۔

جنگ کے اخلاقی حدود منو نے جنگ کے عملی پہلو میں بہت کچھ ترقی کی ہے اور اعمالِ جنگ کو ایک ضابطہ کے تحت لانے کے لئے ایسی حدود مقرر کی ہیں جو کسی حد تک اسلام کی مقرر کردہ حدود سے ملتی جلتی ہیں۔ ذیل میں ہم اس کے احکام بلفظہٖ نقل کرتے ہیں:

"کوئی شخص جو جنگ میں شامل ہو اپنے دشمن کو چھپے ہوئے ہتھیاروں سے، یا زہر میں بجھے ہوئے یا کانٹے دار تیر سے، یا آگ میں گرم کئے ہوئے برچھے سے قتل نہ کرے۔" (۷ : ۹۰)

"نہ (گاڑی یا گھوڑے پر سوار ہونے والا) پیدل کو قتل کرے، نہ زنانے کو، نہ اس کو جو ہاتھ جوڑ کر جان کی امان مانگے، نہ اس کو جس کے بال کھل گئے ہوں، نہ اس کو جو بیٹھا ہوا ہو، اور نہ اس کو جو کہے کہ میں تیرا قیدی ہوں، نہ اس کو جو سوتا ہو، نہ اس کو جس کے پاس زرہ نہ ہو، نہ اس کو جو ننگا

ہو، نہ اس کو جو نہتا ہو، نہ اس کو جو محض تماشائی ہو شریک جنگ نہ ہو۔ نہ اس کو جو کسی دوسرے سے گتھا ہوا ہو" (۷: ۹۱-۹۲)

"شریف آدمی کے فرض کو یاد رکھتے ہوئے وہ ایسے شخص کو قتل نہ کرے جس کا ہتھیار ٹوٹ گیا ہو یا جو غمزدہ ہو، یا سخت مجروح ہو، یا دہشت زدہ ہو، یا جو پیٹھ پھیر دے" (۷: ۹۳)

"گاڑی، گھوڑا، ہاتھی، چھتری، لباس (سوائے ان جواہر کے جو اس میں ٹکے ہوئے ہوں)، غلّہ، مواشی، عورتیں، اور ہر قسم کی رقیق اور جامد چیزیں (سوائے چاندی سونے کے) اس شخص کی جائز ملک ہیں جو لڑائی میں ان کو جیتے" (۷: ۹۶)

"ان چیزوں میں جو قیمتی اشیا ہوں، ان کے ایک حصہ کو لوٹنے والا راجہ کے سامنے پیش کرے ..... اور جو چیزیں فرداً فرداً نہ لوٹی گئی ہوں انہیں راجہ کو تمام فوج میں تقسیم کر دینا چاہیئے" (۷: ۹۷)

"جب وہ دشمن کا محاصرہ کرے تو خیمہ زن ہونے کے بعد وہ دشمن کے ملک کو تاراج کر دے۔ مخالف راجہ کے سامان رسد (چارہ اور غلہ وغیرہ) پانی اور ایندھن کو غارت کرتے رہنا چاہیئے"۔ (۷: ۱۹۵)

"اسے تالاب، کنوئیں، اور خندقیں سب کو برباد کر دینا چاہیئے۔ وہ دن اور رات دشمن کو خوفزدہ اور پریشان کرتا رہے" (۷: ۱۹۶)

"ملک کو فتح کرنے کے بعد وہ دیوتاؤں کی عبادت کرے اور نیکوکار برہمنوں کی بھی۔ وہ لوگوں میں داد و دہش کرے اور ظلم و زیادتی سے بے خوفی کی عام منادی کر دے" (۷: ۲۰۱)

"حکمران لوگوں کے طرز عمل اور ارادوں کا حال اچھی طرح معلوم کرنے کے بعد وہ اس ملک میں

ل؎ منو کے شارح کلوکا نے دیوتاؤں سے مراد مفتوح ملک کے دیوتا لئے ہیں، لیکن ساتھ ہی لفظ "برہمن" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ حکم غیر آریہ قوموں کے لئے نہیں ہے۔ نیز یہ بھی امید نہیں کی جاسکتی کہ منو نے آریوں کو غیر آریہ قوموں کے دیوتاؤں اور برہمنوں کی پرستش کا حکم دیا ہوگا۔

دشمن کے شاہی خاندان میں سے کسی فرد کو حکمراں بنا دے اور اس کو باقاعدہ ہدایات دے۔ (۷: ۲۰۲)

"اور وہ ان کے قوانین کو جس طرح وہ ان کے ہاں بیان کئے گئے ہوں مستند قرار دے، اور دشمن کے راجہ اور دوسرے امراء کو زر و جواہر کے عطایا سے ممنونِ احسان بنائے" (۷: ۲۰۳)

ان احکام میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہیں معرکۂ کارزار میں ملحوظ رکھنا قطعاً ناممکن ہے، مثلاً یہ کہ سوار پیدل کو قتل نہ کرے، دشمن کے بال کھل جائیں تو اس پر حملہ نہ کیا جائے، دشمن کے پاس زرہ نہ ہو تو اسے چھوڑ دیا جائے، ننگے یا نہتے یا غمزدہ یا دہشت زدہ کو قتل نہ کیا جائے، دشمن کسی دوسرے شخص سے لڑنے میں مشغول ہو تو اس پر وار نہ کیا جائے۔ اس قسم کے احکام میں اصلاح

۱؎ یہ حکم بھی صرف آریہ قوموں کی (اور صحیح تر یہ ہے کہ "ہندو آریہ" قوموں کی) باہمی جنگ سے متعلق ہے، کیونکہ اشلوک نمبر ۲۰۲ کوئی مستقل اشلوک نہیں ہے، بلکہ نمبر ۱۹۶ سے نمبر ۲۰۳ تک ایک مسلسل جملہ کا جزو ہے۔ اس خیال کی تائید دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ پروفیسر ہاپکنس لکھتا ہے:۔

"یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ منو اور وشنو دونوں کہتے ہیں کہ جب ایک راجہ کسی بیرونی دشمن کو مغلوب کرے تو وہ خود اس ملک کے (نہ کہ اپنے ملک کے) ایک شاہزادے کو وہاں کا راجہ بنا دے۔ اسے اپنے دشمن کے شاہی خاندان کو برباد نہ کرنا چاہیے، مگر یہ اس صورت میں جائز ہے جبکہ وہ شاہی خاندان نیچ ذات کا ہو"

(Cambridge History of India, Vol. 1 P. 290)

تاریخ ہند قدیم کا ایک اور ماہر پروفیسر ہیول Havel، جو ہندو تہذیب کا بڑا دلدادہ ہے، اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"مختلف آریہ قبائل کے درمیان لڑائیاں، اور آریوں سے غیر آریہ وحشی (داس اور دسیو) کی جنگیں اکثر ہوتی رہتی تھیں، مگر چونکہ متقدم الذکر صورت میں (یعنی آریوں کی باہمی لڑائیوں میں) یہ ایک مقررہ قاعدہ تھا کہ جنگ محض توسیع مملکت کی غرض سے نہ ہونی چاہیے اور یہ کہ ایک مغلوب آریہ راجہ کو معزول نہ کیا جائے، بلکہ غالب اسے اپنا باجگذار بنا لے، اس لئے قبائلی نزاعات نے آریوں کے اجتماعی نظام کو درہم برہم نہ ہونے دیا" (History of Aryan Rule in India, PP. 83-34)

کے جذبہ پر فائشی اخلاق غالب آگیا ہے اس لئے ضروریات جنگ اور اخلاقی حدود کا توازن برقرار نہیں رہا۔ ظاہر ہے کہ جب میدان جنگ میں گھمسان کی لڑائی ہوتی ہے تو سپاہی ان باتوں کا لحاظ نہیں کر سکتا۔ اور لحاظ کرے تو لڑ نہیں سکتا۔ دوسری طرف بعض احکام میں منو نے ضروریات جنگ پر اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو قربان بھی کر دیا ہے، مثلاً یہ حکم کہ دشمن کے تمام وسائل کو برباد کر کے سارے ملک کو بھوکا مار دیا جائے کسی طرح شریف تر اخلاقی حسیات کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔ تاہم مجموعی حیثیت سے منو کے یہ احکام بہت مہذب ہیں اور ایسے تربیت یافتہ اخلاقی شعور کا پتہ دیتے ہیں جو عداوت اور جنگ کی حالت میں بھی محاربین کے انسانی فرائض کا احساس رکھتا ہے۔ اور اس بلند اخلاقی تخیل تک پہنچ چکا ہے کہ انسان پر انسانی حیثیت سے اس کے دشمن کے بھی کچھ حقوق ہیں جنہیں بہر حال اسے ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اس معاملہ میں اصولاً منو کے احکام اسلام سے قریب تر ہیں، اگرچہ اتنے معتدل اور ترقی یافتہ نہیں ہیں۔

مفتوح قوموں کے ساتھ برتاؤ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ منو کا قانون اس عہد میں مدون ہوا تھا جب غیر آریہ اقوام کی سیاسی قوت فنا ہو چکی تھی اور ہندوستان میں ان کی ایک بھی حکومت باقی نہ رہی تھی جس سے آریوں کی جنگ ہوتی۔ اس لئے منو کی دھرم شاستر میں ایسے قوانین کی تلاش فضول ہے جو آریہ اور غیر آریہ اقوام کی جنگ کے لئے مقرر کئے گئے ہوں۔ اس زمانہ میں وہ تمام غیر آریہ قومیں جو ویدوں میں داس، دسیو، راکشس اور اسر وغیرہ ناموں سے یاد کی گئی ہیں، یا تو آبادیوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ گزین ہو چکی تھیں، یا مغلوب و مفتوح ہو کر ملک کی آبادی کا جزو بن چکی تھیں اور مجموعی طور پر ان کا نام "شودر" رکھ دیا گیا تھا۔ پس منو سے ہم کو جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہندو قانون مفتوح غیر آریہ اقوام کو سوسائٹی میں کیا درجہ دیتا ہے اور ان کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ جائز رکھتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں شودروں کے متعلق منو کے احکام پر نظر ڈالنی چاہیئے:۔

(۱) منو شودروں کو فطرۃً ذلیل قرار دیتا ہے۔ وہ اعمال کی بنا پر نہیں بلکہ پیدائش کی بنا پر ان کو سب سے ادنیٰ مخلوق سمجھتا ہے،

"برہما نے اپنے منہ سے برہمن کو، ہاتھ سے کشتری کو، ران سے ویش کو اور پاؤں سے شودر کو

پیدا کیا۔" (۱ : ۳۱)

"برہمن کے نام کا پہلا حصہ تقدس کو ظاہر کرنے والا ہو، کشتری کا طاقت کو، ویش کا دولت کو، اور شودر کا ذلت کو۔" (۲ : ۳۱)

"برہمن کے نام کا دوسرا حصہ خوشحالی کو ظاہر کرے، کشتری کا تحفظ کو، ویش کا دولت کو، اور شودر کا غلامی و خدمت گاری کو۔" (۲ : ۳۲)

"دویج ذاتیں صرف تین ہیں، برہمن، کشتری اور ویش۔ چوتھی شودر کی ذات، کا صرف ایک جنم ہے۔" (۱۰ : ۴)

"ہاتھی گھوڑے، شودر، قابل نفرت ملیچھ لوگ، شیر، تیندوے، اور سور تناسخ کے وہ ادنے مدارج ہیں جو تاریکی سے حاصل ہوتے ہیں۔" (۱۲ : ۴۳)

(۲) منو شودروں کو بالذات نجس و ناپاک اور کمینہ سمجھتا ہے اور معاشرت میں دویج یعنی شریف آریہ قوموں کو ان سے کامل پرہیز کا حکم دیتا ہے،

"شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بٹھانے سے برہمن نرک میں جاتا ہے۔" (۳ : ۱۷)

"وہ کسی برادری سے خارج کئے ہوئے شخص، یا چنڈال[۲] ..... کے ساتھ ایک درخت کے سایہ میں بھی نہ ٹھہرے۔" (۴ : ۷۹)

"جو کوئی شودر کو دھرم کی تعلیم دیگا اور جو اسے مذہبی مراسم ادا کرنا سکھائے گا، وہ اس شودر کے ساتھ ہی اسم ورت نامی جہنم میں جائیگا۔" (۴ : ۸۱)

"وہ شودر کے سامنے وید نہ پڑھے۔"[۳] (۴ : ۹۹)

[۱] یہی مضمون رگ وید (۱۰ : ۹ : ۱۲) اور بھاگوت پران (۲ : ۵، ۳۷) میں بھی آیا ہے۔

[۲] جو شخص برہمن عورت کے بطن اور شودر مرد کے نطفہ سے پیدا ہو وہ "چنڈال" ہے۔ (منو ۱۰ : ۱۲)

[۳] "اگر کوئی شودر بالارادہ وید کے الفاظ سن لے تو اس کے کان میں پگھلی ہوئی رانگ یا لاکھ ڈال دی جائے، اگر وید کی عبارت پڑھے تو اس کی زبان کاٹ لی جائے، اور اگر وہ اس کو یاد کرے تو اس کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں۔" (گوتم ۱۲ : ۴ : ۶)

"وہ شودر کا کھانا نہ کھائے" (۴ : ۲۱۱)

"شودر کا کھانا رُوحانی نور کو زائل کرتا ہے" (۴ : ۲۱۸)

"اگر برہمن بھُول سے شودر کا کھانا کھائے تو تین دن تک روزہ رکھے اور اگر عمداً کھائے تو اس کو وہی کفارہ ادا کرنا چاہئے جو حیض، پیخانہ یا پیشاب پینے اور کھانے والے کے لئے مقرر ہے" (۴ : ۲۲۲)

"جس شخص نے چنڈال کو چھونیا ہو وہ صرف نہانے ہی سے پاک ہو سکتا ہے" (۵ : ۸۵)

"شودر کا جنازہ شہر کے جنوبی حصہ سے جائے، اور دویجوں کے جنازے مغربی شمالی اور مشرقی سمتوں سے" (۵ : ۹۲)

"اگر کسی برہمن کی اپنی ذات کا آدمی موجود نہ ہو تو اس کی میت کو شودر کے ہاتھ سے نہ اٹھوانا چاہئے، کیونکہ جو مراسم تجہیز ایک شودر کا ہاتھ لگنے سے آلودہ ہو جائیں وہ بہشت کی طرف نہیں جا سکتے" (۵ : ۱۰۴)

"شودر مرد سے ویش یا کشتری یا برہمن عورت کے ہاں جو اولاد پیدا ہو وہ مخلوط نسل کی ہوگی، ان کے نام علی الترتیب ایوگو، کشتر، اور چنڈال ہیں، اور یہ سب سے ادنیٰ مخلوق ہیں" (۱۰ : ۱۲)

"چنڈال اور سوپاس لوگوں کی سکونت بستی کے باہر ہونی چاہئے۔ انہیں ثابت برتن استعمال نہ کرنے چاہئیں۔ ان کی جائداد صرف کتے اور گدھے ہوں۔ ان کو مُردوں کے کپڑے پہنائے جائیں۔ ان کے کھانے کے برتن ٹوٹے ہوئے ہوں۔ ان کے زیور لوہے کے ہوں۔ وہ ہمیشہ خانہ بدوش پھرتے رہیں۔ جو شخص اپنے دینی و دنیوی فرائض کا پابند ہو وہ ان سے کوئی رابطہ ضبط نہ رکھے۔ ان کے تمام تعلقات آپس ہی میں ہوں اور برابر والوں ہی میں وہ شادی بیاہ کریں"

لے "جو کھانا شودر کا تیار کیا ہوا ہو خواہ اس کا ہاتھ اسے لگا ہو یا نہ لگا ہو، بہرحال اس کا کھانا جائز نہیں ہے" (اپستمبھ ۱ : ۵ : ۱۶ : ۲۲)

"اگر کوئی برہمن ایسی صورت میں مرے کہ اس کے پیٹ میں شودر کا کھانا موجود ہو تو آئندہ جنم میں وہ گاؤں کا سور پیدا ہوگا" (وششٹھ ۶ : ۲۷)۔ "اگر کسی برہمن کو کھانا کھلاتے ہوئے کوئی شودر ہاتھ لگا دے تو وہ کھانا چھوڑ دے" (اپستمبھ ۱ : ۵ : ۱۷)

ان کو کھانا ٹھیکروں ہیں دیا جائے، مگر دینے والا اپنے ہاتھ سے ان کے ہاتھ میں نہ دے۔
راتوں کو وہ بستیوں میں نہ پھریں۔ دن کو کام کاج کے لئے آئیں تو راجہ کے مقرر کئے ہوئے
مخصوص نشانات ان کے بدن پر لگے ہوئے ہوں۔ وہ لاوارث مردوں کو لے جانے کا کام کریں
جن لوگوں کو قانوناً سزائے موت دی گئی ہو انہیں چنڈال قتل کریں اور وہی مقتول کے کپڑے
بچھونا اور زیور لے لیں" (۱۰: ۵۱-۵۶)

"برہمن شودر سے کبھی دان نہ لے۔ اگر وہ اس سے دان لے کر قربانی کریگا تو آئندہ جون میں
چنڈال پیدا ہوگا" (۱۱: ۲۴)

"اگر کوئی برہمن شودر کا جھوٹا پانی پی لے تو اسے تین دن رات تک کوش گھانس کے ابلے ہوئے
پانی کے سوا کچھ نہ پینا چاہئے" (۱۱: ۱۴۹)

"اگر کوئی برہمن شودر کا جھوٹا کھانا کھالے تو وہ سات دن تک آش جو کے سوا کچھ نہ کھائے پیئے"
(۱۱: ۱۵۳)

(۳) منو شودروں کو دویجوں کی غلامی پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک شودر کا پیدائشی اور فطری وظیفہ
ہی یہ ہے کہ وہ دویجوں کی خدمت کرے،

"تعالیٰ نے شودر کے لئے صرف ایک فرض رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ بے چون و چرا ان تینوں
(برہمن، کشتری، اور ویش) کی خدمت کرتا رہے" (۱: ۹۱)

"برہمن کی خدمت میں لگا رہنا شودر کا سب سے بہتر کام ہے۔ اس کے سوا جو کام وہ کرے گا
وہ اسے کچھ فائدہ نہ دیگا" (۱۰: ۱۲۳)

"راجہ شودر ذات کے ہر آدمی کو دویجوں کی خدمت کا حکم دے" (۸: ۱۰)

"شودر ذات کا ہر آدمی خواہ خریدہ ہو یا ناخریدہ، اسے برہمن اپنی خدمت پر مجبور کرسکتا ہے،
کیونکہ اس کو واجب الوجود نے برہمن کی غلامی ہی کے لئے پیدا کیا ہے" (۸: ۴۱۳)

"شودر کو اگر اس کا آقا آزاد کردے تب بھی وہ آزاد نہیں ہوسکتا، کیونکہ جو حالت اس کی فطرت

میں ودیعت کی گئی ہے اس سے کون اس کو نکال سکتا ہے؟" (۸: ۴۱۴)

(۴) منو شودر کو اس کی اپنی کمائی ہوئی دولت وجائداد پر بھی حقوقِ ملکیت دینے سے انکار کرتا ہے۔

"ایک برہمن بلا تامل اپنے شودر غلام کا مال لے سکتا ہے، کیونکہ کوئی مال بھی شودر کی ذاتی ملک نہیں ہے۔ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی جائداد اس کا آقا لے سکتا ہے" (۸: ۴۱۷)

"شودر اگرچہ مال و دولت حاصل کرنے کی قوت رکھتا ہو تب بھی اسے حاصل نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ جو غلام دولت جمع کر لیتا ہے وہ برہمن کو اذیت دیتا ہے" (۱۰: ۱۲۹)

(۵) قانونِ وراثت میں بھی منو نے دویجوں اور شودروں کے درمیان امتیاز رکھا ہے۔ بعض حالات میں وہ شودر کو حقِ میراث سے بالکل محروم کرتا ہے اور بعض حالات میں دویجوں سے کمتر درجہ دیتا ہے۔

"اگر برہمن کی چار بیویاں چاروں ذاتوں کی ہوں اور چاروں سے اس کے ہاں بیٹے پیدا ہوں تو ان کے درمیان تقسیم اس طرح ہوگی کہ کاشتکار، ملازم، سانڈ، سواری کے گھوڑے، گاڑیاں، زیورات اور مکان، برہمنی کے لڑکے کو ملیں گے۔ اور ان چیزوں کو الگ کرنے کے بعد جو املاک بچیں گی ان میں بھی اس کی اعلیٰ ذات کے لحاظ سے اس کا حصہ خاص طور پر زیادہ ہوگا"

"برہمن لڑکا باقی ماندہ ترکہ میں سے تین سہام، اور کشتری عورت کا لڑکا دو سہام، ویش عورت کا لڑکا ڈیڑھ سہام اور شودر عورت کا لڑکا ایک سہم"

"یا پھر ایک عالمِ قانون داں آدمی مجموعی طور پر تمام جائداد کو دس حصوں میں تقسیم کر کے اس طرح بانٹے:۔ برہمنی کے لڑکے کو چار حصے، چھتری کے لڑکے کو ۳ حصے، ویشنی کے لڑکے کو ۲ حصے اور شودرانی کے لڑکے کو ایک حصہ"

"اس برہمن کے ہاں خواہ اپنی تین ذاتوں کی بیویوں سے بیٹے ہوں یا نہ ہوں، بہر صورت شودرانی کے لڑکے کو [1] سے زیادہ نہ ملے گا"

"شودر عورت کے پیٹ سے برہمن، کشتری، یا ویش مرد کا لڑکا باپ کے ترکہ میں سے کوئی حصہ نہ پاسکے گا۔ اس کا باپ جو کچھ اسے دیدے وہی اس کی ملک ہے"

[1] حاشیہ صفحہ ۳۰۹ پر ملاحظہ فرمائیے۔

"دویج ذات کے مردوں کی جو اولاد خود اپنی ذات کی عورت سے پیدا ہوئی ہو وہ باہم ترکہ کی مساویانہ تقسیم کرے" (۹: ۱۴۹-۱۵۶)

(۶) فوجداری قوانین میں منو نے شودروں کے ساتھ انتہائی سختی برتی ہے۔ وہ ان کی جان اور عزت کو قانون کی پناہ دیتے ہیں حد درجہ بخل سے کام لیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں دویجوں کے حقوق کی تعیین اور تحفظ میں اتنی فیاضی برتتا ہے کہ شودروں کی آئینی حیثیت بالکل صفر کے برابر رہ جاتی ہے۔

"ایک شودر اگر دویج کی شان میں گستاخی کرے تو اس کی زبان کاٹ دی جائے کیونکہ وہ برہما کے حصۂ اسفل سے پیدا ہوا ہے" (۸: ۲۷۰)

"اگر وہ ان کا نام اور ان کی ذات کا نام لے کر توہین کرے تو دس انگل لمبی لوہے کی سلاخ آگ میں سرخ کرکے اس کے حلق میں اتار دی جائے" (۸: ۲۷۱)

"اگر وہ غرور کی راہ سے برہمن کو اس کے فرائض کے متعلق ہدایت دے تو راجہ اس کے منہ اور کان میں کھولتا ہوا تیل ڈالنے کا حکم دے" (۸: ۲۷۲)

"جو ادنیٰ ترین ذات کا آدمی (شودر) اعلیٰ ذات کے آدمی (برہمن) کے برابر بے ادبی سے ایک ہی جگہ بیٹھ جائے، اس کے پیچھے حصہ پر نشان لگا کر راجہ یا تو اس کو ملک بدر کر دے، یا اس کے سرین کٹوا دے" (۸: ۲۸۱)

"اگر وہ برہمن پر غرور سے تھوک دے تو راجہ اس کے دونوں ہونٹ کٹوا دے، اگر وہ اس پر پیشاب کرے تو اس کی شرمگاہ کو قطع کرا دے، اگر وہ برہمن کی طرف گوز صادر کرے تو اس کی جائے مخصوص کو کٹوا ڈالے" (۸: ۲۸۲)

"اگر وہ برہمن کے سر کے بال یا اس کے پاؤں یا اس کی ڈاڑھی یا اس کا گلا یا اس کے خصیے پکڑے

(حاشیہ صفحہ ۳۰۸) اس اشلوک کا مضمون اوپر کے اشلوک سے صراحتہً متناقض ہے۔ اس تناقض کو منو کے شارحین (کلوکا اور میدھاتیتھی) نے بھی محسوس کیا ہے اور اس کی تاویل وہ یہ کرتے ہیں کہ شودرنی کے لڑکے کو حصہ ملنے کا انحصار اس کے اعمال پر ہے اگر وہ نیکوکار ہو اور اس کی ماں باقاعدہ باپ کے نکاح میں آئی ہو تو اسے حصہ مل سکتا ہے۔

تو راجہ بلا تامل اس کے ہاتھ کٹوا ڈالے" (۸: ۲۸۳)

"اگر ایک شودر کسی دویج عورت سے زنا کرے تو اس عورت کے غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں اس کا وہ عضو کاٹا جائیگا جس سے اس نے ارتکاب جرم کیا ہے اور اس کی تمام جائداد ضبط کی جائے گی۔ اور اگر وہ عورت شادی شدہ ہو تو وہ اپنی ہر چیز حتیٰ کہ جان سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔"

"برہمن عورت سے زنا کرنے کا جرم اگر ویش سے سرزد ہو تو اسے ایک سال قید اور کل جائداد کی ضبطی کی سزا دی جائیگی۔ اگر کشتری یہ فعل کرے، تو اس پر ایک ہزار پن جرمانہ کیا جائیگا، یا گدھے کے پیشاب سے اس کی داڑھی مونچھ مونڈی جائے گی۔ اور اگر وہ برہمن عورت غیر شادی شدہ ہو تو ویش کو ۵۰۰ اور کشتری کو ۱۰۰۰ پن جرمانہ دینا ہوگا۔ اگر ایک برہمن مرد کسی شادی شدہ عورت سے زنا بالجبر کرے تو اس پر ۱۰۰۰ پن جرمانہ کیا جائے گا اور اگر اس کی مرضی سے کرے تو صرف ۵۰۰ پن" (۸: ۳۷۴-۳۷۸)

"راجہ کسی برہمن کو ہرگز نہ قتل کرے، خواہ وہ کیسی ہی شدید معصیت کا مرتکب ہوا ہو۔ وہ برہمن مجرم کو اس کی ذات و جائداد سے ادنیٰ تعرض کئے بغیر صرف جلاوطن کر سکتا ہے۔ روئے زمین پر برہمن کے قتل سے زیادہ عظیم گناہ (اور کوئی) نہیں ہے۔ اس لئے بادشاہ اپنے دل میں اس حرکت کا خیال بھی نہ لائے۔[1]" (۸: ۳۸۰-۳۸۱)

"نیچ ذات کا آدمی اگر ارادۃً برہمن کو دکھ پہنچائے تو راجہ اس کو مختلف قسم کی عبرتناک جسمانی سزائیں دے" (۹: ۲۴۸)

"ایک کشتری کو قتل کرنے کا کفارہ اس سے چوتھائی ہے جو برہمن کو قتل کرنے والے کے لئے مقرر ہے۔ ویش کو قتل کرنے کا کفارہ اس کا آٹھواں حصہ ہے۔ اور شودر اگر نیکوکار ہو تو اس کو قتل کرنے کا کفارہ اس سے سولھواں حصہ" (۱۱: ۱۲۷)

---

[1] البتہ بودھ دھرم شاستر سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل، چوری، اور ڈاکہ کے شدید جرائم کی پاداش میں برہمن کو صرف اتنی سزا دی جاتی ہے کہ اسے اندھا کر دیا جائے (۲: ۱۷)۔ لیکن اگر شودر انہیں جرائم کا ارتکاب کرے تو اس کے لئے موت کی سزا ہے (۲: ۲۷: ۱۶)۔

"اور اگر برہمن کسی کشتری کو بلا ارادہ قتل کر دے تو وہ اپنے آپ کو گناہ سے پاک کرنے کے لئے ایک سانڈ اور ایک ہزار گائیں دان دے، یا تین سال تک نفس کشی و ریاضت کرے۔ اور اگر وہ بلا ارادہ کسی نیکوکار ویش کو قتل کرے تو ایک سال نفس کشی و ریاضت کرے، یا سو گائیں اور ایک سانڈ دان دے۔ اور اگر شودر کو بلا ارادہ قتل کر دے تو یہی ریاضت چھ مہینہ تک کرے یا دس سپید گائیں اور ایک سانڈ برہمنوں کو دان دے۔ (۱۱: ۱۲۷، ۱۳۱)

"اور اگر برہمن کسی بلی یا نیولے یا پپیہے، یا مینڈک، یا کتے، یا چھپکلی یا الو یا کوے کو مار ڈالے تو اس کا وہی کفارہ ہے جو شودر کو مارنے پر مقرر کیا گیا ہے۔" (۱۱: ۱۳۲)

یہ احکام اپنی تفسیر و تشریح آپ کر رہے ہیں۔ ہندو قانون مفتوح قوموں کو جس ذلت کی نظر سے دیکھتا ہے اور سوسائٹی میں ان کو جو ادنیٰ درجہ دیتا ہے اس کی کیفیت ان احکام سے صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر اسلام کے ماتحت غیر مسلم ذمیوں کے حقوق کو دیکھا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

نسلی امتیاز موجودہ زمانہ کے بعض ہندو اہل قلم نے عہد جدید کے افکار سے متاثر ہو کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہندو مذہب میں ذاتوں کی تقسیم پیدائش اور نسل پر نہیں بلکہ گن اور کرم پر ہے۔ اگر واقعہ یہی ہوتا تو ہم کو اس سے بڑی خوشی ہوتی۔ مگر افسوس ہے کہ ہندو قانون کی اصل کتابیں اپنے الفاظ اور اسپرٹ دونوں میں اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتیں۔ ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مذہب اعمال اور خصائل کی بنا پر فرقِ مراتب کے تخیل سے قطعاً ناآشنا ہے۔ اس میں ذاتوں کی تقسیم "گن کرم" پر نہیں بلکہ "ورن" پر مبنی ہے۔ ابتدائی زمانہ میں جن لوگوں کو داس اور دسیو کے خطاب دئے گئے تھے اور بعد میں جنہیں شودر قرار دیا گیا، ان کی یہ تذلیل اس بنا پر نہ تھی کہ وہ بد اعمال تھے، بلکہ اس بنا پر تھی کہ وہ غیر آریہ نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ اوپر قانون وراثت، قانون تعزیرات اور قوانین معاشرت کے جو احکام نقل کئے گئے ہیں، ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے یہ حقیقت روشن ہو جائیگی۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ نیکوکار شودر کو بھی وہ حقوق نہیں دیئے گئے ہیں جو بدکار اور شدید جرائم کا ارتکاب کرنے والے برہمن کو حاصل ہیں۔ برہمن کا لڑکا اگر شودر رانی کے پیٹ سے پیدا ہو تو نیکوکار ہونے کے باوجود اس کو خود اپنے اس بھائی کے برابر حقوق نہیں دیئے جاتے جو باپ کی

برہمن بیوی سے پیدا ہوا ہے۔ شودر مرد کی اولاد اگر برہمن عورت کے پیٹ سے پیدا ہو تو محض یہ پیدائش ہی اس کو چنڈال بنا دیگی اور اس کو وہ ذلیل زندگی بسر کرنی ہوگی جو منو نے چنڈالوں کے لئے مخصوص کر دی ہے۔ کیس لئے؟ کیا یہ کرم کا پھل ہے؟ کیا شودر کے ہاں پیدا ہونا بھی کوئی بدعملی اور برہمن کے ہاں پیدا ہونا کوئی نیکوکاری ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ نیکی اور بدی کا نہیں نسل اور قومیت کا امتیاز ہے۔ ہندو مذہب نے شرافت اور ذلت کو انسان کے ذاتی اعمال و خصائل سے نہیں بلکہ نطفہ اور بطن سے مخصوص رکھا ہے۔ اس باب میں خود منو نے بھی کافی تصریح سے کام لیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"جو شخص شریف مرد اور کمینہ عورت سے پیدا ہو وہ اپنے اچھے اعمال سے شریف ہو سکتا ہے[1]، مگر جو کمینہ مرد سے شریف عورت کے ہاں پیدا ہو وہ کمینہ ہی رہیگا" (۱۰: ۶۷)

"جس طرح اچھا درخت صرف اچھے بیج اور اچھی زمین ہی سے پیدا ہوتا ہے، اسی طرح جو شخص شریف مرد اور شریف عورت سے پیدا ہو وہی پورے دویج کا درجہ حاصل کر سکتا ہے" (۱۰: ۶۹)

"خود برہما نے دویجوں کے کرم کرنے والے شودر اور شودروں کے کرم کرنے والے دویج کا موازنہ کر کے فیصلہ کیا کہ "دونوں نہ مساوی ہیں اور نہ غیر مساوی"، یعنی نہ وہ رتبہ میں مساوی ہیں نہ برے اعمال میں غیر مساوی[2]" (۱۰: ۷۳)

ان تصریحات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ ہندو مذہب میں انسانی برادریوں کی تقسیم نسل پر نہیں بلکہ عمل پر مبنی ہے؟

نئے زمانہ کے ہندو محققین نے یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ شودر دراصل غیر آریہ دیسی باشندے نہیں تھے بلکہ خود آریہ نسل کے ادنیٰ طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ علمی تحقیق کی روشنی میں یہ دعویٰ بھی قابل قبول نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شودروں میں آریہ نسل کے وہ لوگ بھی شامل کر دیئے

[1] اگرچہ تقویٰ کے لحاظ سے پھر بھی شریف النسل لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتا۔ دیکھو منو ۹: ۱۴۹، ۱۵۶ و ۱۱: ۱۲۷۔

[2] رتبہ میں مساوی نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی طور پر دویج اور شودر کا درجہ سوسائٹی میں وہی رہیگا جو ان کے لئے مقرر ہے البتہ شودر کا اچھا عمل بجائے خود دویج کے برے عمل سے زیادہ افضل ہوگا یعنی عمل پر تو فضیلت ہوگی مگر عامل کو عامل پر فضیلت نہ ہوگی

جاتے تھے جو ورن آشرم کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے باعث برادری سے خارج کیے جاتے تھے[1]۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شودروں کا طبقہ بالعموم ان غیر آریہ اقوام پر مشتمل تھا جنہوں نے اپنے گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں میں نکل جانے کے بجائے آریہ فاتحین کی غلامی میں رہنے کو پسند کر لیا تھا۔ لسانی اور تاریخی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ شودر دراصل ایک قدیم ہندوستانی قبیلہ کا نام تھا جسے آریوں نے آ کر دریائے اٹک کی وادی میں سب سے پہلے مغلوب کیا تھا۔ اس کے بعد جو ہندی قبائل آریوں کی حکومت کے تابع ہو جاتے ان کو شودر کے نام سے موسوم کیا جاتا، اور جو قبائل برسرِ جنگ ہوتے ان کو دسیو اور ملیچھ کہا جاتا تھا[2]۔ تیتریہ برہمن میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "برہمن ایک جاتی ہے جو دیوتاؤں سے نکلی ہے اور شودر ایک دوسری جاتی ہے جو اسروں یا ارواحِ خبیثہ سے نکلی ہے[3]۔" یہ عبارت اس بات کو بالکل واضح کر دیتی ہے کہ شودر انہیں اسلاف کے اخلاف ہیں جنہیں ابتدائی زمانہ میں ارواحِ خبیثہ کہا گیا تھا۔

تاریخ ہند قدیم کے تمام ممتاز محققین اسی رائے کے موید ہیں۔ مثال کے طور پر ہم ان میں سے چند کے نتائجِ تحقیق یہاں نقل کرتے ہیں۔

راگوزن لکھتا ہے:-

"یہ تقسیم آریوں اور دسیوں کے درمیان ہوتی ہے۔ متقدم الذکر کو تو ہم خوب جانتے ہیں، رہے موخر الذکر، سو طبعی مناسبت ہم کو اس نتیجہ کی طرف لیجاتی ہے کہ وہ دیسی باشندوں، یعنی غیر آریہ اقوام کے سوا اور کوئی نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو آریہ مہاجرین نے اس ملک میں پایا اور ایک طویل دورِ جنگ و نزاع کے بعد کم و بیش ایک غیر مرغوب انقیاد کی حالت تک پہنچا دیا۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ یہیں سے ذاتوں کی تقسیم کا ابتدائی سررشتہ ہمارے ہاتھ لگتا ہے، کیونکہ یہی مجموعی تقسیم ان تقسیم سے مشابہت تام رکھتی ہے جو موجودہ زمانہ میں دوجھوں اور شودروں کے درمیان پائی جاتی ہے۔

---

[1] Vedic Index of Names and Subjects, Vol. II. PP. 265, 3 891

[2] Wilson, Indian Castes, Vol 1, P. III

[3] Muir, Sanskirit Texts, P. 14

علاوہ بریں جات پات کے لئے آریوں کی زبان میں لفظ "ورن" استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی "رنگ" کے ہیں، اور آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ گورے فاتحین اور سیاہ رنگ دیسی باشندوں کے درمیان اسی رنگ کے فرق کو ویدک نظموں میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔ پھر خود لفظ "داس" بھی ان معنوی تغیرات کے ساتھ جو اس پر گذرے ہیں، ہمارے سامنے ایک وسیع داستان بیان کرتا ہے۔ یہ ایک قدیم آریہ لفظ ہے جسے ایرانی لوگ، اس کے اصلی بے ضرر معنی (قوم اور گروہ) میں استعمال کرتے تھے...... ہندوستان آکر اس نے ایک معاندانہ رنگ اختیار کر لیا۔ وہ دشمن کے معنی میں بولا جانے لگا[1]۔ پھر اس معنی سے ترقی کر کے ویدک اوہام کی سرزمین میں اس نے بآسانی بھوت، پریت اور ارواح خبیثہ کا مفہوم اختیار کر لیا اور اس سے تاریکی اور قحط سالی کی قوتیں مراد لی جانے لگیں جن سے اندر ہمیشہ برسر پیکار رہتا ہے، اور جن کو وہ مُردتوں، انگیروں اور دوسری روشنی کی قوتوں سے مغلوب کرتا ہے۔ یہ تحول جس قدر منطقی اور فطری ہے، اسی قدر وہ ویدوں کے فہم و تعبیر کی مشکلات میں اضافہ کرتا ہے کیونکہ جب اندر یا اگنی سے دسیوں کو نکالنے اور ہلاک کرنے کی درخواست کی جاتی ہے، یا جب بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے دسیوں کی طاقت کو مٹا دیا تو اکثر اوقات یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس سے کون سے دشمن مراد ہیں؟ مادی دشمن یا خیالی دشمن؟

اس لفظ میں آخری تغیر معنی خیز ہے۔ وہ محض خادم اور غلام کے معنی میں بولا جانے لگا اور ذرا سی لفظی تغیر کر کے اسے داس بنا دیا گیا۔ اس طرح وہ تکمیل فتح کی خبر دیتا ہے اور زیادہ جدید لفظ شودر کے قریب جا پہنچتا ہے پس اس ترتیب کے مطابق ہم یہ صحیح مساوات قائم کر سکتے ہیں:۔

آریہ۔ دسیو = دویج۔ شودر۔

اگر اس امر کا کوئی مزید ثبوت، کہ شودر جاتی کو فتح کے ذریعہ سے خادم طبقہ بنا لیا گیا تھا، درکار ہو تو وہ ہم کو منو کے مجموعہ قوانین میں ملتا ہے جس میں دویج کے لئے ایک شودر کی معیت [illegible] ممنوع قرار دی گئی ہے، خواہ وہ شودر راجہ ہی کیوں نہ ہو۔ اب ایک شودر راجہ اس کے سوا اور کیا

[1] عربی زبان میں بھی اکثر قوم کا لفظ بول کر دشمن قوم مراد لیتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ اس سے ایک دیسی حکمراں مراد ہے۔
اگرچہ آریہ اور دسیو یا داس کے الفاظ، اور دویج اور شودر کے الفاظ کا متقابل اصطلاحیں ہونا ایک پوری طرح ثابت اور صریح واقعہ ہے، تاہم یہ سمجھنا ایک غلطی ہے کہ دسیو اور شودر کسی خاص قوم کے نام ہیں۔ دراصل ان کا اطلاق ان تمام قوموں پر ہوتا ہے جو آریہ نہیں ہیں، بالکل اسی طرح جیسے قدیم زمانہ میں وہ تمام لوگ "بربرہ" (Barbarians) کہلاتے تھے جو رومی یا یونانی نہ تھے[1]۔"

پروفیسر ریپسن لکھتا ہے:۔
"رگ وید کے شعراء اُن محدود معنوں میں جات پات سے واقف نہ تھے جو اس لفظ نے بعد میں حاصل کر لئے۔ مگر وہ اتنا جانتے تھے کہ آدمیوں کے مختلف طبقات ہیں: مذہبی طبقہ یا برہمن، اشراف یعنی راجنیہ یا کشتری، زمین جوتنے والے یعنی وش یا ویشیہ، اور خدمت پیشہ طبقات یعنی شودر۔ پہلے تین طبقات اور چوتھے طبقہ کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ مقدم الذکر آریہ لوگ ہیں، اور مؤخر الذکر محکوم دسیو۔ ان کے درمیان فرقِ رنگ (ورن) کا ہے۔ آریہ مجموعی حیثیت سے گورے رنگ کے لوگ سمجھے جاتے ہیں اور دسیو کالے رنگ کے[2]۔"

ڈاکٹر بریڈیل کیتھ لکھتا ہے:۔
"آریوں اور داسوں میں بڑا اور اہم فرقِ رنگ کا ہے۔ آریہ ورن اور کالے رنگ کا امتیاز بلا شک و شبہ ہندوستان کے ورن آشرم (Caste System) کے اہم ترین مآخذ میں سے ایک ہے۔ کالے چمڑے کو مغلوب کرنا دراصل ویدک ہندو کے نہایت اہم اعمال میں سے ہے۔ . . . .
اگرچہ رگ وید میں زیادہ تر داسوں کے خلاف جنگ و پیکار اور ان سے نئی نئی زمینیں چھیننے کے لئے دیوتاؤں کے مجبور کرنے کا تذکرہ آتا ہے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ آریوں نے اصل باشندوں کو بالکل

[1] Vedic India, PP. 282-85.

[2] Cambridge History of India, Vol. 1 P. 54

تہس نہس کرنے کی کوشش نہیں کی بے شک بہت سے قدیم باشندے آریوں کے حملوں سے بھاگ کر شمال وجنوب کے پہاڑوں میں پناہ گزین ہو گئے، مگر دوسرے لوگ رجو باقی بچ رہے) غلام بنا لئے گئے۔[1]

پروفیسر ہاپکنس لکھتا ہے:-

"غلام شودر اور نیچے طبقے کے لوگ اجتماعی عمارت کے اجزا تسلیم کئے گئے ہیں۔ خود یہ نام ہی بتاتا ہے کہ شودر در اصل مفتوح قوم کے لوگ تھے جس طرح ایتھنز میں لفظ "کارین" (   ) غلام کا مترادف ہو گیا تھا۔ اسی طرح شودر بھی غلام کا ہم معنی ہو گیا ہے تاہم شودر پار یاد انسانی جماعت سے خارج نہیں تھے، بلکہ گھریلو زندگی میں شامل کر دئے گئے تھے اور بعض خانگی رسموں میں حصہ لیتے تھے"[2]

آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے:-

"گوتم (۱۲ : ۲) نے ایک آریہ عورت سے ایک شودر کے ناجائز تعلقات پیدا کرنے کے متعلق جو قوانین بیان کئے ہیں ان کو جب اپستمبھ دھرم شاستر (۲ : ۲۶، ۲۰، ۲۷، ۹) سے مقابلہ کر کے دیکھا جاتا ہے تو قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ آریہ نسلاً برتر ہے اور سیہ رنگ لوگوں سے ممتاز ہے ...... مسٹر کننگہم نے اپنی کتاب "ہندوستان میں ذاتوں کی تقسیم کی تاریخ" (ص ۸۲) میں یہ رائے ظاہر کرنے میں بے احتیاطی سے کام لیا ہے کہ "آریوں اور دراوڑوں کے درمیان کوئی نسلی امتیاز محسوس نہیں ہوتا تھا" یہ سچ ہے کہ جو لوگ جات برادری سے خارج کر دیئے جاتے وہ پھر آریہ نہیں کہلاتے تھے۔ مگر کوئی شودر کبھی آریہ نہیں سمجھا گیا آریہ قوم نے رگ وید کے زمانہ سے لیکر بعد تک ہمیشہ نسلی امتیاز ظاہر کیا ہے"[3]

---

[1] Cambridge History of India, Vol. 1, PP. 84-86

[2] Cambridge History of India, Vol. 1, P. 234

[3] Cambridge History of India Vol. 1, P. 246

ان شہادتوں کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہندو قانون میں جن لوگوں کو شودر قرار دیا گیا ہے وہ در اصل غیر آریہ مفتوح اقوام ہیں لہذا اُن کے لئے جو قوانین ہندو دھرم شاستروں میں بیان کئے گئے ہیں وہ اُن تمام قوموں کے ساتھ ہندو دھرم کے برتاؤ کو ظاہر کرتے ہیں جو مفتوح و مغلوب ہو کر اس کی حکومت کے تابع ہو جائیں۔

۲ - یہودی مذہب

یہودی مذہب کے قوانین کی تلاش و تحقیق میں ہم کو وہ دقتیں پیش نہیں آتیں جو ہندو مذہب کے قوانین تلاش کرنے میں پیش آتی ہیں۔ صرف ایک کتاب توراۃ کو لیکر ہم یہودی مذہب کی تعلیم اور اس کے احکام و قوانین معلوم کر سکتے ہیں اور اس میں یہودیت کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ متاخرین علمائے یہود نے شریعت یہود کے قوانین کو مرتب کرنے کے لئے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جو جزئیات کی تفصیل پر حاوی ہیں، مثلاً عقیبہ بن یوسف کی مشناہ اور مدراش جو دوسری صدی عیسوی کی تصنیفیں ہیں، اور تالمود جو مشناہ اور گمارا کو ملا کر چھٹی صدی عیسوی میں مرتب کی گئی، اور اسحاق الفاسی کی ہلاخوت جو گیارہویں صدی میں لکھی گئی اور تالمودی قوانین کی بہترین شرح سمجھی جاتی ہے، اور موسیٰ میمونی کی مشنہ توراۃ جو بارہویں صدی کے اواخر میں مرتب ہوئی، اور یعقوب بن اشہر کی طور جو چودھویں صدی کی یادگار ہے، اور یوسف قارو کی شولخان اروخ جو سولہویں صدی میں لکھی گئی ہے اور جس میں یہودی احکام و عبادات کے سارے احکام روایات قدیمہ کے مطابق مرتب کئے گئے ہیں لیکن ہمارے لئے ان کتابوں سے احتجاج چنداں مفید نہیں ہے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو یہودیوں کے تمام فرقوں میں متفق علیہ ہو، اور نہ کسی کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ اسے یہودی مذہب کی اساس و بنیاد قرار دیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ بسا اوقات یہودیوں نے ان کتابوں سے بیزاری ظاہر کی ہے اور توراۃ کے سوا سب کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۰۶ء میں ربیون امریکہ کی مرکزی مؤتمر کا جو اجتماع انڈیاناپولس میں ہوا تھا اس نے مذہبی ضوابط کی ہمہ گیری کے خلاف علانیہ اظہار بغاوت کر دیا تھا۔ لہذا ہم ان سب کتابوں کو نظر انداز کر کے مسئلہ جنگ میں صرف توراۃ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔[۱]

[۱] دیکھو حاشیہ ص ۳۱۵ پر)

مقصدِ جنگ توراۃ میں نہایت کثرت سے لڑائیوں کا ذکر آیا ہے اور جگہ جگہ جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر سوائے اُس ایک مقصد کے جو استثنا باب ۲ اور اعداد باب ۳۳ میں بیان کیا گیا ہے، اور کسی مقصد کا نشان ہم کو

(حاشیہ صفحہ ۳۱۸) ؎ یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ توراۃ کے متعلق ہم جو کچھ کہیں گے وہ اس توراۃ کے متعلق نہیں ہوگا جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی۔ بلکہ اس توراۃ سے متعلق ہوگا جو آج عہدِ عتیق (Old Testament) کے نام سے دنیا میں موجود ہے۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ "عہدِ عتیق" کی کتب خمسہ (Pentateuch) اصلی توراۃ نہیں ہیں۔ اصلی توراۃ دنیا سے ناپید ہو چکی ہے۔ اس نظریہ کی تائید خود "عہدِ عتیق" سے ہوتی ہے اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں حضرت یشوع کی مدد سے توراۃ کو مرتب کر کے ایک صندوق میں رکھوا دیا تھا (استثنا ۳۱: ۲۴-۲۶)۔ ان کے انتقال کے بعد چھٹی صدی ق م میں جب بخت نصر نے بیت المقدس کو آگ لگا دی تو وہ مقدس صندوق ان تمام کتابوں سمیت جل گیا جو حضرت موسیٰ کے بعد شریعت موسویہ کے مجددین نے مرتب کی تھیں۔ اس تباہی کے دو ڈھائی سو برس بعد حضرت عُزیر نے (بائیبل کی روایت کے مطابق) بنی اسرائیل کے کاہنوں اور لاویوں کے ساتھ مل کر آسمانی الہام سے اس کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا (ایزدراس جزو دوم باب چہاردہم)۔ مگر حوادث زمانہ نے اس نئے نسخہ کو بھی اپنی اصلی صورت میں باقی نہ رہنے دیا۔ سکندرِ اعظم کی عالمگیر فتوحات کا سیلاب جب یونانی حکومت کے ساتھ علوم و آداب کو بھی لیکر شرقِ ادنیٰ پر پھیل گیا تو ۲۸۰ ق م میں توراۃ کی تمام کتابیں یونانی زبان میں منتقل کر دی گئیں، اور رفتہ رفتہ اصل عبرانی نسخہ متروک ہو کر یہی یونانی ترجمہ رائج ہو گیا۔ پس آج جو توراۃ ہمارے سامنے ہے اس کی سند کسی طرح حضرت موسیٰ تک نہیں پہنچتی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موجودہ توراۃ میں اصلی توراۃ کا کوئی جزو بھی شامل نہیں ہے یا یہ سراسر جعلی ہے۔ دراصل جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس توراۃ میں اصل توراۃ کے ساتھ بہت سی دوسری چیزیں مل جل گئی ہیں، اور بعید نہیں کہ اس کی بعض چیزیں اس میں سے غائب بھی ہو گئی ہوں۔ آج جو شخص بھی محققانہ نظر سے اس کتاب کو پڑھیگا وہ صریح طور پر یہ محسوس کریگا کہ اس میں خدا کے کلام کے ساتھ یہودی علماء کی تفسیریں، بنی اسرائیل کی قومی تاریخ، اسرائیلی فقہاء کے قانونی اجتہادات، اور دوسری بہت سی چیزیں خلط ملط ہو گئی ہیں جنہیں الگ کر کے کلام الٰہی کو چھانٹ نکالنا سخت مشکل کام ہے۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ قرآن کی رو سے توراۃ کا دین وہی تھا جو خود قرآن کا دین ہے اور موسیٰ علیہ السلام اُسی طرح اسلام کے پیغامبر تھے جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ بنی اسرائیل ابتدا میں اسی دینِ اسلام کے پیرو تھے، مگر بعد میں انہوں نے اصل دین میں اپنی خواہشات کے مطابق بہت کچھ کمی بیشی کر کے ایک نیا مذہبی نظام

نہیں ملتا۔ یہ مقصد کتاب اعداد میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

"اور خداوند نے موآب کے میدانوں میں یردن کے کنارے یریحو کے مقابل موسیٰ کو خطاب کرکے فرمایا: بنی اسرائیل کو خطاب کر اور انہیں کہہ جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہو تو تم ان سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں، اپنے سامنے سے بھگاؤ، ان کی مورتیں فنا کر دو، اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو، اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھا دو، اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں خارج کر دو اور وہاں آپ بسو، کیونکہ میں نے وہ سرزمین تم کو دی ہے کہ اس کے مالک بنو" (۳۳: ۵۰-۵۴)

اور کتاب استثنا میں ہے:۔

"سو تم اٹھو، کوچ کرو، اور نہر ارنون کے پار جاؤ، دیکھو میں نے حسبون کے بادشاہ اموری سیحون کو اس کی سرزمین سمیت تیرے ہاتھ میں دیا ہے۔ سو اس کی میراث لینا شروع کر اور جنگ میں اس کا مقابلہ کر" (۲: ۲۴)

"لیکن حسبون کے بادشاہ سیحون نے ہم کو اپنے ہاں سے گذرنے نہیں دیا کیونکہ خداوند تیرے خدا نے اس کا مزاج کڑا کر دیا، اور اس کے دل کو سخت۔ تاکہ اسے تیرے ہاتھ میں دیوے جیسا آج ہے۔ پھر خداوند نے مجھے فرمایا، دیکھ میں نے سیحون کو اس کی سرزمین سمیت تجھے دینا شروع کیا، تو میراث لینا شروع کر، تاکہ اس کی زمین کا وارث ہو جائے۔ تب سیحون یہص میں ہمارے مقابلہ کے لئے نکلا: وہ اور اس کی ساری قوم۔ تاکہ ہم سے لڑیں۔ سو خداوند ہمارے خدا نے اسے ہمارے حوالہ کر دیا اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹوں کو اور اس کی سب قوم کو ہلاک کیا اور ہم نے اسی وقت اسکے سارے شہروں کو لے لیا اور مردوں اور عورتوں اور بچوں کو ہر ایک شہر میں حرم کیا (یعنی قتل کیا) اور کسی کو باقی نہ چھوڑا، سوا چارپایوں کے جنہیں ہم نے اپنے لئے غنیمت جان کر پکڑا اور اس مال کے جو ہم نے شہروں میں سے لوٹا" (۲: ۳۰-۳۵)

(بقیہ حاشیہ ۳۱۸) اسے یہودیت کے نام سے بنا لیا۔ لہٰذا یہاں جس چیز پر ہم بحث کر رہے ہیں وہ یہی یہودیت ہے نہ کہ وہ دین جو حضرت موسیٰ لائے تھے

"تب ہم پھرے اور بسن کی راہ میں چڑھ گئے، اور بسن کا بادشاہ عوج اور عی میں وہ اور اس کی ساری قوم ہمارے مقابلہ کے لئے نکلی، تاکہ ہم سے لڑے۔ اور خداوند نے اس وقت مجھے فرمایا، اس سے مت ڈر کہ میں اس کو اور اس کی ساری قوم کو اس کی سرزمین سمیت تیرے قبضہ میں کر دوں گا۔ تو اس سے وہی کر جو تو نے اموریوں کے بادشاہ سیحون سے جو حسبون میں رہتا تھا، کیا۔ چنانچہ خداوند ہمارے خدا نے بسن کے بادشاہ عوج کو بھی اس کی ساری قوم سمیت ہمارے قابو میں کر دیا، اور ہم نے انہیں یہاں تک مارا کہ ان میں سے کوئی باقی نہ رہا، اور ہم نے اسی وقت اس کے سب شہر لے لئے . . . . . . اور ہم نے ان کو یعنی ان کے مردوں اور عورتوں اور لڑکوں کو ہر ایک شہر میں حسبون کے بادشاہ سیحون کی طرح حرم کیا، لیکن سارے مواشی اور شہروں اور مال اسباب کو ہم نے اپنے واسطے لوٹ لیا۔" (۳: ۱-۷)

ان عبارات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توراۃ کی جنگ کا مقصد ملک گیری ہے۔ ایک ملک کے باشندوں کو تلوار کے زور سے مغلوب کرنا اور قوت کے حق کی بنا پر ان کے اموال و املاک اور خود ان کی جانوں کو اپنے قبضہ میں لے لینا اس کی نگاہ میں جائز ہے، اور اس کے نزدیک یہی تصرف و تسلط اس وراثت ارضی کا مفہوم ہے جس کے عطا کرنے کا خدا نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں بھی "وراثت ارضی" کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا گیا ہے

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (۲۱: ۷) زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:-

ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ و العاقبۃ للمتقین (۷: ۱۵) زمین خدا کی ہے اور اس کا وارث وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے بناتا ہے، اور انجام کار کامیابی صرف پرہیزگاروں کا حصہ ہے۔

لیکن اس وراثت کا تخیل توراۃ کے تخیل سے بالکل مختلف ہے۔ توراۃ زمین کی وراثت صرف بنی اسرائیل کو دیتی ہے، جیساکہ اعداد (۳۳: ۵۰) سے صاف ظاہر ہوتا ہے، مگر قرآن اسے کسی ایک نسل یا قوم کا

نہیں بلکہ صالحین کا حق قرار دیتا ہے۔ توراۃ میں وراثت ارضی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے گھر بار، ملک و مال اور جان و آبرو کی مالک بن جائے، مگر قرآن میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی قوم کو وراثت ارضی دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنی بداعمالیوں کے باعث ناکارہ ہو جاتی ہے اور زندہ رہنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے تو اللہ تعالیٰ دوسری قوم کو جو اس سے بہتر اور اصلح ہو اس کی جگہ کھڑا کر دیتا ہے۔ پھر توراۃ میں میراث زمین حاصل کرنے کے لئے جنگ کا حکم دیا گیا ہے، مگر قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ فلاں ملک تمہاری قومی میراث ہے لہٰذا تم اسے لڑ کر فتح کر لو۔ پس توراۃ کی "وراثت ارضی" کھلی کھلی ملک گیری ہے۔ اسلام کے جہاد فی سبیل اللہ کے برعکس اس کی جنگ کا مقصد محض ملک و دولت کا حصول اور دوسری قوموں پر ایک خاص قوم کی برتری قائم کرنا ہے۔

حدودِ جنگ جنگ کے حدود و ضوابط کے متعلق ہم کو توراۃ میں کچھ زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ تاہم اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہودی مذہب اپنے پیروؤں کو دشمن کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس کے لئے ذیل کے احکام قابلِ مطالعہ ہیں۔

کتاب اِستثناء میں ہے:-

"اور جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لئے آپہنچے تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر۔ تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور ہے، اور دروازہ تیرے لئے کھول دے، تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری خراج گذار ہوگی، اور تیری خدمت کرے گی۔ اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ جنگ کرے، تو تو اس کا محاصرہ کر، اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں دیدے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو، اس کی سارا لوٹ اپنے لئے لے اور تو اپنے دشمن کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے کھائیو" (۲۰: ۱۰-۱۴)

"جب تم کسی شہر کو اس ارادہ سے کہ لڑائی کرکے اسے لو، مدت تک محاصرہ کئے رہو تو تبر چلا کر اس کے درختوں کو خراب مت کیجیو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تو ان کا میوہ کھائے۔ سو تو انہیں محاصرہ

سکے کام میں لانے کے لئے کاٹ نہ ڈالیو، کیونکہ میدان کے درخت آدمی کی زندگی ہیں" (۲۰-۱۹)

"لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے، جیتا نہ چھوڑیو، بلکہ تو ان کو حرم کیجیو" (۲۰: ۱۶-۱۷)

"اور جبکہ خداوند تیرا خدا انہیں تیرے حوالہ کر دے تو تو انہیں ماریو اور حرم کیجیو۔ نہ تو ان سے کوئی عہد کریو، اور نہ ان پر رحم کریو تم ان کے مذبحوں کو ڈھا دو، ان کے بتوں کو ڈھا دو، ان کے گھنے باغوں کو کاٹ ڈالو اور ان کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلا دو" (۷: ۲-۵)

"تم ان سب جگہوں کو جہاں ان قوموں نے جن کے تم وارث ہو گے اپنے معبودوں کی بندگی کی ہے۔ اونچے پہاڑوں پر اور ٹیلوں پر، اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے نیست و نابود کر دیجیو۔ ان کے مذبحوں کو ڈھا دیجیو اور ان کے ستونوں کو توڑ دیو اور ان کے گھنے باغوں میں آگ لگائیو اور ان کے معبودوں کی گھڑی ہوئی مورتوں کو چکنا چور کیجیو اور ان کے ناموں کو اس جگہ سے مٹا دیجیو" (۱۲: ۲)

کتاب خروج میں ہے:-

"آج کے دن جو حکم میں تجھے کرتا ہوں تو اسے یاد رکھیو کہ میں اموریوں اور کنعانیوں اور حتیوں اور فرزیوں اور حویوں اور یبوسیوں کو تیرے آگے سے ہانکتا ہوں ہوشیار رہنا ہوئے کہ تو اس سرزمین کے باشندوں کے ساتھ جس میں تو جاتا ہے، کچھ عہد باندھ لیوے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ عہد تیرے درمیان پھندا ہو۔ بلکہ تم ان کی قربان گاہوں کو ڈھا دو اور ان کے بتوں کو توڑ دو اور ان کی یسیریں کو کاٹ ڈالو" (۳۴: ۱۱-۱۳)

کتاب اعداد میں ہے:-

"پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اہل مدیان سے بنی اسرائیل کا انتقام لے اور تو بعد اس کے اپنی قوم کے لوگوں سے مل جائیگا۔ تب موسیٰ نے لوگوں کو فرمایا کہ بعض تم میں سے لڑائی کے لئے تیار ہوں...... سو ہزاروں بنی اسرائیل میں سے ہر فرقہ کے ایک ایک ہزار حاضر ہو گئے۔ یہ سب لڑائی کے لئے ہتھیار بند تھے ۱۲ ہزار ہوئے...... اور انہوں نے مدیانیوں

سے لڑائی کی جیسا خداوند نے موسیٰؑ سے فرمایا تھا، اور سارے مردوں کو قتل کیا۔ ....

اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا اور ان کے مواشی اور بھیڑ بکری اور مال و اسباب سب کچھ لوٹ لیا، اور ان کے سارے شہروں کو جن میں وہ رہتے تھے اور ان کے سب قلعوں کو پھونک دیا، اور انہوں نے ساری غنیمت اور سارے اسیر انسان اور حیوان لئے، اور وہ قیدی اور غنیمت اور لوٹ موسیٰؑ اور الیعزر کاہن اور بنی اسرائیل کے پاس خیمہ گاہ میں، مواب کے میدانوں میں یردن کے کنارے جو یریحو کے متقابل ہے، لائے، .....

..... اور موسیٰ لشکر کے رئیسوں پر اور اُن پر جو ہزاروں کے سردار تھے اور اُن پر جو سینکڑوں کے سردار تھے، جو جنگ کر کے پھرے تھے، غصہ ہوا اور ان کو کہا کہ کیا تم نے سب عورتوں کو جیتا رکھا؟ ...... سو تم ان بچوں کو جتنے لڑکے ہیں سب کو قتل کرو، اور ہر ایک عورت جو مرد کی صحبت سے واقف تھی، جان سے مارو، لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لئے زندہ رکھو" (۳۱: ۱-۱۸)

کتاب یشوع میں ہے :-

"اور انہوں نے ان سب کو جو شہر میں تھے کیا مرد، کیا عورت، کیا جوان، کیا بوڑھا، کیا بیل، کیا بھیڑ، کیا گدھا، سب کو یک لخت تہ تیغ کر کے حرم کیا۔ .... پھر انہوں نے اس شہر کو اس سب سمیت جو اس میں تھا پھونک دیا۔ مگر روپا اور سونا اور پیتل اور لوہے کے ظروف خداوند کے خزانہ میں داخل کئے" (۶: ۲۱-۲۵)

"اور انہوں نے عی کے بادشاہ کو جیتا پکڑا اور اسے یشوع پاس لائے۔ اور ایسا ہوا کہ جب اسرائیل میدان میں اُس بیابان کے درمیان جہاں ان کا پیچھا کیا، عی کے لوگوں کو قتل کر چکے اور جب وہ سب تہ تیغ ہو گئے یہاں تک کہ بالکل کھپ گئے، تو سارے بنی اسرائیل عی کو پھرے اور اسے تلوار کی دھار سے مارا۔ چنانچہ وہ جو اس دن مارے گئے مرد اور عورت ۱۲ ہزار تھے یعنی عی کے سب لوگ۔ کیونکہ یشوع نے اپنا ہاتھ جس سے بھالا اٹھایا۔ جب تک عی کے سارے رہنے والوں کو حرم

نہ کر لیا، نہ کھینچا۔ اسرائیل نے اس شہر کے فقط مواشی اور اسباب کو اپنے لئے لوٹا، خداوند کے حکم کے مطابق جو اس نے یشوع کو فرمایا تھا۔" (۸: ۲۳-۲۸)

ان عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودی مذہب اپنے دشمنوں کو دو قسموں پر تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جنہیں خداوند نے بنی اسرائیل کی میراث میں نہیں دیا ہے۔ دوسرے وہ جنہیں اس نے ان کی میراث میں دیا ہے۔ ان دونوں کے ساتھ اس کا معاملہ جدا جدا رنگ کا ہے۔

پہلی قسم کے دشمنوں کے لئے اس کا حکم یہ ہے کہ پہلے انہیں صلح کا پیغام دیا جائے، اور اگر وہ اسے قبول کر کے اپنا ملک بنی اسرائیل کے سپرد کر دیں تو ان کو باجگذار اور خدمت گذار بنا لیا جائے لیکن اگر وہ صلح نہ کریں تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے اور فتح پانے کے بعد ان کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے، اور مال اسباب پر قبضہ کر لیا جائے۔ دوران جنگ میں باغوں اور کھیتوں اور میوہ دار درختوں کو خراب کرنے کی ممانعت ہے، مگر اس لئے نہیں کہ یہ ایک مفسدانہ فعل ہے، بلکہ اس لئے کہ انہیں اس طرح خراب کر دینے سے فتح حاصل کرنے کی صورت میں فاتح کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکے گا۔

دوسری قسم کے دشمنوں کو وہ تمام انسانی حقوق اور رعایات سے محروم کر دیتا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ ان قوموں سے کوئی صلح و معاہدہ نہ کیا جائے، ان کے خلاف بلا تامل جنگ چھیڑ دی جائے، ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کیا جائے، ان کی کھیتیاں اور باغات اور عمارتیں اور عبادت گاہیں سب تہس نہس کر دی جائیں، ان کی عورتیں، مرد، بچے، حتیٰ کہ جانور تک تہ تیغ کر دیئے جائیں اور روئے زمین سے ان کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ اس جنگ کی غایت صرف یہ قرار دی گئی ہے کہ میراث میں دی ہوئی قومیں کلیتہً نیست و نابود کر دی جائیں۔ ان قوموں کے سامنے کوئی ایسی شرط پیش کی ہی نہیں گئی جسے پورا کرنے کے بعد ان کی جاں بخشی ممکن ہو۔

اس تعلیم پر کسی تبصرہ کی حاجت نہیں، وہ اپنے اوپر آپ تبصرہ کر رہی ہے۔

۳۔ بودھ مذہب

یہاں تک ان مذاہب کا ذکر تھا جن سے اسلام کا اختلاف نفس جنگ کے جواز و عدم جواز میں

نہیں بلکہ محض اس کی اخلاقی اور عملی نوعیت میں تھا۔ اب دوسری قسم ان مذاہب کی ہے جو سرے سے جنگ ہی کے مخالف ہیں اور اسلام سے اس بنا پر اختلاف رکھتے ہیں کہ وہ جہاد بالسیف کی اجازت ہی کیوں دیتا ہے؟ ان مذاہب میں تاریخی ترتیب کے اعتبار سے پہلا نمبر بودھ مذہب کا ہے۔

بودھ مذہب کے مآخذ مسئلۂ زیر بحث میں بودھ مذہب کے طریقہ کی تحقیق کرنے سے قبل یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ آج ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہے کہ فی الواقع بودھ کی تعلیم کیا تھی۔ بودھ نے اپنی زندگی میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اس نے اپنے قائم کردہ مذہب کے عقائد اور احکام کا کوئی ایسا مجموعہ بھی مرتب نہیں کرایا جس سے اس کی تعلیمات خود اس کی زبان سے معلوم کی جا سکتی ہوں۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے کسی پیرو نے بھی اس کی زندگی میں یا اس کے بعد کسی قریبی زمانہ میں اس کی تعلیمات کو ضبط تحریر میں لانے کی کوشش نہیں کی۔ بعض روایات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے انتقال کے بعد راج گرہ میں ایک بڑی مجلس منعقد ہوئی تھی جس میں اس کے ایک دو مخصوص مریدوں نے اس کی تعلیمات پر زبانی لکچر دیئے تھے۔ لیکن اول تو خود انہیں روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لکچروں کو ضبط تحریر میں نہیں لایا گیا۔ دوسرے تاریخی حیثیت سے یہ بھی پوری طرح ثابت نہیں ہوتا کہ آیا یہ کونسل فی الواقع منعقد ہوئی بھی تھی یا نہیں۔ مہاپرنبان سوتر جو ہمارے پاس بودھ کی زندگی اور اس کے بعد کے حالات معلوم کرنے کا سب سے زیادہ مستند ذریعہ ہے، اس کونسل کے بارے میں بالکل خاموش ہے[1]۔ اب رہیں موجودہ کتابیں جو اس مذہب کے متعلق ہماری معلومات کا تنہا ذریعہ ہیں، سو یہ سب بودھ کے بہت بعد کی تصنیف ہیں۔ اس کے انتقال پر ایک صدی گذر چکی تھی جب ویسالی میں اس مذہب کے اعیان و ائمہ کی ایک کونسل منعقد ہوئی اور بڑے مباحثے کے بعد اس کے اصول اور عقاید و احکام کو مرتب کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر اس کے متعلق دیپ و مسا کا مصنف ہم کو خبر دیتا ہے کہ اس میں بھکشوؤں نے اصل مذہب کے اصول بدل دیئے، اس کے عقائد و احکام میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کی اور اصل سوتروں کو بدل کر نئے سوتر بنا لئے[2]۔ اسی زمانہ میں بودھ مذہب کو ضبط تحریر میں لانے کا سلسلہ شروع

---

[1] Buddhist Suttas, PP. XI-XIII

[2] دیکھو میکس مولر کا دیباچہ "سیکرڈ بکس آف دی بدھسٹس"

ہوا اور پہلی صدی عیسوی یعنی ۴۰۰ برس تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن آخری زمانہ میں اس مذہب کو پھر تحریف سے دوچار ہونا پڑا، یہاں تک کہ اس کے بنیادی اصول بھی بدل گئے۔ ابتدائی بودھ مت میں خدا کا کوئی وجود نہ تھا، مگر اب ایک غیر فانی ہستی کا وجود مان لیا گیا جو تمام کائنات سے برتر ہے اور جس کا محض ایک مادی ظہور بودھ کی شکل میں ہوا ہے۔ ابتدائی بودھ مت میں جنت اور دوزخ کا کوئی تصور نہ تھا، مگر اب نیک اعمال کا صلہ جنت اور برے افعال کا عوض دوزخ کو تسلیم کر لیا گیا۔ ابتدائی بودھ مت میں زاہدانہ زندگی کے قواعد بے انتہا سخت تھے، مگر اب ان کو بدلکر ضروریات کے لحاظ سے نسبتۃً نرم کر دیا گیا۔ بودھ مت میں یہ آخری تحریف کنشک کے زمانہ میں ہوئی جو پہلی صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ماتحت کشمیر میں جو کونسل منعقد ہوئی تھی اس میں اسی تحریف و تمسیخ کے ساتھ بودھ مذہب کے قوانین مرتب کئے گئے تھے[۱]۔ ان جدید قوانین کو ایک چھوٹے سے فرقہ نے رد کر دیا، مگر پیروان بودھ کے سواد اعظم نے جو اصطلاح میں مہایانا فرقہ کہلاتا ہے انہیں تسلیم کر لیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ صحیح معنوں میں جس چیز پر "مذہبی کتاب" کا اطلاق ہوتا ہے وہ بودھ مذہب میں موجود نہیں ہے اور ہم کسی سند کی بنا پر وثوق کے ساتھ یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ بودھ کی اصلی تعلیم کیا تھی۔ زیادہ سے زیادہ اعتماد ان کتابوں پر کیا جا سکتا ہے جو عہد کنشک کے آخری عمل تحریف سے بچ کر ہم تک پہنچی ہیں اور وہ تین ہیں:

۱۔ ونائی پتک جو زاہدانہ زندگی کے قوانین کا مجموعہ ہے اور ۵۰۰ ق م سے تقریباً ۲۵۰ ق م تک مختلف ایام میں مرتب ہوا ہے۔ مگر اس کے مصنف یا مصنفوں کا پتہ نہیں ملتا۔

۲۔ سُتّ پتک جس میں حصول نجات کے طریقے یا بودھ مت کے فلسفۂ اخلاق پر، زیادہ تر بودھ کے اقوال جمع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کے مصنف اور زمانہ تصنیف کے متعلق بھی تاریخ میں کسی قسم کی معلومات محفوظ نہیں ہیں۔

۳۔ ابھی دھمّ پتک جو زیادہ تر بودھ مت کے فلسفۂ اخلاق و مابعد الطبیعیات پر مشتمل ہے اس

---

[۱] Hackman, Buddhism As A Religion, PP. 51-55

کے متعلق ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ تیسری صدی قبل مسیح کے خاتمہ سے پہلے موجود تھی[1]۔

آئندہ صفحات میں ہم بودھ کی تعلیم کے متعلق جو کچھ کہیں گے وہ در اصل اُس بودھ کے متعلق ہوگا جسے یہ کتابیں ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں، نہ کہ اس بودھ کے متعلق جس کو ہم نہیں جانتے کہ وہ در اصل کس چیز کی تعلیم دیتا تھا۔

اہنسا کی تعلیم بودھ مت ایک اہنسائی مذہب ہے۔ اس میں ہر ذی روح شے کو معصوم قرار دیا گیا ہے اور انسان سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے کیڑے تک ہر جاندار کی عصمت اس معنی میں تسلیم کی گئی ہے کہ اس پر کسی حال میں تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ بودھ کے احکام عشرہ میں سب سے پہلا تاکیدی حکم یہ ہے کہ کسی جاندار کو ہلاک نہ کرو۔ "جو بھکشو عمداً کسی جاندار شے کو اس کی زندگی سے محروم کرے وہ اس کے قانون میں ناقابل عفو جرم کا مرتکب ہے[2]۔ حد یہ ہے کہ وہ بھکشوؤں کو برسات کے تین مہینوں میں گوشۂ عزلت سے باہر نکلنے تک کی ممانعت کرتا ہے تاکہ زمین پر چلنے سے حشرات الارض نہ کچلے جائیں[3]۔ ان شدید اہنسائی احکام کے ساتھ جنگ کی اجازت تو درکنار اس کا تصور بھی ناممکن ہے جب جان کا احترام اس کی نگاہ میں اس قدر بڑھا ہوا ہے تو لامحالہ اسے ایک ایسے عمل کو شدید نفرت کی نظر سے دیکھنا ہی چاہیئے جس میں کیڑوں کی نہیں آدمیوں کی، ایک دو نہیں ہزاروں لاکھوں جانیں تلوار کی دھار اور گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے قربان کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بودھ نے ایک بھکشو کے لئے اس کی اجازت بھی نہیں دی ہے کہ وہ میدان جنگ میں تماشائی کی حیثیت ہی سے جا کر خوں ریزی کا نظارہ کرے چنانچہ پتیہ دھما کی اڑتالیسویں دفعہ یہ ہے:۔

"جو بھکشو بلا کسی وجہ معقول کے ایک ایسی فوج کو دیکھنے جائے جو جنگ کے لئے صف بستہ

---

[1] مزید تفصیل کے لئے سلسلہ کتب مقدسہ شرق کی گیارہویں جلد کے مقدمہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے جو پروفیسر ریس ڈیوڈس کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔

[2] Vinaya Texts, Vol. 1, P, 46

[3] Vinaya Texts, Vol. 1, PP. 298-301

ہو تو وہ پکتیہ جرم کا مرتکب ہوگا“

اور دفعات ۴۹۹ و ۵۰۰ کے الفاظ یہ ہیں:-

”اگر اس بھکشو کے فوج کی طرف جانے کی کوئی معقول وجہ ہو تو وہ صرف دو یا تین راتوں تک وہاں ٹھہر سکتا ہے۔ اگر وہ اس سے زیادہ ٹھہرے تو یہ پکتیہ ہے“

”اور اگر وہ وہاں دو یا تین رات کے دوران قیام میں میدانِ جنگ کی صف آرائی یا افواج کی سپہ شماری، یا قوائے حرب کی صف بندی، یا معائنہ کے موقع پر جائے تو یہ بھی پکتیہ جرم ہے“[1]

بودھ کا فلسفہ ان احکام سے جنگ کے متعلق بودھ کا مسلک صاف معلوم ہو جاتا ہے لیکن اس مسلک کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے صرف ان مختصر احکام ہی کا جان لینا کافی نہیں ہے بلکہ اس پورے نظامِ فلسفہ کو سمجھنا ضروری ہے جس کا ایک جزء اہنسا کا عقیدہ ہے۔ اہنسا خود تو دراصل اُن وسائل میں سے ایک وسیلہ ہے جو اس خاص شکل میں انسانی زندگی کو ڈھالنے اور اس مخصوص راستہ پر اس کو لے جانے میں ممد ہوتے ہیں جسے بودھ نے انسان کے لئے پسند کیا ہے لہٰذا دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ کونسی شکل ہے جس میں بودھ انسان کی زندگی کو ڈھالنا چاہتا ہے؟ وہ کونسا راستہ ہے جس پر وہ اس کو لے جانے کی کوشش کرتا ہے؟ وہ کون سی منزل ہے جسے اس نے اپنا نصب العین بنایا ہے؟ اور وہ کیا عملی وسائل ہیں جنہیں اس غرض کے لئے وہ استعمال کرتا ہے؟ ان مسائل کو سمجھے بغیر اہنسا کی اصلی روح اور حیاتِ انسانی پر اس کے عمیق اثرات کو سمجھنا مشکل ہے۔

بودھ نے انسان کی زندگی کا مطالعہ جس نقطۂ نظر سے کیا ہے وہ دنیا کے دوسرے حکما اور معلمین مذہب و اخلاق کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ اس نے یہ سمجھنے کی سرے سے کوئی کوشش ہی نہیں کی ہے کہ انسان دنیا میں کیوں پیدا ہوا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس لئے قدرتی طور پر

---

[1] Vinaya Texts, Vol. I, P. 43

وہ اس سوال سے بھی کوئی بحث نہیں کرتا کہ اس دنیا میں انسان کے لئے زندگی بسر کرنے کا کونسا طریقہ ہے جو اس کی اور اس کے ابنائے نوع کی حقیقی فلاح کا موجب ہو۔ اس نے اپنی ساری توجہ صرف اس سوال کے حل کرنے میں صرف کر دی ہے کہ انسان کی زندگی میں تغیر و انقلاب کیوں ہوتا ہے؟ بچپن، جوانی، بڑھاپا، تندرستی، بیماری، پیدائش، موت، رنج، خوشی، راحت، مصیبت، اور اسی قسم کے مختلف تغیرات کی علت کیا ہے؟ اور اس چکر سے نجات حاصل کرنے کی کیا صورت ہے؟ انسان کی پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کو صرف یہی ایک سوال قابلِ توجہ نظر آیا ہے اور تمام دوسرے عملی و اعتقادی مسائل سے اس نے بالکل آنکھیں بند کر لی ہیں۔

اس بنیادی سوال پر کئی سال تک گیان دھیان کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ زندگی فی نفسہ ایک مصیبت ہے جس میں انسان مبتلا ہو گیا ہے، اور پیدائش سے لیکر موت تک اس پر جتنے انقلابات گذرتے ہیں وہ سب اسی مصیبت کے مظاہر ہیں۔ اُس کے دنیا میں آنے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ وہ محض عبث اور بیکار پیدا ہوا ہے۔ یا اگر اس کا کوئی کام ہے تو وہ صرف مصیبت سہنا اور تکلیف اٹھانا ہے۔ اس لئے یہ دنیا اس کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں اس کے لئے حقیقتہً کوئی راحت و مسرت نہیں ہے کیونکہ ہر راحت کے پیچھے ایک نقصان، ہر شگفتگی کے پیچھے ایک پژمردگی، اور ہر پیدائش کے پیچھے ایک موت لگی ہوئی ہے۔ اور یہ سب کچھ تحول و انقلاب کے ایک دائمی عمل کے تابع ہے جو خود ایک مصیبت ہے۔

اس مصیبت میں انسان کیوں مبتلا ہے؟ اس کا جواب بودھ یہ دیتا ہے کہ خواہش، احساس اور شعور اس کو زندگی کی مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں نفس کی انہی قوتوں کے باعث دنیا سے انسان کا تعلق قائم ہوتا ہے اور یہی تعلق اسے بار بار دنیا میں لاتا ہے۔ وہ بار بار اس کو ایک جون سے دوسری جون میں، ایک قالب سے دوسرے قالب میں، اور ایک زندگی سے دوسری زندگی میں لئے پھرتا ہے، اور جب تک خواہش کا یہ پھندا اس کی گردن سے نہیں نکلتا اس وقت تک وہ بار بار مرنے اور بار بار زندہ ہو کر کسی نہ کسی شکل میں پھر پیدا ہونے کے سلسلہ سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔

پھر اس مصیبت، اس زندگی کے چکر سے نجات حاصل کرنے کی کیا صورت ہے؟ اس سوال کو بودھ

نے صرف ایک لفظ "نروان" سے حل کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب زندگی مصیبت ہے اور خواہش اس مصیبت کی جڑ، تو انسان کے لئے اصلی راحت صرف نیستی، فنا، اور عدم محض ہی ہے، اور وہ خواہش، احساس اور شعور کو بالکل مٹا دینے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان دنیا کے تمام علائق سے منقطع ہو جائے، کسی چیز کی محبت، کسی شے کی تمنا، کسی لذت کی چاشنی، غرض اس دنیا کی کسی چیز کی طرف اپنے دل میں انجذاب نہ رکھے، اور اپنے تمام جذبات، احساسات، اور خواہشات کو اس طرح فنا کر دے کہ اس دنیا سے اس کا کوئی واسطہ و تعلق باقی ہی نہ رہے جو اسے یہاں دوبارہ لانے کا موجب ہو۔ اس طرح وہ "وجود" کی قید سے نکل کر "عدم" یا "فنائے محض" کی حالت میں چلا جائے گا۔ یہی "نروان"[1] ہے اور یہی بدھ کے نزدیک انسان کا منتہائے نظر ہونا چاہئے۔

اب چوتھا سوال یہ ہے کہ نروان تک پہنچنے کی صورت کیا ہے[2]؟ یہاں پہنچ کر بودھ کا مذہب عملی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس نے نروان تک پہنچنے کے لئے طریق ہشت گانہ تجویز کیا ہے[3]۔ اور وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے:

(۱) صحیح عقیدہ یعنی مذکورہ بالا چاروں بنیادی صداقتوں کو اچھی طرح سمجھنا،

(۲) صحیح ارادہ یعنی ترکِ لذات کا مصمم فیصلہ اور دوسروں کو تکلیف پہنچانے اور ذی روح ہستیوں کو ایذا دینے سے کامل پرہیز،

(۳) صحیح گفتار یعنی بد زبانی، یاوہ گوئی، غیبت اور جھوٹ سے احتراز،

---

[1] لفظ "نروان" کے مفہوم میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ ینس، اولڈن برگ، اور ریس ڈیوڈس وغیرہ کے نزدیک وہ نفس کی ایک حالت ہے جس میں وہ مصیبت اور خواہش سے پاک، دنیوی زندگی سے بے نیاز، اور کامل امن و سکون سے متمتع ہو جاتا ہے۔ میکس مولر، شمت، ہارڈی، سان ٹلیر، اور برنوف جیسے محققین اس مبہم تعریف پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ صاف تصریح کرتے ہیں کہ اس سے مراد انسان کا معدوم ہو جانا یا ہستی کی قید سے بالکل آزاد ہو جانا ہے۔

[2] یہ چار مسائل یعنی مصیبت، وجہ مصیبت، صورت دفع مصیبت، اور طریق دفع مصیبت، بودھ مذہب کی اصطلاح میں حقائق حسنیہ اریہ ستیہ کہلاتے ہیں۔

[3] Vinaya Texts, Vol. 1, PP. 94-97

(۴) صحیح چلن یعنی بدکاری، قتلِ نفس اور خیانت سے اجتناب۔
(۵) صحیح معیشت یعنی جائز طریقہ سے روزی حاصل کرنا،
(۶) صحیح کوشش یعنی دھرم کے احکام کے مطابق عمل کرنا،
(۷) صحیح حافظہ یعنی اپنے گذشتہ اعمال کو یاد رکھنا،
(۸) صحیح تخیل یعنی راحت اور مسرت سے بے نیاز ہو کر عدم محض (نروان) کی طرف دھیان لگانا۔[۱]

اس طریق ہشت گانہ کو عملی شکل میں لانے کے لئے بودھ نے دس اخلاقی احکام دیئے ہیں جن میں سے پانچ موکد ہیں اور پانچ غیر موکد۔ یہ احکام حسب ذیل ہیں:-

(۱) کسی کی جان نہ لو،
(۲) چوری نہ کرو،
(۳) زنا نہ کرو،
(۴) جھوٹ نہ بولو،
(۵) نشہ آور چیزیں نہ پیو،
(۶) مقرر وقت کے سوا کھانا نہ کھاؤ،
(۷) کھیل تماشے اور گانے بجانے سے پرہیز کرو،
(۸) پھول، عطر وغیرہ سے پرہیز کرو،
(۹) اچھے اور نرم بستر پر سونے سے پرہیز کرو،
(۱۰) سونا چاندی اپنے پاس نہ رکھو۔[۲]

یہی طریق ہشت گانہ اور احکام عشر بودھ مذہب کے پورے اخلاقی نظام کی بنیاد ہیں۔ بودھ نے اپنے پیروؤں کو معیشت و معاشرت کے متعلق جتنی ہدایات دی ہیں ان سب کا بنیادی پتھر نفس کشی

[۱] Warren, Buddhism in Translations, P. 373

[۲] Vinaya Texts, Part 1, P. 211

اور "ترکِ دنیا" ہے۔ چونکہ اس کی منزل مقصود "نروان" ہے، اور وہ بغیر نفس کشی کے حاصل نہیں ہو سکتی، اس لئے وہ خودی کو مٹانے کے لئے نہایت سخت ریاضتیں تجویز کرتا ہے۔ مثلاً ڈاڑھی، مونچھ اور سر کے بالوں کو نوچنا تاکہ غرورِ حسن خاک میں مل جائے، ہمیشہ کھڑے رہنا، کانٹوں یا کیلوں کے بستر پر لیٹنا، ہمیشہ ایک ہی پہلو پر سونا، بدن پر خاک ملے رہنا، اور اسی قسم کے دوسرے اعمال جو جسم کو انتہائی تکلیف میں مبتلا کرکے روح کو مضمحل اور احساس کو باطل کرنے والے ہوں[1]۔ ان کے علاوہ زندگی بسر کرنے کے عام طریقوں کے متعلق بھی بودھ نے ایسے ہی احکام دیئے ہیں۔ اس جگہ ان سب کی تفصیل دینا بہت مشکل ہے کیونکہ وہ کئی جلدوں پر محیط ہیں، تاہم مثال کے طور پر چند نقل کئے جاتے ہیں۔

چار چیزیں جن سے پرہیز کی سخت تاکید ہے، یہ ہیں (۱) عورت اور مرد کا فطری تعلق[2] (۲) چوری حتی کہ گھانس کے ایک تنکے کی بھی (۳) کسی جاندار حتی کہ چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کو بھی عمداً ہلاک کرنا (۴) اپنی طرف کسی فوق العادۃ کیفیت کو منسوب کرنا۔

مذہبی زندگی اختیار کرنے کے بعد انسان نئے کپڑے نہ پہنے، کوڑے پر پڑے ہوئے چیتھڑے یا قبرستان سے مردوں کے کفن لیکر ان کی گدڑیاں سی لینی چاہئیں[3]۔ مگر اس قسم کی گدڑیاں بھی ایک وقت میں تین سے زیادہ نہ ہوں۔

---

[1] بودھ نے اس قسم کی بہت سی ریاضتیں تجویز کی تھیں جن کی تفصیل "مکالمات بودھ" Dialogues of Buddha, PP. 226-32 میں ملے گی۔

[2] اس میں جائز اور ناجائز کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ "ونای پٹک" میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بھکشو نے مذہبی زندگی اختیار کرنے کے بعد جب اپنی منکوحہ بیوی سے خلوت کا تعلق باقی رکھنا چاہا تو بودھ نے اس فعل سے اس کو سختی سے منع کر دیا۔ (حصہ اوّل صفحہ ۲۳۴)
Vinaya Texts. Part 1, PP. 235-36

[3] بودھ مذہب کی روایات میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب اُرویلا کے سردار کی لڑکی مر گئی اور ایک قریب کے قبرستان میں اسے دفن کر دیا گیا تو ایک روز بودھ نے اس کی قبر کھولی، اس کا کفن نکالا، قریب کے ایک تالاب میں لے جاکر اس کو دھویا اور اپنے ہاتھ سے اس کا کرتہ سی کر پہن لیا۔ Sant Hilaire, Buddha and his Religion, P. 50

بسر اوقات کے لئے کوئی پیشہ نہ کرے، ایک لکڑی کا چنبل لیکر خاموشی کے ساتھ در بدر بھیک مانگتے پھرنا چاہئے۔ یہ بھیک کی روزی ہی بودھ مذہب میں سب سے زیادہ پاک روزی ہے[1]۔

رہنے کے لئے کوئی مکان نہ بنائے، جنگل میں رہنا چاہئے اور درختوں کے سایہ میں پناہ لینی چاہئے۔ بیمار ہو تو کوئی دوا استعمال نہ کرے، پیشاب کی تحلیل اس کے لئے کافی وسیلۂ علاج ہے[2]۔

اپنے جسم کو صاف رکھنے کی کوشش بھی نہ کرے، حد سے حد پندرہ دن میں ایک مرتبہ نہانا جائز ہے[3]۔

اپنے پاس روپیہ پیسہ بالکل نہ رکھے۔ تجارت، لین دین، خرید و فروخت اور تمام ایسے کاموں سے پرہیز کرنا چاہئے جن میں چاندی سونا استعمال کیا جاتا ہو[4]۔

اچھی قسم کا بستر بھی نہ رکھے، ایک موٹا جھوٹا کمبل رکھنا چاہئے اور اس ایک کمبل کو کم از کم چھ سال چلانا چاہئے[5]۔

بودھ مذہب کی اصلی کمزوری یہ اُس پورے اخلاقی نظام کا خلاصہ ہے جس کا ایک جزو اہنسائی تعلیم ہے۔

بلاشبہ اس میں بعض نہایت عمدہ اخلاقی ہدایات بھی موجود ہیں۔ ناانصافی ہوگی اگر ہم اس پرہیزگاری اور پاک سیرتی کی تعریف نہ کریں جس کی تعلیم بودھ نے دی ہے اور جس کا ایک مکمل عملی نمونہ خود اس نے اپنی پر عظمت زندگی میں پیش کیا ہے۔ لیکن فروع میں اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھنے کے باوجود اصول میں یہ پورا نظام اول سے لیکر آخر تک غلط ہے۔ اس کی بنیاد ایک غلط عقیدہ پر ہے، حیاتِ انسانی کے متعلق اس کا نظریہ غلط ہے، اس نے ایک غلط مقام سے انسان اور اس کی زندگی پر نظر ڈالی ہے، ایک غلط مقام کو انسان کی منزلِ مقصود قرار دیا ہے، اور ایک غلط راستہ اس تک پہنچنے کے لئے تجویز کیا ہے۔ بودھ دراصل دنیا کے حوادث و تغیرات

[1] خود بودھ اپنے وہار سے نکل کر روزانہ بھیک مانگنے جایا کرتا تھا۔ اسی لئے وہ اپنے پیرؤوں کو بھکشو اور خود اپنے آپ کو مہا بھکشو یعنی سب سے بڑا بھکاری کہتا ہے۔ Sant Hilaire, Buddha and his Religion, P. 101

[2] Vinaya Texts, Part 1, PP. 173-74

[3] Vinaya Texts, Part 1, P. 44

[4] Vinaya Texts, Part 1, PP. 26-27

[5] Vinaya Texts, Part 1, PP. 24-25

اور زندگی کے انقلاب و تحول کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا ہے۔ وہ ان کی اصلی علت کو سمجھنے، ان کی گہرائیوں تک پہنچ کر حقیقت کا پتہ لگانے، اور مردانگی کے ساتھ ان کا مقابلہ کر کے کسی بلند تر نصب العین کی طرف اقدام کرنے کے بجائے ان کا ایک سطحی مطالعہ کرتا ہے اور ایک سرسری نظر ڈال کر اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ انسان کی زندگی عبث ہے، یہ سارا کارخانہ دنیا بے معنی ہے، اس میں انقلاب اور گردش کا جو سلسلہ جاری ہے وہ کسی سبب و علت اور مقصد و منشا کے بغیر صرف انسان کو دکھ دینے اور ستانے کیلئے چل رہا ہے۔ انسان کو عقل، احساس، ادراک، شعور، جذبات، خواہشات اور جسمانی قوتیں جو کچھ حاصل ہیں سب اسے مصیبت میں مبتلا کرنے کے لئے ہیں اور ان کا کوئی اعلیٰ مصرف نہیں ہے۔ دنیا کی دولت و ثروت، اس کی تہذیب، اس کا تمدن، اس کی سیاست، اس کی حکومت، اس کی صنعت و تجارت، غرض اس کے سارے کاروبار بے فائدہ ہیں۔ یہ سب تعلقات کے پھندے ہیں جو انسان کو بار بار زندگی کی طرف کھینچ لاتے ہیں اور تناسخ کے ایک دائمی چکر میں مبتلا رکھتے ہیں پس اس دنیا میں بجز اس کے انسان کا اور کوئی کام نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات کے سوا تمام خارجی تعلقات سے منقطع ہو جائے اور اپنی ذات کو بھی ہر قسم کی لذتوں سے محروم کر کے، طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کر کے اس حد تک مٹائے کہ وہ "ہستی" اور "وجود" کی قید سے آزاد ہو کر "نیستی" اور "عدم" کی سرحد میں چلی جائے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص دنیا کے مصائب سے خوفزدہ ہو کر خود دنیا ہی کو چھوڑ دیتا ہے، اس کے تمام تمدنی و اجتماعی علائق سے الگ ہو کر صرف اپنی نجات کی فکر میں لگ جاتا ہے، اور اس نجات یا عدم کی منزل تک پہنچنے کے لئے بھی وہ راستہ اختیار کرتا ہے جو دنیا کے اندر سے نہیں بلکہ باہر ہی باہر گذر جاتا ہے، اس سے ہرگز امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے خاندان، اپنی قوم، اپنے وطن، اور اپنے ابنائے نوع کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی شجاعانہ جد و جہد کریگا۔ اپنے دل و دماغ کی قوتوں اور اپنے مادی و معنوی وسائل کو اولوالعزمی کے ساتھ سوسائٹی کی ترقی و اصلاح کے کام میں لگائے گا، ظلم و عدوان، فتنہ و فساد، طغیان و سرکشی، اور گمراہی و ضلالت سے بہادرانہ جنگ کر کے دنیا میں عدل و انصاف، امن و امان اور حق و صداقت کا علم بلند کریگا، اور ان مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کریگا جو قدرتی اسباب کے ماتحت ہر کام میں انسان کو پیش آتی ہیں۔ یہ جد و جہد، یہ عملی سرگرمی، یہ سرفروشی و جانبازی، یہ میدان جنگ کی مصیبتیں، یہ

تیر و تفنگ کی پروا نہیں ہے۔ یہ سیاست و فرمانروائی کی بوجھل ذمہ داریاں تو وہی شخص اٹھا سکتا ہے جو اس دنیا کو جائے عمل سمجھتا ہے، جس کے پیشِ نظر زندگی کا ایک بلند نصب العین اور اعلیٰ مقصد ہے، جو اپنے آپ کو ایک اہم خدمت پر مامور اور ایک بالاتر ہستی کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے، اور جس کو یقین ہے کہ اس دنیا میں وہ جتنا زیادہ عمل کرے گا اتنا ہی زیادہ انعام مستقبل کی دائمی زندگی میں پائے گا۔ ورنہ جو غریب پہلے ہی اپنی جان سے بیزار ہو، اپنے عمل کے نتائج سے مایوس ہو، اپنے گردوپیش کی کثافت سے شکستہ خاطر ہو، دنیا کے ہر حادثہ سے ڈر کر، ہر مصیبت سے سہم کر، ہر انقلاب سے خوف کھا کر، عدم کی گود میں پناہ لے رہا ہو، اس بزدل، پست ہمت، اور بیچارہ غریب انسان سے کب یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ذمہ داریوں کے اس بھاری بوجھ کو اٹھائے گا اور خواہ مخواہ اپنی جان کو جہاد و قتال اور سیاست و فرمانروائی کی مصیبت میں مبتلا کرے گا۔ اس نے تو پہلے ہی دنیا کے جھگڑوں کو چھوڑ کر موت، اور دائمی موت کو اپنی زندگی کا منتہائے نظر بنالیا ہے، پھر اسے کیا پڑی ہے کہ شمشیر بکف ہو کر میدانِ عمل میں نکلے اور اس دنیا کے انتظام میں اپنا وقت ضائع کرے جس کی زندگی کو وہ بیکار، اور جس کے سارے کارخانہ کو وہ بے حقیقت سمجھتا ہے؟

پس بودھ مذہب جو اہنسا کا قائل ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا اور اس کے معاملات کی ذمہ داریوں کو قبول کرتا ہے اور اس کے باوجود جنگ و خونریزی کو غیر ضروری سمجھتا ہے، بلکہ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو دنیا اور اس کے معاملات سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کو جنگ و پیکار سے بھی اجتناب ہے۔ اس نے اہنسا کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کی زندگی میں تلوار کا کوئی کام نہیں ہے، اور اس نصب العین تک پہنچنے میں اس سے کسی قسم کی مدد نہیں ملتی جو ایک بودھ سنیاسی کا منتہائے نظر ہے۔

پیروانِ بودھ کی زندگی پر اہنسا کا اثر بودھ مذہب کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں کوئی طاقتور تہذیب قائم نہ کر سکا۔ اس میں اتنی قوت بھی پیدا نہیں ہوئی کہ کسی تہذیب کو شکست دے کر اپنا اثر قائم کر دے۔

[1] بودھ مذہب نے ترکِ دنیا کی جو تعلیم دی ہے اس پر یہاں تبصرہ نہیں کیا گیا، چونکہ آگے چل کر مسیحیت کے باب میں بھی ہم کو یہی بحث کرنی ہے اس لئے یہاں اسے چھوڑ دیا گیا ہے۔

جن جن ملکوں میں وہ پہنچا ان کی اخلاقی زندگی میں ایک منفی تغیر پیدا کرنے میں تو اسے ضرور کامیابی ہوئی مگر ان کے طرزِ سیاست اور ان کے نظامِ تمدن کو بدل کر ایک بہتر نظام قائم کرنے میں نہ وہ کامیاب ہو سکا اور نہ اس کی اس نے کوشش کی۔ بلاشبہ اس کو دنیا میں بہت اشاعت نصیب ہوئی۔ شرقِ اوسط اور مشرقِ اقصیٰ میں اس کو جتنا عروج حاصل ہوا کسی اور کو نہ ہو سکا۔ انسانی آبادی نے اس کو اتنی کثرت سے قبول کیا کہ آج بھی اس کے پیروؤں کی تعداد دنیا کے ہر مذہب سے بڑھی ہوئی ہے لیکن تاریخ میں اس قسم کی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ بودھ مذہب کے اثر سے کسی قوم کی زندگی میں کوئی بڑا انقلاب ہوا ہو، یا اس نے دنیا میں کوئی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہو۔ بخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کہیں اس کا مقابلہ کسی طاقتور تہذیب سے ہوا اس کو سخت شکست اٹھانی پڑی۔ ہندوستان جو اس کی جنم بھومی ایک عرصہ تک اس کا حلقہ بگوش رہا۔ پہلی صدی عیسوی میں تقریباً سارا ملک اس کا پیرو تھا۔ تیسری صدی میں بھی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی بودھ مذہب رکھتی تھی۔ چوتھی صدی میں جب فاہیان ہندوستان آیا ہے تو اس وقت بھی یہاں اس مذہب کا بول بالا تھا لیکن اس کے بعد جب برہمنی مذہب نے کروٹ بدلی تو اس کو تین صدی کے اندر اندر اس کے لئے میدان خالی کر دینا پڑا اور اس ملک سے اس کا نام ایسا مٹ گیا کہ آج ۳۲ کروڑ کی آبادی میں مشکل سے تین چار لاکھ بودھ نظر آتے ہیں۔[1] اسی طرح افغانستان[2] میں اشوک کے اثر سے بودھ مذہب کو کافی اشاعت نصیب ہوئی اور دوسری صدی عیسوی میں تو خود کابل کا بادشاہ مینانڈر یا ملندا بودھ مذہب کا پیرو ہو گیا تھا، مگر جب اسلام کی طاقتور تہذیب سے اس کا

---

[1] ریس ڈیوڈس نے اپنی کتاب بودھسٹ ہند Buddhist India میں اس مذہب کے اسباب زوال پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ برہمنی مذہب کے پیروؤں نے اسے تلوار سے نہیں مٹایا۔ اگر اس تاریخی تحقیق کو مان لیا جائے تو یہ بودھ مذہب کی کمزوری پر اور بھی زیادہ قوی حجت ہے۔ تلوار کے زور سے مٹ جانا تو صرف مادی قوت کی کمی پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن تلوار کے بغیر محض پرامن مقابلہ ہی میں فنا ہو جانا تو اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یہ مذہب معنوی قوت کے اعتبار سے برہمنی مذہب کے مقابلہ میں کمزور تھا۔

[2] Smith, Early History of India, P: 225

مقابلہ ہوا تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ٹھہر سکا چین میں اس کو جو کچھ ثبات نصیب ہوا وہ صرف تاؤازم Taoism کی مساعدت کا نتیجہ تھا، ورنہ کنفیوشس کے مذہب نے تو اس کا خاتمہ ہی کر دیا تھا[1]۔ جاپان میں بھی شنٹو مذہب سے بہت کچھ لے دے کر اسے مصالحت کرنی پڑی حتیٰ کہ اس کے مقابلہ میں اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے بنیادی عقائد بھی بدل دینے پڑے[2]۔ باقی رہے دوسرے ممالک مثلاً سیلون، برما، تبت وغیرہ تو وہاں کوئی ایسی طاقتور تہذیب ہی نہ تھی جو اس کی مزاحمت کرتی، اس لئے وہ آسانی سے ان پر چھا گیا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس نے کسی زمانہ میں بھی ان ملکوں میں تہذیب و تمدن کی روح نہیں پھونکی جس طرح پہلے وہ بے جان اور غیر متحرک تھے اسی طرح بودھ مت کے عہد میں بھی رہے۔

علاوہ بریں یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بودھ مذہب نے کسی جگہ حکومت کا مقابلہ کرنے اور سوسائٹی کے بگڑے ہوئے نظام کو درست کرنے کی جرأت نہیں کی۔ بودھ کے دستور العمل میں سیاست کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہے۔ اس نے حکومت میں حصہ لینے یا اس کو بدلنے کے بجائے ہر حال میں اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے، عام اس سے کہ وہ جابر و ظالم ہو یا عادل و منصف[3]۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اس نے شیطانی قوت کے مقابلہ میں عجز و انکسار اور ظلم کے مقابلہ میں مجبورانہ برداشت کی ایسی تعلیم دی ہے کہ اس کا کوئی پیرو سخت سے سخت مظالم پر بھی اُف نہیں کر سکتا۔ اس کا قول یہ ہے کہ انسان پر اس زندگی میں جتنے مصائب نازل ہوتے ہیں سب اُن گناہوں کا نتیجہ ہیں جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں کئے تھے، لہٰذا جب کسی شخص پر کوئی دشمن ظلم کرے تو اسے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ ظالم قصوروار نہیں ہے بلکہ میں خود قصوروار ہوں، میں نے گذشتہ جنم میں کوئی ایسا ہی گناہ کیا ہوگا جس کی یہ سزا مجھ کو مل رہی ہے[4]۔ یہ مذہبی عقیدہ بودھ کے پیروؤں میں غیرت و انتقام کے جذبات کو ٹھنڈا کر کے ایک ایسی انفعالی کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ خوشی کے ساتھ ہر تذلیل و توہین اور

---

[1] Haekman, Buddhism As A Religion, P. 83

[2] Hackman, PP. 90-91

[3] Vinaya Tsxts, Part 1, P. 301

[4] Buddha And His Relion, PP. 150-51

ظلم و جور کو برداشت کر لیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایک جابر حکومت کے لئے اس سے زیادہ مرغوب چیز اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ ایسا مذہب اس کے لئے خطرہ ہونے کے بجائے مزید استحکام کا موجب ہوتا ہے جو رعایا اس قسم کے عقائد پر ایمان رکھتی ہو اسے اطمینان کے ساتھ ہر قسم کے ظالمانہ قوانین اور جابرانہ احکام کا تابع بنایا جا سکتا ہے، اس کو ہر طرح ٹیکسوں اور رشوتوں کے ذریعہ لوٹا جا سکتا ہے، اس کی جان و مال اور عزت و آبرو پر ہر قسم کے حملے کئے جا سکتے ہیں، اور اسے ظالم حکمرانوں کی شیطانی خواہشات کے لئے ہر طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بودھ مذہب کو حکومتوں سے بہت کم مقابلہ کی نوبت پیش آئی ہے۔ بلکہ اکثر ملکوں میں تو حکومتوں نے اس کی مزاحمت کرنے کے بجائے سرگرمی کے ساتھ تائید و حمایت کی ہے۔ بودھ کی دعوت شروع ہوتے ہی مگدھ کے راجہ بمبسار نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے مذہب کی حمایت میں ایک فرمان شائع کیا۔[1] اس کے بعد اس کا بیٹا اجات شترو بھی بودھ کا معتقد اور اس کے مذہب کا سرگرم حامی رہا۔ کوسالا کے راجہ پاسنادی (اگنی دت) نے خود اس کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی، اس کے مذہب کو قبول کیا، اور اس سے تعلقات بڑھانے کے لئے شاکیہ خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔[2] اس کے علاوہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سدر اسینیاس کا راجہ اودتی پتہ، اور ایک دوسرا راجہ ایلیا بھی بودھ کا مرید اور اس کا مؤید تھا۔[3]

اس دور سے گذر کر تیسری صدی قبل مسیح میں ہم دیکھتے ہیں کہ اشوک نے اس مذہب کی سرپرستی کی اور اپنے تمام شاہانہ وسائل استعمال کر کے نہ صرف اطراف و اکناف ہند میں بلکہ دور دور کے ممالک میں بھی اسے پھیلا دیا۔ پھر پہلی صدی عیسوی میں کنشک نے اس مذہب کی سرگرمی کے ساتھ حمایت کی۔ اس کے بعد تیسری صدی عیسوی میں وکرما جیت اول نے خود برہمنی مذہب رکھنے کے باوجود بودھ مت کی سرپرستی کی اور اس کو تقویت پہنچائی۔ ساتویں صدی میں پھر ایک طاقتور راجہ ہرش کی حمایت اس کو حاصل ہوئی اور اس نے اتنے زور کے

---

[1] Vinaya Tsxts, Part 1, PP. 136-197

[2] Buddhist India, PP. 10-11

[3] Buddhist India, P. 16

ساتھ اس کی حمایت کی، تو برہمنی مذہب کے شیدائی اس کے قتل کی سازشیں کرنے لگے[1]۔ ہندوستان سے باہر تبت اور منگولیا میں قبلائی خاں نے اس مذہب کی اشاعت میں اپنی پوری قوت صرف کر دی، کیونکہ وہ سیاسی وجوہ سے اپنی مملکت کے لئے اس کو مفید سمجھتا تھا[2]۔ چین میں شاہ منگ ٹی نے خود اس کے مبلغوں کو دعوت دی اور بڑھ کر اس کا استقبال کیا[3]۔ اس کے بعد بھی اکثر بادشاہ اس کی تائید و حمایت کرتے رہے۔ یہی حال دوسرے ممالک کا بھی ہے جن کا حال تاریخ کا تتبع کرنے سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے۔

پس بودھ مذہب کو دنیا میں جو اشاعت نصیب ہوئی اور صدیوں کے پیہم انقلابات کے باوجود وہ اکثر ممالک میں زندہ رہا، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ طاقتور تہذیب رکھتا تھا، یا اس کی قوتِ حیات مضبوط تھی، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ جابرانہ فرمانروائی کے آگے ہمیشہ سر جھکاتا رہا، اس نے ظلم کے مقابلہ کی کبھی جرأت نہیں کی اور انسانیت کو سرکش حکمرانوں کے تسلط سے نجات دلانا کیا معنی، اس کا خیال تک نہیں کیا۔ اس لئے حکومت نے ہمیشہ اس کی تائید کی اور اس کے وجود کو اپنے غلبہ و قہر کے لئے مفید سمجھا۔

اس مختصر تبصرہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جنگ کے معاملہ میں اسلام اور بودھ مذہب کے درمیان کس قسم کا اختلاف ہے۔ اسلام کے نزدیک دنیا میں انسان ایک بہت بڑے مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی نجات کا راز اسی دنیا کو بہترین اسلوب سے برتنے میں مضمر ہے۔ اس لئے وہ انسان کو ہر اس طریقِ عمل کے اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے جو اس کی اور اس کے ابنائے نوع کی اخلاقی و مادی فلاح اور دنیوی زندگی کے بہترین انتظام کے لئے ضروری و مفید ہے۔ بخلاف اس کے بودھ مذہب کی نظر میں انسان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے اور اس کی نجات بس اسی میں ہے کہ اس دنیا اور اس کے تمام تعلقات، حتیٰ کہ خود اپنی ذات سے بھی کنارہ کش ہو جائے۔ اس لئے وہ اس کو کسی ایسی عملی کوشش یا ذہنی دلچسپی کی اجازت نہیں دیتا جس کی بدولت دنیا کی کسی چیز سے اس کا رابطہ و تعلق قائم رہتا ہو۔ اب عقل سلیم خود فیصلہ کر سکتی ہے کہ

[1] Smith, Early History of India, P. 349

[2] Buddhism As A Religion, PP.73-74

[3] Buddhism As A Religion, p 177

آیا اسلام کا جہاد انسانیت کے لئے زیادہ مفید ہے یا بودھ مذہب کی اہنسا؟

۴ - مسیحیت

دوسرا مذہب جو جنگ کے مسئلہ میں اسلام سے اصولی اختلاف رکھتا ہے مسیحی مذہب[1] ہے یہودی مذہب کی طرح اس کے متعلق بھی ہماری معلومات کا واحد ذریعہ ایک ہی کتاب ہے جس کو تمام مسیحی دنیا اپنے مذہب کی بنیادی کتاب تسلیم کرتی ہے، اور وہ انجیل ہے لیکن قبل اس کے کہ ہم اصل مسئلہ کے متعلق اس سے استفسار کریں، یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ آج وہ جس صورت میں موجود ہے اس سے صرف موجودہ مسیحیت کے معتقدات ہی ہم کو معلوم ہو سکتے ہیں، ورنہ یہ سوال کہ فی الاصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کیا تھی، اُس سے حل نہیں ہوتا۔ چونکہ آئندہ مباحث کو سمجھنے کے لئے اس مقدمہ کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے اس لئے آگے بڑھنے سے پہلے انجیلی صحائف کی تاریخی حیثیت پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

مآخذ کی تحقیق آج ہم جس مجموعہ کو انجیل کہتے ہیں وہ در اصل چار بڑے صحیفوں پر مشتمل ہے، متی، مرقس، لوقا، یوحنا۔ لیکن ان میں سے کوئی صحیفہ بھی حضرت عیسیٰؑ کا نہیں ہے جس طرح قرآن مجید میں وہ تمام منزل من اللہ آیات اور سورتیں جمع ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں اس طرح کسی کتاب میں وہ وحیاں ہم کو یکجا نہیں ملتیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھیں۔ پھر وہ مواعظ و نصائح بھی ہم کو خود حضرت عیسیٰؑ کے اپنے الفاظ میں کہیں نہیں ملتے جو انہوں نے اپنی پیغمبرانہ زندگی کے زمانہ میں مختلف مواقع پر ارشاد

[1] مسیحی مذہب سے مراد فی الحقیقت وہ مذہب نہیں ہے جس کی تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی بلکہ وہ مذہب ہے جو حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ہمارے پاس اس بات کے لئے قوی دلائل ہیں کہ اس مسیحیت کی تعلیم حضرت عیسیٰ نے نہیں دی تھی بلکہ وہ تو وہی اسلام لیکر آئے تھے جو ان سے پہلے سارے پیغمبر لائے تھے اور ان کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے آگے چل کر ہم ان دلائل میں سے بعض کو بیان بھی کریں گے۔ یہاں ہم صرف اس بات پر تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم مسیحیت پر یہاں جو بحث کر رہے ہیں وہ در اصل دین مسیح سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس دین سے متعلق ہے جو مسیح علیہ السلام کے نام پر بنایا گیا ہے۔

فرمائے تھے۔ یہ صحیفے جو ہم تک پہنچے ہیں نہ خدا کا کلام ہیں، نہ حضرت عیسیٰؑ کا۔ بلکہ در اصل حضرت عیسیٰ کے حواریوں بلکہ حواریوں کے بھی شاگردوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جن میں ان لوگوں نے اپنے اپنے علم و فہم کے مطابق حضرت کے حالات اور ان کی تعلیمات کو جمع کیا ہے۔

لیکن یہ کتابیں خود اس قدر مجہول الاصل ہیں کہ ان پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا پہلی کتاب مسیح کے حواری متی کی طرف منسوب ہے اور یہ تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ متی کی لکھی ہوئی نہیں ہے متی کی اصل کتاب جس کا نام لوجیا Logia تھا، مفقود ہے۔ جو کتاب متی کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس کا مصنف کوئی گمنام شخص ہے جس نے دوسری کتابوں کے ساتھ لوجیا سے بھی استفادہ کیا تھا۔ خود متی کا ذکر اس میں اس طرح کیا گیا ہے جیسے کسی غیر آدمی کا کیا جاتا ہے[1]۔ پھر اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر مرقس کی انجیل سے ماخوذ ہے کیونکہ اس کی ۱۰۶۸ آیات میں سے ۵۰۰ بعینہٖ وہی ہیں جو مرقس کی انجیل میں آئی ہیں۔ حالانکہ اگر اس کا مصنف متی حواری ہوتا تو اس کو ایک ایسے شخص کی کتاب سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہ تھی جو نہ حواری تھا اور نہ حضرت عیسیٰ سے کبھی ملا تھا۔ مسیحی علما کا خیال ہے کہ یہ کتاب ۷۰ء میں یعنی مسیح سے ۴۱ برس بعد لکھی گئی ہے اور بعض کا خیال ہے کہ ۹۰ء کی تصنیف ہے۔

دوسری کتاب مرقس کی طرف منسوب ہے اور عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ مرقس خود ہی اس کا مصنف ہے لیکن یہ ثابت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ سے کبھی نہیں ملا اور نہ ان کا مرید ہوا[2]۔ وہ در اصل پطرس حواری St. Peters کا مرید تھا اور جو کچھ ان سے سنتا تھا اسے یونانی زبان میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے

---

[1] متی باب ۹ آیت ۹ میں لکھا ہے:-

"اور یسوع نے وہاں سے آگے بڑھ کر متی نام ایک شخص کو محصول کی چوکی پر دیکھا"۔

ظاہر ہے کہ مصنف خود اپنا تذکرہ اس طرح نہیں کر سکتا تھا۔

[2] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دیئے جانے کے وقت وہ تماشائی کی حیثیت سے موجود تھا مگر اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔

عیسائی مصنفین اس کو عموماً "پطرس کا ترجمان" کہا کرتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب ۶۳ء اور ۷۰ء کے درمیان کسی زمانہ میں لکھی گئی ہے۔

تیسری کتاب لوقا کی طرف منسوب ہے اور یہ بالکل مسلم ہے کہ لوقا نے کبھی مسیح کو نہیں دیکھا اور نہ ان سے استفادہ کیا۔ وہ پولوس (St. Paul) کا مرید تھا، ہمیشہ اسی کی صحبت میں رہا، اور اس نے اپنی انجیل میں اسی کے خیالات کی ترجمانی کی، چنانچہ خود پولوس اس کی انجیل کو اپنی انجیل کہتا ہے لیکن یہ ثابت ہے کہ سینٹ پال خود بھی مسیح کی صحبت سے محروم تھا اور مسیحی روایات کے مطابق واقعۂ صلیب کے ۶ برس بعد اس مذہب میں داخل ہوا۔ اس لئے لوقا اور مسیح کے درمیان سلسلۂ روایت کی ایک کڑی بالکل غائب ہے۔ انجیل لوقا کی تاریخ تحریر بھی متعین نہیں ہے بعض اس کو ۵۷ء کی تصنیف بتاتے ہیں اور بعض ۷۴ء کی۔ مگر ہارنک، ہیگنفرٹ اور پلومر جیسے محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ ۸۰ء سے پہلے نہیں لکھی گئی۔

چوتھی کتاب جو یوحنا کی انجیل کہلاتی ہے جدید تحقیقات کے مطابق مشہور یوحنا حواری کی لکھی ہوئی نہیں ہے، بلکہ کسی اور مجہول الاحوال شخص کی ہے جس کا نام یوحنا تھا۔ یہ کتاب مسیح سے بہت بعد ۹۰ء میں یا اس کے بھی بعد لکھی گئی ہے۔ ہارنک اس مدت کو ۱۱۰ء تک بڑھا دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں سے کسی ایک کا سلسلہ بھی مسیح تک نہیں پہنچتا اور ان کی سند پر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ مسیح نے کیا کہا تھا اور کیا نہیں کہا تھا۔ لیکن زیادہ عمیق تحقیقات سے ان کتابوں کی دستاویزی حیثیت اور بھی زیادہ مشکوک ہو جاتی ہے۔

اولاً چاروں انجیلوں کے بیانات میں اختلاف ہے، حتیٰ کہ پہاڑی کے وعظ کو بھی، جو مسیحی تعلیم کا اصل الاصول ہے، متی، مرقس اور لوقا تینوں نے مختلف اور متضاد طریقوں سے بیان کیا ہے۔

ثانیاً، چاروں انجیلوں میں ان کے مصنفین کے خیالات و تاثرات صاف طور پر نمایاں ہیں۔ متی کے مخاطب یہودی معلوم ہوتے ہیں، اور وہ ان پر اتمام حجت کرتا نظر آتا ہے۔ مرقس کے مخاطب رومی ہیں اور وہ ان کو اسرائیلیات سے روشناس کرانا چاہتا ہے۔ لوقا سینٹ پال کا وکیل ہے اور دوسرے حواریوں کے خلاف اس کے دعاوی کی تائید کرنا چاہتا ہے۔ یوحنا ان فلسفیانہ خیالات سے متاثر نظر

آتا ہے جو پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں مسیحیوں کے درمیان پھیل گئے تھے۔ اس طرح ان چاروں انجیلوں کے درمیان معنوی اختلاف، لفظی اختلاف سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔

ثالثاً، اناجیل سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی ہیں، حالانکہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے تمام حواریوں کی زبان عبرانی تھی۔ زبان کے اختلاف سے خیالات کی تعبیر میں اختلاف ہو جانا قدرتی بات ہے۔

رابعاً، اناجیل کو ضبط تحریر میں لانے کی کوئی کوشش دوسری صدی عیسوی سے پہلے نہیں کی گئی۔ ۱۵۰ء تک عام خیال یہ تھا کہ زبانی روایت تحریر سے زیادہ مفید ہے۔ دوسری صدی کے آخر میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا لیکن اس زمانہ کی تحریروں کو مستند نہیں سمجھا جاتا۔ عہد جدید (New Testament) کا پہلا مستند متن قرطاجنہ کی کونسل میں منظور کیا گیا جو ۳۹۷ء میں منعقد ہوئی تھی۔

خامساً، اناجیل کا قدیم ترین نسخہ جو اس وقت دنیا میں موجود ہے چوتھی صدی عیسوی کے وسط کا ہے۔ دوسرا نسخہ پانچویں صدی کا اور تیسرا ناقص نسخہ بھی جو پاپائے روم کے کتب خانہ میں ہے، چوتھی صدی سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔ پس یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلی تین صدیوں میں جو انجیلیں رائج تھیں ان سے موجودہ اناجیل کس حد تک مطابقت رکھتی ہیں۔

سادساً، اناجیل کو قرآن کی طرح حفظ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ ان کی اشاعت کا انحصار ابتداءً روایت بالمعنی پر رہا جس میں حافظہ کے اختلال، اور راویوں کے ذاتی خیالات کا اثر آنا قدرتی امر ہے۔ بعد میں جب کتابت کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ نقل نویسوں کے رحم پر تھیں۔ نقل کرتے وقت ہر شخص کے لئے آسان تھا کہ جس چیز کو اپنے عقائد کے خلاف دیکھے حذف کر دے اور جس کی کمی پائے بڑھا دے۔[1]

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اناجیل اربعہ میں ہم کو مسیح کی اصل تعلیم

---

[1] یہ پوری بحث ذیل کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔

Dummellow, Commentary on The Holy Bible

Y. K. Cheyne, Encyclopaedia Biblica

Millman, History of Christianity

ملتی ہے پس آئندہ صفحات میں مسیحیت کے متعلق جو کچھ کہا جائیگا وہ اس دین کے متعلق نہ ہوگا جس کی تعلیم مسیح علیہ السلام نے دی تھی، بلکہ اس مسیحیت کے متعلق ہوگا جس پر آج کل کی مسیحی دنیا اعتقاد رکھتی ہے۔

"محبت" کی تعلیم | انجیل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت جنگ کی سخت مخالف ہے، عام اس سے کہ جنگ حق کے لئے ہو یا غیر حق کے لئے مسیح کے نزدیک مذہب کا سب سے بڑا حکم یہ ہے کہ "خدا سے محبت رکھنے کے بعد اپنے پڑوسی سے محبت رکھو" (متی ۲۲: ۳۹)۔ اور اس محبت کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ "تو اپنے بھائی پر غصہ نہ کر" (متی ۵: ۲۲)، لیکن وہ صرف محبت کرنے اور غصہ نہ کرنے ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ صاف الفاظ میں ایک سچے مسیحی کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ ظلم اور شرارت کے مقابلہ میں سر جھکا دے، اور دوسروں کی حفاظت کرنا تو درکنار، خود اپنے حق کی حفاظت بھی نہ کرے۔ ان کی تعلیم کا گل سرسبد پہاڑی کا وعظ ہے جس پر مسیحی اخلاق کی بنیاد قائم ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:-

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ تم شریر کا مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور کوئی تجھ پر نالش کرکے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لینے دے، اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے تو اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔ ... تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھو اور اپنے دشمن سے عداوت، مگر میں کہتا ہوں کہ اپنے دشمن سے محبت رکھو، جو تم پر لعنت کریں ان کے لئے برکت چاہو، جو تم سے نفرت کریں ان سے اچھا سلوک کرو، جو تمہیں ذلیل کریں اور تمہیں ستائیں ان کے لئے دعا مانگو" (متی ۵: ۳۸-۴۴)۔

"میں تم سننے والوں سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمن سے محبت رکھو۔ جو تم سے عداوت رکھیں ان کا بھلا کرو، جو تم پر لعنت کریں ان کے لئے برکت چاہو، جو تمہاری بے عزتی کریں ان کے لئے دعا مانگو، جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا بھی پھیر دے، جو تیرا چوغہ لے اس کو کرتہ لینے سے بھی منع نہ کر۔ جیسا تم اوروں سے برتاؤ چاہتے ہو تم بھی اُن کے ساتھ ویسا ہی کرو۔ اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمہارا کیا احسان ہے؟ کیونکہ گناہگار بھی اپنے محبت رکھنے

والوں سے محبت رکھتے ہیں" (لوقا ۶ : ۲۷-۳۲)

یہ تعلیم مسیحیت کی اصل الاصول ہے اور اس کا منشا خود اس کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک سچے مسیحی کو جو "آسمانی باپ کی طرح کامل" (متی ۵ : ۴۸) بننا چاہتا ہو اور جس کا نصب العین "خدائے برتر کا بیٹا" (لوقا ۶ : ۳۵) بننا ہو کسی حال میں ظلم و تعدی کا مقابلہ قوت سے نہ کرنا چاہیے، بلکہ شریرین اور مفسدین کے سامنے اپنے حقوق سے خود بخود دست بردار ہو جانا چاہیے۔

مسیحیت کا فلسفۂ اخلاق اس تعلیم کے حسن و قبح کا پورا پورا اندازہ اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک مسیحیت کی روح کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے۔

مسیحیت جس شکل میں ہم تک پہنچی ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ در اصل سنیاس، رہبانیت اور بیراگ کا مذہب ہے۔ اس میں انسان کی حضری و مدنی زندگی کے لئے کوئی دستور العمل، کوئی شریعت، کوئی ضابطۂ قوانین وضع نہیں کیا گیا ہے۔ وہ انسان کو کچھ نہیں بتاتا کہ اس پر اس کی ذات، اس کے خاندان، اس کی قوم، اس کے ابنائے نوع اور اس کے خدا کے کیا حقوق ہیں، وہ ان کو ادا کرنے کی صحیح صورت کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو مادی وسائل، اور ذہنی و جسمانی قویٰ عطا کئے ہیں ان کا مصرف کیا ہے اور اسے ان چیزوں کو کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔ عملی زندگی کے ان مسائل سے وہ کوئی بحث نہیں کرتا۔ اس کی ساری توجہات کا مرکز صرف ایک سوال ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان کس طرح "آسمانی بادشاہت" میں داخل ہو۔ یہی ایک سوال پورے مسیحی اخلاقیات کا محور ہے، اور مسیح نے جو کچھ تعلیم دی ہے اس کا اصلی مقصد اسی نصب العین تک لے جانے کے لئے انسانی جماعت کو تیار کرنا ہے۔

لیکن "آسمانی بادشاہت" مسیحیت کی نگاہ میں زمین کی بادشاہت کی ارتقائی صورت کا نام نہیں ہے۔ وہ ان دونوں کے درمیان بیج اور پھل کا تعلق تسلیم نہیں کرتی۔ بلکہ ان دونوں میں تضاد اور کلی اختلاف کی قائل ہے۔ اس کے نزدیک دنیوی بادشاہت اور آسمانی بادشاہت دو الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں بالکل اسی طرح جمع نہیں ہو سکتیں جس طرح آگ اور پانی باہم جمع نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں چیزوں کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ آسمانی بادشاہت حاصل کرنے کا راستہ بھی زمین کی بادشاہت کے راستہ سے بالکل الگ

اختیار کرتی ہے۔ ہر وہ چیز جو زمین کی بادشاہت کے ساز و سامان میں داخل ہے آسمانی بادشاہت کے ساز و سامان سے خارج ہے، اور صرف خارج ہی نہیں بلکہ اس کا وجود انسان کو آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے روکنے والا ہے۔ اسی لئے مسیحیت قدم قدم پر انسان کو تاکید کرتی ہے کہ اگر وہ آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتا ہے تو زمین کی بادشاہت کے سروسامان سے کلّی اجتناب کرے، اور اگر اس سے اجتناب نہیں کر سکتا تو آسمانی بادشاہت کی امید نہ رکھے۔ اسی اصل پر وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں رہبانیت کی تعلیم دیتی ہے اور تمدن و تہذیب سے الگ کر کے انسان کو کلیتہً تارک الدنیا بنا دینا چاہتی ہے۔ اس کی تشریح کے لئے مسیح کے چند احکام نقل کر دینا کافی ہے:-

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور اولاد اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی نفرت نہ رکھے تو وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔" (لوقا ۱۴: ۲۶)

"کیا تم گمان کرتے ہو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں؟ میں تم سے کہتا ہوں کہ نہیں، بلکہ تفریق کرانے، کیونکہ اب سے ایک گھر کے پانچ آدمی آپس میں مخالفت رکھیں گے، تین دو کے خلاف اور دو تین کے خلاف، باپ بیٹے سے مخالفت رکھے گا، اور بیٹا باپ سے، ماں بیٹی سے اور بیٹی ماں سے ساس بہو سے اور بہو ساس سے۔" (لوقا ۱۲: ۵۱-۵۳)

"تم نے مفت پایا مفت دینا۔ نہ سونا اپنے کیسہ میں رکھو نہ چاندی نہ پیتل۔ اپنے سفر کے لئے نہ جھولی لو نہ دو دو کرتے، نہ جوتیاں اور نہ لاٹھی۔" (متی ۱۰: ۸-۱۰)

"اے چھوٹے گلے نہ ڈر کیونکہ تمہارے باپ کو پسند آیا کہ تمہیں بادشاہت دے۔ اپنا مال اسباب بیچ کر خیرات کر دو اور اپنے لئے ایسے بٹوے بناؤ جو پرانے نہیں ہوتے یعنی آسمان پر ایسا خزانہ جو خالی نہیں ہوتا۔" (لوقا ۱۲: ۳۲-۳۳)

"اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال اسباب بیچ کر غریبوں کو دے دے اور میرے پیچھے ہو لے[1]۔ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا۔" (متی ۱۹: ۲۱)

[1] مسیح نے یہ حکم اس شخص کو دیا تھا جو متی، مرقس، اور لوقا کے متفقہ بیان کے مطابق قتل، زنا، چوری اور جھوٹ سے پرہیز کرتا

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولتمند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے، اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو" (متی ۱۹: ۲۳-۲۴)

"اپنے لئے زمین میں مال نہ جمع کرو، جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے . . . . . بلکہ آسمان پر جمع کرو" (متی ۶: ۱۹)

"اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کروگے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہیں معاف کریگا، اور اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کروگے تو تمہارا باپ بھی تمہیں معاف نہ کریگا" (متی ۶: ۱۴-۱۵)

"میں تم سے کہتا ہوں کہ نہ اپنی جان کی فکر کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے، نہ اپنے بدن کے لئے کہ کیا پہنیں گے۔ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بہتر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں، پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کرکے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور تم لباس کے لئے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کیسے بڑھتے ہیں۔ نہ محنت کرتے ہیں، نہ کاتتے ہیں، پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی اپنی ساری شان و شوکت کے باوجود ان میں سے کسی کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو، جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائیگی، ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو ضرور ہی پہنا دیگا۔ اس لئے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے، کیا پئیں گے؟" (متی ۶: ۲۵-۳۱)

ان اقوال سے صاف ظاہر ہے کہ آسمانی بادشاہت کی طرف لیجانے کے لئے مسیحیت جس ڈھنگ پر انسانی جماعت کی تربیت کرنا چاہتی ہے وہ تمدن اور تہذیب سے کامل انقطاع پر مبنی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ خاندانی تعلقات تمدنی زندگی کی بنیاد ہیں۔ جماعت سے انسان کا ابتدائی تعلق اپنے رشتہ داروں ہی

(بقیہ حاشیہ ۳۴۶) تھا، اپنے ماں باپ کی خدمت کرتا تھا، اور اپنے پڑوسی سے اپنے مانند محبت رکھتا تھا۔ مسیح نے اس سے کہا کہ تو کامل اس وقت ہوگا جب اپنا سارا مال اسباب بیچ کر خیرات کر دیگا۔

کے واسطہ سے ہوتا ہے، انہیں کے باہمی روابط سے ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوتی ہے، اور درحقیقت انسان کے لئے اخلاق کی بہترین درس گاہ بھی یہی ہے۔ مگر "مسیح" کے تیشہ کا سب سے پہلا وار اسی اصل الاصول پر پڑتا ہے اور وہ سب سے پہلے اس رشتہ کو کاٹ دیتا ہے جو آدمی کو سوسائٹی سے منسلک کئے ہوئے ہے۔ دنیا کو برتنے اور اس کے معاملات میں حصہ لینے کے لئے سب سے پہلے جو شے انسان کو عمل پر مجبور کرتی ہے وہ پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کی فکر ہے۔ لیکن "مسیح" اس ابتدائی محرک ہی کو قتل کر دینا چاہتے ہیں تاکہ آدمی دنیا میں ویسی ہی زندگی بسر کرے جیسی ہوا کے پرندوں اور جنگلی سوسن کے درختوں کی ہے۔ انسان کی راحت و آسائش اور انفرادی و اجتماعی فلاح کے لئے مال و دولت حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ مگر "مسیح" کے نزدیک روحانی ترقی اور آسمانی بادشاہت کے لئے اس کو چھوڑ دینا ضروری ہے۔ دنیا میں نظام امن و عدل کا قیام سیاست و تعزیر اور قصاص و انتقام کے قانون پر منحصر ہے۔ مگر "مسیح" کہتے ہیں کہ آسمانی باپ اس وقت تک تمہارے قصور معاف نہ کریگا جب تک مکافات عمل کے اس پورے قانون کو لپیٹ کر نہ رکھ دیا جائے۔ غرض یہ کہ "مسیح" کے نزدیک دینداری درحقیقت ترک دنیا کا نام ہے۔ جو شخص دنیا اور اس کے اسباب کو نہیں چھوڑتا، اجتماعی تعلقات کو قطع نہیں کرتا، دنیوی کاروبار کو ترک نہیں کرتا، اور کامل ترک و تجرید کی زندگی بسر نہیں کرتا اس کے لئے آسمان کی بادشاہت میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ انسان بیک وقت ان دونوں بادشاہتوں میں داخل نہیں ہو سکتا، دین اور دنیا دونوں کو پالینا اس کے لئے ناممکن ہے۔ "مسیح" کے ارشاد کے مطابق تم بیک وقت خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے، یہ دو متضاد چیزیں ہیں، اس لئے جو ایک کا طالب ہو اسے دوسرے کی طلب چھوڑنی پڑیگی۔

"مسیح" کی اس تعلیم کو خود مسیحی علماء جس رنگ میں پیش کرتے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے ریورنڈ ڈمیلو کی تفسیر انجیل کے چند فقرات یہاں نقل کر دینا کافی ہے۔ یہ تفسیر بیس سے زیادہ مسیحی علماء کی مدد سے تیار کی گئی ہے اور انجیل کی بہترین تفاسیر میں سے ہے۔ اس کے مقدمہ میں ایک مستقل مقالہ "تعلیمات مسیح" کے عنوان پر ہے جس میں لکھا ہے:-

"مسیح نے انسانی سیرت کے لئے وہ طرز پسند کیا ہے جو بڑی حد تک دنیا کے بندھن کٹے ہوئے ہو

مختلف ہے۔ خودداری کے بجائے فروتنی، اپنے حقوق پر جمے رہنے کے بجائے بدی کے آگے سر جھکا دینا، اور دست طلبی کی جگہ قناعت، شرافت، عجز، صبر، ہمدردی، مصیبت میں خوش ہونا اور دوسرے راحت حاصل کرنا، یہ دنیا کو مسیحیت کے عطایا ہیں۔ . . . . . مگر ایک مسیحی کے کیرکٹر کی سب سے زیادہ جامع تعریف غالباً یہ ہے کہ وہ ایک یک سو آدمی ہوتا ہے۔ وہ ایک پاؤں دنیا میں اور دوسرا دین (چرچ) میں نہیں رکھ سکتا۔ وہ ایک ہی وقت میں خدا اور متاع دنیا دونوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ . . . . . مسیح کے نزدیک دنیا کے پاس انسان کو اپنی خدمت پر مجبور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ دولت ہے۔ لہٰذا ایک مسیحی بننے کے لئے پہلی اور سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ انسان دولت سے بے تعلق ہو جائے۔[ل]

مسیحی اخلاقیات کا اصلی نقص: اب یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مسیحیت میں محبت، عفو و درگذر اور تذلل و انفعال کی جو تعلیم دی گئی ہے وہ ایک ایسے اخلاقی نظام کے اجزاء میں سے ہے جو رہبانیت کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ چونکہ اس نے اخروی نجات کا راستہ دنیوی کامیابی کے راستہ سے الگ اختیار کیا ہے اس لئے وہ دنیوی معاملات کو دنیا داروں پر چھوڑ دیتی ہے، اور خود اپنے دینداروں کو لیکر الگ ہو جاتی ہے تاکہ گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر آسمانی بادشاہت حاصل کرنے کی تیاری کرے۔ ایسے مذہب میں جنگ نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ دنیا اور اس کے معاملات کی ذمہ داریاں قبول کرتا ہے اور اس کے باوجود ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قوت کے استعمال کی ضرورت نہیں سمجھتا، بلکہ در اصل اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اس کو دنیا کے معاملات ہی سے کچھ تعلق نہیں ہے تو قدرتی طور پر جنگ و خونریزی سے بھی انکار ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ فساد کو فرو کرنے کے لئے تلوار کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ خود فساد ہی کو فرو کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ نہیں کہتا کہ شرارت کا استیصال جنگ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ اس کے استیصال کے بجائے تم اس کے قہر و غلبہ کے آگے سر جھکا دو۔ وہ نہیں کہتا کہ ظلم و تعدی کے مقابلہ میں حق کی حفاظت خونریزی کے بغیر بھی ممکن ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ حق کی حفاظت ہی نہ کرو۔ اگر ظالم تمہارا حق چھینتا ہے تو

ل Commentary on The Holy Bible Dummelow, P. LXXX

چھین لینے دو۔ وہ نہیں کہتا کہ مجرموں کو تشدد کے بغیر بھی سزا دی جا سکتی ہے اور مظلوموں کا قصاص قوت کے بغیر بھی لیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ تم سرے سے سزا اور قصاص ہی کو چھوڑ دو اور کوئی ”سات دفعہ نہیں سات کے ستر گنے تک قصور کئے جائے تو اسے معاف کرتے رہو“ غرض یہ کہ دنیا میں امن قائم کرنا، اس کو بدی و شرارت سے پاک کرنا، اس میں عدل و انصاف کی حکومت قائم کرنا، اور انسانیت کو ظلم و فساد کے تسلط سے نجات دلانا سب کچھ مسیحیت کے دائرۂ عمل سے خارج ہے۔ اس نے اپنے لئے محکومی و مغلوبی اور مظلومی و منکوبی کی زندگی پسند کر لی ہے، اس لئے اگر وہ جنگ کی مخالف ہے اور بلا تمیز حق و غیر حق نفس جنگ ہی کو برا سمجھتی ہے، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، بلکہ ایسی زندگی کے لئے یہی زیادہ موزوں ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تذلل و انفعال کی تعلیم انسان کے لئے ایک دائمی اور عالمگیر قانون بننے کی کہاں تک صلاحیت رکھتی ہے؟ اس کا جواب مسیحیت خود اپنے منہ سے دے رہی ہے جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جنگ سے احتراز کا حکم خود کوئی مستقل قانون نہیں ہے، بلکہ رہبانیت و ترکِ دنیا کے ایک وسیع قانون کی دفعات میں سے ایک دفعہ ہے، تو اس سے یہ بھی لازم آیا کہ اس کا نفاذ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ پورا قانون نافذ ہو، یعنی خود مسیحیت کی تعلیم کے مطابق اس انفعالی زندگی کو انسان اسی وقت اختیار کر سکتا ہے جبکہ وہ دنیا کو چھوڑ دے اور اس کی مختلف تمدنی ذمہ داریوں سے دستبردار ہو جائے۔ ورنہ ان سب ذمہ داریوں کو قبول کرنے اور پورا کرنے کے ساتھ اس طریقہ کو اختیار کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ خود واضع کے منشا کے مطابق۔ اب اگر اس کو عالمگیر قانون قرار دیا جائے تو لامحالہ بنی نوع انسان کو تمدن و تہذیب سے کنارہ کش ہو جانا پڑیگا۔ کیونکہ جب انسان کی منزل مقصود ”آسمانی بادشاہت“ ٹھہری اور یہ مان لیا گیا کہ دنیوی زندگی کے تمام معاملات اس بادشاہت میں داخل ہونے سے روکتے ہیں، تو ضروری ہو گیا کہ نوع بشر ساری کی ساری اس منزل تک پہنچنے کے لئے اس روکنے والی چیز سے اجتناب کرے اور راہبانہ زندگی اختیار کر کے نفس کشی و ریاضت میں لگ جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا ہونا غیر ممکن ہے۔ تمام دنیا بیک وقت اپنے کاروبار بند نہیں کر سکتی، معاش کی فکر چھوڑ کر ”ہوا کے پرندوں“ اور ”جنگلی سوسن کے درختوں“ کی سی زندگی اختیار نہیں کر سکتی، تجارت، صنعت، زراعت، اور تمام دوسرے مشاغل کو

ترک کرکے تعطل و بیکاری کی حالت قبول نہیں کر سکتی حکومت اور اس کے انتظام کو چھوڑ کر خانقاہوں میں نہیں بیٹھ سکتی۔ اور اگر بفرض محال وہ ایسا کر بھی لے تو ہرگز اس شرف و عزت کی مالک نہیں رہ سکتی جو اس کو اللہ تعالیٰ نے دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں عطا فرمایا ہے۔ بلکہ سچ یوں ہے کہ زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ انسانی سوسائٹی کی یہ ایک ایسی حالت ہے جس کا متحقق ہونا ایک شاداب تخیل کے سوا کسی خارجی عالم میں ممکن نہیں ہے۔ اور جو خدانخواستہ ممکن ہو بھی جائے تو کم از کم وہ کسی ذی عقل انسان کو مطلوب و مرغوب نہیں ہو سکتی۔ پس یہ کہنا بالکل بعید از عقل ہے کہ مسیحیت کا قانون اخلاق تمام بنی نوع انسان کے لئے ایک دائمی اور عالمگیر قانون ہے۔ کیونکہ عالمگیر اور دائمی قانون صرف وہی ہو سکتا ہے جس پر تمام دنیا کے باشندے ہر حالت میں عمل کر سکتے ہیں۔

پھر یہ قانون کسی ایک پوری قوم کے لئے بھی قابل عمل نہیں ہے۔ اگر کوئی قوم من حیث المجموع اس کی پابندی قبول کرے اور ”آسمانی بادشاہت“ میں داخل ہونے کے لئے اس کی تمام ہدایات پر عمل پیرا ہونے لگے، تو اس کو سب سے پہلے اپنی حکومت کا سارا انتظام معطل کرنا پڑیگا، فوج اور پولیس منتشر کرنی ہوگی، سرحدوں کی حفاظت اور قلعوں کی نگہبانی چھوڑنی پڑے گی، اور جب اس کی کوئی ہمسایہ قوم میدان خالی دیکھ کر حملہ کردے تو مسیحی تعلیم کے مطابق وہ شریر کا مقابلہ نہ کریگی، بلکہ ایک گال کے ساتھ دوسرا گال بھی، اور کرتے کے ساتھ چوغہ بھی پیش کردیگی۔ پھر وہ اپنی ساری دولت، اپنی تجارتی کوٹھیاں، اپنی دکانیں حتیٰ کہ اپنے گھروں کا مال اسباب بھی چھوڑ دیگی کیونکہ ”دولتمند آسمانی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا“ اور حکم ہے کہ ”تو اپنا سارا مال بیچ کر خیرات کردے“۔ اس کے بعد وہ کسب معاش کے لئے محنت مزدوری کرنا بھی چھوڑ دیگی، اپنے کارخانے بند کردیگی، صنعت و حرفت، خدمت سب کچھ ترک کردے گی، اور اس کے تمام کاروباری آدمی اپنے اپنے کام چھوڑ کر صومعوں میں جا بیٹھیں گے، کیونکہ تم خدا اور دولت دونوں کی ایک ساتھ خدمت نہیں کر سکتے، اور مسیح کا حکم ہے کہ تم اپنی جان کی فکر نہ کرو۔ آخر میں اس کے لئے صرف ایک یہ ذریعہ معاش رہ جائے گا کہ زمین کی کاشت کرے اور اپنی خوراک کے لئے غلہ حاصل کرے۔ لیکن آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کے لئے اسے یہ بھی چھوڑنا پڑیگا، کیونکہ مسیح کا ارشاد ہے کہ ”ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے“۔ اس طرح وہ قوم اپنی حکومت، اپنی زمین، اپنی دولت، اپنی صنعت و تجارت، غرض اپنا سب کچھ

ان بیرونی حملہ آوروں کے سپرد کردیگی، اور ساری کی ساری قوم اُن کی غلام بن جائیگی پھر وہ "ایک کوس بیگار" میں لے جائیں گے، تو یہ "دو کوس" جائیگی، وہ ظلم کریں گے اور یہ ان کے لئے دعا مانگے گی، وہ اس پر لعنت کریں گے اور یہ ان کے لئے "برکت" چاہے گی، وہ اس کی عزت و حرمت پر حملے کریں گے، اور یہ انہیں خاموشی کے ساتھ برداشت کرتی رہیگی۔ مسیحی نقطۂ نظر سے یہ اس کے اخلاق کا منتہائے کمال ہے جس کے بعد کوئی چیز اس کو آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتی، مگر عقل و دانش کے نقطۂ نظر سے یہ ایک قوم کی پستی و تنزل کا انتہائی درجہ ہے جس کے حصول کی کوشش کو ایک عقلمند آدمی خودکشی کے سوا کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کرسکتا۔ ظاہر ہے کہ اس معنی میں دنیا کی کوئی قوم مسیحیت کے قانونِ اخلاق کو اپنا قانونِ حیات نہیں بنا سکتی، کیونکہ اس کی فطرت اسے اپنے وجود کی حفاظت اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے اس قانون کی ایک ایک دفعہ کو توڑنے پر مجبور کردے گی، اور عملاً اس کی خلاف ورزی کے بعد اعتقاداً اس پر ایمان رکھنا بے معنی ہوگا۔

اب تیسری صورت یہ ہے کہ اس کو ایک عالمگیر قانون نہ مانا جائے بلکہ ایک خاص گروہ کے لئے مخصوص سمجھ لیا جائے، جیسا کہ خود مسیح کی تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ صورت یقیناً ممکن العمل ہے اگر انسانی جماعت کے مختلف گروہ اس کی مختلف ضروریات کو انجام دیتے رہیں، کوئی تجارت میں مشغول رہے، کوئی صنعت و حرفت کا کام کرے، کوئی زراعت کرتا رہے، کوئی سیاسی امور کی تنظیم میں لگا رہے، اور اس طرح تمدن کا کارخانہ برابر چلتا رہے، تو یہ ممکن ہے کہ سوسائٹی اپنے ایک قلیل حصہ کو "ہوا کے پرندوں" اور "جنگلی سوسن کے درختوں" کی طرح بے عمل اور بیکار زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دے، اور اس کے چند افراد مسیحی اخلاق کے اس منتہائے کمال تک پہنچنے کی کوشش میں مشغول ہوجائیں جو ترکِ اسباب قطع علائق، تذلل و انفعال، اور نفس کشی و خود انکاری سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر ایک مخصوص گروہ کے لئے اس قانون کو محدود مان لینے، اور دوسری طرف اسی کو برحق اور واحد ذریعۂ نجات تسلیم کرنے کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم "نجات" یا "آسمانی بادشاہت" پر راہبوں اور سنیاسیوں کی ایک مختصر جماعت کا اجارہ تسلیم کریں، اور یہ مان لیں کہ اس چھوٹی سی "بادشاہت" کے تنگ دائرے میں عالم انسانیت کے سوادِ اعظم کو جگہ نہیں مل سکتی۔ جو لوگ نظامِ تمدن کو چلاتے ہیں، حکومت و سیاست کی تدبیر کرتے ہیں، قوم و ملک کی حفاظت میں جان لڑاتے

ہیں، اور مختلف انسانی ضروریات کو مہیا کرنے کے لئے مختلف قسم کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں، ان کے لئے اس بادشاہت کے دروازے بند ہیں، کیونکہ مسیحیت کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان بیک وقت دنیا اور دین دونوں میں پاؤں نہیں رکھ سکتا، اور آسمانی بادشاہت کا دروازہ اسی وقت کھل سکتا ہے جبکہ وہ دنیا کو چھوڑ کر مسیح کی بتائی ہوئی دینی زندگی اختیار کرے۔ اس طرح صرف ایک مختصر سے گروہ کو آسمانی باپ کی بادشاہت میں داخل ہونے کا موقع ملتا ہے، اور باقی اللہ کی ساری مخلوق اس سے محروم کر دی جاتی ہے حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی وہاں بار نہیں مل سکتا جو دنیا میں نیکی اور پاکیزگی کے ساتھ رہتے ہیں، قتل نہیں کرتے، زنا نہیں کرتے، چوری اور جھوٹ وغیرہ منہیات سے پرہیز کرتے ہیں، ماں باپ کی عزت کرتے ہیں، اپنے پڑوسی سے اپنے مانند محبت رکھتے ہیں، مگر اپنا سارا مال بیچ کر خیرات نہیں کر دیتے۔

اس نظریہ کو صحیح مان لینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم پھر پہلی صورت کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ آسمانی بادشاہت یعنی نجات کی منزل تک پہنچنے کا ذریعہ صرف مسیحیت کا قانون اخلاق ہی ہے، اور جو کوئی اس پر عمل نہیں کرتا وہ اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا، تو پھر لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑیگا کہ نوع انسانی کے لئے وہ ایک عالمگیر قانون ہے۔ کیونکہ نجات تو ہر انسان کی منزل مقصود ہے اور کسی راستہ کو اس تک پہنچنے کا واحد راستہ قرار دینا یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے اور سب کو اس کی طرف دعوت دینا مطلوب ہے۔ لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس راستہ پر تمام نوع انسانی کا جمع ہو جانا اور بالاتفاق گامزن ہونا عقلاً و عملاً ناممکن ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ مسیحیت کا بنایا ہوا قانون جس طرح دائمی اور عالمگیر نہیں ہے اسی طرح برحق اور واحد ذریعۂ نجات بھی نہیں ہے[1]۔ عالمگیر، دائمی اور واحد ذریعۂ نجات

[1] اس اشکال کو خود مسیحیوں نے بھی محسوس کیا ہے اور اسی لئے یہ عقیدہ پیدا کیا گیا ہے کہ نجات کے لئے مسیحیت کے قانون پر پوری طرح عمل درآمد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ مسیح نے خود صلیب پر چڑھ کر تمام اہل ایمان کا کفارہ ادا کر دیا ہے اور مسیح ان تمام لوگوں کے نجات دہندہ ہیں جو ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر اس مسئلہ کی کمزوری ظاہر ہے۔ اس کو تسلیم کر لینے کے بعد تو مسیحیت کے قانون اخلاق کی کوئی ضرورت باقی ہی نہیں رہتی۔ اگر یہ کفارہ کا عقیدہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی قتل کرے، چوری اور زنا کرے، ہمسایہ کو ستائے اور حرام کی کمائی کے ذخیرے جمع کرے، جب بھی آسمانی بادشاہت میں داخل ہو سکتا ہے بشرطیکہ مسیح پر ایمان لے آئے۔ اس صورت میں وہ ساری اخلاقی

تو صرف وہی قانون ہو سکتا ہے جس پر حاکم رہتے ہوئے، تاجر رہتے ہوئے، کسان رہتے ہوئے اور ہر شخص اپنے اجتماعی و انفرادی فرائض ادا کرتے ہوئے عمل پیرا ہو سکتا ہو، جس کی تعمیل ہر انسان کیلئے ناقابلِ عبور نہ ہو، ناقابلِ برداشت خطرات و مصائب اور ناقابلِ برداشت تکالیف نہ ہوں۔ جو قانون ایسا نہیں ہے وہ حق کا سیدھا راستہ ہے نہ نجات کا واحد ذریعہ ہے، اور نہ فطرت کا سچا قانون ہے۔

لیکن ہم اس نقطہ پر بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ ہم کو ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہنا چاہئے کہ مسیحیت کا قانونِ اخلاق اپنی موجودہ شکل میں فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ وہ دراصل اخلاقی فضیلت کے ایک غلط تصور کا نتیجہ ہے جس میں بے اعتدالی کے ساتھ بعض فضائل پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور بعض کو بلا ضرورت معطل کر کے انسانیت کو مفلوج کر دیا گیا ہے۔ اس نے انسانی اخلاق کی جن خوبیوں پر زور دیا ہے انکی فضیلت یقیناً مسلّم ہے۔ فروتنی، عجز و انکسار، عفو و درگذر، حلم و بردباری، صبر و تحمل کی فضیلت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ مگر تنہا انہیں صفات پر انسانی زندگی کی تعمیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر دنیا سے بدی و شرارت بالکل مٹ جائے، زمین پر انسانوں کی جگہ فرشتے بسنے لگیں، اور شیطان اپنی ذریات کو لیکر کسی اور کرہ میں چلا جائے، تب تو یہ ممکن ہے کہ انسان اپنی جسمانی قوت و شدت کا استعمال کئے بغیر اپنے حقوق، اپنی عزت اور خود اپنے وجود کی حفاظت کر سکے۔ لیکن جب دنیا میں نیکی کے ساتھ بدی بھی موجود ہے اور انسانی فطرت سے وہ شیطانی ملکات مٹ نہیں گئے ہیں جو ملکوتی فضائل کو مغلوب کرنے کے لئے ہر وقت مستعد رہتے ہیں، تو ایسی صورت میں نیکی کو تنہا چھوڑ دینا اور اللہ کی دی ہوئی قوتوں کو اس کی حفاظت کے لئے استعمال نہ کرنا صرف خودکشی ہی نہیں ہے بلکہ بدی و شرارت کی بالواسطہ امداد بھی ہے۔ حقیقتاً یہ کوئی نیکی ہی نہیں ہے کہ ظالموں کو عمداً ظلم کا موقع دیا جائے اور مفسدوں کو جان بوجھ کر فساد پھیلانے کی آزادی دے دی جائے۔ اس کو ہم کمزوری کہہ سکتے ہیں، بزدلی و

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۰) تعلیم مہمل ہو جاتی ہے جو مسیح نے اپنے مواعظ میں دی ہے، بلکہ خود مسیح کا اپنا قول بھی غلط ہو جاتا ہے کہ ان اعمال کے ساتھ کوئی شخص آسمانی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا اور اگر مسیح کی یہ بات سچی ہے تو یقیناً کفارہ کا عقیدہ باطل ہے۔ بہرحال یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں اور عقل و منطق کی رو سے کسی طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ صریح تناقض کے بغیر یہ دونوں ایک ہی مذہبی نظام کا جزو بن سکیں۔

کم حوصلگی سے موسوم کر سکتے ہیں، مگر خیر و صلاح اور نیکی و احسان سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ نیکی در اصل اعتدال کا دوسرا نام ہے، اور وہ محبت و غضب دونوں کے معتدل امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر بدی کی اصلاح عفو و درگذر، صبر و تحمل اور لطف و رحم سے ہو سکے تو اسی سے کرنی چاہیئے، اور اگر یہ محبت کی قوتیں اس میں کامیاب نہ ہو سکیں تو پھر سیاست، تعزیر اور قصاص و انتقام کی قوتوں سے کام لینا ضروری ہے۔ کیونکہ اصل مقصود اصلاح ہے، اور انسان کا فرض ہے کہ ضرورت کی حد تک ہر اس طریقے کو استعمال کرے، جو اس مقصد کے حصول کے لئے مفید اور ناگزیر ہو۔ اس میں طریقوں کا امتیاز کرنا اور ایک ہی طریقہ پر اس حد تک اصرار کرنا کہ وہ اصلاح کے بجائے مزید فساد کا موجب ہو جائے، نہ تو عقلمندی ہے اور نہ نیکی۔

مسیحیت کا یہ نظریہ کہ دین کا اصل الاصول "محبت" ہے، اور اس کے سوا انسان کے تمام جذبات اور اخلاقی خصائص باطل ہیں جن کو مٹا دینے ہی سے دینداری کو نشو و نما حاصل ہو سکتا ہے، در اصل ایک غلط تخیل پر قائم ہے۔ اس نظریہ کے موجدوں کی نظر اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکی کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کوئی چیز عبث نہیں پیدا کی ہے، اس لئے انہوں نے سمجھ لیا کہ غضب، شہوت اور حب نفس وغیرہ جذبات فی نفسہٖ مذموم ہیں، اور انسانی سیرت میں شجاعت و خودداری، جرأت و شہامت، تدبر و سیاست، عدل و انصاف وغیرہ کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ انسان کے اندر جتنے ملکات و قویٰ اور عواطف و جذبات ودیعت کئے گئے ہیں سب کے سب اپنا ایک مصرف اور ایک مدعا رکھتے ہیں، جس طرح انسان کا کوئی عضو حتیٰ کہ کوئی رونگٹا بھی بیکار نہیں ہے، اسی طرح انسان کی کوئی ذہنی و جسمانی قوت، اس کا کوئی ظاہری و باطنی ملکہ، اور کوئی نفسانی جذبہ و داعیہ بھی بیکار نہیں ہے۔ فاطر کائنات نے اس کو بغیر کسی مصلحت کے نہیں بنایا ہے۔ اگر یہ قوتیں غلط صورتوں میں ظاہر ہوں اور غلط راستے اختیار کر لیں تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ فی نفسہٖ غلط اور مذموم ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان نے ان کا صحیح مصرف نہیں سمجھا اور اس کے شعور نے اتنی ترقی نہیں کی کہ وہ ان کے صحیح استعمال کی طرف اس کی رہنمائی کرے۔ مثال کے طور پر شہوت ایک جذبہ ہے جس کی بدولت انسان نے اتنے گناہ کئے ہیں کہ شاید کسی اور جذبے کے اثر سے نہ کئے ہوں گے، مگر اس کی بنا پر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو بالکل مٹا

دینا چاہیئے۔ کیونکہ اسی پر بقائے نوع کی بنیاد قائم ہے۔ حرص ایک جذبہ ہے جو انسان کو بندۂ غرض بنا کر بدترین گناہوں پر آمادہ کرتا ہے۔ مگر اس کو بالکل فنا کر دینے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہی چیز عمل کی اصلی محرک ہے۔ غضب ایک جذبہ ہے جس نے دنیا میں بے شمار جھگڑے اور ظلم و ستم کرائے ہیں، مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ سراسر بدی ہی بدی ہے اور اس میں کوئی فائدہ متصور نہیں ہے، کیونکہ یہی چیز دنیا میں امن و امان کی ضامن ہے، ورنہ بدی و شرارت کی قوتیں اس کو تباہ کر ڈالیں۔ بالکل یہی حال ان جذبات و ملکات کا ہے جو لطیف اور افضل سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں بھی جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں بہت سی خرابیاں بھی ہیں۔ شجاعت اگر حد سے بڑھ جائے تو تہور اور حماقت کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ دور اندیشی اگر افراط کا پہلو اختیار کرے تو بزدلی و نامردی بن جاتی ہے۔ رحم اگر اپنی قدرتی حدود میں نہ رہے تو جرائم و معاصی کا مددگار بن جاتا ہے۔ فیاضی اگر حد سے گذر جائے تو اسراف و تبذیر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کفایت شعاری اگر زیادہ ہو جائے تو بخل اور کنجوسی سے بدل جاتی ہے۔ محبت اگر اپنی حدود میں نہ رہے تو انسان کی عقل کو اندھا کر دیتی ہے۔ مروت اگر بے موقع استعمال کی جائے تو بدکاروں میں جسارت و بیباکی پیدا کر دیتی ہے۔ حلم و بردباری اگر بے محل ہو تو گستاخی اور ظلم کی محرک بن جاتی ہے۔ فروتنی و انکساری اگر بے محل ہو تو خودداری و عزتِ نفس خاک میں مل جاتی ہے۔ غرض یہ کہ نفسِ انسانی کو جتنی قوتیں عطا کی گئی ہیں سب اپنے اچھے اور برے دونوں پہلو رکھتی ہیں، اور ان کے ایک ہی پہلو کو دیکھ کر نہ تو انکی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی کے ترک اور کسی کے اختیار کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ جس طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان کے لئے صرف ہاتھ پاؤں اور قلب و دماغ ہی مفید ہیں، آنکھ، ناک، معدہ و جگر وغیرہ کی ضرورت نہیں، محض قوتِ سامعہ اور لامسہ کافی ہے، باصرہ اور شامہ کی ضرورت نہیں، محض شعور و ادراک کفایت کرتا ہے، حافظہ اور تمیز کی ضرورت نہیں، بالکل اسی طرح ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انسان میں صرف محبت و رحم، عفو و درگذر، عجز و فروتنی ہی کی ضرورت ہے، اور نفرت و غضب، شجاعت و شہامت، خودداری و عزتِ نفس، غیرت و حمیت وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر معدہ کی خدمت قلب پوری نہیں کر سکتا، اور جگر کی جگہ دماغ کا کام نہیں دے سکتا، تو یقیناً غضب و انتقام کی جگہ محبت و رحم اور سیاست و تعزیر کی جگہ عفو و درگذر بھی مفید نہیں ہے۔

جس طرح بدن کی صحت کا انحصار تمام جسمانی قوتوں کے اعتدال پر ہے، اور جس طرح صحت عقل اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب تمام قوائے ذہنی اپنا اپنا کام کرتے رہیں، ٹھیک اسی طرح کمال اخلاق اسی وقت متحقق ہوتا ہے جب جذبات و خواہشات میں اعتدال ہو، نفس کی تمام قوتیں اپنے اپنے موقع و محل پر استعمال کی جائیں، اور قدرت کے دیئے ہوئے تمام ملکات کو اپنی اپنی حدود میں کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ ایک فطری مذہب کا کام اسی اعتدال کی طرف رہنمائی کرنا ہے، نہ کہ ایک بے اعتدالی کے جواب میں دوسری بے اعتدالی، اور افراط کے مقابلہ میں تفریط پیدا کر دینا۔

مسیحیت اس حقیقت کبریٰ کے فہم سے قاصر رہی ہے۔ اسی لئے اس نے انسان کو ترک دنیا اور رہبانیت کی تعلیم دی اور فیصلہ کر دیا کہ انسان محض تذلل و انفعال ہی کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائے۔ مگر یہ نہ تو کمال اخلاق کا کوئی درجہ ہے اور نہ انسانیت کی کوئی خدمت۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ انسانیت پر ایک ظلم عظیم ہے، کیونکہ اس طریق زندگی کو اختیار کرنے والے ایک طرف اپنی ذات کو ان جائز لذتوں اور آسائشوں سے محروم کر دیتے ہیں جو اللہ نے ان کے لئے پیدا کی ہیں، اور دوسری طرف اپنے وجود کو بیکار و معطل کر کے انسانی جماعت کو اپنی خدمات سے محروم کر دیتے ہیں۔ مسیحیت نے دنیوی بادشاہت کو آسمانی بادشاہت سے الگ کر دیا ہے۔ خدا اور دولت دو متضاد قوتیں قرار دی ہیں، اور سچے دینداروں کو حکم دیا ہے کہ وہ دولت کو چھوڑ کر خدا کے ہو جائیں، اور دنیوی بادشاہت سے دست کش ہو کر صرف آسمانی بادشاہت کے ہو رہیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ دیندار، خدا ترس، ایمان دار اور سچے لوگ تو دنیا کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں، اور دنیا کا تمام کاروبار سوسائٹی کے ان ادنیٰ طبقوں کے ہاتھ میں چلا جائے جو خدا ترسی و ایمانداری کے جوہر سے خالی ہوں۔ حکومت پر ظالموں کا قبضہ ہو، تجارت طماع اور بددیانت لوگوں کے حصہ میں آئے، صنعت و حرفت پر دھوکہ باز اور حیلہ ساز قابض ہو جائیں، اور شر و فساد کی قوتیں سوسائٹی کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیں۔ جب وہ نیکوکار لوگ جو سوسائٹی کو صحیح راستہ پر چلا سکتے ہیں، ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں گے تو یقیناً بدکار لوگ برسرکار آئیں گے۔ اور ان کی بدکاریوں کی کم از کم آدھی ذمہ داری ان نیکوکاروں پر بھی عائد ہوگی جنہوں نے اپنی کنارہ کشی سے ان کو اس کا موقع دیا۔

دعوتِ مسیح کی حقیقت اس بحث سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مسیحیت میں جنگ اور سیاست و تعزیر کا نہ ہونا اس کے کمال کی دلیل نہیں، بلکہ نقص کی دلیل ہے، اور مسیحیت جس شکل میں ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے وہ اتنے نقائص سے بھری ہوئی ہے کہ اس کے بنائے ہوئے طریقہ کی پیروی دنیا کی کوئی قوم نہیں کر سکتی لیکن مسیحیت اور اس کی تاریخ کے گہرے مطالعہ سے ایک اور حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ جب ہم مسیح کی تعلیمات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عقائد و اخلاق کی موٹی موٹی باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ نہ ان کی کوئی شریعت ہے، نہ کوئی مستقل ضابطۂ قوانینِ اخلاق ہے، نہ حقوق و فرائض اور معاملات کے متعلق کسی قسم کی ہدایات ہیں، حتیٰ کہ عبادت کا کوئی طریقہ بھی متعین نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا مذہب کوئی مستقل مذہب نہیں ہو سکتا۔ عقائد اور چند اخلاقی ہدایات کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہت سی ایسی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں جن کے لئے ایک مذہب کے پیروؤں کو اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہدایات کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جس مذہب میں یہ ہدایات موجود نہ ہوں، اس میں ایک جداگانہ دینی نظام بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اب قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسیح نے ایسے ہی غیر مکمل مذہب کو ایک مستقل مذہب بنایا تھا؟ اور کیا مسیح اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ ایسا مذہب تمام نوعِ بشری بلکہ کسی ایک قوم کے لئے بھی ہر حالت میں، ہر زمانہ میں، قابلِ عمل نہیں ہو سکتا؟ مسیحیت کے متبعین اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ مگر جب ہم مسیحیت کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، اور ان حالات پر نظر ڈالتے ہیں جن میں وہ پیدا ہوئی تھی، اور ان اغراض کی تحقیق کرتے ہیں جن کے لئے وہ وجود میں آئی تھی، تو ہمیں اس کا جواب کچھ اور ملتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسیحی مذہب خود کوئی مستقل مذہب نہیں تھا بلکہ موسوی شریعت کی تکمیل و اصلاح کے لئے پیدا ہوا تھا۔ موسوی شریعت جس زمانہ میں بھیجی گئی تھی وہ بنی اسرائیل کی ذہنی طفولیت کا زمانہ تھا۔ ان میں کسی گہری اخلاقی تعلیم کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس لئے حضرت موسیٰ نے ان کو ایک سادہ عقیدہ اور ایک سیدھے سادے ضابطۂ اخلاقی کی تعلیم دے کر چھوڑ دیا تھا جس میں اخلاقی فضائل، روحانی پاکیزگی اور ایمانی روح کی بہت کمی تھی۔ چند صدیوں تک بنی اسرائیل اس شریعت کے پابند رہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں جب ان کے معاملات نے وسعت اختیار کی تو وہ کمی جو شریعت میں رہ گئی تھی، نمایاں ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ بنی اسرائیل کی

اخلاقی حالت خراب ہوتی چلی گئی اور فسادِ اخلاق کا طبعی نتیجہ اضمحلالِ قوی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ پہلے ان کی جماعت کا شیرازہ منتشر ہوا، پھر منتشر اجزا آپس میں باہم تصادم شروع ہوا، اور آخر میں غلامی کی لعنت ان پر مسلط ہوگئی جس سے انہیں ترقی و تنزل کی انتہا کو پہنچا دیا۔ مسیح کی پیدائش سے ۷۲۸ برس پہلے اشوریوں نے ان کو مغلوب کیا اور دو صدی تک اور اس کے بعد اہل بابل انہیں پیستے رہے۔ پھر ۵۳۶ء ق م میں ایرانی آئے اور دو سو برس تک ان کا دور دورہ رہا۔ ان کے بعد سکندر اعظم کی قیادت میں یونانیوں نے ان کو مغلوب کیا۔ (۳۲۳ء ق م) اور سکندر کی وفات کے بعد مصر کے بطالسہ Ptolemies نے ان کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا۔ اس طرح ایک صدی تک بنی اسرائیل یونانیوں کی غلامی میں رہے۔ پھر ۱۹۸ء ق م میں ایک دوسرے یونانی خاندان سلیوکیڈ یا د نے ان پر اپنی حکومت قائم کرلی اور جبراً ان میں صنم پرستی کو داخل کیا۔ دوسری صدی قبل مسیح کے وسط میں یہودیوں کو کچھ آزادی کا احساس ہوا اور انہوں نے بغاوت کرکے ۱۴۱ء ق م میں ایک آزاد یہودی حکومت قائم کرلی جو تقریباً ۸۰ برس تک زندہ رہی۔ مگر ان کے اخلاق اس قدر بگڑ چکے تھے کہ جماعت کا شیرازہ بندھنا مشکل تھا، اس لئے ان میں پھوٹ پڑی اور انہوں نے خود ہی رومیوں کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی۔ مسیح کی پیدائش سے ۶۰ برس پہلے رومیوں نے فلسطین پر حملہ کیا اور جب مسیح نے آنکھ کھولی تو ان کی پوری قوم رومیوں کی غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔ سات آٹھ صدی تک بابل و آشور کے ستارہ پرستوں، ایران کے آتش پرستوں اور یونان و روم کے صنم پرستوں کے ماتحت غلامانہ زندگی بسر کرنے کے باعث اس قوم کے اندر اخلاق، شرافت، دینداری اور انسانیت کا نام و نشان تک باقی نہ رہا تھا۔ خود بائبل کے عہدِ عتیق میں یہودیوں کے اس اخلاقی و روحانی تنزل کی تفصیلات ہم کو بکثرت ملتی ہیں۔

ساتویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کے بادشاہ منسی (Manessah) نے اہل بابل کے اثر سے ارضِ مقدس میں جن گمراہیوں کو رواج دیا اس کی کیفیت ۲ سلاطین باب ۲۱ میں اس طرح بیان کی گئی ہے:۔

"اس نے اونچے مکانوں کو جنہیں اس کے باپ حزقیاہ نے ڈھایا تھا، پھر بنا دیا اور بعل کے لئے مذبح اٹھائے، اور یسیرت بنائی جس طرح اسرائیل کے بادشاہ اخی اب نے کیا تھا، اور آسمان کی ساری فوج (یعنی اجرام فلکی) کی پرستش کی اور ان کی بندگی کی۔ اس نے خداوند کے اس گھر میں جس کی بابت خداوند نے

فرمایا تھا کہ میں یروشلم میں اپنا نام رکھونگا، مذبح بنائے۔ اس نے آسمان کی ساری فوج کے لئے خداوند کے گھر کے دونوں صحنوں میں مذبح بنائے۔ اس نے اپنے بیٹے کو آگ میں گذارا، اور ساعتوں کو مانا اور جادوگری کی، اور دیوؤں اور افسوں گروں سے یاری کی . . . . . اس نے یسیرت کی مورت کو اس گھر میں نصب کیا جس کی بابت خداوند نے داؤد کو اور اس کے بیٹے سلیمان کو کہا تھا کہ اسی گھر میں اور یروشلم میں جسے میں نے بنی اسرائیل کے سارے فرقوں میں سے چن لیا ہے میں اپنا نام ابد تک رکھونگا"

اس عہد کی اخلاقی حالت کو ہوسیع نبی (۷۸۲ سے ۷۴۱ ق م) نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

"اس سرزمین کے بسنے والوں سے خداوند کا ایک جھگڑا ہے، کیونکہ ملک میں نہ راستی ہے نہ شفقت نہ خداشناسی۔ کوسنے اور جھوٹ بولنے اور خون اور چوری اور حرام کاری کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ پھوٹ نکلتے ہیں اور خون پر خون ہوتا ہے۔ اس لئے یہ سرزمین ماتم کرے گی اور ہر ایک جو اس میں رہتا ہے جنگل کے جانوروں اور ہوا کے پرندوں سمیت ناتواں ہو جائیگا" (۴: ۱-۳)

۷۴۷ سے ۷۰۱ ق م میں یسعیاہ نبی کہتے ہیں:۔

"تمام سر بیمار ہے اور دل بالکل سست ہے۔ تلوے سے لیکر چندیا تک اس میں کہیں صحت نہیں ہے بلکہ زخم اور چوٹ اور سڑے ہوئے گھاؤ ہیں . . . . . . تمہارا ملک اجاڑ ہے، تمہاری بستیاں جل گئیں، پردیسی لوگ تمہاری زمین کو تمہارے سامنے نگلتے ہیں، وہ ویران ہے، گویا کہ اسے اجنبی لوگوں نے اجاڑا ہے" (۱: ۵-۷)

"وہ بستی جو سراسر پاکدامن تھی کیسی چھنال ہو گئی! وہ تو انصاف سے معمور تھی، راستبازی اس میں بستی تھی، پر اب خونی رہتے ہیں۔ تیری چاندی میلی ہو گئی۔ تیری مے میں پانی مل گیا۔ تیرے سردار گردن کش چوروں کے شریک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک رشوت دوست اور انعام طلب ہے۔ وہ یتیموں کا انصاف نہیں کرتے اور بیواؤں کی فریاد ان تک نہیں پہنچتی" (۱: ۲۱-۲۳)

"ان کے جشن کی محفلوں میں بربط اور بین اور دف اور بانسری اور مے کا زور ہے لیکن وہ خداوند کے کام پر غور نہیں کرتے اور اس کے ہاتھوں کی کاریگری کو نہیں دیکھتے۔ اس لئے میری قوم اسیری میں مبتلا

ہوگئی ہے کیونکہ وہ علم نہیں رکھتی۔ ان کے عزت والے بھوکوں مرتے اور عوام پیاس سے خشک ہوئے جاتے ہیں۔ اس لئے دوزخ نے وسعت اختیار کرلی ہے اور اپنا منہ بے اندازہ پھاڑ دیا ہے۔ ان کے شان و شوکت والے اور عوام اور تمام فخر کرنے والے اس میں جا پڑیں گے" (۵: ۱۲-۱۴)

"ان پر واویلا ہے جو مے پینے میں زورآور اور نشے کی چیزیں ملانے میں طاقتور ہیں، جو رشوت کی خاطر بدکاروں کو صادق ٹھہراتے ہیں اور صادقوں سے ان کا حق چھین لیتے ہیں۔ سو جس طرح آگ بھوسی کو کھا جاتی ہے اور جلتا ہوا پھونس بیٹھ جاتا ہے، اسی طرح ان کی جڑ بوسیدہ ہوگی اور ان کی کلی گرد کی طرح اڑ جائیگی، کیونکہ انہوں نے رب الافواج کی شریعت کو ناجائز ٹھہرایا اور اسرائیل کے قدوس کے سخن کو ذلیل جانا" (۵: ۲۲-۲۴)

اسی عہد کے ایک اور نبی حضرت میکاہ کہتے ہیں:۔

"اے یعقوب کے سردارو اور بنی اسرائیل کے قاضیو! تم وہ ہو جو نیکی سے کینہ رکھتے ہیں اور بدی کو پیار کرتے ہیں، جو لوگوں کا پوست ان پر سے کھینچتے ہیں اور ان کی ہڈیوں پر سے گوشت نوچتے ہیں، اور جو میری قوم کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی کھال ان پر سے کھینچتے ہیں، اور ان کی ہڈیوں کو توڑتے ہیں، اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں،" (۳: ۲-۳)

"تم کہ عدالت سے عداوت رکھتے ہو، اور ساری راستی کو الٹا دیتے ہو، اس بات کو سنو۔ تم صیہون کو خونریزی سے، اور یروشلم کو بے انصافی سے تعمیر کرتے ہو۔ اس کے سردار رشوت لیکر عدالت کرتے ہیں اور اس کے کاہن اجرت لیکر تعلیم دیتے ہیں، اور اس کے غیب گو نقد لیکر ریاکاری کرتے ہیں" (۳: ۹-۱۱)

انبیائے بنی اسرائیل کے ان اقوال سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ اس زمانہ میں یہودیوں سے شریعت کی اصلی روح یعنی ایمان، صداقت، دیانت، عدل، انصاف اور پاکیزگی اخلاق رخصت ہوچکی تھی۔ حرام خوری، حرص و طمع، ظلم و جفا اور بے حیائی و بدکاری نے ساری قوم کو گھیر لیا تھا۔ ان کے حاکم ظالم، ان کے پیشوا ریاکار، ان کے سردار خائن، اور ان کے عوام معصیت پیشہ ہوگئے تھے۔ انہوں نے شریعت کے الفاظ اور ظاہری رسوم و شعائر ہی کو اصل شریعت سمجھ لیا تھا، اور اس معنوی حقیقت کو فراموش کر دیا تھا جو ہر شریعت حقہ

کے احکام میں مقصود اصلی ہوتی ہے۔ اس روز افزوں پستی و ظاہر پرستی کو دیکھ کر مسیح سے بہت پہلے بنی اسرائیل کے انبیاء اصلاح کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے مواعظ و نصائح سے ان کو یہ بھولی ہوئی حقیقت یاد دلانی شروع کر دی تھی کہ خدا محض قربانیوں اور دعاؤں سے خوش نہیں ہوتا، بلکہ صداقت، ترحم اور حسن معاملت سے خوش ہوتا ہے، اور اس کی مہربانی حاصل کرنے کے لئے عفو و درگذر اور محبت و ایثار کی ضرورت ہے چنانچہ بائبل میں انبیاء متاخرین کے ایسے نصائح ہم کو بکثرت ملتے ہیں یسعیاہ نبی فرماتے ہیں:۔

"خداوند فرماتا ہے، تمہارے ذبیحوں کی کثرت سے مجھے کیا کام؟ میں مینڈھوں کی سوختنی قربانیوں اور فربہ بچھڑوں کی چربی سے سیر ہو چکا ہوں۔ میں بیلوں اور بھیڑوں اور بکروں کا لہو نہیں چاہتا۔۔۔ ۔۔۔ اب میرے سامنے جھوٹے نذرانے مت لاؤ، لوبان سے مجھے نفرت ہے، اور نوچندی اور سبت اور جماعت عید سے بھی، کیونکہ میں عید اور بدینی دونوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا جی تمہاری نوچندیوں اور تمہاری عیدوں سے بیزار ہے۔ وہ مجھ پر وبال ہیں میں ان کے اٹھانے سے تھک گیا۔ جب تم اپنے ہاتھ پھیلاؤ گے میں تم سے اعراض کروں گا، جب تم دعاؤں پر دعائیں مانگو گے تو میں نہ سنوں گا، کیونکہ تمہارے ہاتھ تو لہو سے بھرے ہوئے ہیں۔ اپنے تئیں دھو کر پاک کرو۔ اپنے برے کاموں کو میرے سامنے سے دور کرو، بدکاری سے باز آؤ، نیکوکاری سیکھو، انصاف کے پیرو بنو، مظلوموں کی مدد کرو، یتیموں کی فریادرسی کرو، بیوہ عورتوں کے حامی ہو۔۔۔۔۔ اگر تم راضی اور فرمانبردار ہو گے تو زمین کے اچھے پھل کھاؤ گے اور اگر انکار کرو گے اور بغاوت اختیار کرو گے تو تلوار کا لقمہ بن جاؤ گے" (۱: ۱۱-۲۰)

ایک دوسرے موقعہ پر یسعیاہ نبی عبادات و اعمال کی معنوی روح اور فضیلت اخلاقی کا درس اس طرح دیتے ہیں:۔

"تم اس مقصد سے روزہ رکھتے ہو کہ لڑائی جھگڑا کرو اور شرارت کے مکے مارو۔ اس طرح کا روزہ جیسا کہ آجکل تم رکھتے ہو، مطلوب نہیں ہے۔ کیا یہی وہ روزہ ہے جو مجھ کو پسند ہے؟ ایسا دن جس میں آدمی اپنی جان کو تکلیف دے اور اپنے سر کو جھاؤ کی طرح جھکا دے اور ٹاٹ اور راکھ کی طرح بچھا دے، کیا تم اس کو روزہ اور خدا کا منظور نظر دن کہو گے؟ کیا وہ روزہ جو میں چاہتا ہوں یہ نہیں ہے کہ ظلم کی زنجیریں

توڑی جائیں، جوئے کے بندھن کھولے جائیں، مظلوموں کو آزاد کیا جائے، بلکہ ہر ایک جوئے کو توڑ ڈالا جائے؟ کیا یہ نہیں کہ تو اپنی روٹی بھوکوں کو کھلائے اور مسکینوں کو جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں پناہ دے۔ اور جب کسی کو ننگا دیکھے تو اسے پہنا دے، اور تو اپنے ہم جنسوں سے منہ نہ چھپائے؟ ...... اگر تو اپنے دل کو بھوکے کی طرف مائل کرے اور آزردہ دل کو سیر کرے تو تیرا نور تاریکی میں طلوع کریگا، اور تیری تیرگی نصف النہار کی طرح چمک اٹھے گی۔" (۵۸ : ۶ - ۱۰)

ایک اور نبی حضرت میکاہ اسی روحانی تعلیم کی اس طرح تجدید کرتے ہیں:-

"میں کیا لے کے خداوند کے حضور میں جاؤں گا؟ کیونکر خدا تعالیٰ کو سجدہ کروں؟ کیا سوختنی قربانیوں اور یکسالہ بچھڑوں کو لیکر اس کے آگے جاؤنگا؟ کیا خداوند ہزاروں مینڈھوں سے یا تیل کی دس دس ہزار نہروں سے خوش ہوگا؟ کیا میں اپنے پہلوٹھے کو اپنے گناہ کے عوض، اپنے پیٹ کے پھل کو اپنی روح کی خطا کے عوض دے سکونگا؟ نہیں اے انسان اس نے تجھے وہ راہ دکھا دی ہے جو نیک ہے، خداوند تجھ سے اس کے سوا اور کیا چاہتا ہے کہ تو انصاف کرے، رحم دلی کو پیار کرے اور اپنے خدا کے ساتھ فروتنی سے پیش آئے۔" (۶ : ۶ - ۸)

یہ تعلیم سات صدیوں تک بہرے کانوں سے ٹکرا کر واپس آتی رہی۔ بنی اسرائیل کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ ان میں جو اخلاقی مفاسد جڑ پکڑ گئے تھے انہیں دور کرنے کے لئے ایک زیادہ طاقتور مصلح کی ضرورت تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کو مبعوث فرمایا اور انہوں نے اسی میکاہ اور یسعیاہ والی تعلیم کو نئے جوش اور نئی روح کے ساتھ پیش کیا۔ انبیاء سابقین کی طرح ان کی تعلیم بھی شریعت موسویہ کو منسوخ کرنے اور اس کی جگہ کوئی الگ مذہب قائم کرنے کیلئے نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد صرف اس کمی کو پورا کرنا تھا جو موسوی شریعت میں باقی رہ گئی تھی، اور اس اخلاقی فضیلت کی روح کو پھونکنا تھا جس کی وہ ضرورت مند تھی اس وقت یہودی اخلاق میں راستبازی، دیانت، حلم، عفو، زہد، قناعت، سیر چشمی، خدا ترسی، رحم، فروتنی اور ایثار کی کمی تھی۔ وہ حد سے زیادہ طماع، دنیا پرست، بندۂ غرض اور دنی الطبع ہو گئے تھے۔ ان میں دینداری کی روح باقی نہ رہی تھی جو انسانیت کی جان ہے۔ اس لئے مسیح نے اپنی پوری قوت انہی نقائص کو دور کرنے میں صرف کی

اور اصل موسوی شریعت کو برقرار رکھکر صرف ان چیزوں کا اس میں اضافہ کیا جن کی اس وقت کے لحاظ سے ضرورت تھی پس دین مسیحی ایک الگ دین نہیں ہے بلکہ درحقیقت دین یہود کا ایک جزء اور زیادہ صحیح الفاظ میں اس کا تتمہ ہے۔[1]

بالکل یہی بات خود انجیل میں حضرت مسیحؑ کی زبان سے منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں توراۃ یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں، توراۃ کا ایک نقطہ یا ایک شوشہ بھی پورا ہوئے بغیر نہ ٹلے گا پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑیگا، اور آدمیوں کو ایسا کرنے کی ہدایت کریگا، وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائیگا۔ لیکن جو ان پر عمل کریگا، اور ان کی تعلیم دیگا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے بڑا کہلائیگا پس میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ اگر تمہاری راست بازی فقیہوں اور فریسیوں کی راست بازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوسکو گے۔" (متی ۵: ۱۷-۲۰ - لوقا ۱۶: ۱۷)

ایک دوسری جگہ اپنے پیروں کو حکم دیتے ہیں:۔

"فقیہہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں، پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں سب عمل میں لاؤ اور مانتے رہو، لیکن ان کے سے کام نہ کرو، کیونکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جنہیں اٹھانا بھی مشکل ہے دوسروں کے کندھوں پر رکھتے ہیں، مگر آپ انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔" (متی ۲۳: ۱-۴)

یوحنا نے اپنی انجیل میں تصریح کی ہے کہ:۔

"شریعت موسیٰ کی معرفت دی گئی، اور فضیلت و صداقت یسوع مسیح کی معرفت پہنچی۔" (۱: ۱۷)

---

[1] اس حقیقت کو خود مسیحی علما بھی تسلیم کرنے لگے ہیں۔ چند سال ہوئے ایک مشہور مسیحی فاضل ڈین انجے نے جن کو کنیسہ سینٹ پال کا سب سے بڑا منصب حاصل تھا، گرٹن کالج کیمبرج میں تقریر کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا تھا کہ:۔

"مسیح نے کبھی موسوی تعلیم سے انحراف نہیں کیا، نہ کوئی نئی تعلیم دی، نہ موسوی مذہب کے مقابل کوئی نیا مذہب قائم کیا۔ روحانی معاملات میں وہ آزادی تو ضرور چاہتے تھے لیکن اپنے ملک اور وقت کی باتوں کو انہوں نے قبول کیا۔ اس لحاظ سے موسوی شریعت سے الگ ہونا تو ضروری تھا مگر مسیح نے عیسائیوں کے لئے خود کوئی شریعت تجویز نہیں کی۔"

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحیت میں موسوی شریعت کے تمام احکام باقی رکھے گئے ہیں اور ان پر صرف فضیلت و صداقت کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مسیحیت میں جنگ نہ ہونے کی وجہ | اب یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ مسیحیت میں جنگ، صلح، حکومت، سیاست، تعزیرات وغیرہ کے متعلق وہ تمام احکام باقی رکھے گئے تھے جو توراۃ میں مذکور تھے۔ دین مسیح ان میں سے کسی کا، حتیٰ کہ ایک لفظ اور ایک شوشے کا بھی منکر نہ تھا، لیکن مسیح نے ان احکام کی تنفیذ اس لئے نہیں کی کہ جس عہد میں وہ پیدا ہوئے تھے، اس میں ان کی تنفیذ کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ مسیح کی بعثت کے وقت ان کی قوم سات آٹھ سو برس سے غیر قوموں کی غلامی میں مبتلا تھی۔ انکی ولادت سے ۶۰ برس پہلے ہی روم کی فوج نے فلسطین پر حملہ کیا تھا اور اسے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پامال کرتی چلی گئی تھی۔ جس وقت مسیح نے آنکھ کھولی تو ان کی پوری قوم رومیوں کی قید غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔ خود ان کا وطن یہودیہ ۶ء میں براہ راست رومی صوبہ داروں کے زیر انتظام آگیا تھا جو پروکیوریٹر (Procurator) کہلاتے تھے جب ان کی پیغمبرانہ دعوت کا آغاز ہوا تو یروشلم کا پروکیوریٹر پونتوس پیلاطس (Pontius Pilate) جیسا بے انصاف اور بے ضمیر شخص تھا۔ ان بے دین آقاؤں کی غلامی میں بنی اسرائیل کی ذہنی و اخلاقی حالت اس حد تک خراب ہو چکی تھی کہ وہ کلمۂ حق سننے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ مسیح کی آنکھوں کے سامنے گلیل کا رئیس ہیرودیس محض ایک رقاصہ کو خوش کرنے کے لئے حضرت یحییٰ (John the Baptist) کو قتل کرا چکا تھا، اور خود مسیح کی قدر و قیمت بھی ان کی قوم میں جیسی کچھ تھی اس کا حال اس سے ظاہر ہے کہ آخر میں انہوں نے برابا نامی ڈاکو کی جان کو مسیح کی جان سے زیادہ قیمتی سمجھا۔ ایسی حالت میں مسیح کے لئے کیونکر ممکن تھا کہ اپنی دعوت کے آغاز ہی میں جنگ کا جھنڈا لیکر اٹھ کھڑے ہوتے اور لڑ کر ایک آزاد دینی حکومت قائم کر دیتے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہودیوں کی روح نکل چکی ہے، ان کی سیرت میں کوئی مضبوطی اور ان کی قومیت میں کوئی زندگی باقی نہیں ہے، اس لئے ان کا سب سے پہلا کام یہی تھا کہ اپنی قوم کو اس اخلاقی پستی کے گڑھے سے نکالتے جس میں وہ گری ہوئی تھی، اور اس میں فضیلت اخلاق کی وہ روح پھونکتے جس کے بغیر کوئی قوم غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور دنیا میں اپنے آزاد وجود کو برقرار رکھنے پر قادر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اول اول انہوں نے قومی سیرت

کے اسی پہلو کی طرف توجہ کی اور اپنے اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک ایسی پرامن فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں حکومت وقت سے کسی قسم کے تصادم کا موقع نہ آئے کیونکہ اگر ابتدا ہی میں حکومت سے مقابلہ شروع ہو جاتا تو اصل اصلاحی کام بھی نہ ہوتا اور اس کے انجام پائے بغیر حکومت کے مقابلہ میں بھی ناکامی ہوتی۔ اسی لئے انہوں نے حکومت کے ساتھ تصادم کرنے سے انتہائی پہلوتہی کی اور جب دشمنوں نے ان کو پھانسنے کے لئے پوچھا کہ قیصر کو ہم ٹیکس دیں یا نہیں تو انہوں نے یہ ذومعنی جواب دیکر ٹال دیا کہ:

"جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو"۔ (لوقا ۲۰: ۲۲)

انہوں نے حکم دیا کہ شریر کا مقابلہ نہ کرو، جو تم پر ظلم کرے اسے دعا دو اور اس کے لئے برکت چاہو، جو تمہیں بیگار میں پکڑے اس کے ساتھ ایک کوس کے بجائے دو کوس جاؤ، جو تمہارا کرتہ چھینے اس کو چوغہ بھی اتار دو، جو تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ ابتداءً ان سب احکام کا مدعا یہ تھا کہ حکومت سے تصادم نہ ہو اور قوم میں مصیبت جھیلنے کی قوت پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد انہوں نے آہستہ آہستہ اپنی قوم کو استقامت، صبر، تحمل، اور بے خوفی کی تعلیم دینی شروع کی، ان کو مصائب و شدائد کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا، اور ان کے دل سے موت کا خوف اور حاکمانہ قہر و طاقت کا ڈر نکالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ "جب تم حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے پیش کئے جاؤ اور تمہیں اذیتیں دی جائیں تو اس وقت ثابت قدم رہنا" (مرقس ۱۳)۔ انہوں نے جان کی محبت دل سے نکالنے اور مرنے کی آمادگی پیدا کرنے کے لئے کہا کہ

"جو کوئی اپنی جان بچانا چاہتا ہے وہ اسے کھوئے گا اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوئیگا وہی اسے بچائے گا"۔ (لوقا: ۹-۲۴)

انہوں نے حکومت اور اس کی عنایت پر بھروسہ رکھنے کے بجائے خدا اور اس کی رزاقی پر بھروسہ رکھنے کی تعلیم دی تاکہ غلامی کی وہ سب سے بڑی کمزوری دور ہو جو ایک غلام قوم کو حکمران قوم کے طلسم میں گرفتار رکھتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ

"جب تم برے ہو کر اپنی اولاد کو اچھی چیزیں دیتے ہو تو تمہارا آسمانی باپ اپنے مانگنے والوں کو ضرور دیگا"۔ (لوقا ۱۱: ۱۳)

انہوں نے حکومت کا رعب و داب لوگوں کے دلوں سے دور کرنے کی کوشش کی اور ان کو بتایا کہ جو لوگ

محض جسم کو قتل کر سکتے ہیں، روح کو قتل نہیں کر سکتے، ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، اصل میں ڈرنے کے قابل وہ ہے جو روح اور جسم دونوں پر ہلاکت طاری کر سکتا ہے۔ (لوقا ۱۲: ۴-۵)

یہ سب باتیں ایک صدیوں کی غلام قوم میں آزادی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ضروری تھیں اور ابتدا ءً مسیح نے انہی تک اپنی تعلیم کو محدود رکھا۔ اس مرحلہ کو طے کرنے کے بعد آخری زمانہ میں وہ جہاد و قتال کے مضمون کی طرف بڑھ رہے تھے اور کبھی کبھی اپنے دشمنوں کو قتل کرنے کی خواہش بھی ظاہر کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ:-

"میرے ان دشمنوں کو جنہوں نے نہ چاہا کہ میں ان پر بادشاہی کروں، یہاں لا کر میرے سامنے قتل کرو"

اسی طرح انہوں نے اپنے متبعین کو تلوار رکھنے کا حکم بھی دیدیا تھا جیسا کہ لوقا نے لکھا ہے:-

"اس نے ان سے کہا کہ اب جس کے پاس بٹوا ہو وہ اسے لے اور اسی طرح جھولی بھی، اور جس کے پاس نہ ہو وہ اپنی پوشاک بیچکر تلوار خریدے،...... انہوں نے کہا کہ اے خداوند! دیکھ یہاں دو تلواریں ہیں، اس نے کہا بہت ہیں"

لیکن مسیح کو اپنی قوم کی ہدایت و رہنمائی کے لئے صرف ڈھائی تین سال کی مدت نصیب ہوئی، اور یہ مختصر مدت ایک پوری قوم کو جہاد فی سبیل اللہ کے قابل بنانے کیلئے کافی نہیں تھی۔ اس عرصہ میں نہ تو ان کے پیرووں کی تعداد اس حد تک پہنچی تھی کہ وہ رومیوں کے مقابلہ پر ان سے کوئی کام لے سکتے، اور نہ خود ان لوگوں کی جو ان کے پیرو ہو چکے تھے، اخلاقی تربیت اس قدر مکمل ہوئی تھی کہ وہ رسول عربی کے صحابیوں کی طرح جرأت و عزیمت کے ساتھ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرتے، گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر جاتے اور بڑی سے بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں بھی بے خوف ہو کر جانیں لڑا دیتے۔ ان لوگوں کے ایمان ابھی اتنے بھی قوی نہ ہوئے تھے کہ وہ علانیہ اظہار حق کی جرأت کرتے۔ مسیح کے سب سے زیادہ محبوب اور معتمد علیہ حواری پطرس کا یہ حال تھا کہ ان کی گرفتاری کے وقت جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا تم بھی مسیح کے پیرو ہو، تو اس نے "مرغ کے دو دفعہ بانگ دینے سے پہلے تین دفعہ مسیح کا انکار کر دیا" (مرقس ۱۴: ۳۰)۔ ان کے ایک اور حواری یہوداہ اسکریوتی نے چاندی کے ۳۰ سکوں کی خاطر ان کو گرفتار کرا دیا" (متی ۲۶: ۱۴)۔ اور "جب ان کو گرفتار کر لیا گیا تو ان کے سارے شاگرد انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے" (متی ۲۶: ۵۶)۔ ظاہر ہے کہ

جب ان کے خاص حواریوں اور بھروسہ کے شاگردوں کا یہ حال تھا تو وہ ایسی ناقابل اعتماد فوج کو لیکر جہاد کی جرأت کیونکر کر سکتے تھے۔ اگر رسول عربی کی طرح ان کو بھی تعلیم و تربیت کا کافی موقع ملتا تو ممکن تھا کہ وہ بھی اپنے حواریوں میں وہی مجاہدانہ روح پیدا کر دیتے جو صحابہؓ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا کی تھی لیکن انکی سرکش قوم نے ان کی نبوت کو پورے تین سال بھی برداشت نہ کیا اور انہیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ اس کی فلاح و بہبود کیلئے کوئی بڑا کام کر سکتے۔ اس قلیل مدت میں زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کام ہو سکتا تھا جتنا حضرت مسیح نے کیا۔ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے ابتدائی تین سال پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس میں بھی کہیں جہاد و قتال کا نشان نہ ملیگا۔ وہی صبر و تحمل، ثبات و استقامت، تقویٰ اور خشیت، توکل علی اللہ اور تزکیۂ نفس، و تنزیہ اخلاق کی تعلیمات وہاں بھی پائی جائیں گی جو مسیح کی حیاتِ نبویہ میں پائی جاتی ہیں۔

مسیحیت اور موسوی شریعت کا تعلق اس علم و بصیرت کی روشنی میں اگر مسیح کی تعلیمات کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو بڑی اقسام پر منقسم ہو جائیں گی :-

ایک قسم وہ ہے جس میں مسیح نے شریعت موسویہ کی تکمیل کی ہے اور اس میں ضروری اضافے کئے ہیں موسوی شریعت میں رأفت و رحمت اور شفقت و لینت کی کمی تھی، مسیح نے اس کا اضافہ کیا۔ اس کے قوانین میں لچک بالکل نہ تھی اور اس کی تعلیمات میں انسانی برادری کا وسیع تخیل بہت دھندلا تھا۔ مسیح نے اس کو پیدا کیا اور بنی اسرائیل کو تمام بنی نوع انسان کے ساتھ یکساں محبت کرنے کی تلقین کی۔ اس میں انسان کے محض فرائض پر زور دیا گیا تھا اور احسان یا فضیلتِ اخلاق کے حصہ کو اچھوتا چھوڑ دیا گیا تھا۔ مسیح نے سب سے زیادہ اسی پہلو پر زور دیا اور خیرات، فیاضی، ہمدردی، ایثار، لطف و رحم وغیرہ فضائل کی خصوصیت کے ساتھ تلقین کی۔ مسیح کی تعلیم کا یہ حصہ خود کوئی مستقل قانون نہ تھا، بلکہ موسوی شریعت کا تتمہ اور ایک ضروری ضمیمہ تھا۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں مسیح نے اپنے زمانہ کے بنی اسرائیل کی مخصوص اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی حالت کو پیش نظر رکھکر اصلاح کی کوشش کی تھی مثلاً یہودیوں میں مال و دولت کی حرص اور دنیا کی محبت بڑھی ہوئی تھی، مسیح نے اس کے مقابلہ میں قناعت و توکل اور متاع دنیا کی تحقیر پر زور دیا۔ یہودیوں میں بیرحمی سنگدلی اور شقاوت کی زیادتی تھی، مسیح نے اس کے جواب میں عفو و درگذر اور رحم کی تلقین کی۔ یہودیوں میں کنجوسی اور تنگدلی حد سے بڑھی ہوئی

تھی مسیح نے انکی اصلاح کیلئے سخاوت، فراخ حوصلگی کا درس دیا۔ یہودی امراء و فقہا خود پسند، نفس پرست، متکبر اور مغرور تھے، مسیح نے ان کو اعتدال پر لانے کے لئے فروتنی، انکسار، زہد و تقویٰ، اور خدا پرستی پر زور دیا۔ یہودی قوم رومی حکومت میں غلام، بے بس، اور کمزور تھی، مسیح نے ان کی سلامتی اور نجات کے لئے انہیں ایک طرف حکومت کے مقابلہ سے روکا، ظلم و تعدی کو برداشت کرنے کی تلقین کی، حقوق کی حفاظت میں قوت استعمال کرنے سے منع کیا، اور دوسری طرف ان میں جنگ کی معنوی قوت پیدا کرنے کے لئے صبر، استقامت، بے خوفی اور پختگی عزم و ارادہ کی قوت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسیح کی تعلیم کا یہ دوسرا حصہ بنی اسرائیل کی خاص اسی حالت کے لئے مخصوص تھا جس میں بعثت مسیح کے وقت وہ مبتلا تھے۔ اس کو کوئی دائمی اور عالمگیر قانون بنانا ہرگز مقصود نہ تھا۔ خصوصیت کے ساتھ تذلل و انفعال کی یہ تعلیم کہ شریر کا مقابلہ نہ کر: جو کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے آگے دوسرا گال بھی پیش کر دے، جو کوئی تیرا کرتہ چھینے اسے چوغہ بھی اتار دے، یہ دراصل غلامی و بے بسی کی ایک مخصوص حالت کے لئے تھی، اس کو کسی آزاد قوم کی سیاسی پالیسی بنانا نہ تو مطلوب تھا اور نہ یہ کسی طرح درست اور معقول ہو سکتا تھا۔

شریعت اور مسیحیت کی علیحدگی لیکن مسیح کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے چند ہی برس بعد ان تمام اصول و قواعد کو یک لخت منہدم کر دیا گیا جن پر انہوں نے اپنی دینی تجدید و اصلاح کی بنیاد رکھی تھی اور اصل مسیحی مذہب کو ایسا بدل دیا گیا کہ دنیا میں اس کے وجود کا نام و نشان تک نہ رہا۔ اس عمل تحریف دین مسیح کا محرک سینٹ پال (پولوس) تھا، ہم اس کی نیت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ممکن ہے کہ مسیح کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی ۶ برس تک ان کی دعوت کا شدید دشمن رہنے کے بعد آخرکار وہ سچے دل سے مسیح کا پیرو اور وکیل بن گیا ہو۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسیح کا صحبت یافتہ نہ تھا، انکی تربیت میں رہکر اسے تعلیمات مسیح کی اصلی روح کو سمجھنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا، اور وہ اُن حواریوں کے مقابلہ میں جو مسیح کے زیر تربیت رہ چکے تھے مسیحی تعلیمات کو زیادہ سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے جب اس نے پطرس جیسے حواریوں کی رائے کے خلاف مسیح کے دین کی تعبیر و تاویل کی اور اسے اپنی نو ایجاد بنیادوں پر قائم کیا، تو یہ بدنیتی نہ سہی جہل و نا واقفیت کی بنا پر یقیناً ایک کھلی ہوئی تحریف تھی[1]۔

(۱) دیکھو حاشیہ صفحہ ۳۴ پر

اس سلسلہ میں پولوس نے دین کے اصول میں جو تحریفات کیں ان میں سب سے پہلی تحریف یہ تھی کہ مسیح کی تعلیم کو تمام عالم انسانی کے لئے ایک عام پیغام قرار دیا حالانکہ دراصل وہ صرف بنی اسرائیل کے لئے تھی۔ مسیح نے اپنی زندگی میں جب حواریوں کو تبلیغ و دعوت کے لئے بھیجا تھا تو صاف طور پر یہ حکم دیا تھا کہ

"غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں ہی کے پاس جانا" (متی ۱۰: ۵-۶)

خود مسیح نے اپنے پورے عہد نبوت میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غیر اسرائیلی قوموں کو اپنی طرف دعوت نہیں دی، اور نہ کسی غیر اسرائیلی کو داخل جماعت کیا۔ سینٹ پال کے ظہور سے پہلے مسیح کے حواری بھی صرف اسرائیلیوں ہی کو دعوت دیتے رہے۔ یہ مبلغ بھی اسرائیلی تھے اور ان کے مخاطب بھی اسرائیلی۔ اس وقت تک مسیحی دعوت یہودی مذہب میں ایک اصلاحی دعوت شمار ہوتی تھی[1]۔ حواریوں میں یہ ایک مسلم مسئلہ تھا کہ انجیل کی منادی صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو شریعت موسویہ کے پیرو ہیں[2]۔ پیروان مسیح کی جو موتمر عام سنہ ۴۹ء میں بمقام یروشلم منعقد ہوئی تھی اس میں ایک بڑی جماعت اسی رائے کی مؤید تھی[3]۔ لیکن پولوس نے بعثت مسیح کی حقیقت، مسیح کی تصریحات اور حواریوں کے علم و یقین سب کو نظر انداز کر کے یہ فیصلہ کیا کہ مسیح کی دعوت تمام دنیا کی قوموں کے لئے ہے، اور اس فیصلہ کو حق بجانب قرار دینے کے لئے یہ دعویٰ کیا کہ مسیح نے صلیب پر چڑھنے اور وفات پا جانے کے بعد اپنے شاگردوں کے پاس آکر یہ حکم دیا تھا کہ "تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ"[4] (متی ۲۸: ۱۹)

(حاشیہ صفحہ ۳۶۹) خود سینٹ پال کے شاگرد لوقا کی کتاب اعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح کی زندگی میں اس کو ان کی صحبت اور تربیت سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا، نیز یہ کہ جب اس نے دین مسیحی میں تحریف شروع کی تو مسیح کے خاص تربیت یافتہ حواریوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ پس انہی کی سند پر کہا جا سکتا ہے کہ سینٹ پال نے جو اصول اختیار کئے وہ اصول نہ صرف دین مسیح کی اسپرٹ کے خلاف تھے بلکہ خود مسیح کی صریح ہدایات کے بھی خلاف تھے۔

[1] Millman, History of Christianity Vol. 1. P. 377

[2] Dummellow, Commentary on The Holy Bible P. LXXXIX

[3] Millman, Vol. 1, P. 398

[4] Dummellow, P. LXXXIX

لیکن غیر اسرائیلی قوموں کو موسوی قوانین کا پابند بنانا مشکل تھا بہت سے رسوم و شعائر ایسے تھے جن سے ان قوموں کو نفرت تھی۔ اس لئے فوراً ہی یہ سوال پیدا ہو گیا کہ جب ان قوموں کو مسیحیت کی طرف دعوت دی جائے تو موسوی شریعت کی پابندی پر زور دیا جائے یا نہیں؟ اس بارے میں مسیح کی تصریحات بالکل واضح تھیں۔ وہ فرما چکے تھے کہ "زمین و آسمان ٹل سکتے ہیں مگر توراۃ کا ایک شوشہ اور ایک نقطہ بھی نہیں ٹل سکتا" اور یہ کہ "میں توراۃ کو منسوخ کرنے کے لئے نہیں بلکہ مکمل کرنے آیا ہوں" اور "آسمان کی بادشاہت میں وہی داخل ہو سکتا ہے جو توراۃ کے حکموں پر عمل کرے"۔ ان تصریحات کے بعد کسی سچے مسیحی کے لئے ممکن نہ تھا کہ مسیحیت کو موسوی شریعت سے الگ کرتا مگر پولوس نے ان کے علی الرغم یہ فیصلہ کیا کہ ہر غیر اسرائیلی مسیحی بن سکتا ہے خواہ شریعت پر عمل کرے یا نہ کرے۔[1] چنانچہ وہ تمام غیر اسرائیلی مشرکین جو شریعت موسویہ کے کلی یا جزوی طور پر منکر تھے، مسیحیت میں داخل کر لئے گئے۔

اس ترمیم و تنسیخ پر ناراضی کا اظہار کیا گیا (اعمال باب ۲۱) اور خود مسیح کی جماعت کے اعیان نے بھی اس کی سخت مخالفت کی۔ مگر پولوس نے سینٹ پیٹرس اور سینٹ برناباس جیسے جلیل القدر حواریوں کو ریاکار اور گمراہ قرار دیا (گلیتوں ۲: ۱۱-۱۴) اور علی الاعلان شریعت موسویہ کی مخالفت شروع کر دی۔ وہ گلیتوں کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے:-

"ہم یہ جان کر یسوع مسیح پر ایمان لائے کہ آدمی شریعت کے اعمال سے نہیں بلکہ صرف یسوع مسیح پر ایمان لانے سے برحق ٹھہرتا ہے ..... شریعت کے اعمال سے کوئی بشر برحق نہ ٹھہریگا ..... حقانیت اگر شریعت ہی کے وسیلہ سے ملتی تو مسیح کا مرنا عبث ہوتا" (۲: ۱۶-۲۱)

"جو لوگ شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں سب لعنت کے ماتحت ہیں ..... شریعت کے وسیلہ سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا کیونکہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیتا رہیگا اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں ..... مسیح نے ہمارے لئے لعنتی بنکر اور ہمیں خرید کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا" (۳: ۱۰-۱۳)

[1] Millman, Vol. 1, P. 362

"شریعت ایمان (یعنی مسیح کی تعلیم) تک پہنچانے کے لئے ہماری استاد بنی تاکہ ہم ایمان کے سبب راستباز ٹھہریں، مگر جب ایمان آچکا تو ہم استاد کے ماتحت نہ رہے" (۳: ۲۴-۲۵)

"مسیح نے ہمیں آزاد رہنے کے لئے آزاد کیا ہے پس قائم رہو، اور دوبارہ غلامی (یعنی شریعت کی پابندی) کے جوے میں نہ جتو ... تم جو شریعت کے وسیلہ سے راستباز بننا چاہتے ہو، تو گویا تم مسیح سے الگ ہو گئے اور فضل سے محروم، کیونکہ ہم روح اور ایمان کے توسل سے راستبازی کی امید بر آنے کے منتظر ہیں (۵: ۱-۵)

اس طرح مسیحیت شریعت سے الگ ہوگئی، تمدن، معاشرت، سیاست، اور اجتماعی و انفرادی زندگی کے متعلق تمام قوانین منسوخ ہو گئے، اور صرف چند اخلاقی و روحانی تعلیمات کے ایک نامکمل مجموعہ کو، جو دراصل شریعت کے ضمیمہ کے طور پر ایک خاص قوم کی خاص حالت کو درست کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا، ایک مستقل، دائمی، اور عالمگیر مذہب بنا دیا گیا۔

مسیحی سیرت پر علیحدگی کا اثر سینٹ پال کے متبعوں نے اس غیر مکمل مذہب کو، جو دراصل پورا ہی مذہب تھا، بنی اسرائیل کو چھوڑ کر روم و یونان کی آزاد قوموں میں پھیلانا شروع کیا، لیکن کسی شریعت اور کسی ضابطہ قانون کے بغیر ایک خالص اخلاقی تعلیم، اور ایسی تعلیم جو دراصل ایک غلام اور پسماندہ قوم کے لئے وضع کی گئی تھی، آزاد اور صاحب حکومت و سیاست قوموں کے لئے بالکل بیکار اور بے معنی چیز تھی۔ اس میں کوئی ایسی مکمل ہدایت تو تھی ہی نہیں کہ عام انسانی جماعت کے لئے مختلف حالات میں مفید و مناسب ہو سکتی۔ وہ تو صرف چند اخلاقی نصائح کا مجموعہ تھی جو زیادہ انتہا پسندانہ تھیں، اور ظاہر ہے کہ تنہا ان پر عمل کر کے کسی قوم کا زندہ رہنا محال تھا۔ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی ڈھائی تین سو برس تک تو عیسائی ہر قسم کے مظالم و شدائد کے تختہ مشق بنتے رہے اور اس کے بعد جب انکو حکومت کی تائید حاصل ہو گئی تو پولوسی مسیحیت کے ناممکن العمل دائرہ میں زندگی بسر کرنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا، وہ اس کی حدود توڑ کر نکل گئے اور انہوں نے ظلم و ستم اور قتل و غارتگری کی انتہا کر دی۔

ابتدا میں چونکہ مسیحیوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ ایک گال کے ساتھ دوسرا گال بھی پیش کر دینا اور شریر کا مقابلہ کبھی نہ کرنا مسیح کی دائمی تعلیم ہے، اس لئے جب ان کی تعداد خوب بڑھ گئی اور ان کے اثرات وسیع ہو

گئے اس وقت بھی ان میں ظلم کا مقابلہ کرنے اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کی کوئی روح پیدا نہ ہو سکی سنہ ۶۴ء میں جبکہ یونان و روم اور شام و فلسطین میں مسیحیوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو چکی تھی، نیرو نے ان پر حریق روم کا جھوٹا الزام لگایا اور اس کے حکم سے ہر وہ شخص جس نے مسیحی ہونے کا اقرار کیا، گرفتار کر لیا گیا کسی کو صلیب پر چڑھایا گیا، کسی کو زندہ جلا دیا گیا، کسی کو کتوں سے پھڑوایا گیا اور سینکڑوں عیسائی عورتوں، مردوں اور بچوں کو روم کے اکھاڑوں میں وحشیانہ کھیلوں کا تختہ مشق بنایا جانے لگا۔ سنہ ۷۰ء میں ٹیٹس Titus کے زیر قیادت بیت المقدس پر چڑھائی گئی، ۹۷ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بنا لئے گئے، گیارہ ہزار آدمیوں کو بھوکا مار دیا گیا، ہزاروں آدمی پکڑ کر روم کے اکھاڑوں اور امفی تھیٹروں میں جنگلی جانوروں کا لقمہ بننے یا سیافوں کی شمشیر زنی کا تختہ مشق بننے کے لئے بھیج دیئے گئے۔[1]

نیرو کے بعد مارکوس آریلیوس، سپٹیموس، سیوروس، ڈیسیوس اور والیریان نے مسیحیت اور اس کے پیروؤں کو کچلنے کی کوششیں کیں۔ آخر میں ڈایوکلیشیان نے تو ظلم و ستم کی حد کر دی۔ اس نے عام حکم جاری کر دیا کہ کنیسا مسمار کر دیئے جائیں، انجیلیں جلا دی جائیں، اور کلیساؤں کے اوقاف ضبط کر لئے جائیں سنہ ۳۰۳ء میں خود شہنشاہ نے نیکومیڈیا کے مرکزی کلیسا کو پیوند خاک کر دیا اور مقدس کتابیں جلوا دیں سنہ ۳۰۴ء میں اس نے عام حکم دیدیا کہ جو شخص مسیحی مذہب پر اصرار کرے وہ قتل کر دیا جائے۔ اس کے بعد سختیاں اور بڑھیں، یہاں تک کہ جو لوگ مسیحی مذہب چھوڑنے سے انکار کرتے ان کے بدن زخمی کر کے ان پر سرکہ اور نمک ڈالا جاتا اور بعد میں ان کی بوٹی بوٹی کاٹی جاتی تھی بعض اوقات ان کو کنیسوں میں بند کر کے آگ لگا دی جاتی اور زیادہ لطف اٹھانے کے لئے ایک ایک عیسائی کو پکڑ کر دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جاتا تھا، یا لوہے کے کانٹے اس کے بدن میں بھونکے جاتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ تمام سلطنت میں عیسائی پھیلے ہوئے تھے، سلطنت کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے عہدے بکثرت ان کے ہاتھ میں تھے، اور خود شہنشاہ کے قصر میں عیسائیوں کی ایک کثیر جماعت موجود تھی[2] لیکن مسیحیوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ اس کثرت و قوت کے زمانہ میں بھی مذہبی شریر کا مقابلہ نہ کرنے اور ایک گال کے ساتھ دوسرا گال

ـــــــــــ

[1] Gibbon, Vol. II, Ch. 16 Early Days of Christianity, P.P. 488-89

[2] Rev. Cutts, Constantine The Great PP. 55-60

بھی پیش کیے دینے کی تعلیم ہی واجب العمل ہے جو اسرائیلیوں کو انتہائی بے بسی و کمزوری کی حالت میں دی گئی تھی۔ اس لئے شام، فلسطین، عراق، مصر، افریقہ، اسپین، گال، سسلی، اٹلی، لیبریا، ایشیائے کوچک، غرض کہیں بھی کسی عیسائی نے ان مظالم پر دم نہ مارا، اور ساری قوم ان تجاوزات کو خوشنودی سے گذشتہ کے ساتھ برداشت کرتی رہی۔ حالانکہ رسول عربی صلعم کی اُمت جس کو جہاد کی تعلیم دی گئی تھی، جب ڈھائی تین سو کی تعداد کو پہنچ گئی تو وہ تمام عرب کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑی ہو گئی اور اس نے دنیا کو بتا دیا کہ جس جماعت میں یہ مجاہدانہ اسپرٹ موجود ہو وہ قلتِ تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود کسی سے دب کر نہیں رہ سکتی۔

یہ تو مسیحیت کی تفریط تھی۔ اس کے بعد جب قسطنطین اعظم نے اس کو قبول کر لیا اور وہ عملاً سلطنت کا مذہب بن گئی تو وہ تفریط کے انتہائی نقطہ سے جست لگا کر دفعتہً افراط کے انتہائی نقطہ پر جا پہنچی۔ پہلی خرابی تو اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ پولسی مسیحیت کو سیاست و تمدن سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کے پیروؤں نے اپنے مذہب کی پابندی کرتے ہوئے ایک خالص انفعالی زندگی اختیار کر رکھی تھی، مگر جب اتفاق وقت سے ان پر سلطنت کی ذمہ داریاں آن پڑیں تو دوسری اور پہلے سے زیادہ شدید خرابی یہ پیدا ہوئی کہ جہانبانی و حکمرانی کے لئے مسیحیت میں ان کی کوئی رہنمائی نہ کی تھی۔ معاملات سلطنت میں تو جنگ بھی ہے اور صلح بھی، سیاست بھی ہے اور تعزیر بھی، انتقام بھی ہے اور عفو بھی۔ مگر موسوی شریعت سے جدا کی ہوئی مسیحیت کے پاس ان میں سے کسی کام کے لئے بھی کوئی ضابطہ قانون اور دستور عمل موجود نہ تھا۔ اس نے زندگی کے معاملات کے لئے بجز اس ایک قانون کے کہ شریر کا مقابلہ نہ کرو، اور کرتہ چھیننے والے کو چوغہ بھی اتار دے، اور کوئی قانون نہ بنایا تھا۔ مگر اس انفعال و تذلل کی تعلیم کے تنگ دائرے میں رہ کر مسیحیوں کے لئے ناممکن تھا کہ سلطنت کے اہم معاملات کو انجام دے سکتے۔ اس لئے وہ اس دائرے کو توڑ کر باہر نکلنے پر مجبور ہوئے، اور جب وہ اسے توڑ کر باہر نکل آئے تو اپنے نفس کے منشاء پر عمل کرنے میں بالکل آزاد تھے۔ اس عملی دنیا میں ان کے لئے کوئی ایسی دینی ہدایت اور الٰہی روشنی موجود ہی نہ تھی جو انہیں صحیح راستہ دکھا سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں نے خدا کی زمین میں فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کیا اور طغیان و سرکشی کا وہ ہنگامہ برپا کیا کہ آج تک سرد نہ ہو سکا۔

قسطنطین کے عہد میں سلطنت کے تقریباً نصف باشندے صنم پرست تھے، اس لئے اس نے ان لوگوں

پھر زیادہ ظلم کرنے کی جرات نہ کی اور صرف اسی پر اکتفا کیا کہ مندروں کے دروازے اور ان کی چھتیں منہدم کرا دیں۔ بتوں کے کپڑے اور زیور اتروا دیئے اور ان کو معبدوں سے باہر نکلوا دیا۔ مگر چند سال بعد جب کلیسا کو مذہب پر پورا تسلط حاصل ہو گیا تو مسیحیت کے مقتداؤں نے وثنیت کو کچلنے کا عزم کر لیا اور مذہبی قوانین کے حسب ذیل دو اصول مقرر کئے جن سے غیر مذاہب کو جبراً مٹانے کے بے شمار احکام مستنبط ہوتے تھے۔

(۱) جن گناہوں کو مجسٹریٹ منع کرے ان پر جسمانی سزا دینا اس کی ذمہ داری میں ہے وہ خود بھی ایک قابل سزا جرم ہے۔

(۲) مشرکی زندقہ اور الحاد یعنی خدائے حقیقی کے بجائے غیر اللہ کی بت پرستانہ عبادت خدائی قانون کی صریح خلاف ورزی ہے قابل تعزیر جرم ہے۔

ان اصول مذکورہ کو عملی جامہ پہنانے کیلئے سب سے پہلے تھیوڈوسیس نے باضابطہ یہ قرار داد منظور کیا کہ رومیوں کا مذہب جوپیٹر Jupiter کی عبادت نہیں بلکہ مسیح کی عبادت ہے۔ اس کے بعد بتوں کی پرستش، اور ان پر نذر و نیاز چڑھانا اور قربانیاں کرنا سب یکقلم ممنوع قرار دے دیا گیا اور ان افعال کے مرتکبوں کیلئے شدید سزائیں مقرر کی گئیں۔ تھیوڈوسیس نے اپنے فرامین میں شرک کی نجس رسوم کو خواہ وہ علانیہ کی جائیں یا گھروں میں چھپا کر حکومت وقت کے خلاف بغاوت اور بدترین قسم کا جرم اور مستوجب موت قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مندروں کو توڑنے، ان کی جائدادیں ضبط کرنے اور عبادت کے سامان کو مٹا دینے کا بھی عام حکم دیدیا۔ اس حکم کے مطابق سب سے پہلے مرکز حکومت میں وثنیت کا جبراً خاتمہ کیا گیا، پھر صوبوں میں بھی یہی مشق کی گئی۔ گال کے صوبہ میں تورس کے بشپ سینٹ مارٹن نے راہبوں کی ایک بڑی فوج سے کر تمام مندروں، معبدوں اور بتوں کو حتیٰ کہ ان درختوں تک کو جو مقدس سمجھے جاتے تھے بیخ و بن سے اکھاڑ دیا۔ شام میں مسیحیت کے مقدس پیشوا مارسیلوس Marcellus نے، جو حلقہ اپامیا Diocess of Apamea کا بشپ تھا، جوپیٹر کے عظیم الشان مندر کو تباہ کر دیا اور ایک بڑی فوج فراہم کی جسے ساتھ لیکر وہ اپنے حلقہ کے غیر مسیحی معابد کو توڑتا پھرتا تھا۔ اسکندریہ میں مسیحیت کے آرچ بشپ تھیوفیلوس Theophilus نے سیراپس کے معبد کو، جو یونانی فن تعمیر کا بے نظیر نمونہ تھا، مسمار کر دیا اور اس کے کتبخانہ کو جس میں خاندان بطالسہ نے علوم و فنون کا بہترین ذخیرہ جمع کیا تھا نذر آتش کر دیا۔[۲]

[۱] Rev. Cutts, Constantine The Great p. 278

[۲] اس کتبخانہ کو ایک بار مارک انتونی نے دوبارہ کتابوں سے بھر دیا تھا۔ اوروسیوس لکھتا ہے کہ ۲۰ برس بعد اس کتبخانہ کی خالی الماریوں کو دیکھکر

سراپیس کے بت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، اس کے بازوؤں کو اسکندریہ کے بازاروں میں گھسٹوایا تاکہ اس کے معتقدین دیکھ کر جلیں، اور آخر میں اس کے ٹکڑوں کو ہزارہا آدمیوں کے سامنے جلوا دیا۔ اسی طرح دوسرے صوبوں میں بھی مذہبی دیوانوں کی ایک پوری فوج کسی باضابطہ اختیار اور کسی نظم و تربیت کے بغیر پرامن باشندوں پر حملے کرتی اور قدیم فن تعمیر کے بہترین نمونوں کو برباد کرتی پھرتی تھی۔[1]

ان مظالم کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذمی رعایا نے تلوار کے خوف سے اس مذہب کو قبول کر لیا جس کو وہ دل سے پسند نہ کرتی تھی۔ بددل اور بے اعتقاد پیرووں سے مسیحی کلیسا بھر گئے۔ ۲۸ برس کے اندر روم کی عظیم الشان سلطنت سے وثنیت کا نام و نشان مٹ گیا اور یورپ، افریقہ، اور مشرق ادنیٰ میں تلوار کے زور سے مسیحیت پھیل گئی۔

اس کے بعد سے مسیحی اور غیر مسیحی سلطنتوں کے ساتھ جس قدر لڑائیاں کی گئی ہیں ان میں اخلاق و انسانیت کے مبادی و اصول کو بالائے طاق رکھ کر جنگ کے ایسے ایسے وحشیانہ طریقے اختیار کئے گئے ہیں جن کے ہولناک ذکر سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ غیر مسیحی عقائد کو مٹانے کے لئے قوت کے استعمال کے جن طریقوں کو مسیحیت کے پیرووں نے جائز کر رکھا تھا ان کا ایک نمونہ وہ مذہبی عدالتیں ہیں جو انکوئزیشن (Inquisition) کے نام سے خود پاپایان روم کے ماتحت قائم تھیں۔ ان میں کفر و الحاد، یہودیت، اسلام اور تعدد ازواج جیسے "جرائم" کی سزا دینے کے لئے جو قانون تعزیرات رائج تھا اس میں منجملہ بہت سی سزاؤں کے انسانوں کو زندہ جلا دینا، زبان کاٹ ڈالنا، اور مرے ہوئے شخص کی قبر کھود کر ہڈیاں نکال پھینکنا بھی شامل تھا۔ تنہا اسپین میں اس مذہبی عدالت کے حکم سے تین لاکھ چالیس ہزار آدمی مختلف طریقوں سے قتل کئے گئے جن میں ۳۲ ہزار وہ تھے جنہیں زندہ جلایا گیا۔ اس کے علاوہ میکسیکو، قرطاجنہ، سسلی، سارڈینیا، مالٹا، نیپلز، میلان، فلانڈرس وغیرہ علاقوں کی مذہبی عدالتوں نے اپنی مدت حیات میں جتنے آدمیوں کو غیر مسیحی عقائد رکھنے کی پاداش میں ہلاک کرایا ان کی تعداد کا کم سے کم اندازہ ڈیڑھ لاکھ کیا گیا ہے۔[2]

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۵) ہر وہ دل رنج و الم اور نفرت و غضب سے بھر جاتا تھا جو مذہبی تعصب سے بالکل سیاہ نہ ہو گیا ہو۔ یہی کتب خانہ ہے جس کے جلانے کا الزام بعض عیسائی مورخوں نے مسلمانوں پر لگایا ہے۔

[1] یہ تمام تفصیلات گبن کی تاریخ زوال و سقوط سلطنت روم کے باب ۲۸ سے لی گئی ہیں۔

[2] Encyclopaedia Brittannica, Art. "Inquisition"

یہ پوری مسیحیت کی ناقص تعلیم کا دوسرا نتیجہ ہے۔ پہلا نتیجہ تو یہ تھا کہ جب مسیحیوں نے اس مذہب کے احکام کی پابندی کی تو حد سے زیادہ نرم بن گئے اور مقاومت کی استطاعت کے باوجود ظلم و ستم کو برداشت کرکے تین سو برس تک اپنے آپ کو تباہ کرتے رہے۔ اور دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ جب زمانہ کے انقلاب نے ان کو قوت بخشی اور سلطنت کی ذمہ داریاں ان پر آپڑیں تو انہیں مسیحیت کے تنگ دائرے سے نکلنا پڑا اور یہاں، مذہب کی ہدایت و رہنمائی نہ پاکر، انہوں نے اپنے ابنائے نوع پر ہر قسم کے ظلم و ستم کرنے شروع کئے اور نفس کی پیروی میں آزادی کے ساتھ جو چاہا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ظلم و ستم بعض مسلمان بادشاہوں نے بھی کئے ہیں، جنگ کے وحشیانہ طریقے مسلمانوں کی بھی بعض لڑائیوں میں پائے گئے ہیں، مذہب کے نام پر غیر مذہبی جنگ کرنے کے داغ سے مسلمانوں کا دامن بھی پاک نہیں رہا ہے، مگر دونوں میں اصولی فرق یہ ہے کہ مسلمانوں کے کسی عمل کی ذمہ داری اسلام پر نہیں آتی، کیونکہ اس نے ان کی تمام فطری ضروریات کے لحاظ سے مکمل قوانین بنا کر دیدیئے ہیں جن میں نہ تو غیر طبعی حدود و قیود ہیں کہ ان کی پابندی نا ممکن ہو، اور نہ ایسی بے قیدی اور کھلی ہوئی آزادی ہے کہ انسان جو چاہے کرے، اسلئے پیروان اسلام سے جو نامناسب حرکات سرزد ہوئی ہیں وہ دراصل قانون شکنی کی تعریف میں آتی ہیں جن کی کوئی ذمہ داری قانون پر نہیں آتی۔ بخلاف اس کے مسیحیت نے اپنے پیروؤں کو ان کی عملی زندگی کے لئے کوئی قانون بنا کر نہیں دیا۔ اس نے نہیں بتایا کہ اگر دوسری قوموں سے صلح ہو تو کن اصول پر ہو، جنگ ہو تو کن مقاصد کے لئے ہو، میدان جنگ میں جائیں تو دشمن سے کیا برتاؤ کریں، دشمن پر فتح پائیں تو اس کے ساتھ کیا سلوک کریں، غیر مذاہب کے باشندوں سے مراعات کریں تو کس حد تک، اور ان پر سختی کریں تو کن امور میں۔ اس لئے پیروان مسیحیت نے پہلے اس کے دائرے میں رہ کر، اور پھر اس کے دائرے سے نکل کر جتنے اخلاقی گناہ کئے ہیں ان کی ذمہ داری میں خود مسیحیت بھی شامل ہے، کیونکہ اس نے انہیں سیدھی راہ نہیں بتائی۔ اسلام کی طرح مسیحیت اپنے پیروؤں کے گناہوں سے اس بنا پر تبری نہیں کر سکتی کہ انہوں نے اس کے بتائے ہوئے اصول و قواعد کی پیروی نہیں کی۔ وہ ان دو صورتوں میں سے ایک کو اختیار کرنے پر مجبور ہے کہ یا تو ان سب عیسائیوں کو گنہگار قرار دے جنہوں نے سیاست و حکمرانی کی ذمہ داری قبول کی ہے، خواہ حق کے ساتھ اسے انجام دیا ہو یا غیر حق کے ساتھ، یا پھر اسے ان تمام عیسائیوں کو بے گناہ قرار دینا پڑیگا جنہوں نے جہانبانی و فرمانروائی کے بار کو اٹھایا اور اس کے امور کو انجام دیا، خواہ

حق کے ساتھ یا غیر حق کے ساتھ۔ وہ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری صورت اختیار نہیں کر سکتی اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں غیر معقول ہیں۔

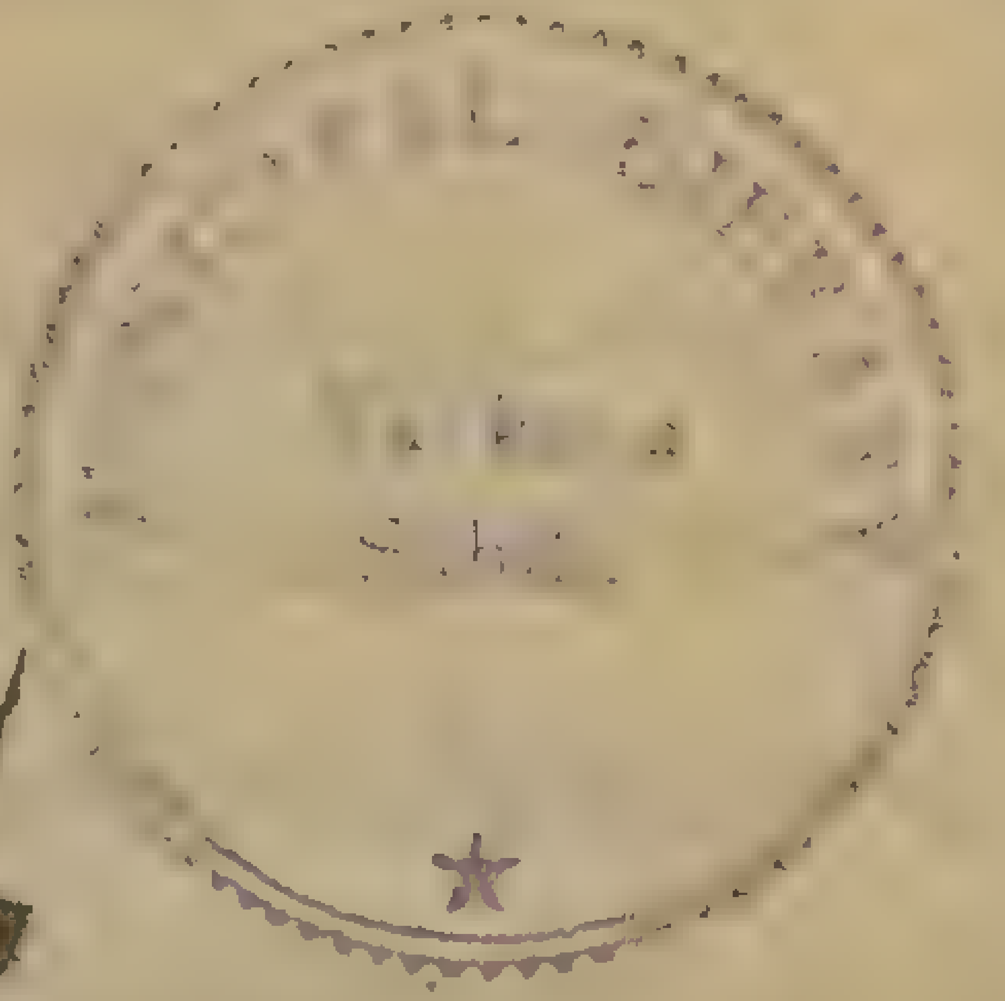
۵۔ مذاہب اربعہ کی تعلیم پر ایک نظر

ہم نے یہاں جنگ کے مسئلہ میں دنیا کے چار بڑے ادیان کے مسلک بیان کر دیئے ہیں۔ یہ مسلک افراط اور تفریط کے دو مختلف نمونے پیش کرتے ہیں۔ مقدم الذکر دو مذہب جنگ کو جائز رکھتے ہیں مگر اس طرح کہ انسان کو اُن تمام اغراض کی خاطر لڑنے کی اجازت دیتے ہیں جن کے لیے ان کا نفس خواہشمند ہو۔ وہ اغراض و مقاصد میں حق و ناحق کا امتیاز نہیں کرتے۔ انسان کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہیں پیش کرتے، اس کو کسی اعلیٰ اخلاقی مقصد کی طرف توجہ نہیں دلاتے، بلکہ خالص حیوانی فطرت پر اس کو یہ حق دیتے ہیں کہ اپنے ابنائے جنس پر جب چاہے، جس طرح چاہے، جس غرض کے لئے چاہے، دست درازی کرے اور جو کچھ چاہے ان سے حاصل کرے۔ انہوں نے تہذیب کی جانب اگر کچھ پیش قدمی کی بھی ہے تو وہ صرف اتنی کہ اس دست درازی کے کچھ طریقے مقرر کر دیئے ہیں، اور اپنے پیروؤں سے مطالبہ کیا ہے کہ جب کبھی وہ اپنے ابنائے جنس کا شکار کرنا چاہیں تو فلاں طریقے سے کریں اور فلاں طریقے سے نہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے انسانیت کو جغرافی، نسلی، اور لونی اصول پر تقسیم کیا ہے اور کسی خاص نسل کے لوگوں کو کچھ ایسی رعایات دی ہیں جن سے باقی تمام ابنائے نوع محروم ہیں۔ دوسری طرف موخر الذکر دو مذاہب یہ تو محسوس کرتے ہیں کہ انسان کو خود انسان کا شکار کرنے کی آزادی دینا درست نہیں ہے، مگر یہ احساس ان کو ایک دوسرے انتہائی نقطہ کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ جنگ سے جنگ کرتے کرتے خود انسانی فطرت ہی سے جنگ کرنے لگتے ہیں۔ اللہ نے انسان کی زندگی میں اعتدال قائم رکھنے کے لئے اس کے اندر جو مختلف قوتیں ودیعت کی ہیں وہ ان میں سے بعض کو بالکل فنا کر دینا چاہتے ہیں، اور بعض کو پوری انسانی سیرت پر حاوی کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں وہ تنزل و انحطاط اور مغلوبی و مقہوری کی انتہائی پستیوں میں گر جاتے ہیں۔ اور جو باقتضائے فطرت اپنے آپ کو ان کی تقلید کے قابل نہیں پاتے اور اپنے انسانی فرائض ادا کرنے پر

مجبور ہوتے ہیں، ان کو عملی زندگی کے کسی شعبہ میں ہدایت کی روشنی نہیں ملتی، ناچار وہ خود اپنے اہواء و امیال کی پیروی اختیار کر کے کبھی ادھر اور کبھی اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔

افراط و تفریط کے ان دو انتہائی نقطوں کے درمیان اسلام نے توسط و اعتدال کی ایک درمیانی راہ نکالی ہے۔ وہ انسانی فطرت، انسانی ضروریات کے صحیح اقتضا۔ اور سب سے زیادہ انسانیت کی اصلاح کے مقصد کو پیش نظر رکھکر جنگ کو دو قسموں پر تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جنگ جو ملک و مال، جاہ و اقتدار اور نفسانی اغراض کے حصول کے لئے لڑی جائے۔ دوسری وہ جنگ جو حق کی حمایت، اور ظلم و جور کو رفع کرنے کے لئے ہو۔ پہلی جنگ کو وہ فتنہ و فساد سے تعبیر کرتا ہے اور اس کو ایک بدترین معصیت قرار دیکر اس سے کامل اجتناب کا حکم دیتا ہے۔ دوسری جنگ اس کے نزدیک اگر خالص حق کے لئے کی جائے اور اس میں کوئی نفسانی غرض شامل نہ ہو تو وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے، ایک بہترین عبادت ہے، ایک مقدس ترین فرض ہے، اور ایک ایسی چیز ہے جس سے زیادہ افضل و احسن انسانی خدمت کوئی نہیں ہے۔ پھر اس عبادت کے لئے اس نے حدود مقرر کئے ہیں، اس کے مواقع بتائے ہیں، اس کے مقاصد کی تفصیل کی ہے، اور اس کے طریقے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کئے ہیں، تاکہ خدا کے نام سے شیطان کا کام نہ ہونے لگے، اور انسان اپنے نفسانی میلانات، خواہشات کی پابندی اختیار کر کے غلط راستے پر نہ پڑ جائے۔

یہ ایک ایسا مکمل ضابطۂ قانون ہے جس کی نظیر اسلام کے سوا کسی مذہب اور کسی تہذیب میں نہیں ملتی۔ کہیں مناہج عمل موجود ہیں تو مقاصد کار کی تعیین نہیں ہے۔ کہیں مقاصد کا ذکر موجود ہے تو مناہج عمل کا پتہ نہیں۔ کہیں مقاصد و مناہج کو کسی حد تک مقرر کیا گیا ہے تو اس میں وہ بلندی و فضیلت نہیں ہے جو اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ پس یہ حقیقت آج قطعاً ناقابل انکار ہے کہ جنگ کو کامل طریقہ پر اس کی قدرتی حدود میں محدود کرنے اور اسے ایک وحشیانہ تصادم سے مہذب مقابلہ تک اور ظلم سے عدل کے درجہ تک اور معصیت سے نیکی اور فرض کے مرتبے تک پہنچانے کی اگر کسی نے کوشش کی ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اسی قانون کو اختیار کر کے دنیا اس لعنت سے بھی بچ سکتی ہے جس کا نام ظلم ہے، اور اس لعنت سے بھی جس کا نام مظلومی ہے۔



باب ہفتم

جنگ تہذیب جدید میں

اس باب میں ہم موجودہ تہذیب کے مقاصد جنگ اور قوانین جنگ کا جائزہ لیکر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اخلاق و انسانیت کے لحاظ سے ان کا کیا حال ہے۔ ہماری پچھلی بحثوں کو دیکھ کر ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ بیشک اسلام نے اپنے عہد کی تہذیب میں بڑی قابل قدر اصلاح کی تھی اور جنگ کے ایسے مقاصد و مناہج کی طرف اس نے انسان کی رہنمائی کی جس سے اس کے ہمعصر تمدن اور ادیان ناآشنا تھے، مگر آج صدیوں کی ترقیات کے اثر سے جنگ کے متعلق انسانی افکار میں جو بلوغ پیدا ہو گیا ہے اور اس کی بدولت جو مہذب قوانین جنگ وجود میں آئے ہیں، ان سے اس عہد کے قوانین و افکار کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے جبکہ انسان کے قوائے فکریہ نسبتہ عالم طفلی میں تھے؟ اس لئے ایک دوسرے تقابل کی ضرورت ہے جس میں اسلام اور تہذیب جدید کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھا جائے کہ جنگ کے متعلق کس کے مقاصد و مناہج زیادہ صحیح، زیادہ مفید اور زیادہ مضبوط ہیں۔

قبل اس کے کہ اس تقابل کا سلسلہ شروع کیا جائے یہ طے کر لینا ضروری ہے کہ ہمیں جنگ کے متعلق مغربی تہذیب کا اصلی قانون معلوم کرنے کے لئے کس چیز کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ ایک مسئلہ میں کسی انسانی جماعت کے عقائد اور طریق کار کا حال عموماً تین چیزوں سے معلوم ہوتا ہے، مذہب، ادبیات، اور سوسائٹی کا طرز عمل۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے اس کو تو تہذیب جدید نے افراد کا شخصی معاملہ بنا دیا ہے اور

موجودہ زمانے کی تمدنی زندگی کے معاملات پر اس کا کوئی قابو نہیں ہے۔ جہاں تک ادبیات کا تعلق ہے، بلاشبہ ان کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مغرب میں موجود ہے۔ مغربی فقہا اور علمائے اخلاق نے جنگ اور متعلقاتِ جنگ پر بہت کچھ لکھا ہے اور ہر پہلو سے ان پر بحث کی ہے، لیکن اس قسم کے اہلِ قلم حضرات کے افادات کو اجتماعی افکار کے نشو و نما میں خواہ کتنا ہی گہرا اثر حاصل ہو، اور سوسائٹی کے قوانین کی تشکیل میں ان کے خیالات نے کیسا ہی زبردست حصہ لیا ہو، مگر وہ خود اپنے اندر کوئی ایسی قوت نہیں رکھتے جس کی بنا پر ان کو انسانی جماعت کے لئے حجت قرار دیا جا سکتا ہو۔ دنیا کے بڑے سے بڑے مصنف کو بھی یہ فخر حاصل نہیں ہے کہ اس کا کوئی قول اس کی قوم کے لئے قانون کی حیثیت رکھتا ہو۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ اس کے اقوال سے متاثر ہو کر اس کی قوم نے اپنے لئے بہت سے قوانین بنائے ہوں، مگر وہ قوانین اس قوم پر اس دلیل سے حجت نہیں ہوں گے کہ وہ فلاں مصنف کے اقوال ہیں، بلکہ اس بنا پر حجت ہوں گے کہ انہیں قوم نے اپنے لئے قانون کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ پس جنگ کے مسئلہ میں ہمارے لئے وہ وسیع لٹریچر بھی بیکار ہے جو مغربی زبانوں میں علمائے مغرب کی قابلِ قدر کوششوں نے مہیا کیا ہے۔ اب صرف تیسری چیز رہ جاتی ہے جس سے ہم مغربی تہذیب کے مقاصد و مناہج جنگ معلوم کر سکتے ہیں، اور وہ مغربی اقوام کا تعامل ہے۔ یہ تعامل دو قسم کا ہے، ایک مدون یا لکھا ہوا (Written) جسے اصطلاح میں بین الملی قانون (International Law) کہتے ہیں۔ دوسرا غیر مدون یا بے لکھا (unwritten) جو عبارت ہے سلطنتوں کے باہمی معاملات اور عملی سیاسیات سے۔ ان دونوں قوانین میں زیادہ معتبر اور مستند کون ہے؟ اختلاف کی صورت میں کس پر اعتماد کیا جائے گا؟ اور مغربی قوموں پر حجت بننے کی اصلی صلاحیت کس میں ہے؟ یہ ایسے مسائل ہیں جن پر خود علمائے مغرب میں سخت اختلاف ہے اور آج تک ان کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ مگر ہمیں اس اصولی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قدرتی طور پر مسئلہ جنگ کے مختلف پہلو دونوں کے درمیان کچھ اس طرح تقسیم ہو گئے ہیں کہ جنگ کا اخلاقی پہلو کلیتہً غیر مدون قانون کے حصے میں آگیا ہے، اور عملی پہلو پر مدون قانون حاوی ہو گیا ہے۔ اس لئے ہم ترجیح کے سوال کو چھوڑ کر دونوں پہلوؤں پر دونوں سے الگ الگ بحث کریں گے۔

۱۔ جنگ کا اخلاقی پہلو

مسئلۂ جنگ کی تحقیقات میں اب تک ہم نے جس طریقے کی پیروی کی ہے اس کے اعتبار سے ترتیب میں جنگ کا اخلاقی پہلو پہلے آتا ہے۔ سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مغربی تہذیب جنگ کو کس نظر سے دیکھتی ہے؟ اس کے نظامِ اخلاق میں جنگ کی کیا حیثیت ہے؟ اس کے نزدیک جنگ کن مقاصد کے لئے جائز ہے اور کن کے لئے ناجائز؟ اگر اس پہلو میں وہ اپنے لئے کوئی بلند اور پاکیزہ نصب العین رکھتی ہے تو وہ کیا ہے؟ اور اگر نہیں رکھتی تو عالمِ اخلاق اور دنیائے تہذیب میں اس کا کیا مقام قرار پاتا ہے؟ ان سوالات کو حل کرنے کے بعد طریقِ جنگ کے قانون کی صحت و عدمِ صحت کا سوال زیرِ بحث آئے گا۔

مذکورہ بالا سوالات کے بارہ میں مغرب کا مدون قانون بالکل خاموش ہے۔ ابتدائی زمانہ میں تو اخلاق کا سوال بین الملی قانون میں ایک متعلق (Relevent) سوال سمجھا جاتا تھا، چنانچہ اس قانون کے مدونِ اول گروٹیوس (Grotius) نے اپنی کتاب (De Jire Belli ac Pacis) میں متعدد مقامات پر جنگ کے جائز و ناجائز مقاصد میں امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن عہدِ جدید کے بین الاقوامی قانون نے اس سوال کو قطعاً خارج از بحث کر دیا ہے۔ پروفیسر لارنس اپنی کتاب "اصول قانون بین الاقوام" میں لکھتا ہے:

"جدید بین الاقوامی قانون ان اخلاقی مسائل سے بالکل ناآشنا ہے۔ وہ ان کے متعلق کچھ نہیں کہتا، بلکہ انہیں صاف نظر انداز کر جاتا ہے۔ اس کے نزدیک، جنگ خواہ حق بجانب ہو خواہ غیر حق بجانب، منصفانہ ہو یا غیر منصفانہ، بہر حال وہ فریقین کے تعلقات کو متعدد و مختلف صورتوں سے بدل دیتی ہے، اور اس لحاظ سے قانون کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اس تغیر کے حدود اور قانونی صورتوں کو واضح کر دے۔ وہ ہم کو صرف یہ بتائے گا کہ کس طرح محاربیت (Belligerency) کا تعلق پیدا ہوتا ہے، اور محاربین ایک دوسرے کے متعلق اور غیر جانبداروں کے متعلق کیا حقوق و فرائض رکھتے ہیں . . . . اخلاقی سوالات بذاتِ خود خواہ کتنے ہی غور و توجہ کے مستحق ہوں، لیکن ایک بین الملی

قانون کی کتاب میں وہ اسی قدر بے محل ہیں جس قدر شخصی مراتب کے قانون میں اخلاقیات ازدواج کا سوال ہو سکتا ہے[1]؟

ایک جرمن مصنف ایلتس باشر Eltzbacher لکھتا ہے :-

"بین الملی قانون نے ہمیشہ جنگی اعمال پر صرف اُس قسم کی پابندیاں عائد کی ہیں جن کو مقاصد جنگ سے قابل لحاظ حد تک تعرض کئے بغیر ملحوظ رکھنا ممکن ہو۔ اس نے صرف یہ تجویز کرنے پر اکتفا کی ہے کہ حتی الامکان دشمن کو غیر ضروری نقصانات سے معاف رکھا جائے یعنی ایسے نقصانات پہنچانے سے پرہیز کیا جائے جو کسی طرح مقاصد جنگ کے حصول میں مددگار نہیں ہوتے، یا اپنے حاصل کی نسبت سے بہت زیادہ گراں قیمت ہوتے ہیں[2]"

پروفیسر نپولد لکھتا ہے :-

"اس بنا پر جنگ میں گناہ کا سوال بین الملی قانون کا سوال نہیں ہے بلکہ اخلاقیات کا سوال ہے بین الملی قانون ایک جائز و ناجائز جنگ میں امتیاز نہیں کرسکتا، کیونکہ جنگ بین الملی قانون کے نقطۂ نظر سے ہمیشہ قانون کی نقیض سمجھی جاتی ہے[3]"

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں تک لکھے ہوئے یا مدون بین الملی قانون کا تعلق ہے، اس میں حق و ناحق، جائز و ناجائز جنگ کے درمیان کوئی امتیاز قائم نہیں کیا گیا ہے اور اس سے ہم یہ نہیں معلوم کرسکتے کہ مغربی تہذیب کن مقاصد کے لئے جنگ کو جائز رکھتی ہے اور کن کے لئے ناجائز۔ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر بانی نے کہا ہے ایک بین الملی قانون غیر مدون یا بے لکھا بھی ہے، اور اصلی قانون وہی ہے، اس لئے اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ اس بارے میں مغرب کی مہذب ترین قوموں کا عمل کیا ہے؟ وہ قومیں جن کا عمل تہذیب جدید کا معیار ہے، جن کی حرکات و سکنات تہذیب سازی کا درجہ رکھتی ہیں، اور جن کے کردار و گفتار سے دراکسی وہ سرمی

[1] Lawrence, Principles of International Law, P. 292

[2]

[3] Nippold, Development of International Law After the World War, Eltzbacher, Nippold, P. 7-8

چیز کو تہذیب جدید سے تعبیر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے درمیان جب جنگ برپا ہوتی ہے تو کن اغراض و مقاصد کے لئے ہوتی ہے؟ کس قسم کی جنگ کو ان کے ہاں حق و انصاف کی جنگ کہا جاتا ہے؟ اس کے لئے ہم ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں سے بحث نہیں کریں گے جو انیسویں اور بیسویں صدی میں مہذب اور مغربی نقطۂ نظر سے غیر مہذب قوموں کی ایک قلیل جماعت کے درمیان ہوئیں، کیونکہ ان میں جو کچھ ہوا اس کو ہم مغربی تہذیب کا مکمل نمونہ نہیں کہہ سکتے۔ ان سب کو چھوڑ کر ہم صرف بیسویں صدی کی اس جنگ عظیم پر نظر ڈالتے ہیں[1] جس میں مغربی تہذیب کے تمام علمبردار شامل تھے، یا بہ الفاظ دیگر جس کی مجلس عاملہ میں دنیائے جدید کی تمام مہذب قوموں کی نمائندگی ہوئی تھی۔ اس جنگ کی روداد ہم کو بتا سکتی ہے کہ مغربی تہذیب کی نگاہ میں جائز و ناجائز جنگ کے امتیاز کا اخلاقی معیار کیا ہے۔

جنگ عظیم کے اسباب و وجوہ ۱۹۱۴ء–۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم دراصل یورپ کی چھ بڑی قوموں کے درمیان ہوئی تھی، اگرچہ ضمنی طور پر دوسری چھوٹی بڑی قومیں بھی اس میں شامل ہو گئی تھیں۔ اس کا ایک فریق جرمنی و آسٹریا پر مشتمل تھا، اور دوسرا فریق انگلستان، فرانس، روس اور اٹلی پر۔ یہ دو مقابل جتھے جن قوموں سے مرکب تھے ان میں باہم شدید اور تاریخی عداوتیں تھیں۔ انگلستان، فرانس کا پرانا دشمن تھا، یہاں تک کہ ۱۸۹۹ء میں مسئلہ سوڈان پر اس کی جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ روس اور انگلستان کے درمیان سخت رقابت تھی، حتیٰ کہ بیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان پر روسی حملے کا خطرہ ہر وقت انگریزی سلطنت کو آمادۂ جنگ رکھتا تھا۔ اسی طرح فرانس اور اٹلی کے درمیان مسئلہ ٹیونس تقریباً نصف قرن سے عداوت و رقابت کا منبع بنا ہوا تھا، اور اسی کی بدولت عین آغاز جنگ عظیم تک اٹلی جرمنی کے ساتھ حلیفانہ اتحاد رکھتا تھا لیکن بیسویں صدی کے ابتدائی عشرہ میں ان معاند قوموں کے درمیان چند ایسے اغراض و مقاصد کا رشتہ پیدا ہو گیا جن کے باعث وہ سب متحد ہو گئیں اور ایک دوسرے جتھے کے خلاف دوش بدوش جنگ میں شریک ہوئیں۔ دوسری طرف جرمنی ۱۹۰۴ء تک انگلستان کا دوست رہا، اٹلی سے ۱۹۱۴ء

[1] یاد رہے کہ یہ کتاب پہلی جنگ عظیم کے بعد لکھی گئی تھی۔ اس لئے یہاں اسی جنگ کے اخلاقی پہلو پر بحث کی جا رہی ہے اس کے بعد دنیا نے ایک اور عالمگیر جنگ دیکھی جس کا اخلاقی پہلو اس سے بھی زیادہ گھناؤنا تھا۔

ہے اس کے حلیفانہ تعلقات رہے، روس ۱۹۰۷ء تک اس کا دوست تھا بلکہ زار و قیصر کے درمیان جنگ کی ابتدا تک گہرے دوستانہ تعلقات تھے، مگر کچھ دوسری اغراض تھیں جنہوں نے اس دوستی کو دشمنی میں تبدیل کر دیا اور جرمنی کو اس آسٹریا کے ساتھ متحد ہو کر اپنے ان قدیم دوستوں کے خلاف جنگ کرنی پڑی جو ایک زمانہ میں اس کا حریف رہ چکا تھا۔

قوموں کی جتھہ بندی یہ خاص اغراض کیا تھیں؟ مذہب کا کوئی سوال نہ تھا کہ سب کے سب عیسائی تھے مدافعت وطن کا بھی کوئی سوال نہ تھا کہ کسی نے کسی پر حملہ نہ کیا تھا، حقوق کا بھی کوئی سوال نہ تھا کہ سب اپنے اپنے حقوق سے پوری طرح متمتع ہو رہے تھے۔ پھر کیا چیز تھی جس نے ان کو ایک دوسرے کے خلاف لڑنے پر آمادہ کیا؟ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ ہر قوم اپنے حصہ سے کچھ زیادہ لینا چاہتی تھی، اور ہر فریق کی خواہش تھی کہ دوسرے فریق کو مٹا کر اس کے منافع سے خود مستفید ہو۔ ان کے درمیان عداوت کا پہلا بیج ۱۸۷۰ء میں پڑا جب کہ جرمنی نے فرانس سے السیس اور لورین کے علاقے چھین لئے۔ باوجودیکہ السیس کی پوری آبادی جرمنی الاصل تھی، اور لورین کی آبادی کا ایک بڑا حصہ نسلی اور لسانی حیثیت سے جرمن تھا، فرانس نے اس کو اپنی ایک قومی حق تلفی قرار دیا اور اس وقت سے فرانسیسی سیاست کا غالب نصب العین یہ ہو گیا کہ وہ جرمنی کو نیچا دکھا کر یہ صوبے پھر حاصل کرے۔ اس کے بعد جرمنی کی تجارت اور صنعت کی ترقی شروع ہوئی، یہاں تک کہ انیسویں صدی کے اختتام پر وہ دنیا کا ایک عظیم الشان صناع اور تاجر ملک بن گیا۔ ۱۹۰۰ء میں اس نے محسوس کیا کہ بحری تجارت کے تمام وسائل پر انگلستان مسلط ہے اور اس تسلط کو ایک زبردست جنگی بیڑے کے بغیر دور نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ اس نے اپنی بحری قوت کو تیزی کے ساتھ ترقی دینی شروع کر دی۔ اس اٹھتے ہوئے خطرے کو انگلستان نے فوراً محسوس کیا۔ پہلے اس نے کوشش کی کہ جرمنی کو دوست بنائے ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۲ء تک مسٹر چیمبرلین، لارڈ لینسڈاؤن اور دوسرے برطانوی مدبرین پیہم اس پر ڈورے ڈالتے رہے، لیکن جرمنی برطانیہ کے بحری اور تجارتی تفوق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اور خود دنیا کی تجارت میں بالاتر قوت بننا چاہتا تھا، اس لئے دونوں حریف حلیف نہ بن سکے، اور دنیا کی سیاست میں دفعۃً ایک انقلاب رونما ہو گیا۔ اس انقلاب کا پہلا ظہور ۱۹۰۴ء میں ہوا

جب کہ صدیوں کے دشمن انگلستان اور فرانس گلے مل گئے۔ فرانس نے مصر پر انگریزی قبضہ کو تسلیم کر لیا۔ اس کے جواب میں انگلستان نے مراکش پر فرانسیسی قبضہ تسلیم کر لیا اور دونوں قوموں نے متحد ہو کر آئندہ کے لئے اپنی اغراض کی خاطر عہد و پیمان کر لئے۔

اس کے بعد ۱۹۰۷ء میں روس بھی اس جتھے میں شامل ہو گیا۔ اس کے پیش نظر دو عظیم الشان مقاصد تھے۔ ایک درہ دانیال اور باسفورس کا قبضہ جس کے لئے وہ کامل ڈیڑھ سو سال سے جد و جہد کر رہا تھا، دوسرے جزیرہ نمائے بلقان پر غلبہ و تسلط تاکہ بحر ایجین اور بحر متوسط تک اس کو راستہ مل سکے۔ ان دونوں اغراض میں جرمنی اور آسٹریا اس کے حریف تھے۔ جرمنی کے پیش نظر برلن سے بغداد تک ایک ریلوے لائن قائم کر کے اپنی مشرقی تجارت کو فروغ دینا تھا جس کے لئے وہ چاہتا تھا کہ ٹرکی اور بلقان روسی اثر سے آزاد رہیں۔ دوسری طرف آسٹریا کو توسیع مملکت اور توسیع تجارت کی ہوس پوری کرنے کی صرف یہی ایک صورت نظر آتی تھی کہ جزیرہ نمائے بلقان پر قبضہ کر کے ایجین اور ایڈریاٹک کے بندرگاہوں سے فائدہ اٹھائے، چنانچہ اس غرض کے لئے اس نے ۱۹۰۸ء میں بوسنیا اور ہرزیگووینا کو باقاعدہ ملحق کر لیا تھا۔ ۱۹۰۷ء تک انگلستان روس کی سیاسی اغراض کا مخالف رہا، لیکن جب اس کو معلوم ہو گیا کہ روس کی مدد کے بغیر وہ جرمنی کا گلا گھونٹ کر مار دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تو اس نے اپنے اس قدیم حریف کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اسے یقین دلا دیا کہ کسی مناسب موقعہ پر درہ دانیال اور باسفورس پر قبضہ کرنے میں وہ اس کی مدد کرے گا۔

اس طرح ۱۹۰۷ء تک دو زبردست جتھے بن گئے۔ ایک جتھے میں انگلستان، فرانس اور روس تھے دوسرے میں جرمنی اور آسٹریا۔ پہلے جتھے والوں کے درمیان وجہ اتحاد یہ تھی کہ وہ اپنی سلطنت کو وسیع کرتے اور اپنے تجارتی تفوق کو باقی رکھنے کے لئے جرمنی اور آسٹریا کی مزاحم قوتوں کو دور کرنا چاہتے تھے۔ اور دوسرے جتھے والوں کو اس خواہش نے متحد کیا تھا کہ انہیں اپنی سلطنت کو وسیع کرنے اور دنیا کی تجارتی و اقتصادی زندگی پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد درکار تھی۔ اس جتھہ بندی میں اٹلی ابھی پوری طرح شریک نہ تھا، بظاہر وہ جرمنی کے ساتھ ایک معاہدہ اتحاد سے مربوط تھا، لیکن کس طرح وہ

اپنے جرمن دوست کو چھوڑ کر فرانسیسی دشمن کے ساتھ مل گیا؟ یہ ایک عجیب داستان ہے۔ اٹلی نے دول خمسہ کے ساتھ اپنے تعلقات و معاہدات کچھ اس ڈھنگ پر رکھے تھے کہ جب اس کو ٹیونس کا قبضہ حاصل کرنے کے لئے فرانس کے خلاف جنگ کی ضرورت ہو تو جرمنی سے حصول امداد کا دعویٰ کر سکے، اور جب آسٹریا کے بعض علاقے (جن پر عرصہ سے اٹلی کا دانت تھا) چھیننے کے لئے جنگ کی حاجت پیش آئے تو وہ اتحادیوں کی اعانت حاصل کر سکے۔ جنگ عظیم کے آغاز میں جب اس نے دیکھا کہ انگلستان کی عظیم الشان بحری طاقت فرانس کے ساتھ ہے اور اس کے مقابلہ پر فرانس سے ٹیونس کا علاقہ فتح کرنے میں جرمنی اس کے کام نہیں آسکتا، تو اس نے دفعتہً اپنا رُخ دول حلفا کی طرف پھیر دیا اور حق پرستی کا نعرہ زن ہو کر دعویٰ کرنے لگا کہ ہم جرمنی اور آسٹریا کو باطل پر سمجھتے ہیں اس لئے ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

جنگ کا آغاز | جون ۱۹۱۴ء میں جب آسٹریا کا ولیعہد ایک سرونی انارکسٹ کے ہاتھ سے مارا گیا تو فتنہ و فساد کی وہ فصل دفعتہً پک کر کٹنے کے لئے تیار ہو گئی جس کی تخم ریزی و آبیاری ۴۴ سال سے کی جا رہی تھی۔ آسٹریا نے سرویا کے سنگ راہ کو ہٹانے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھا کیونکہ بلقان کی جانب اس کی پیش قدمی میں وہی حائل تھا۔ جرمنی بھی اپنی تجارتی اسکیم کی تکمیل کے لئے سرویا کا استیصال ضروری سمجھتا تھا اس لئے وہ بھی آسٹریا کا ہمنوا ہو گیا۔ دوسری طرف روس سرویا کو اپنا "چھوٹا بھائی" سمجھتا تھا اور بلقان میں اس کی تمام امیدیں اسی سے وابستہ تھیں، نیز یہ امر بھی یقینی تھا کہ اگر آسٹریا کو سرویا کے استیصال میں کامیابی ہو گئی تو پھر بلقان پر اس کے تسلط کو کوئی چیز نہ روک سکے گی، اس لئے وہ اپنے چھوٹے بھائی کی حمایت پر کھڑا ہو گیا۔ ادھر فرانس کو خطرہ تھا کہ روس اور سرویا کو مغلوب کر کے جرمنی اور آسٹریا کی قوت اتنی بڑھ جائے گی کہ السیس اور لورین کو واپس لینا تو درکنار خود پیرس پر بھی قابض رہنا ناممکن ہو جائیگا۔ اس لئے وہ بھی روس کی حمایت پر آمادہ ہو گیا۔ ان حلیفوں کے بعد انگلستان کے لئے علیحدہ رہنا ناممکن تھا۔ اس "حق پرست" نے اپنے ذمہ بہت سی اخلاقی ذمہ داریاں لے رکھی تھیں جن کی انجام دہی کے لئے ضروری تھا کہ جرمنی کے بڑھتے ہوئے خطرے کو ملکۂ بحر کے بحری اور تجارتی تفوق کے راستے سے ہمیشہ کے لئے ہٹا دیا جاتا۔ اس لئے وہ بھی ہتھیار لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور دنیا میں "مہذب قوموں" کی وہ عظیم الشان جنگ

برپا ہوئی جس کے سامنے پچھلی غیر مہذب قوموں کی لڑائیاں ہیچ ہو گئیں۔

شرکائے جنگ کے اغراض و مقاصد | اس جنگ میں شریک ہونے والی ہر قوم کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ اپنے "مقدس حقوق کی حفاظت کے لئے جنگ پر مجبور ہوئی ہے اور صرف اپنے حقوق کی حفاظت ہی نہیں بلکہ دنیا کی دوسری ضعیف و کمزور قوموں کو "آزادی" دلانا اور جبر و قہر کی طاقتوں کو مغلوب کر کے دنیا میں حق و انصاف اور امن و امان کا بول بالا کرنا بھی ان کا عین مقصود ہے۔ لیکن دوران جنگ میں اور اختتام جنگ کے بعد ان "حق پرستوں" نے جس طرح قوموں اور ملکوں کا لین دین کیا اور سلطنتوں کی بانٹ اور علاقوں کی تقسیم کا کاروبار جس وسیع پیمانہ پر پھیلایا اس کی کیفیت دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ مغربی تہذیب میں "حق" کس چیز کا نام ہے۔

۱۹۱۷ء میں آسٹریا ہنگری کے بادشاہ کارل نے کوشش کی تھی کہ اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر انگلستان، فرانس اور اٹلی کے ساتھ علیحدہ صلح کر لے۔ اس مقصد کے لئے اس نے بوربان کے شہزادے سکستہ (Prince Sixte of Bourbon) کی معرفت دول حلفا سے گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا تھا، اور اس گفت و شنید کے تمام حالات شاہزادے نے خود اپنے قلم سے لکھے تھے جو بعد میں (Austria's Peace offer) "آسٹریا کی تقدیم صلح" کے نام سے شائع ہوئے۔ ان مذاکرات کے مطالعہ سے اس کاروبار کی پوری کیفیت معلوم ہوتی ہے جو ملکوں اور قوموں کی جنس میں کیا جا رہا تھا۔ فرانس اور انگلستان نے اٹلی کو اس وعدے کے ساتھ شرکت جنگ پر آمادہ کیا تھا کہ آسٹریا کا جنوبی علاقہ اس کے حصہ میں دیا جائیگا۔ اس تقسیم کی بنا پر اٹلی نے آسٹریا کے ساتھ علیحدہ صلح کی مخالفت کی۔ فرانس خصوصیت کے ساتھ یہ چاہتا تھا کہ آسٹریا کو جرمنی سے توڑ لے، اس لئے اس نے قبول صلح کے لئے اٹلی پر بہت زور دیا لیکن اٹلی نے اس کی اتنی سختی کے ساتھ مخالفت کی کہ دول حلفا کو یہاں تک اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں وہ "حق" کا ساتھ چھوڑ کر "باطل" (یعنی جرمنی) کے ساتھ نہ ہو جائے۔ ایم پال کامبوں، جو اس وقت لندن میں فرانس کا سفیر تھا، پرنس سکستہ سے ایک ملاقات کے دوران میں کہتا ہے کہ:-

"اٹلی کی حرص اُسے ہر قسم کی بد معاشیوں پر آمادہ کر سکتی ہے"[1]

ایک دوسری ملاقات میں وہ بیان کرتا ہے کہ

"اٹلی نے بار بار اس امر کا اعلان کیا ہے کہ وہ جنگ میں محض ان علاقوں کو حاصل کرنے کے لئے شریک ہوا ہے جن کو وہ آسٹریا سے حاصل کرنے کی خواہش رکھتا تھا"[2]

پال کامبوں کا بھائی ایم ژول کامبوں، جو پہلے برلن میں فرانس کا سفیر تھا، اس گفت وشنید کی مخالفت اس بنا پر کرتا ہے کہ

"اگر آسٹریا کے ساتھ صلح کر لی گئی تو بلا شک و ریب اس صلحنامہ پر دستخط ہونے کے ۴۸ گھنٹے کے اندر اندر اٹلی جرمنی کی گود میں ہوگا"[3]

ایک دوسرے موقع پر وہ کہتا ہے کہ

"اٹلی ہمارے لئے کچھ نہیں کریگا۔ وہ صرف ایک ہی خیال رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جنگ کے بعد جب دوسرے حلفا بالکل تھک کر چور ہو چکے ہوں تو وہ اقتصادی جدوجہد میں ان پر سبقت لے جانے کی کوشش کرے"[4]

یہ ان "حق پرستوں" کے اندرونی مقاصد تھے، اور یہ رائے تھی اُن لوگوں کی خود ایک دوسرے کے متعلق جو باہم مل کر "حق" کی خاطر جنگ کر رہے تھے۔ آخر جب یہ بات تحقیق ہوگئی کہ اٹلی کسی طرح توسیع مملکت کے ارادوں کو چھوڑ کر آسٹریا سے صلح کرنے پر آمادہ نہیں ہے تو اُس کے "حق پرست" حلیفوں نے آسٹریا سے کہا کہ تم اٹلی کے لئے ان علاقوں کو چھوڑ دو جن کی وہ طمع رکھتا ہے، اور اس کے عوض ہم تم کو سلیشیا اور بویریا کے علاقے جرمنی سے چھین کر دلوا دیں گے۔ جیسا کہ معلوم ہے یہ دونوں

[1] Austria's Peace offer, P. 103

[2] Austria's Peace offer, P. 173

[3] Austria's Peace offer, P. 28

[4] Austria's Peace offer, P. 173

صوبے خالص جرمن نسل کے لوگوں سے آباد ہیں اور جرمنوں کے وطنِ قومی کے غیر منفک اجزا ہیں، لیکن "حق پرست" اتحادی ان کو بالکل اس طرح آسٹریا کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے گویا کہ وہ انہی کی ملک ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ "حق پرست" آسٹریا نے بھی انہیں قبول کرنے سے انکار اس بنا پر نہیں کیا کہ وہ اس کے دوست جرمنی کے علاقے تھے، بلکہ صرف اس بنا پر کہ وہ فی الحال فرانس کی ملک نہیں تھے اور یہ امر مشتبہ تھا کہ فرانس انہیں چھین کر اس کے حوالے کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے یا نہیں! اس کے بعد کچھ اور علاقوں کی تلاش شروع ہوئی تاکہ انہیں آسٹریا کے حوالے کر کے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے۔ پہلے طرابلس پر نگاہ ڈالی گئی، مگر اٹلی نے اسے چھوڑنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ قدیم رومن سلطنت کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس کے لئے قرطاجنہ کا پورا ترکہ اُسے درکار تھا۔ پھر مصوّع (Eritrea) اور سومالی لینڈ پر نظر گئی۔ اٹلی ان دونوں علاقوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ رکھتا تھا اور آسٹریا بھی انہیں قبول کرنے پر راضی تھا، لیکن بعض وجوہ کی بنا پر یہ معاملہ بھی نہ پٹ سکا اور اٹلی کی طمع کی بنا پر دولِ حلفا کے ساتھ آسٹریا کے مخابراتِ صلح منقطع ہو گئے۔[1]

خفیہ معاہدات | اس کاروبار کی داستان کا ایک دوسرا باب وہ خفیہ معاہدات ہیں جو دورانِ جنگ میں دولِ حلفا کے درمیان ہوئے تھے۔ ان معاہدات کو ۱۹۱۷ء میں روس کی انقلابی حکومت نے شائع کر دیا تھا جس میں "حق پرست" اتحادیوں کے ارادوں اور منصوبوں کی اصلی تصویر دیکھ کر دنیا حیران رہ گئی۔ ان کی کوئی دفعہ ایسی نہیں تھی جس میں مخالف سلطنتوں کے کسی نہ کسی علاقہ یا ان کی اقتصادی ثروت کے کسی نہ کسی وسیلے کو دولِ حلفا سے ملحق نہ کیا گیا ہو۔ پہلا طے شدہ امر یہ تھا کہ السیس اور لورین کو فرانس سے ملحق کر دیا جائے، باوجودیکہ یہ دونوں صوبے زیادہ تر جرمنی النسل لوگوں سے آباد ہیں اور جغرافی حیثیت سے بھی ان کا تعلق فرانس کے مقابلہ میں جرمنی سے زیادہ ہے، لیکن صرف اس دلیل کی بنا پر ان کو فرانس سے ملحق کرنے کی تجویز کی گئی کہ وہ ۱۸۷۰ء سے پہلے فرانس کے قبضہ میں تھے۔ دوسری بات یہ طے ہوئی کہ دریائے رہائن کے مغرب میں جرمنی کا جتنا علاقہ ہے سب فرانس سے ملحق کر دیا جائے۔ اس تجویز کو فرانس اور روس نے خود اپنے حلیف انگلستان تک سے پوشیدہ رکھا اور اس کا اظہار اس وقت کیا گیا جب جنگ ختم ہونے کے بعد مجلس صلح میں

---

[1] Austria's Peace offer; P. 139

غنائم جنگ کی تقسیم شروع ہوئی تیسرا فیصلہ یہ تھا کہ مراکش کو، جو اب تک فرانسیسی سیادت میں تھا، فرانسیسی مقبوضہ تسلیم کیا جائے، نیز جرمنی کے تمام افریقی مقبوضات اس کے حصے میں آئیں اور ٹرکی کے ترکہ میں سے بھی اس کو کافی حصہ دیا جائے۔

یہ تو "حق پرست" فرانس کا حصہ تھا۔ اس کے ساتھ اٹلی کو بھی مطمئن کرنا ضرور تھا، کیونکہ وہ بیچارہ محض "حق کی خاطر" باطل" کا ساتھ چھوڑ کر جنگ میں شریک ہوا تھا۔ اس کے لئے ترنتینو، ترلیستہ اور جنوبی تیرول کے علاقے مخصوص کیئے گئے۔ بحر ایڈریاٹک کے پورے سواحل اور جزائر بھی اس کے حصے میں آئے اور ٹرکی کے مقبوضات میں سے بھی اس کو بہت کچھ دینے کا وعدہ کیا گیا۔

روس میں "حق" کا سب سے بڑا علمبردار یعنی زار حکمران تھا۔ اس لئے اس کاروبار میں اسکی شرکت بھی ضروری تھی۔ اس کے ساتھ پہلا سمجھوتہ پولینڈ کے متعلق ہوا جس کا مفاد یہ تھا کہ اس کی روح حریت کو فنا کرنے کے لئے روس کو ہر مناسب اور ممکن کارروائی کرنے کا اختیار حاصل ہے ——— یہ وہی پولینڈ ہے جس کو آغاز جنگ میں آزادی کی امید دلائی گئی تھی، اور اختتام جنگ کے بعد محض بولشویکوں کی ضد پر جس کی پشتیبانی کا فرض دوبارہ فرانس نے اپنے ذمہ لے لیا ——— دوسرا عہد نامہ قسطنطنیہ اور آبنائوں کے متعلق تھا۔ اعلان جنگ سے چھ مہینہ پہلے فروری ۱۹۱۴ء ہی میں روس کی کراؤن کونسل نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ اب درۂ دانیال اور باسفورس کے الحاق میں زیادہ تاخیر مناسب نہیں ہے، چنانچہ ابتداءً اسی غرض کے لئے جنگی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو روس کو سب سے پہلے اپنے اسی منصوبے کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا اور ۱۹۱۵ء کے خفیہ عہد نامہ میں اس نے اپنے اتحادیوں سے یہ تسلیم کرا لیا کہ جنگ کے غنائم میں سے اس کو درۂ دانیال، باسفورس، قسطنطنیہ اور ایشیائے کوچک کا مشرقی حصہ ضرور دیا جائیگا۔ ۱۹۲۳ء کا ایک روسی مورخ بیرن کارف (Barron S. A Karff) لکھتا ہے کہ:-

"اس خفیہ عہد نامے کی رو سے دولت عثمانیہ اور آسٹریا ہنگری غنائم جنگ قرار دیئے گئے تھے۔ انہیں اتحادیوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس تقسیم میں قسطنطنیہ اور درۂ دانیال د

باسفورس قطعی طور پر روس کو تفویض کئے گئے تھے۔"

اب رہ گیا انگلستان جو تمام روحق پرستوں" کی رہنمائی کر رہا تھا، سو اس نے اپنے لئے جرمنی کے افریقی اور ایشیائی مستعمرات کو کافی نہیں سمجھا اور ایک دوسرا میدان پیدا کیا جو اس کی ہمت عالی کے شایان شان تھا۔ ٹرکی سے اعلان جنگ کے ۵ مہینے بعد مارچ ۱۹۱۵ء میں اس نے فرانس کے ساتھ ایک ابتدائی خفیہ معاہدہ کیا جس میں بلادِ عرب کو دو منطقوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک منطقہ شام، دوسرا منطقہ عراق۔ پہلا منطقہ فرانسیسی نفوذ و اثر کے ماتحت تسلیم کیا گیا، اور دوسرے منطقہ پر برطانی سلطنت کے حقوق قائم ہو گئے۔ اس تقسیم کی کامیابی بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ خود اہل عرب اس میں برطانیہ و فرانس کا ہاتھ بٹاتے، اور اہل عرب کے لئے یہ بہت مشکل تھا کہ اپنے وطن کی اس تقسیم کے راز سے آگاہ ہونے کے بعد اس کی فتح میں خود دشمنوں کے معین و مددگار بننا قبول کر لیتے۔ اس لئے ان کے ساتھ یہ چال چلی گئی کہ تقسیم کے ابتدائی معاہدہ کو بالکل خفیہ رکھا گیا، اور عربی لیڈروں سے مل کر انہیں یقین دلایا گیا کہ اگر انہوں نے دول حلفا کے ساتھ مل کر بلادِ عرب میں ترکی حکومت کا تختہ الٹ دیا تو اس کے عوض ایک آزاد عربی سلطنت قائم کی جائے گی جو جنوبی عراق اور لبنان کی ساحلی پٹی کے سوا تمام ممالک عربیہ پر حاوی ہوگی۔ اس آزادی کے خوشنما خواب نے عربوں میں دفعتہً ایک نئی روح پھونک دی اور اکتوبر ۱۹۱۵ء میں یعنی برطانیہ و فرانس کے خفیہ معاہدہ سے ۹ مہینہ بعد، انہوں نے سر ہنری میکموہن کی معرفت دول حلفا کے ساتھ ایک معاہدۂ اتحاد کر لیا جس کی رو سے ان کی پوری قوت دول حلفا کے ساتھ ہو گئی۔ اس امداد کے عوض ان کو اس امر کا ایک کاغذی میثاق مل گیا کہ اختتام جنگ کے بعد عربی ممالک کو ایک مستقل سلطنت بنا دیا جائیگا۔ اس معاہدہ کے بعد ہی جون ۱۹۱۶ء میں شریف حسین نے ٹرکی کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ رفتہ رفتہ عراق، شام، اور فلسطین میں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ چند ہی مہینہ کے اندر یہ بات تحقیق ہو گئی کہ ممالک عربیہ میں ترکی حکومت نہیں ٹھہر سکے گی اور برطانیہ و فرانس کے مشترک مقاصد ضرور حاصل ہو جائیں گے۔ اس لئے نومبر ۱۹۱۶ء میں دونوں سلطنتوں کے درمیان پھر گفت و شنید ہوئی اور ایک دوسرا خفیہ عہد نامہ طے ہوا جو معاہدہ سائکس پیکو کے نام سے مشہور

ہے۔ اس معاہدہ میں طے ہوا کہ عراق کلیتہً برطانیہ کے قبضہ میں رہے گا، شام تمام تر فرانسیسی سلطنت کے دائرے میں رکھا جائیگا، فلسطین ایک بین الملی علاقہ ہوگا، اور حیفہ اپنے بندرگاہ سمیت برطانیہ کے اثر میں رہے گا۔ باقی رہے وہ ممالک جو عراق اور سواحلِ شام کے درمیان واقع ہیں، سوان کو دو حلقوں میں تقسیم کیا جائے گا، ایک حلقہ برطانیہ کے زیرِ اثر ہوگا اور دوسرا فرانس کے زیرِ اثر۔ اس معاہدے میں انگریزی نمائندے سر مارک سائکس نے موصل کو فرانسیسی اثر میں دینے پر اتفاق کر لیا تھا کیونکہ اس سے پہلے ۱۹۱۵ء کے ایک خفیہ عہد نامہ کی رو سے یہ طے ہو چکا تھا کہ ارمینیہ، مشرقی کردستان اور ٹرکی کے وہ علاقے جو سرحدِ موصل سے متصل ہیں، روس کے حصہ میں دیئے جائیں گے، اور برطانی سیاست اس امر کی مقتضی تھی کہ اس کی سرحد روس کی سرحد سے نہ ملنے پائے۔ لہٰذا اس نے روس کی ہمسائگی کے سیاسی خطرات سے بچنے کے لیئے برطانی اور روسی علاقہ کے درمیان ایک فرانسیسی علاقہ کو حائل کر دینا مناسب سمجھا لیکن موصل کے چشمہائے روغنِ نفط پر ابتدا سے برطانیہ کا دانت تھا، اس لیئے جب روسی خطرہ جاتا رہا تو اس نے فرانس کی دوستی کی پروا کیئے بغیر آخر انہیں حاصل کر کے چھوڑا۔

جنگ کے بعد ملکوں کی تقسیم | یہ ارادے اور منصوبے تھے جنہیں لے کر "حق پرست" مغربی قومیں جنگ میں شریک ہوئی تھیں۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ جنگ کے بعد انہوں نے اپنی "حق پرستی" کا کس طرح ثبوت دیا۔

جنگ کے آخری ایام میں دو واقعات ایسے پیش آگئے جنہوں نے اُس نقشہ کو بہت کچھ بدل دیا جو ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء کے درمیان خفیہ معاہدوں نے قائم کیا تھا۔ ان میں سے ایک واقعہ تو امریکہ کا شریکِ جنگ ہونا تھا، اور دوسرا روس کا انقلاب۔ امریکہ نے یورپ کے معاملات سے بے تعلق رہنے کی قدیم پالیسی کو چھوڑ کر جنگ میں صرف اس لیئے شرکت کی تھی کہ اپنی تجارت کی کامیابی کے لیئے وہ امن کا خواستگار تھا، لہٰذا اس کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ جنگ کے بعد غنائمِ جنگ کی تقسیم میں ایسی بے اعتدالیاں نہ ہونے پائیں جن سے ایک دوسری جنگ کی بنیاد پڑنے والی ہو۔ دوسری طرف روس جس شاہی حکومت کے ماتحت جنگ میں شریک ہوا تھا ۱۹۱۷ء کے آخر میں اس کا تختہ اُلٹ گیا، اور اس پر بولشویک

جماعت کو غلبہ حاصل ہوگیا جو انگلستان، فرانس اور اٹلی کی اغراض کے لئے جرمنی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اس لئے غنائم جنگ کی تقسیم میں روس کا جو حصّہ مقرر کیا گیا تھا وہ سارا کا سارا منسوخ کر دیا گیا اور "حق پرست" اتحادیوں کو ایک نیا نقشہ بنانا پڑا جس میں امریکہ کے امن خواہانہ جذبات کی رعایت بھی ضروری تھی۔

بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۱۷ء کے خفیہ معاہدے میں فرانس نے روس کے ساتھ مل کر یہ طے کیا تھا کہ دریائے رہائن کے مغربی جانب کا تمام علاقہ جرمنی سے چھین کر فرانس کے ساتھ ملحق کر دیا جائے گا۔ اسی زمانہ میں پرنس سکستہ نے جب صدر جمہوریہ فرانس ایم پوانکارہ سے علاقہ رہائن کو غیر جانبدار علاقہ قرار دینے کی تجویز کی تھی، تو "حق پرست" فرانس کے صدر نے مسکرا کر کہا تھا کہ

"آدمی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ دل میں ہو اس کو ہمیشہ ظاہر بھی کر دیا کرے۔ عملاً میرے خیالات بھی وہی ہیں جو آپ کے ہیں"[1]

اس طرح فرانس نے دوران جنگ ہی میں جرمنی کے ساتھ وہی عمل کرنے کی ٹھان لی تھی جو ۱۸۷۰ء میں جرمنی نے اس کے ساتھ کیا تھا لیکن اُسے معلوم تھا کہ رہائن کے زرخیز علاقہ کا فرانس کے ساتھ الحاق امریکہ اور انگلستان دونوں کی پالیسی کے خلاف ہے۔ اسلئے اس نے جنگ کے زمانہ میں اپنے اس ارادے کو پوشیدہ رکھا۔ اختتام جنگ کے بعد جب اس نے صلح کانفرنس میں یہ مطالبہ پیش کیا تو جیسی کہ امید تھی، امریکہ اور انگلستان دونوں نے اس تجویز کی سختی کے ساتھ مخالفت کی۔ صلح کانفرنس میں اس پر تیز تیز گفتگوئیں ہوئیں اور فرانس کے انتہائی اصرار کے باوجود دونوں طاقتیں دائمی الحاق پر کسی طرح راضی نہ ہوئیں۔ آخر موسیو کلیمنشو نے (جو اس وقت فرانس کے رئیس الوزراء تھے) یہ تجویز پیش کی کہ جرمنی پر جو تاوان جنگ عائد کیا گیا ہے اس کی ضمانت کے طور پر رہائن کا علاقہ ۱۵ سال کے لئے فرانسیسی قبضہ میں دے دیا جائے۔ اس تجویز کے منشا کو اولاً خود فرانس کے بہت سے سیاسیین نہ سمجھ سکے اور فرانس کے ایوان مبعوثین میں مارشل فوش، ایم ژول کامبوں اور ایم تاردیو جیسے لوگوں نے اس کی مخالفت کی لیکن جب ایم کلیمنشو نے کھڑے ہو کر بتایا کہ ۱۵ سال کی تعیین کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جرمنی کے ہاتھ سے اس کے بہترین علاقے چھین کر اس پر اتنا تاوان ڈال دیا جائے کہ وہ اس کو مدت معینہ کے اندر ادا نہ کر سکے، اور ہم پندرہ سال

---

[1] Austria's Peaee offer, P. 99

گذر نے کے بعد علاقہ رہائن کو ہمیشہ کے لئے ملحق کر لیں، تو اس پر تمام ایوان مطمئن ہو گیا۔ موسیو کلیمنشو کی اس تقریر کا ایک فقرہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ملاحظہ ہے جس سے ان کی "حق پرستی" کا حال خوب معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے موسیو پوانکارہ کو خطاب کر کے کہا:-

"جناب صدر! آپ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں، ۱۵ سال کے اندر جرمنی کسی طرح معاہدے کی تمام دفعات کو پورا نہ کر سکے گا، اور مجھے یقین ہے کہ ۱۵ سال کے بعد اگر آپ میری قبر پر آنے کی عزت بخشیں گے تو ضرور مجھے خوشخبری دیں گے کہ ہم رہائن پر ہیں اور وہیں رہیں گے۔"

یہ چال کامیاب ہو گئی۔ فرانس نے اپنے حلیفوں سے اس تجویز کو منظور کرا لیا اور اس کا مقصد پورا کرنے کے لئے جرمنی کو سلیشیا کے کوئلہ کی دولت سے بھی محروم کر دیا گیا تاکہ وہ اس گراں قدر تاوان کو کسی طرح ۱۵ سال کے اندر ادا نہ کر سکے جو معاہدۂ ورسائی میں اس پر عائد کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پولینڈ کی نئی ریاست کا نقشہ اس طرح مرتب کرایا کہ اس سے مشرقی پروشیا، دولت پروشیا کے باقی علاقوں سے بالکل منقطع ہو گیا ہے اور ایک ایسی مشکل صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس کا حل بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ جرمنی جنگ عظیم کے مصائب سے افاقہ پاتے ہی سب سے پہلے پولینڈ کے ساتھ الجھ جائے۔[1]

پھر ۱۹۲۲ء میں جب فرانس کو اندیشہ ہوا کہ جرمنی ان تمام باتوں کے باوجود ۱۵ سال کے اندر رہائن کو واگذار کرا لینے میں کامیاب ہو جائے گا، تو اس نے اپنے شکار پر ایک اور ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔ مجلس الوزراء کی مالی کمیٹی کے صدر موسیو داریک اس سوال پر غور کرنے کے لئے مقرر کئے گئے کہ روہر کے علاقہ پر قبضہ کرنا کس حد تک مفید ہو سکتا ہے؟ انہوں نے کافی عرصہ تک غور کرنے کے بعد مجلس الوزراء کے سامنے ایک خفیہ رپورٹ پیش کی جس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ روہر کے علاقہ پر صرف عارضی ہی نہیں بلکہ مستقل قبضہ کر لیا جائے۔ چنانچہ اس سفارش کے مطابق ۱۹۲۳ء کی ابتدا میں فرانس نے روہر پر

[1] یہ بات فی الواقع ۱۹۳۹ء میں پوری ہو گئی۔ دوسری جنگ عظیم کا آغاز آخر کار پولینڈ ہی پر جرمن حملہ سے ہوا۔

اپنی فوجیں بھیجدیں اور جرمنی کو اُس علاقہ سے محروم کردیا جس پر اس کی صنعتی و معاشی زندگی کا تمام تر انحصار تھا۔ موسیو ورایک۔ نے اپنی اس رپورٹ میں جن وجوہ کی بنا پر یہ سفارش کی تھی وہ بھی خود انہیں کی زبان سے سننے چاہئیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"۱۹۱۳ء میں تمام جرمنی کی کانوں سے ۱۹۱ ملین ٹن کوئلہ نکلا تھا جس میں سے ۱۱۵ ملین ٹن صرف روہر کا تھا۔ اس میں سے ۵۵ ملین ٹن کے قریب روک لیا گیا اور ۱۰ ملین ٹن گیس پیدا کرنے میں اور ۴۵ ملین ٹن دوسرے معادن نکالنے میں استعمال کیا گیا۔ دیگر معادن جو جرمنی میں تقریباً ۳۳ ملین ٹن نکلے تھے ان میں سے ۲۵ ملین ٹن صرف روہر کے تھے۔ علاوہ ازیں عرق کشی کے اثنا میں روہر کے کارخانوں سے ۵ لاکھ ٹن سلفیٹ آف امونیا اور ۴ لاکھ ٹن رال نکلی اور اس سے وہ تمام چیزیں بنیں جو رنگ سازی کے کام آتی ہیں۔ رنگ سازی کے بھی زیادہ تر کارخانے روہر ہی میں ہیں جو دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ عطریات، ادویہ، رنگ، رال، اور رال کے تمام مصنوعات اور امونیم سلفیٹ جرمن صنعت کے سب سے بڑے اجزا ہیں، اور یہ سب کوئلہ پر منحصر ہیں۔ جنگ کے بعد سے ان تمام ضروریات کے لئے کوئلہ حاصل کرنے کا ذریعہ جرمنی کے پاس صرف روہر رہ گیا ہے، کیونکہ جنگ میں اس نے سار کے علاقہ کو کھو دیا، جہاں سے ۱۸ ملین ٹن کوئلہ سالانہ نکلتا تھا، اور بالائی سلیشیا بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا جو ۲۸ ملین ٹن کوئلہ ہر سال مہیا کرتا تھا۔ پس اب سوائے روہر کے جرمنی کے پاس اور کوئی ایسا علاقہ نہیں رہا ہے جو اس کو کوئلہ دے سکتا ہو۔

یہی حال دوسری دھاتوں کا بھی ہے۔ جنگ سے پہلے جرمنی میں ۱۹ ملین ٹن لوہا نکلتا تھا جس میں سے ۹ ملین ٹن روہر کا تھا۔ باقی ۱۰ ملین ٹن لورین اور بالائی سلیشیا کا ہوتا تھا، سو یہ دونوں علاقے اب اس کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔"

اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ روہر پر قبضے کا مقصد صرف یہ تھا کہ جرمنی کو اس کے وسائل ثروت سے محروم کر کے بھوکا مار دیا جائے اور فرانس نہ صرف ان وسائل سے مستفید ہو بلکہ اس کے ساتھ ہی تاوان جنگ

وصول نہ ہونے کے بہانہ سے رہائن کے مغربی علاقے پر بھی دائمی تسلط قائم کرے۔
دوسری طرف اٹلی کے حریصانہ مقاصد پورے کرنے کے لئے اسے نہ صرف ترلیستہ اور ترنتینو کے علاقے دیئے گئے، بلکہ جنوبی تیرول (Tyrol) کا علاقہ بھی اس سے ملحق کر دیا گیا جو زیادہ تر جرمن قوم سے آباد ہے۔ باقی رہے ایڈریاٹک کے سواحل و جزائر، سو اگرچہ خفیہ معاہدات کی رو سے وہ اٹلی کا حصہ قرار پائے تھے لیکن اختتام جنگ پر سرویا کا ایک نئی سلافی قوت کی شکل میں نمودار ہونا اس منصوبے کی تکمیل میں حائل ہو گیا اور ایڈریاٹک کی تقسیم کچھ اس صورت سے کی گئی کہ نہ اٹلی کے مقاصد اس سے پورے ہوتے ہیں اور نہ یوگو سلافیا کے۔ چنانچہ دونوں قوموں کے درمیان باہم کشمکش جاری ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا انجام کب جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

یورپ کو اس غیر متناسب نقشہ پر تقسیم کرنے کے خطرات کو خود ان لوگوں نے محسوس کر لیا تھا جو اس وقت دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج نے صلح کانفرنس کے سامنے ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں انہوں نے جرمن قوم کے لاکھوں افراد کو دوسری حکومتوں کے تسلط میں دینے کو ایک خطرناک فعل بتایا تھا اور کہا تھا کہ یہ حرکت یورپ کو دوبارہ جنگ کی مصیبت میں مبتلا کر دیگی۔ اس یادداشت کے یہ الفاظ خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہیں:-

"یورپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عام باشندے موجودہ نظام حیات پر سیاسی، معاشی اور اجتماعی، تمام حیثیات سے معترض ہیں۔۔۔۔۔۔ سب سے بڑا خطرہ جو مجھے اس صورت حال میں نظر آ رہا ہے یہ ہے کہ کہیں جرمنی اپنی قسمت بولشوزم کے ساتھ وابستہ نہ کر دے اور اپنے وسائل ثروت، اپنے دماغ اور اپنی زبردست تنظیمی قوت اُن انقلابی مجنونوں کے ہاتھ میں نہ دیدے جو دنیا کو تلوار کے زور سے بولشوزم کے لئے فتح کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں[1]"

یہ مسٹر لائڈ جارج کوئی بے بس اخبار نویس نہ تھے، بلکہ اس وقت صلح کانفرنس کے اکابر اربعہ میں سب سے

---

[1] یہ نتیجہ اس وقت تو ظاہر نہ ہوا مگر اب دوسری جنگ عظیم میں جو کچھ کیا گیا ہے اس کی بدولت اس کا قوی امکان پیدا ہو گیا ہے۔

زیادہ باأثر شخصیت کے مالک تھے۔ اگر وہ چاہتے تو یورپ کو ایسے غیر مناسب طریقہ پر تقسیم نہ کرتے جس کے خطرات وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن حرص و طمع نے، یا اُس "حق پرستی" نے جس کی خاطر دولِ حلفا جنگ میں شریک ہوئے تھے، ان کو اور ان کے رفقاء کو وہ سب کچھ کرنے پر آمادہ کر دیا جسے خود وہ بھی ایک دوسری جنگ کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔

یہ "حق پرستی" کا مظاہرہ تو یورپ میں ہُوا۔ آؤ اب ایشیا کو دیکھیں کہ یہاں "حق" کی خاطر جنگ کرنے والوں نے لڑائی جیتنے کے بعد کیا کیا۔ عرب کی تقسیم کے متعلق ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء میں جو خفیہ سمجھوتے ہوئے تھے ان کا حال اوپر گذر چکا ہے۔ ان سمجھوتوں کے متعلق دورانِ جنگ ہی میں عراق، شام، اور فلسطین، برطانیہ اور فرانس کے درمیان تقسیم ہو چکے تھے۔ لیکن جنگ کے آخر تک عربوں کو برابر یقین دلایا جاتا رہا کہ یہ جنگ محض ان کو ٹرکی کے پنجۂ ستم سے آزاد کرانے اور ان کو ایک مستقل سلطنت بنانے کے لئے لڑی جا رہی ہے۔

۱۱ مارچ ۱۹۱۷ء کو جب جنرل سر اسٹینلے ماڈ Maud بغداد میں داخل ہُوا تو اس نے اہلِ عرب کے نام ایک عام اعلان شائع کیا جس کے الفاظ یہ تھے:-

"ہم آپ کے شہر میں فاتحانہ حیثیت سے داخل نہیں ہوئے ہیں۔ ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں بلکہ نجات دہندہ ہونے کی حیثیت سے آپ کو آزادی دلوانے آئے ہیں، .... بغداد کے باشندوں کو جان لینا چاہئے کہ ہم ان کے ملک پر حکومت نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ان کے علماء و فقہاء کی دیرینہ آرزوئیں پوری ہوں، ان کا ملک ایک مرتبہ پھر آزاد ہو، اور اس میں ایسے آئین و قوانین نافذ ہوں جو ان کی مقدس شریعت اور قومی روایات کے مطابق ہوں"۔

جنگ کے خاتمہ پر بھی فرانس اور انگلستان کی جانب سے ایک مشترک منشور بلادِ عرب میں شائع کیا گیا۔ جس میں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا گیا تھا:-

"یہ جنگ جو دنیا کو جرمنی کے توسیعی حوصلوں سے بچانے کے لئے برپا کی گئی تھی، اس کے خطرات و مصائب کو مشرق تک وسیع کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ برطانیہ اور فرانس اُن تمام

قوموں کو، جو ایک طویل زمانہ سے ترکوں کے جور و ستم کی تختۂ مشق بنی ہوئی تھیں، کامل آزادی دلانا چاہتے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسی وطنی حکومتیں اور ادارات قائم کئے جائیں جو خود ان قوموں کی اپنی رغبت و خواہش پر مبنی ہوں اور جن میں کوئی دوسرا دخیل نہ ہو۔"

لیکن ان لفظی اعلانات کے ساتھ جب عملی ساتھ جب عربوں نے اتحادیوں کا عمل یہ دیکھا کہ شام کے سواحل پر فرانس کی فوجیں مسلط ہیں اور عراق و فلسطین میں انگریزوں کا پنجۂ استبداد مستولی ہے، تو ان کو معلوم ہو گیا کہ حقیقتہً ان کے ساتھ غدر کیا گیا ہے، اور یہ چال محض ترکوں اور عربوں میں نفاق ڈالکر ملک چھیننے کے لئے چلی گئی تھی۔ آخر انہوں نے عراق، شام اور فلسطین میں آزادی کی جد و جہد شروع کی، اور شام میں امیر فیصل بن حسین کے ماتحت ایک وطنی حکومت قائم کر دی۔ اسی اثنا میں خود حلفا کے درمیان غنائم جنگ کی تقسیم پر تنافس و تباغض کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سائیکس پیکو کے معاہدہ کی رو سے موصل کا علاقہ فرانسیسی منطقۂ نفوذ میں دیا گیا تھا، مگر وہاں تیل کے چشموں کی کثرت دیکھ کر برطانیہ کے جذبۂ حرص کو حرکت ہوئی اور اس نے خود اس پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح فلسطین کے متعلق یہ طے ہوا تھا کہ وہ ایک بین الاقوامی علاقہ رہے گا اور صرف حیفہ پر برطانی حکومت قائم ہو گی، مگر مصر کی شورش نے برطانیہ کو مجبور کر دیا کہ ہندوستان کے راستہ کی حفاظت کے لئے نہر سویز کے دوسری جانب بھی اپنے اقتدار کو مضبوط کرے، اور ممکن ہو تو حیفا سے بصرہ تک ایک دوسرا راستہ اپنے لئے پیدا کرے۔ لہٰذا فلسطین پر بھی اس نے پورا پورا قبضہ جمانے کا تہیہ کر لیا۔ دوسری طرف شام پر بھی فرانسیسی نفوذ واثر برطانیہ کو ناگوار تھا اور وہ اپنی مصلحت کے لئے زیادہ بہتر یہ سمجھتا تھا کہ اس کے اپنے زیر اثر کوئی وطنی حکومت وہاں قائم ہو جائے۔ ان مسائل پر تقریباً ڈیڑھ سال تک دونوں دوستوں میں کشمکش ہوتی رہی اور لوٹ کے مال کی تقسیم کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ مگر جب دونوں سلطنتوں نے اس باہمی نزاع کا نتیجہ یہ دیکھا کہ عرب کی وطنی تحریک ترقی کر رہی ہے تو وہ اپنے مشترک فوائد کی خاطر عربوں کے خلاف متحد ہو گئے اور اپریل ۱۹۲۰ء میں بمقام سان ریمو انہوں نے یہ تصفیہ کر لیا کہ عراق و فلسطین برطانیہ کے قبضہ میں رہیں اور شام تنہا فرانس کے قبضہ میں۔ یہ تقسیم کسی طرح اُس تقسیم سے مختلف نہ تھی جو ڈاکوؤں کے گروہ کسی گھر کو لوٹنے کے بعد کیا کرتے ہیں۔ مگر یورپ کے مہذب ڈاکوؤں نے اس کو بھی حق"

اور "انصاف" کا رنگ دینے کی کوشش کی اور دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے ظاہر کیا کہ یہ تینوں ملک ان کو جمعیت اقوام کی طرف سے "انتداباً" دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ نہ کسی جمعیت اقوام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ کسی قوم کو بھیڑ بکریوں کی طرح دوسری قوم کی ملک میں دیدے، نہ اس وقت تک جمعیت اقوام کا کوئی اجتماع ہوا تھا، اور نہ انتداب کے متعلق کوئی فیصلہ کیا گیا تھا۔[1] بہرحال اس قرارداد کے مطابق تمام فرانس کی ملک بن گیا۔ اس کے بعد ہی جنرل گورو نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ شامیوں کی قومی حکومت پر حملہ کر دیا اور انہی عربوں کو تلوار کے زور سے اطاعت و بندگی پر مجبور کیا جنہیں چار سال پہلے دوست بنایا گیا تھا، جن کی مدد سے ترکوں کو شکست دیکر ملک فتح کیا گیا تھا جن کو دو سال پہلے تک یقین دلایا گیا تھا کہ ہم محض تم کو آزاد کرنے کے لئے جنگ کر رہے ہیں، جن سے جنگ کے بعد تک یہ وعدہ کیا جاتا رہا تھا کہ تمہارے ملک پر خود تمہاری حکومت ہوگی۔

دوسری طرف اہل عراق کو، جو برطانی انتداب کا اعلان سنتے ہی بھڑک اٹھے تھے، تلوار کے زور سے کچلا گیا۔ جس زمین پر "ظالم" ترکوں نے کبھی ۱۴ ہزار سے زیادہ فوج نہیں رکھی تھی، اس پر "نجات دہندہ" سلطنت برطانیہ نے ۹۰ ہزار سے زیادہ فوج مسلط کر دی جس زمین پر "ظالم" ترکوں نے سالانہ دو سو سے زیادہ عربوں کو کبھی قتل نہیں کیا تھا، اس "حق پرست" برطانیہ نے ایک ہی موسم گرما (۱۹۲۰ء) میں دس ہزار عربوں کو قتل کر ڈالا۔ اور یہ سب کچھ اس وقت کیا گیا جب کہ انہی عربوں سے یہ کہکر جنگ میں امداد حاصل کی جا چکی تھی کہ "ہم تمہارے دشمن بن کر نہیں آئے بلکہ تم کو آزادی دلوانے آئے ہیں" اس طرح عرب کی تحریک وطنی کو کچلنے کے بعد برطانیہ نے ایک طرف اپنے مواعید کی ظاہری حرمت برقرار رکھنے کے لئے، اور دوسری طرف اس برطانی پبلک کو مطمئن کرنے کے لئے جو عراق میں دس کروڑ پونڈ سالانہ کے مدہش اسراف سے سخت ناراض تھی، یہ ضروری سمجھا کہ عراق پر براہ راست حکومت کرنے کے بجائے ایک ایسی نام نہاد وطنی حکومت قائم کر دی جائے جو جنرل ماڈ کے برعکس اہل عراق کی نہیں بلکہ اہل برطانیہ کی خواہش کی تابع ہو۔

[1] انتداب کے متعلق اتحادیوں کی سپریم کونسل نے ۲۵ اپریل ۱۹۲۰ء کو فیصلہ کر لیا تھا، حالانکہ جمعیت اقوام کا پہلا عام اجتماع ۱۵ نومبر ۱۹۲۰ء کو جنیوا میں ہوا۔

اس غرض کے لئے اس نے ۱۹۲۱ء کے موسم بہار میں اعلان کیا کہ اہلِ عراق کو خود اپنا بادشاہ منتخب کرنے کا اختیار ہے۔ لیکن اس اعلان کی تعمیل یوں کی گئی کہ اہلِ عراق کو انتخاب کا کوئی حق نہیں دیا گیا۔ ان کی خواہش کے برعکس فیصل بن حسین کو، جو شام کے تخت سے محروم ہونے کے بعد کسی اور تخت کا خواہشمند تھا، اس شرط پر تختِ عراق کے لئے نامزد کیا گیا کہ وہ برطانیہ کے زیرِ اثر رہ کر کام کریگا۔ اہلِ عراق کسی طرح فیصل کی بادشاہت پر راضی نہ تھے، مگر برطانیہ نے زبردستی ان کی آواز کو دبا دیا۔ عراق کے با اثر لیڈر طالب پاشا کو جس نے جنگ کے زمانہ میں برطانیہ کی عظیم الشان خدمات انجام دی تھیں، گرفتار کر کے لنکا میں قید کر دیا گیا اور عراق کی بڑھتی ہوئی ناراضی کا دف مارنے کے لئے ۲۳ اگست ۱۹۲۱ء کو ایسی حالت میں شاہ فیصل کی تخت نشینی کا اعلان کرا دیا گیا جب کہ فی الحقیقت "تخت" تیار بھی نہ تھا اور شراب کے پیپے رکھ کر ایک عارضی "تخت" بنا لیا گیا تھا۔

اس طرح فیصل کو عراق کا بادشاہ بنانے کے بعد برطانیہ نے، اُسی برطانیہ نے جو عراقیوں کو نجات دلانے کے لئے عراق گیا تھا، تختِ شاہی کی قیمت طلب کی۔ وہ قیمت کیا تھی؟ وہ صرف یہ تھی کہ عراق کو ایک ایسا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا گیا جس کی رو سے وہ بالواسطہ پورے طور پر برطانی اقتدار کے تحت آجاتا ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ کے لئے برطانیہ کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ یہ معاہدہ عراقی قوم کو ایک لمحہ کے لئے بھی منظور نہ تھا مگر دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے اس پر عراقی قوم کی رضامندی ثبت کرانے کا یہ انوکھا طریقہ ایجاد کیا گیا کہ اسے آدھی رات کو عراق کی مجلسِ وطنی میں پیش کیا گیا، ارکانِ مجلس کو بستروں سے اٹھا اٹھا کر پولیس کی معرفت بلوایا گیا، اور جبراً ان سے ووٹ لے کر اعلان کر دیا گیا کہ عراقی پارلیمنٹ نے معاہدہ کی تصدیق کر دی ہے۔

اب رہی ٹرکی کی دوسری تقسیم جس کے متعلق ۱۹۱۵ء میں روس سے سمجھوتا ہوا تھا، سو اس کو بولشویک انقلاب کے باعث منسوخ کر دیا گیا اور ایک دوسری اسکیم بنائی گئی جس میں روس کے بجائے یونان کو ٹرکی کے ترکہ کا وارث قرار دیا گیا۔ اس اسکیم کے مطابق یونان نے مشرقی تھریس اور سمرنا پر حملہ کیا اور ترکوں کو ان کے اصلی وطن کے ایک بڑے حصہ سے محروم کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ، فرانس

اور یونان کی متحدہ قوتوں نے خاص شہر قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کرلیا اور درۂ دانیال و باسفورس کے دونوں راستے ترکوں سے چھین لئے جنہیں پہلے روس کو دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ دوسری تقسیم بعد کو یونان کی شکست سے بالکل فسخ ہوگئی، لیکن اس تنسیخ میں انصاف پسندی کے جذبہ کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ حقیقتاً اس کی ذمہ داری محض ترکوں کی تلوار پر تھی جس نے یونان اور دول حلفا کو ترکی خاک سے نکل جانے پر مجبور کردیا۔

جنگ کے جائز مقاصد | یہ اُن قوموں کے جنگی اعمال کی روداد ہے جو تہذیب مغرب کی علمبردار ہیں، بلکہ حقیقتاً انہیں کی تہذیب کا نام تہذیب مغرب ہے۔ یورپ کے چند اہل بصیرت فلسفیوں اور عالموں کو چھوڑ کر جن کا درحقیقت کوئی اثر نہیں ہے، باقی تمام انگلستان، فرانس، اٹلی، جرمنی اور آسٹریا کی رائے عام بھی اپنی قوموں کے ان اعمال کی مؤید تھی اور اُسی کی پرجوش امداد سے ان سلطنتوں کے مدبرین اتنی بڑی جنگ لڑنے میں کامیاب ہوسکے۔ اس لئے ان کے تعامل اور طریق کار کو دیکھ کر ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ جنگ سے پہلے، جنگ کے دوران میں اور جنگ کے بعد جو جو افعال "حق" اور "انصاف" کے نام سے کئے گئے وہی دراصل مغربی تہذیب میں "حق" اور "انصاف" کے مصداق ہیں اور ایسے ہی "حقوق" کی خاطر لڑنا، لڑانا مغربی تہذیب جائز رکھتی ہے۔

اس معیار کے مطابق جنگ کے وہ مقاصد جو مغربی تہذیب میں جائز رکھے گئے ہیں حسب ذیل قرار پاتے ہیں:۔

۱۔ اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے دنیا کی منڈیوں کا اجارہ حاصل کرنا،

۲۔ اگر کوئی حریف تجارت و صنعت کے میدان میں آگے بڑھ رہا ہو تو اس کا سر کچل دینا،

۳۔ اپنے دور دراز مقبوضات کے راستہ میں جو ممالک واقع ہوں انہیں اپنے زیر اثر لانا،

۴۔ ملکوں اور سلطنتوں کے حصے بخرے کرنا اور کمزور قوموں کو غلام بنانا،

۵۔ اگر کسی قوم سے دشمنی ہو تو اسے خواہ کسی وجہ سے ہو قوت سے مٹا دینا، یا کم از کم اس کا زور توڑ دینا۔

ان اغراض کو جنہیں اکثر "مقدس حقوق" سے تعبیر کیا گیا ہے کسی توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص بآسانی خود ان کے جواز و عدم جواز اور تقدس و عدم تقدس کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات اس طریق استدلال کو مبالغہ اور غلو پر مبنی قرار دیں، مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مغربی قوموں کے اجتماعی عمل کے سوا مغربی تہذیب اور کس چیز کا نام ہو سکتا ہے؟ مذہب قابلِ استناد ہو سکتا تھا، مگر یورپین قومیں اس کو اپنی سیاست میں دخل دینے کی اجازت دیتی ہیں اور نہ وہ خود سیاسی امور سے تعلق رکھنا پسند کرتا ہے۔ قانون کو بھی معتبر سمجھا جا سکتا تھا، مگر آپ سن چکے ہیں کہ وہ جنگ کے جائز اور ناجائز مقاصد سے کوئی بحث ہی نہیں کرتا۔ اب دونوں چیزوں کو الگ کر دینے کے بعد ہم مغربی تہذیب کا منشاء کس سے دریافت کریں؟ کیا علمائے اخلاقیات سے دریافت کریں؟ کیا امن کا دعوٰی کرنے والے مفکرین سے دریافت کریں؟ کیا ان گنتی کے چند مصنفوں اور اخبار نویسوں سے دریافت کریں جن کے قلم سے کبھی کبھی انسانیت اور انسانی اخوت کے دل خوش کن خیالات ٹپک پڑتے ہیں؟ تو ہمیں ان لوگوں سے استفسار کرنے میں تامل نہیں ہے، اگر ہم کو ان میں سے ہزار دو ہزار نہیں صرف ایک دو ہی ایسے آدمیوں کے نام بتا دیئے جائیں جن کا کوئی قول مغربی اقوام کے لئے حجت کا حکم رکھتا ہو اور جن کے خیالات پر تمام اہلِ مغرب یا ان کی اکثریت کا ایمان ہو۔ اگر کوئی ایسی متفق علیہ چیز مغرب میں موجود نہیں ہے تو ہمارے پاس مغربی قوموں کے معمول بہ طریقوں کے سوا اور کون سی چیز رہ جاتی ہے جس سے ہم جنگ کے متعلق مغربی قوموں کا اخلاقی عقیدہ معلوم کر سکیں؟

قیامِ امن اور تخفیفِ سلاح کی تجویزیں جنگ کے مسئلہ میں یورپ کی نیک نیتی ثابت کرنے کے لئے ان کوششوں کا ضرور حوالہ دیا جائیگا جو چند سال سے جنگ کو روکنے، دائمی امن قائم کرنے، آلات و اسلحہ کے استعمال پر قیود عائد کرنے، اور جنگی طاقتوں کو توڑ دینے یا کم از کم گھٹا دینے کے متعلق کی جا رہی ہیں، لیکن ان کوششوں کی ظاہر فریب صورت سے قطع نظر کر کے جب ہم ان کی حقیقت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جنگ کو روکنے کی نہیں بلکہ اسے پہلے سے بھی زیادہ بڑھا دینے کی تدابیر پنہاں ہے۔

تخفیفِ اسلحہ کی تجویز رسمی طور پر سب سے پہلے ۱۸۹۸ء میں پیش کی گئی تھی۔ اگست ۹۸ء میں زارِ روس کی جانب سے بڑی بڑی سلطنتوں کو ایک مراسلہ بھیجا گیا تھا جس میں ایک بین الملی اجتماع کی ضرورت ظاہر کی گئی تھی تاکہ

"امن و صلح کا تحفظ بین الملی سیاست کا سب سے بڑا مقصد قرار دیا جاتا ہے۔ اسی مقصد کے لئے بڑی بڑی سلطنتوں نے طاقتور ایتلافات قائم کر رکھے ہیں، اسی امن کی ضمانت کے لئے انہوں نے اپنی فوجی طاقت کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ اس سے پہلے اتنی طاقت کبھی نہ دیکھی گئی تھی، اور وہ اسے برابر ترقی دیئے جا رہی ہیں اور اس کی خاطر کسی قربانی میں تامل نہیں کرتیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ شریف تر مقصد یعنی قیام امن کسی طرح حاصل نہیں ہوتا۔ روز افزوں مالی مصارف عام رفاہیت و خوش حالی کے چشموں کو خشک کئے دے رہے ہیں۔ قوموں کی ذہنی و جسمانی طاقت، ان کی محنت، اور ان کا سرمایہ سب کچھ اپنے اصلی مصرف کے بجائے ایسے کاموں میں صرف ہو رہا ہے جن سے کوئی منفعت حاصل نہیں ہوتی۔ کروڑوں روپیہ تخریب کے ان آلات کی ساخت میں صرف ہو رہا ہے جو آج چاہے سائنس کے منتہائے کمال ہوں مگر کل اسی میدان میں کسی نئے اکتشاف سے اپنی قدر و قیمت ضرور کھو دیں گے اس کی بدولت قومی تہذیب، اقتصادی ترقی اور دولت کی پیداوار یا تو خطرہ میں پڑ گئی ہے یا اس کا نشو و نما رک گیا ہے۔

مزید برآں جس نسبت سے ہر سلطنت کی فوجی قوت میں اضافہ ہوتا ہے، اسی نسبت سے اس مقصد کا حصول بعید تر ہوتا جا رہا ہے جسے سلطنتیں حاصل کرنا چاہتی ہیں معاشی مشکلات، جو زیادہ تر فوجوں کے ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ جانے سے پیدا ہوتی ہیں، اور وہ دائمی خطرات، جو آلاتِ جنگ کی اتنی کثرت میں مضمر ہیں، ہمارے موجودہ زمانہ کی ہتھیار بند صلح کو ایک جاں گسل بوجھ کی صورت میں تبدیل کر رہے ہیں جس کا اٹھانا باشندوں کے لئے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ پس یہ بالکل ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ صورتِ حال قائم رہی تو وہ لازماً دنیا کو اسی مہلکہ کی طرف لے جائیگی جس سے بچنا مقصود ہے اور جس کے آلام کا محض تصور ہی انسانی فکر کے لئے بہت ہولناک ہے۔"

یہ خیالات آج سے ۴۰ سال پہلے ایک ایسی سلطنت کی جانب سے ظاہر کئے گئے تھے جو خود جنگی تیاریوں

اور جنگ آزمائی کے ارادوں میں سب سے پیش پیش تھی جس وقت دنیا میں ان خیالات کی اشاعت ہوئی تو ہر طرف سے ان کا خیر مقدم کیا گیا، مبارکباد کی صدائیں بلند ہوئیں، اور دنیا کی بہت سی سلطنتوں نے بین الملی کانفرنس کی دعوت پر لبیک کہا، چنانچہ دوسرے ہی سال ۱۸۹۹ء میں پہلی ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی جس کے لائحہ عمل کی سب سے پہلی دفعہ یہ تھی کہ جلد سے جلد بری و بحری قوتوں کی روزافزوں ترقی کو روکا جائے، لیکن جب کانفرنس کے مباحث شروع ہوئے تو بہت جلدی یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ سلطنتوں میں تخفیف اسلحہ کی طرف کوئی میلان نہیں ہے مسٹر ہولس جو کانفرنس میں امریکہ کے نمائندے بنکر آئے تھے، اس رنگ کو ابتدا ہی میں سمجھ گئے تھے اور انہوں نے نہایت صفائی کے ساتھ یہ کہدیا تھا:-

"ہر شخص جو سادہ لوحی کی بنا پر تخفیف اسلحہ کی تجویزوں سے توقعات وابستہ کئے بیٹھا ہے، یا یہ امید رکھتا ہے کہ ایک بین الملی عدالت عالیہ ایک بین الملی پولیس کے ساتھ قائم ہوگی اور اس کے فیصلے دنیا پر نافذ کرائے جائیں گے، اسکو آخر میں یقیناً مایوس ہونا پڑیگا"[1]

چنانچہ یہی ہوا۔ کانفرنس نے پہلے تو خلع سلاح یا تخفیف اسلحہ کی تجویز پر غور ہی کرنے سے اعراض کیا پھر جب اس پر زیادہ زور دیا گیا تو ہر سلطنت کی طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ آخر اس مسئلہ کو محض ایک ریزولیوشن پاس کر کے ختم کر دیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے:-

"یہ کانفرنس یہ رائے رکھتی ہے کہ فوجی مصارف کو جو بحالت موجودہ دنیا پر ایک بھاری بوجھ ہیں کم کرنا نوع بشری کی اخلاقی و مادی بہبود کے لئے حد درجہ مطلوب ہے"

اس "رائے" اور "حد درجہ مطلوب" کی جو کچھ قیمت تھی وہ اس سے ظاہر ہے کہ پہلی ہیگ کانفرنس کے بعد سے دوسری ہیگ کانفرنس تک کسی ایک سلطنت نے بھی اس کا لحاظ نہ کیا اور جنگی قوتوں کی کمیت و کیفیت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں جب دوسری ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کے ایجنڈا میں خلع سلاح کی تجویز کا ذکر تک نہ تھا، بلکہ تصریح کر دی گئی تھی کہ "ایسے مسائل کو ہاتھ نہ لگایا جائیگا جو بری و بحری قوی کی تحدید سے تعلق رکھتے ہیں"۔ تاہم بعض مصالح کی بنا پر پہلی کانفرنس کے رزولیوشن کا اعادہ

[1] ٹائمز مورخہ یکم اگست ۱۸۹۹ء۔

کر دینا مناسب سمجھا گیا اور اس کے ساتھ یہ فقرہ بھی بڑھا دیا گیا:-

"اور چونکہ اس وقت (یعنی پہلی کانفرنس کے بعد سے تقریباً ہر سلطنت کے فوجی مصارف میں کافی اضافہ ہوا ہے، اس لیے یہ کانفرنس اعلان کرتی ہے کہ یہ امر خاص طور پر مطلوب ہے کہ سلطنتیں اس سوال پر دوبارہ سنجیدگی کے ساتھ غور کریں"

اس قرارداد کا منشا صرف اس قدر تھا کہ سلطنتیں خلع سلاح کے سوال پر محض "غور" کریں، چنانچہ سلطنتوں نے بہت "سنجیدگی کے ساتھ" غور کیا اور جس نتیجہ پر پہنچیں وہ یہ تھا کہ اپنی جنگی طیاریوں کو اور زیادہ بڑھا دیں۔

جنگ عظیم سے تھوڑے عرصہ پہلے یورپ کے ارباب فکر میں پھر اس سوال پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہوا تھا کہ جنگ کو بے ضرر کرنے کی مناسب تدابیر کیا ہو سکتی ہیں؟ اور بین الملی قانون کس حد تک اس کی اجازت دیتا ہے؟ لیکن ابھی ان سوالات پر گفتگو ہی ہو رہی تھی کہ جنگ چھڑ گئی اور دنیا ایک دوسرے اور اہم تر سوال یعنی بقائے حیات کے سوال کو حل کرنے میں منہمک ہو گئی۔ اگرچہ بعض تخیل پرست اب بھی گوشہائے خلوت میں بیٹھے خلع سلاح اور منع اسلحہ سازی کی تجویزوں پر کلام کئے جا رہے تھے، اور جنگ کو زبردستی روکنے کے وسائل پر غور کرنے میں مشغول تھے، مگر عملی دنیا میں ہر آن ان کے خیالات کی تردید ہو رہی تھی۔ دنیا کے لوگوں کو ان کے افکار پر غور کرنا تو درکنار ان کو سننے کی بھی فرصت نہ تھی۔ تاہم ان کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکومت امریکہ نے سرکاری طور پر اس تحریک کو اٹھانا قبول کر لیا اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو صدر جمہوریہ امریکہ مسٹر ولسن نے سینٹ کے نام ایک طویل پیغام بھیجا جس میں منجملہ اور امور کے ایک یہ تجویز بھی تھی:-

"فوجوں کے استعمال میں اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے جس سے فوجیں صرف محض قیام امن کا ذریعہ ہوں نہ کہ حملہ اور خود غرضانہ جبر و تشدد کا آلہ ...... اگر ہر ملک میں زبردست سامان جنگ کی صنعت اور افواج کی ترتیب کا سلسلہ جاری رہے تو دنیا کی قوموں میں سکون و اطمینان کا احساس کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ بری و بحری افواج اور آلات جنگ کا مسئلہ نہایت اہم اور ضروری مسئلہ ہے جو اقوام عالم اور نوع بشری کی آئندہ قسمت کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے"

سنہ ۱۸۹۹ء کے بعد یہ دوسرا موقع تھا جبکہ ایک مغربی سلطنت کی جانب سے خلع سلاح کا مسئلہ باضابطہ چھیڑا گیا، لیکن اس مرتبہ یہ آواز پہلے سے بھی زیادہ بے معنی اور لغو تھی، کیونکہ جس سلطنت نے اسے بلند کیا تھا وہ خود جنگ میں شریک ہوئی اور اپنے عمل سے اس نے خود اپنے قول کی تردید کر دی۔

جمعیتہ اقوام [ ] جنگ عظیم کے بعد فتحیاب مغربی سلطنتوں نے پریزیڈنٹ ولسن کے مشورہ سے ایک انجمن قائم کی جس کو جمعیت اقوام League of Nations کا خطاب دیا گیا۔ اس انجمن کا اولین مقصد یہ قرار دیا گیا تھا کہ جنگ اور اسباب جنگ کو ختم کیا جائے۔ چنانچہ اسباب جنگ کے استیصال کے لئے اس نے ایک بین الملی محکمۂ عدلیہ قائم کیا تاکہ وہ سلطنتوں کے باہمی نزاعات کا تصفیہ کرے، اور خود جنگ کو روکنے کے لئے سلطنتوں کے درمیان ایک مفاہمت کی جس کا منشا یہ تھا کہ سلطنتیں اپنے باہمی نزاعات کو مصالحانہ طریقوں سے طے کیا کریں، اور اگر کوئی سلطنت اپنی اغراض کے لئے تلوار سے کام لے تو تمام سلطنتیں مل کر اس کو راہ راست پر لائیں۔ اس مفاہمت کی دفعہ ۱۶ کے الفاظ یہ ہیں:-

"اگر جمعیت کے کسی رکن نے اس سمجھوتہ کی دفعہ ۱۲، ۱۳، ۱۵ کو پس پشت ڈال کر جنگ چھیڑ دی تو اس کا یہ فعل گویا جمعیت کے تمام دوسرے ارکان کے خلاف جنگ کا مترادف ہوگا۔ ارکان جمعیت اس مفاہمت کے ذریعہ سے یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ فوراً ہی اس عہد شکن سلطنت سے اپنے مالی و تجارتی تعلقات منقطع کر لیں گے اور اپنی رعایا کا بھی اس کی رعایا سے لین دین بند کر دیں گے، نیز وہ کوشش کریں گے کہ اس سلطنت کی رعایا کو دوسری سلطنتوں کی رعایا سے بھی تجارتی، مالی، یا شخصی تعلقات نہ رکھنے دیں، خواہ وہ سلطنتیں جمعیت کی ممبر ہوں یا نہ ہوں۔"

اس کے بعد دوسرے فقرے میں جمعیت کی مجلس منتظمہ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس مجرم سلطنت کی سرکوبی کرنے کے لئے اپنے ارکان سے جتنی بری و بحری فوج مناسب سمجھے طلب کرے۔ اور تمام ارکان کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی مالی و جنگی قوتوں کو اس مجرم سلطنت کے خلاف استعمال کرنے کے لئے جمعیت کے سپرد کر دیں۔

یہ سمجھوتہ بظاہر جنگ کو روکنے کا نہایت موثر اور بے خطا ہتھیار معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے

کہ یہ اسی جتھہ بندی کی زیادہ مہذب، زیادہ منظم، اور زیادہ خطرناک صورت ہے جس کی بدولت ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم برپا ہوئی تھی۔ چونکہ جنگ کے زمانہ میں اس جتھہ بندی کے ہولناک نتائج دیکھ کر تمام یورپ اس سے متنفر ہو گیا تھا، اور اسی کو اپنے تمام مصائب کا باعث سمجھنے لگا تھا، اس لئے مغربی سلطنتیں اس پرانے طریقے کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں۔ مگر اس کے بغیر ان کی سیاسی اغراض کا حاصل ہونا بھی ناممکن تھا۔ کیونکہ "فرداً فرداً" کسی سلطنت کا اتنا اثر نہیں ہو سکتا کہ تمام دنیا کو مرعوب کر کے اپنی اغراض پوری کر لے، اور مشترک اغراض کے لئے بہرحال یہ ضروری ہے کہ بڑی بڑی سلطنتیں متحدہ قوت کے ساتھ دنیا پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنے کی کوشش کریں۔ اس لئے انہوں نے اسی جتھہ بندی کو ایک دوسری وضع و شکل میں اختیار کیا ہے جس میں کھلم کھلا ہجومی و دفاعی اتحاد کے بجائے صلح کوشی و امن پروری کے "لباس تقویٰ" میں وہی مجرمانہ اتحادِ عمل و اشتراکِ کار کی روح بھری ہوئی ہے۔ جہاں تک چھوٹی سلطنتوں کو دبانے کا تعلق ہے، جمعیت کا یہ سمجھوتہ بہت کارآمد ہو سکتا ہے۔ اگر یونان اور بلغاریہ میں اختلاف ہو، یا پولینڈ اور لتھونیا میں جھگڑا ہو جائے تو جمعیت اقوام کے بڑے بڑے ارکان ایک دھمکی میں ان کو درست کر سکتے ہیں۔ اس طرح صرف یہی نہیں ہوتا کہ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ بند ہو سکتا ہے، بلکہ اس سے زیادہ بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جمعیت کے لیڈروں کا رعب و اثر بھی ساری دنیا پر قائم ہو جاتا ہے اور وہ "خدائی فوجدار" بن کر نظامِ عالم میں ترمیم و تنسیخ کرنے، طاقتوں کو گھٹانے بڑھانے، مرعوب قوتوں کو ممنون کرنے اور غیر مرعوب قوتوں کو خوفزدہ کرنے کی خدمات بڑی خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن اگر خود بڑی طاقتوں میں سے کوئی جمعیت کے سمجھوتے کی خلاف ورزی کر بیٹھے، تو جمعیت اس پر کسی قسم کی کارروائی کرنا تو درکنار، زبانی بازپرس کی بھی جرأت نہیں کر سکتی، اور اگر وہ اس کی جرأت کرے بھی تو اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا[۱]۔ فرض کرو کہ آج انگلستان جمعیت کے سمجھوتے کی خلاف ورزی کر کے امنِ عام کے منافی کوئی جرم کرتا ہے۔ جمعیت کی کونسل اس پر غور کرنے کے لئے مجتمع ہوتی ہے، تمام ارکان کے اتفاق سے مجرم کو تہدید کی جاتی ہے کہ وہ ارتکابِ جرم

[۱] ان سطور کی تحریر کے کئی سال بعد جب حبش پر اٹلی کا اور چین پر جاپان کا حملہ ہوا، اور جرمنی نے آس پاس کی قوموں کو نگلنا شروع کیا تو جمعیت اقوام کی کمزوری بالکل نمایاں ہو گئی اور اسی چیز نے آخر کار اس جمعیت کے وجود کو ختم کر دیا۔

سے باز آئے ورنہ اس کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی، مگر مجرم جو دنیا میں سب سے بڑی بحری قوت کا مالک ہے، اس کی کوئی پروا نہیں کرتا اور جو کچھ کرنا چاہتا ہے کئے جاتا ہے۔ آخر جمعیت مجبور ہو کر اپنے ارکان سے درخواست کرتی ہے کہ وہ دولت برطانیہ سے ہر قسم کے تجارتی، مالی، اور سفارتی تعلقات منقطع کرلیں، اور اپنی جنگی قوت سے اس کو امتثال امر پر مجبور کریں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا دنیا کی تمام وہ سلطنتیں جو جمعیت کی رکن ہیں، محض جمعیت کے حکم کی تعمیل میں اس بات پر آمادہ ہو جائیں گی کہ ان بیشمار معاشی، سیاسی، تجارتی اور مالی مصالح کو قربان کر دیں جو انگلستان جیسی عظیم الشان سلطنت سے وہ وابستہ رکھتی ہیں؟ کیا دنیا کی آبادی کے ۱/۴ حصہ سے بقیہ ۳/۴ حصہ کے تعلقات یکلخت منقطع ہو جائیں گے؟ کیا یورپ اور امریکہ کی بڑی بڑی سلطنتیں اپنے مخصوص مصالح کو نظر انداز کر کے محض اس لئے ایک زبردست سلطنت کے مقابلہ میں جنگ کے نقصانات برداشت کرنے پر راضی ہو جائیں گی کہ جمعیت اقوام ان سے ایسا کرانا چاہتی ہے؟ کوئی شخص جو عملی سیاست سے ذرہ برابر بھی مس رکھتا ہو، ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا، اور جب اس کا جواب اثبات میں نہیں ہے تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ جمعیت اقوام دنیا کی بڑی سلطنتوں کو قابو میں رکھنے سے عاجز ہے، حالانکہ امن عالم کو اصلی خطرہ انہیں بڑی سلطنتوں کی حرص و طمع سے ہے۔

یہ محض ایک مفروضہ صورت نہیں ہے۔ گذشتہ ۸ سال میں اس کا پورا تجربہ کیا جاچکا ہے۔ جس روز سے جمعیت اقوام عالم وجود میں آئی ہے، اس کو ایک مرتبہ بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ بڑی سلطنتوں میں سے کسی کے ظالمانہ افعال پر باز پرس کرے۔ دمشق میں فرانس نے علانیہ قتل عام کیا اور جمعیت خاموش بیٹھی دیکھتی رہی، حالانکہ اسی کی جانب سے شام کا علاقہ فرانس کو انتداباً دیا گیا تھا۔ ریف کی چھوٹی سی قوم کو ہسپانیہ اور فرانس نے ملکر ہلاک کر دیا، اور جمعیت ایک لفظ زبان سے نہ نکال سکی۔ اٹلی اور یوگوسلاویہ کے مسئلہ میں جمعیت نے دخل دینا چاہا، مگر اٹلی کی ایک دھمکی اس کا منہ بند کرنے کے لئے کافی تھی۔ برطانیہ نے عراق میں خون کی ندیاں بہائیں، مگر جمعیت نے پلٹ کر یہ بھی نہ پوچھا کہ جس ملک کو اس کے انتداب میں دیا گیا ہے اس کے ساتھ وہ کیا سلوک کر رہا ہے۔ پھر جمعیت کی پنچایت میں آج تک جتنے ایسے

مسائل پیش ہوئے ہیں، جو چھوٹی اور بڑی سلطنتوں کے درمیان متنازع فیہ تھے ان میں بھی ہمیشہ بڑی سلطنتوں کی جیت ہوئی اور کبھی یہ نہ دیکھا گیا کہ کسی کمزور کو طاقتور کے مقابلہ میں کامیابی نصیب ہوئی ہو۔ موصل کا مسئلہ ابھی بالکل تازہ ہے۔ اس کو محض برطانیہ کی معاشی حرص کی خاطر جس طرح ٹرکی سے الگ کر کے عراق سے ملحق کر دیا گیا ہے، اس سے یہ راز بالکل آشکارا ہو جاتا ہے کہ جمعیت اقوام در اصل دنیا کی طاقتور سلطنتوں کا ایک جتھہ ہے جس کو ان سلطنتوں نے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ اپنی اغراض حاصل کرنے کے لئے قائم کر رکھا ہے۔ اس جتھے کی قوت جن قوموں کے خلاف استعمال کی گئی ہے اور کی جا رہی ہے، ان میں ناراضی کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں، اور وہ اپنے حقوق، بلکہ عین وجود کی حفاظت کے لئے ایک دوسرا جتھہ قائم کرنا چاہتی ہیں، تاکہ جب کبھی مغربی دول اپنی متحدہ قوت سے ان کو دبانے کی کوشش کریں تو یہ بھی متحدہ قوت کے ساتھ ان کا جواب دے سکیں۔ یہ خواہش اگر قوت سے فعل میں آ گئی تو وہی دو متقابل کے جتھے پھر بن جائیں گے جو جنگ عظیم سے پہلے بنے تھے اور دنیا میں پھر ایک عالمگیر جنگ برپا ہوگی جو شاید پہلے سے بھی زیادہ مہلک ہو۔

خلع سلاح کی جدید تجویزیں

گذشتہ سات سال سے یورپ اور امریکہ میں خلع سلاح، تخفیف قوائے حربیہ اور تحریم جنگ کے مسائل پر بھی مختلف تجویزیں سرگرمی کے ساتھ زیر بحث ہیں، اور بہت سے خوش گمان لوگ ان کو یورپ کے حسن نیت کی دلیل سمجھ رہے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس تمام قیل و قال میں بھی حقیقت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ چونکہ مغرب کے عام باشندے لڑتے لڑتے تھک گئے ہیں، اور ان کو اپنی اجتماعی اور خصوصیت کے ساتھ تجارتی و صنعتی زندگی میں سکون کی سخت ضرورت ہے، اس لئے وہ کم از کم دل بہلانے کے لئے ایسی تجویزوں اور خیالی باتوں کو سننا پسند کرتے ہیں جن سے سکون نہیں تو سکون کی مبہم توقع ہی قائم ہو جاتی ہے۔ ورنہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے، اس میں ان توقعات کے بر آنے کا کوئی سامان نہیں ہے۔ بلکہ گذشتہ سات آٹھ سال کے اندر مغربی ممالک میں وسائل جنگ کو جو ترقی نصیب ہوئی ہے وہ تو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی، حتیٰ کہ سنہ ۱۴ء میں بھی نہ تھی جبکہ تمام یورپ جنگ کی تیاریوں میں منہمک تھا۔

جنگ عظیم کے بعد سنہ ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ جمہوریہ امریکہ نے اس مسئلہ کو چھیڑا اور اس کی تحریک سے

نومبر ۱۹۲۱ء میں بمقام واشنگٹن ایک بین الملی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کا مقصد بظاہر جنگی طاقتوں میں تخفیف کرنا تھا۔ مگر دراصل امریکہ، فرانس، جاپان اور اٹلی یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح برطانیہ کی عظیم الشان بحری طاقت کو کم کیا جائے، کیونکہ ان سب ملکوں کی زندگی بحری تجارت پر منحصر ہے، اور جب تک برطانیہ سمندر کی لہروں پر حکمران ہے اس وقت تک کوئی ملک اپنی تجارت کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا۔ دوسری طرف برطانیہ کو یہ احساس تھا کہ اس کی زندگی کلیتہً بحری قوت کے تفوق پر منحصر ہے اسلئے اس کی خواہش تھی کہ کوئی سلطنت اسکی برابری تک نہ پہنچ سکے۔ یہی باہمی کشمکش واشنگٹن کانفرنس کے مباحثات میں جاری رہی۔ ہر فریق دوسروں پر پابندیاں عائد کرنا چاہتا تھا، مگر جب خود اس کا اپنا سوال پیش آتا تو صاف کہدیتا کہ ہماری جنگی پالیسی دوسروں کے اثر سے بالکل پاک ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ واشنگٹن کانفرنس اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکی کہ اس نے پانچ بڑی سلطنتوں کے درمیان بحری قوت کا تناسب مقرر کر دیا اور اس کے بعد ہی امریکہ نے جو تخفیف اسلحہ کا علمبردار بنکر اٹھا تھا، ۵۰ نئے ڈریڈناٹ تعمیر کرنے اور ہر جہاز کو جدید ترین آلاتِ جنگ سے آراستہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔

اسی واشنگٹن کانفرنس میں تحت البحر کشتیوں کا معاملہ پیش ہوا۔ ان کشتیوں سے اصلی خطرہ انگلستان کو ہے، کیونکہ اسی کی زندگی سب سے زیادہ بیرونی ممالک کی درآمد پر منحصر ہے، اور وہی سب سے زیادہ جنگی و تجارتی جہازوں کا مالک ہے۔ جنگ عظیم میں ان کشتیوں نے اس کی بحری تجارت کو برباد کر کے جس طرح اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا، اس کا سبق برطانیہ کو یاد تھا، اس لئے اس نے واشنگٹن کانفرنس میں اپنی ساری قوت اس کوشش میں صرف کر دی کہ تحت البحر کشتیوں کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے۔ دوسری طرف فرانس خصوصیت کے ساتھ اس کا مخالف تھا، کیونکہ اس کی بحری قوت کمزور تھی، اور برطانیہ کے مقابلہ میں اس کے پاس اپنی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ یہی تحت البحر کشتیاں تھیں۔ اس کے نمائندوں نے صاف طور پر کہہ دیا کہ یہ کشتیاں دراصل حملہ کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ مدافعت کا ذریعہ ہیں، اور وہ ممالک انہیں استعمال کرنے پر مجبور ہیں جن کی بحری قوت کمزور ہے۔ آخر اس مسئلہ میں امریکہ نے ایک متوسط راہ نکالی جس پر فریقین متفق ہو گئے، اور وہ یہ تھی کہ حالتِ جنگ میں تجارتی جہازوں کو برباد کرنے کے لئے تحت البحر کشتیوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔

ایک اور میثاق زہریلی گیسوں کے استعمال کے متعلق بھی طے ہوا۔ اول اول ۱۸۹۹ء میں ہیگ کانفرنس

میں زہریلی اور دم گھونٹنے والی گیسوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا تھا جس کی برطانیہ نے سخت مخالفت کی تھی۔ پھر ۱۹۰۷ء کی دوسری ہیگ کانفرنس میں برطانیہ بمشکل اس پر راضی ہو گیا، مگر امریکہ آخر وقت تک مخالف رہا۔ جنگ عظیم میں جرمنی اور اس کے حریفوں نے آزادی کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف ان گیسوں کو استعمال کیا اور جو کچھ قانونی بندشیں تھیں وہ سب سلطنتوں کے متفقہ عمل سے ٹوٹ گئیں۔ اس کے بعد واشنگٹن کانفرنس میں پھر اسی قیود کی تجدید کی گئی مگر دل سے اب بھی کوئی سلطنت ان کو قبول کرنے پر راضی نہ تھی۔ چنانچہ کانفرنس کے فرانسیسی نمائندے ایم سارآؤر M. Sarraut نے اس پر دستخط کرتے وقت یہ نوٹ لکھ دیا کہ:-

"زہریلی گیسوں کے استعمال کو روکنے کی کوشش ناممکن العمل معلوم ہوتی ہے"

مسٹر بالفور نے بھی برطانیہ کی طرف سے یہ تصریح کافی ضروری سمجھی کہ:-

"یہ اقرار نامہ قوموں کو اس حفاظت کی ضرورت سے بے نیاز نہیں کرتا جو ایک شریر دشمن کی جانب سے گیسوں کے استعمال کی صورت میں پیش آتی ہے"

اسی بددلی کا نتیجہ ہے کہ اب تک کسی سلطنت نے اس اقرار نامہ کی باقاعدہ توثیق نہیں کی، اور قانونی حیثیت سے وہ اس وقت ایک بے معنی دستاویز ہے۔

واشنگٹن کانفرنس کے بعد اپریل ۱۹۲۲ء میں مسٹر لائڈ جارج کی تحریک پر جنوا میں ایک پان یورپین کانفرنس منعقد کی گئی جس کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ آئندہ دس سال کے لئے دول مغرب ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا عہد کریں۔ اور تمام قومیں مل کر جنگ زدہ ممالک کی تعمیر جدید کریں۔ لیکن اس کانفرنس میں امریکہ نے شرکت سے انکار کر دیا، فرانس نے ابتدا ہی میں اعلان کر دیا کہ ہم اس کے فیصلوں کو تسلیم کرنے کی ذمہ داری نہیں لیتے، ٹرکی کو سرے سے شرکت کی دعوت ہی نہیں دی گئی، اور روس کو بلایا گیا تو اس لئے کہ اس پر دباؤ ڈال کر ان نقصانات کا تاوان ادا کرنے پر مجبور کیا جائے جو انقلاب کے زمانہ میں روسی حدود کے اندر یورپین سلطنتوں کی املاک کو پہنچا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس ناکام ہوئی اور جنگی طیاریوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

جنیوا کے بعد ہیگ میں ایک دوسری کانفرنس ہوئی، مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو جنیوا کانفرنس کا ہوا تھا۔ پھر ایک اور بین المللی کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی، مگر وہاں برطانیہ اور فرانس کے درمیان اتنا سخت اختلاف برپا ہوا کہ موسیو پوانکارے ترش رو ہو کر کانفرنس سے اٹھ گئے اور سیدھے پیرس چل دیئے، یہاں تک کہ تصویر کھنچوانے تک کے لئے بھی نہ رکے!

ستمبر ۱۹۲۵ء میں جمعیت اقوام نے تحدید قوی حربیہ اور تحریم جنگ کے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی درخواست پر کونسل نے ایک بین المللی مؤتمر خلع سلاح کے انعقاد کا راستہ صاف کرنے کے لئے ایک مجلس تحضیری (Preparatory Committee) مقرر کی، تاکہ وہ جملہ امور پر غور کر کے بتائے کہ کس طرح اور کن اصول پر ایسی کانفرنس کو دعوت دی جا سکتی ہے۔ یہ کمیٹی سال بھر تک کوئی کام نہ کر سکی۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۲۶ء کو جمعیت کے اجلاس عام نے کونسل سے سفارش کی کہ وہ کمیٹی کو ۱۹۲۷ء تک اپنا کام ختم کرنے کی تاکید کرے تاکہ آٹھویں اجلاس عام سے پہلے بین المللی کانفرنس کو مدعو کیا جا سکے۔ مگر اس مدت میں بھی کمیٹی نے کام ختم نہیں کیا اور آج تک بس اس کے جلسے ہی ہوتے جا رہے ہیں۔ چونکہ ابھی تک اس تحریک کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے اس لئے کوئی رائے دینا قبل از وقت ہوگا۔ لیکن آثار بتاتے ہیں کہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو پہلے ایسی کوششوں کا ہو چکا ہے۔ اگر دول مغرب میں تخفیف خلع سلاح کی کوئی قلبی خواہش موجود ہوتی تو وہ روس کی ان تجاویز پر لبیک کہتے جو اس نے تخفیف قوی حربیہ کے متعلق پیش کی تھیں، کیونکہ اس مقصد کی جانب عملی اقدام صرف انہیں تجاویز سے ہو سکتا ہے۔ لیکن دول میں سے کوئی ان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، اور برطانیہ کے نمائندے لارڈ کشنڈن نے تو صاف کہدیا ہے کہ

"کامل خلع سلاح قوموں کو غارتگری، لوٹ مار اور انقلاب کے خطرے میں مبتلا کر دیگا"

اس سے ظاہر اور باطن کا فرق صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ زبان سے تو بیشک اس قسم کی باتیں کہی جا رہی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی قومیں جنگ و خونریزی سے بیزار ہیں، امن و صلح کی قدر شناس ہیں، اور دل سے چاہتی ہیں کہ اپنے ابنائے نوع کی تباہ کاری کا کھیل چھوڑ کر اپنے قدرتی حدود میں اپنی تعمیر و ترقی کے لئے گرم عمل رہیں۔ مگر حال یہ ہے کہ ان قوموں کے درمیان شدید عداوتیں پرورش پا رہی ہیں!

ان کے دلوں میں آتش فشاں مادے پک رہے ہیں، ان کی فوجیں تعداد اور قوت میں بڑھ رہی ہیں، ان کے آلاتِ جنگ روز بروز ترقی کر رہے ہیں، اور ہر قوم اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ آیندہ جنگ میں اپنے حریفوں سے زیادہ طاقتور ثابت ہو اور تمام مخالف قوتوں کو مٹا کر اپنی برتری کا سکہ بٹھا دے اِس رقابت و مسابقت کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ دولِ مغرب میں امن پسندی کا حقیقی میلان موجود ہے اور جنگجوئی سے وہ فی الواقع توبہ کر چکی ہیں؟ ۱۹۱۹ء کے میمورنڈم میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، برطانی وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج نے لکھا تھا کہ

"جمعیت اقوام کی کامیابی کی اولین شرط یہ ہے کہ سلطنتِ برطانیہ ریاستہائے متحدہ امریکہ، فرانس، اور اٹلی کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو جائے جس کے مطابق ان سلطنتوں میں جنگی جہازوں کی تعمیر اور فوجوں کی تکثیر و توفیر کی مسابقت بند ہو جائے۔ جب تک جمعیت کی مفاہمت پر دستخط کرنے سے پہلے یہ نہ ہو سکے گا جمعیت محض ایک ضحوکہ اور ایک "سوانگ" رہیگی"۔

اس قول کے مطابق جمعیت اقوام ایک "ضحوکہ" اور ایک "سوانگ" ثابت ہو چکی ہے۔ آج سلطنتوں کے درمیان جنگی طاقت بڑھانے کے لئے اس قدر زبردست مقابلہ جاری ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ آج مغربی دنیا جنگ و پیکار کے لئے اتنی تیار ہے کہ ۱۹۱۴ء میں بھی نہ تھی۔ آج مغربی تہذیب نے فوجوں کی کثرت، مہلک آلاتِ جنگ کی ترقی، دیو ہیکل جنگی جہازوں کی صنعت، تباہ کن ہوائی جہازوں کی ساخت، زہریلی گیسوں اور غارت گر سامانِ جنگ کی تیاری سے انسانیت کی ہلاکت و بربادی کرنے کے لئے وہ سامان فراہم کیا ہے جس کی نظیر سے پوری تاریخ عالم خالی ہے۔ ان حقائق کو دیکھ کر کون ہے جو امن پسندی کی بناوٹی باتوں اور صلح کوشی کی نمائشی کانفرنسوں سے دھوکہ کھائے گا؟

۲۔ جنگ کا عملی پہلو

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق مغربی جنگ کی اخلاقی حیثیت سے تھا۔ اس پہلو میں آپ نے دیکھ لیا کہ جہاں تک جنگ کے اغراض و مقاصد کا تعلق ہے، مغربی دنیا اپنی تمام ترقی تہذیب و

تمدن کے باوجود اُس نقطہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی ہے جس پر عہد تاریک کی غیر متمدن اور وحشی قومیں صدیوں پہلے قائم تھیں۔ وسائلِ جنگ میں تو بیشک انہوں نے ترقی کے آسمان کو جالیا ہے۔ ان کی فوجوں کی اعلیٰ ترتیب، ان کے سپاہیوں کی خوبصورت وردیاں، ان کے جنرلوں کی زبردست مہارتِ فن، ان کے آلاتِ حرب کی دلفریب سجاوٹ دیکھ کر کون ہے جس کی آنکھیں خیرہ نہ ہو جائیں گی۔ مگر اس جنگ کے اندر جو روح کام کر رہی ہے وہ اسی عہدِ وحشت کی روح ہے جس کی درندگی و بہیمیت آلات و وسائل کی ترقی سے کم نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہو گئی ہے۔ قدیم وحشیوں کی طرح ان جدید وحشیوں کے پیش نظر بھی نہ کوئی بلند نصب العین ہے نہ کوئی اعلیٰ مطمحِ نظر، نہ کوئی ایسا اخلاقی مقصد جس کی بنا پر یہ اُن کے مقابلہ میں کسی سبقت و فوقیت کا دعویٰ کر سکیں۔ وہی حصولِ جاہ و مال اور توفیرِ ثروت و توسیعِ اقتدار کی خواہش جو آج سے چار ہزار برس پہلے کسی غیر متمدن قبیلہ کو جنگ پر ابھار سکتی تھی، آج کل کی مہذب قوموں کو بھی مردم کشی و خون ریزی پر آمادہ کرتی ہے۔ تہذیب و تمدن کی ترقی سے اخلاقی حالت میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ البتہ اگر کوئی ترقی ہوئی ہے تو یہ کہ پہلے اِن ادنیٰ و اسفل مقاصد کے لئے جتنی قوت استعمال کی جاتی تھی اب اس سے دس ہزار درجہ زیادہ شدید، ہولناک، اور تباہ کن قوت استعمال کی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب مقصد شرافت و پاکیزگی سے خالی ہے تو طریقِ حصولِ مقصد خواہ کتنا ہی بہتر اور پاکیزہ تر ہو، اس سے کوئی عمل صلاحیت و صواب کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ تاہم اتمامِ حجت کے لئے ہمیں یہ بھی دیکھ لینا چاہئے کہ تہذیبِ مغرب نے اپنے اعمالِ جنگ کو کیسے قوانین و ضوابط سے منضبط کیا ہے، اور ان قوانین کی معنوی قوت اور عملی حیثیت اسلامی قوانین کے مقابلہ میں کیسی ہے۔ اہلِ مغرب کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے پرانے زمانہ کے وحشیانہ طریقوں کو بدل کر جنگ کے نہایت مہذب طریقے اختیار کئے ہیں اور جنگ کو، جو پہلے درندوں کے کھیل سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی، ایک مہذب کشمکش اور شریفانہ زور آزمائی کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ دعویٰ اس بلند آہنگی کے ساتھ کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ ظاہری شان و شوکت کا اتنا سامان ہے کہ ناواقف دنیا اسے سن کر بلا تامل ایمان لے آتی ہے۔ مگر ہم

اس کو امتحان کی کسوٹی پر کس کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ فی الواقع یہ کہاں تک درست ہے؟

بین الملی قانون کی حقیقت: مغربی قوموں اور سلطنتوں کے باہمی معاملات اور جنگ و صلح کے تعلقات پر جو قانون حاوی ہے اسے اصطلاح میں بین الملی قانون (International Law) کہا جاتا ہے۔ علمائے قانون نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں، مگر سب سے زیادہ جامع تعریف یہ ہے:

"وہ ایک رواج ہے جس کی پابندی مہذب قومیں اپنے معاملات میں اختیار کرتی ہیں"

اس رواج کو کسی بااثر قوت نے وضع نہیں کیا ہے کہ اس کی پیروی کرنے پر یہ قومیں مجبور رہیں اور اس میں ردوبدل کرنے کا انہیں اختیار نہ ہو۔ بلکہ اس کو خود انہوں نے اپنی آسانی کے لئے وضع کیا ہے، اور واضع ہونے کی حیثیت سے انہیں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جس طرح چاہیں اسے اپنے حسب منشا دبا لیں اور جب چاہیں اس کو چھوڑ کر کوئی اور رواج یا قانون وضع کر لیں۔ پس زیادہ صحیح یہ ہے کہ مغربی قومیں بین الملی قانون کی پیرو نہیں ہیں بلکہ بین الملی قانون ان کا پیرو ہے۔ اپنی آسانی کے لئے جو طریقہ وہ اختیار کریں وہی قانون ہے، اور جس طریقہ کو وہ ترک کر دیں وہ سرے سے قانون ہی نہیں ہے۔ آج جن اصولوں کی پابندی پر مغربی قومیں متفق ہیں وہ آج کا بین الملی قانون ہے، مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کل کا قانون بھی ہو۔ کل اگر یہ اصول بدل کر انہوں نے کچھ دوسرے اصول وضع کر لئے تو یہ قانون منسوخ ہو جائے گا اور وہ نئے اصول بین الملی قانون بن جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض ممتاز علمائے مغرب کی رائے میں اس رواج کو لفظ قانون سے تعبیر کرنا ہی غلط ہے۔ آسٹن اپنی کتاب "حدود علم قانون کی تعیین" (Province of Jurisprudence Determined) میں لکھتا ہے:

"بین الملی قانون کی قوت کا انحصار محض رائے عام کی تائید پر ہے، اس لئے وہ صحیح معنوں میں قانون نہیں کہا جا سکتا"

لارڈ سالسبری کہتا ہے:

"اس کو کوئی عدالت بزور نافذ نہیں کر سکتی، اس لئے اسے لفظ قانون سے تعبیر کرنا

گمراہ کُن ہے۔"

۱۸۷۱ء میں امریکہ کے سپریم کورٹ نے ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ تصریح کی تھی کہ:-

"بحری قانون بھی تمام بین الملّی قوانین کی طرح مہذب ممالک کی مجموعی رضامندی پر قائم ہے۔ وہ اگر نافذ العمل ہے تو اس لئے نہیں ہے کہ کسی بالاتر قوت نے اسے وضع کیا ہے بلکہ صرف اس لئے ہے کہ اسے عموماً ایک ضابطۂ عمل کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔"

لارڈ برکنہیڈ اپنی کتاب قانون بین الملل (International Law) میں کہتا ہے کہ اس قانون کا بقاء و استحکام صرف تین چیزوں پر ہے:

۱- قومی عزت کا لحاظ جو بین الملّی رائے عام کے اثر سے پیدا ہوتا ہے (اگرچہ وہ اکثر ضروریات وقت کے اثر سے مر بھی جاتا ہے)،

۲- اہم ترین قومی مقاصد کے سوا چھوٹے چھوٹے مقاصد کے لئے جنگ کے نقصانات برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہونا،

۳- قوموں کا اس امر کو محسوس کر لینا کہ یہ طے شدہ قوانین ان کی اپنی آسانی کے لئے ہیں اور ان کا بقا انفرادی اطاعت پر منحصر ہے۔

ایک دوسری جگہ برکنہیڈ لکھتا ہے:-

"اصولاً بین الملّی قانون کے احکام کی پشت پر رائے عام اور حکومت متعلقہ کے خود اپنے اختیاری تطوع سے زیادہ کوئی مجبور کن طاقت نہیں ہے۔"

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ بین الملّی قانون محض چند قوموں کا ٹھہرایا ہوا ایک رواج ہے جس کی نہ کوئی قانونی قیمت ہے اور نہ مستحکم بنیاد۔

بین الملّی قانون کے عناصر ترکیبی | اس قانون کی ترکیب میں مختلف عناصر شامل ہیں اور ان عناصر کی ترکیبی مقدار و قیمت کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ بعض عناصر وہ ہیں جنہیں وضع قانون میں صرف اخلاقی اثر حاصل ہے، اور بعض وہ ہیں جو صرف مادی اثر رکھتے ہیں اور بسا اوقات ان کا اثر اخلاقی اثر کے

خلاف واقع ہوتا ہے۔ آئندہ مباحث کو سمجھنے کے لئے بین الملی قانون کے ان مآخذ کی تشریح ضروری ہے۔

(۱) پہلا ماخذ علمائے قانون کی آراء ہیں۔ گروشیوس سے لیکر آج تک بین الملی قانون کے جتنے ماہرین گزرے ہیں سب کے خیالات کتابوں میں موجود ہیں اور قانون کی تدوین میں انہوں نے بڑا حصہ لیا ہے لیکن ان کی آراء کی قانونی حیثیت صرف اتنی ہے کہ پیچیدہ بین الملی مسائل میں ان سے مشورہ کر لیا جاتا ہے۔ باقی رہا فیصلہ تو اس کا ان پر ذرہ برابر بھی انحصار نہیں ہے۔ لارنس اپنی کتاب اصول قانون بین الملل (Principles of International Law) میں لکھتا ہے:-

"مختلف فیہ امور میں ان کے خیالات کا عزت کے ساتھ حوالہ دیا جاتا ہے، اور ان پر غور کیا جاتا ہے، مگر وہ کسی حیثیت سے بھی فیصلہ کن نہیں ہیں"

برکنہیڈ لکھتا ہے:-

"وہ کوئی قانون نہیں بناتے بلکہ ہم کو صرف یہ بتاتے ہیں کہ فی الواقع سلطنتوں کا عمل کس چیز پر ہے"

جسٹس گرے اپنے ایک فیصلہ میں لکھتا ہے:-

"اس قسم کے مصنفین کی کتابوں سے عدالتوں میں جو حوالے دیئے جاتے ہیں ان کا منشا یہ بتانا نہیں ہوتا کہ قانون کیا ہونا چاہیئے، بلکہ صرف اس امر کی ایک معتبر شہادت پیش کرنا ہوتا ہے کہ قانون فی الواقع کیا ہے"

جسٹس کوک برن اپنے ایک فیصلہ میں لکھتا ہے:-

"ان مصنفین کی آراء خود کوئی قانون نہیں بناسکتیں البتہ مہذب اقوام کی رضامندی ان کو قانون کی حیثیت دے سکتی ہے"

ان مستند اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ قانون بین الملل کے ماہرین نے جو عظیم الشان کتابیں لکھی ہیں ان کو کوئی تشریعی قوت حاصل نہیں ہے۔

(۲) دوسرا ماخذ بین الملی معاہدات ہیں۔ ان معاہدات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تقریری[1] (Declaratory) دوسرے غیر تقریری (Non-declaratory)۔ تقریری معاہدات وہ ہیں جن میں تمام یا اکثر دول کی باہمی رضامندی سے کوئی مخصوص قاعدہ مقرر کر دیا گیا ہو، جیسے ۱۸۱۵ء کا معاہدۂ وائنا، ۱۸۵۶ء کا اعلان پیرس، ۱۸۶۴ء اور ۱۹۰۶ء کے معاہدات جنیوا، ۱۸۷۱ء کا اعلان لنڈن، ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کے معاہدات ہیگ، ۱۹۰۹ء کا اعلان لنڈن، اور ۱۹۲۲ء کے معاہدات واشنگٹن

[1] یہاں لفظ تقریر اصل لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے یعنی مقرر کرنا۔

یہ معاہدات ان سلطنتوں کے لئے واجب العمل ہیں جو ان پر دستخط کر دیں، مگر ہر سلطنت کو حق ہے کہ جب چاہے دوسرے شرکائے معاہدہ کو مطلع کر کے ان کی ذمہ داری سے بری ہو جائے۔ ایسے معاہدات سے کوئی عالمگیر قانون وجود میں نہیں آتا۔ لارنس کے بقول لازمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس قسم کے معاہدات کوئی تشریعی عمل (Legislative act.) ہیں۔ اب رہے دوسری قسم کے معاہدات۔ سو ان میں وہ مفاہمتیں شامل ہیں جو اقوام عالم کی کسی بڑی جماعت کے درمیان نہیں ہوتی ہیں بلکہ دو یا زیادہ قوموں نے مل کر اپنے معاملات کی انجام دہی کے لئے انہیں طے کر لیا ہے۔ لارنس کہتا ہے:

"یہ دوسری قسم کے معاہدات اس بات کی علامت نہیں ہیں کہ بین الملی قانون کیا ہے، بلکہ اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ بین الملی قانون میں کیا نہیں ہے۔"

تشریعی اعتبار سے ان دونوں قسم کے معاہدات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تاہم بعض معاہدات ایسے ضرور ہیں جو اصولِ قانون وضع کرتے ہیں، مثلاً جنیوا کنونشن جس میں اہلِ قتال اور غیر اہلِ قتال کے حقوق و فرائض کو متعین کیا گیا ہے، لیکن ان اصولِ قانون کا انحصار بھی سلطنتوں کے متفقہ تعامل پر ہے۔ اگر کوئی بڑی سلطنت یا چند سلطنتیں مل کر ان کو توڑ دیں تو تمام سلطنتیں توڑ ڈالتی ہیں اور قانون کی تانی میں ایک تار بھی باقی نہیں رہتا۔

(۳) تیسرا ماخذ بین الملی پنچایتوں اور عدالت ہائے غنائم بحریہ (Prize Courts) اور بین الملی کانفرنسوں کے فیصلے ہیں۔ یہ فیصلے درحقیقت کوئی قانون نہیں بناتے بلکہ صرف موجود الوقت قوانین کو پیش آمدہ حالات سے منطبق کرتے ہیں۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ ان کو بین الملی قانون کی تشریح و تعبیر کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ایسے فاضل جج بھی گزرے ہیں جنہوں نے مختلف مسائل کے فیصلوں میں قانون کے عام اصول بھی وضع کر دیئے ہیں، مثلاً لارڈ اسٹوول، ایم پورٹالیس اور مسٹر جسٹس اسٹوری، کہ ان کو بین الملی قانون کے واضعین میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے وضع کردہ اصول بھی آخر میں اپنی تنفیذ کے لئے جس چیز کے محتاج ہیں وہ سلطنتوں کی رضامندی ہی ہے۔

(۴) چوتھا ماخذ وہ ہدایات ہیں جو مختلف سلطنتیں اپنی فوجوں کو دیتی ہیں۔ یہ ہدایات ابتداءً کسی ایک

سلطنت کی طرف سے دی گئی تھیں، مگر بعد میں دوسری سلطنتوں نے ان کو پسند کر کے اپنے ہاں رائج کر لیا اور رفتہ رفتہ وہی ایک بین الملی دستور العمل بن گئیں۔ ان ہدایات سے ایک قانون ضرور بنتا ہے، مگر وہ بین الملی واجبات کی بنیاد پر قائم نہیں ہے، بلکہ سلطنتوں کی انفرادی قبولیت اور پسند پر قائم ہے ہر سلطنت کو حق ہے کہ جب چاہے اس قانون کو بدل کر دوسرا قانون جاری کر دے۔

بین الملی قانون کی ناپائداری

یہ وہ عناصر ہیں جن کے مجموعی اشتراک، و امتزاج سے بین الملی قانون بنتا ہے ان میں سے فرداً فرداً کوئی بھی ایسی تشریعی قدرت نہیں رکھتا جو اقوام عالم کو پابند بنانے والی ہو۔ ظاہر ہے کہ جب ستون ہی کمزور ہیں تو جو عمارت ان پر کھڑی کی گئی ہے وہ بھی بودی ہوگی۔ ان کی ترکیب سے جس قانون کا قصر تیار ہوا ہے اس پر ایک تفصیلی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ اس تعمیر میں خرابی کی بیشمار صورتیں مضمر ہیں۔ اس میں ہر چیز کو سلطنتوں کی مفاہمت پر موقوف رکھا گیا ہے۔ جس قاعدہ کو تمام یا اکثر سلطنتیں متفق ہو کر مان لیں وہی بین الملی قانون ہے، اور جس کو وہ نہ مانیں یا کچھ عرصہ تک مانتے رہنے کے بعد چھوڑ دیں وہ سرے سے کوئی قانون ہی نہیں ہے۔ اس طرح یہ قانون محض سلطنتوں کے سیاسی مصالح اور جہانبانی کے اغراض و مطامع کا آلۂ کار بن کر رہ گیا ہے جسے بنانے اور حسب منشا کام میں لانے اور حسب ضرورت ادلنے بدلنے کے تمام اختیارات سلطنتوں کے اُن چالاک مدبرین کو دے دیئے گئے ہیں جو مطلب براری میں ہر جائز و ناجائز وسیلہ کو استعمال کرنے کے عادی ہیں پھر اس میں تاویل و تعبیر کی اتنی گنجائش، اختلاف رائے کے لئے اتنی لچک اور واجبات سے بری الذمہ ہونے کے لئے اتنی کشادگی رکھی گئی ہے کہ ہر سلطنت اپنی اغراض کے مطابق جب چاہے اسے توڑ دے، اور وہ پھر بھی قائم کا قائم رہے۔ گویا خود قانون ہی نے اپنے اندر قانون شکنی کے لئے بھی کافی وسعت مہیا کر رکھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اوہن البیوت آج صرف اس لئے قائم ہے کہ سلطنتیں خود اپنی ضروریات کے لئے اس کو قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ ورنہ اگر آج وہ اپنی مختلف و متضاد سیاسی اغراض کے لئے اس کی وسعتوں اور کشادگیوں سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیں تو بین الملی قانون کا فلک بوس قصر آن کی آن میں پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ جائے۔

بین الملّی قانون کا شعبۂ جنگ

لیکن اس قانون کا جو حصّہ قانونِ جنگ سے موسوم کیا جاتا ہے اس کی بنیاد قانونِ صلح سے بھی کمزور ہے۔ مغرب کا قانونِ جنگ حقیقتہً کسی اخلاقی بنیاد پر قائم نہیں ہے بلکہ صرف اس بنیاد پر قائم ہے کہ سلطنتیں خود اپنے آدمیوں کو وحشیانہ اعمال کی زد سے بچانے اور خوفناک تکلیفوں سے محفوظ رکھنے کی خواہش مند ہیں۔ اسی غرض کے لئے انہوں نے باہم مل کر یہ طے کر لیا ہے کہ جب کبھی ہم ایک دوسرے سے لڑیں گے تو فلاں فلاں قواعد کی پیروی کریں گے۔ مثال کے طور پر ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس میں انہوں نے ایک معاہدہ مرتب کیا جس میں اسیرانِ جنگ کے لئے بے شمار رعایات اور آسائشیں مقرر کی گئی تھیں۔ ان وسیع رعایتوں پر سلطنتوں کے متفق ہو جانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتی تھیں جو ان سے جنگ کرنے کے لئے آئیں، بلکہ اس کی اصلی وجہ صرف یہ تھی کہ ہر سلطنت خود اپنے سپاہیوں کے لئے اس بات کی خواہش مند تھی کہ جب وہ دشمن کے ہاتھ گرفتار ہوں تو ان کو جذبۂ انتقام کی تسکین کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اگر آج کوئی سلطنت اس معاہدہ کو توڑ دے اور اسیرانِ جنگ کے ساتھ وہی سلوک کرنے لگے جو چھٹی صدی میں روم و ایران کی سلطنتیں کرتی تھیں، تو شاید کوئی مہذب سے مہذب سلطنت بھی اس کے جواب میں معاہدات کو بالائے طاق رکھ کر اسی وحشیانہ طریقہ کی پیروی میں تامل نہ کرے گی۔[1] یہی حال ان قوانین کا بھی ہے جو ہوائی جہازوں کی گولہ باری، پھٹنے والی گولیوں اور زہریلی گیسوں کے استعمال، جنگی ہسپتالوں اور تیمارداروں کے احترام، اور ایسے ہی دوسرے جنگی معاملات کے متعلق ہیں۔ ان کے بارے میں جتنے معاہدات ہیں، ان سب کی علّت بھی یہی ہے کہ ہر سلطنت خود اپنی فوجوں اور شہری آبادیوں کو تباہی و ہلاکت سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے، ورنہ کسی فریق کی جانب سے خلاف ورزی ہونے کی صورت میں کوئی سلطنت بھی ان قوانین کی پابندی پر آمادہ نہیں ہے۔

جنگی قوانین کی معنوی صورت

پس یہ قواعد و ضوابط جن کو جنگ کے "مہذب قوانین" کہا جاتا ہے، در اصل

---

[1] دوسری جنگِ عظیم میں فی الواقع یہی صورت پیش آئی ہے۔ جذبۂ انتقام کے اندھے جوش میں جو جو کچھ ایک فریق نے دوسرے فریق کے اسیرانِ جنگ کے ساتھ کیا وہی دوسرا فریق اُس کے اسیرانِ جنگ سے کرتا گیا، یہاں تک کہ وہ تمام مہذب قوانینِ جنگ توڑ کر رکھ دیئے گئے جو اسیرانِ جنگ کے معاملہ میں پہلے طے ہو چکے تھے۔

قوانین نہیں ہیں بلکہ معاہدے ہیں۔ وہ صرف اس وقت نافذ ہو سکتے ہیں جب تمام معاہد قومیں ان کو تسلیم کر لیں، اور ہر سلطنت صرف اسی وقت تک ان کی پابند رہ سکتی ہے جب تک دوسری سلطنتیں بھی ان کی پابند رہیں۔ جوں ہی کسی بڑی سلطنت یا چند سلطنتوں کے کسی مجموعہ نے ان کی خلاف ورزی کی اور ایسی تمام دنیا کی مہذب سلطنتیں ان کی پابندی سے بری الذمہ ہو گئیں۔ ایسے قواعد کسی طرح قوانین سے موسوم نہیں کئے جا سکتے۔ قانون کی تعریف یہ ہے کہ ہر فرد فی حد ذاتہ اس کی پابندی پر مجبور ہو، بلا لحاظ اس کے کہ دوسرے افراد اس کی پابندی کریں یا نہ کریں۔ جس قانون میں ایک فرد کی پابندی دوسرے افراد کی پابندی پر موقوف ہو وہ درحقیقت قانون نہیں، معاہدہ ہے، اور معاہدہ خواہ کیسے ہی عمدہ قواعد و ضوابط پر مشتمل ہو کسی تحسین و ستائش کا مستحق نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے قواعد و ضوابط معاہدین کی خود غرضی پر مبنی ہوتے ہیں نہ کہ اخلاقی فرائض کے احساس پر۔

یہ صرف ہمارا ہی خیال نہیں ہے، خود یورپ کے بڑے بڑے اہل سیاست اور علمائے قانون بھی یہی کہتے ہیں۔ مسٹر ایمس بارکلے (Barclay) اپنے ایک مضمون کے آخر میں لکھتا ہے:-

"جنگ کے عمل کو منضبط کرنے کے لئے جو ضوابط بنائے گئے ہیں ان پر بہت زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ جنگی ضروریات، جوش، اور ہیجان جذبات، جو ہمیشہ حالت جنگ میں برسرکار آجاتے ہیں، ان بہتر سے بہتر قواعد کو بھی توڑ ڈالتے ہیں جنہیں ڈپلومیسی اپنی انتہائی ذہانت کے ساتھ وضع کر سکتی ہے۔ تاہم یہ قواعد اس رائے عام کی حالت کو ظاہر کرتے ہیں جو مہذب قوموں میں وحشیانہ اعمال کے ارتکاب کی روک تھام کرتی ہے۔"[1]

جنگ عظیم سے کچھ عرصہ قبل جرمنی کے محکمہ جنگ کی جانب سے ایک کتاب شائع کی گئی تھی جس کا نام "بری جنگ کے لئے ہدایت نامہ" (Kriegs Brauch im Land Kriege) تھا۔ اس کے ابتدائی فقرات یہ ہیں:-

"قانون جنگ کوئی ایسا واجب العمل دستور نہیں ہے جسے بین الملی قانون نے پیدا کیا ہو

[1] Encyclopaedia Brittannica, Art. War

بلکہ وہ محض ایک مراعاتِ باہمی کا سمجھوتہ اور مطلق آزادیٔ عمل کی ایک تحدید ہے جسے رواج اور مفاہمت، نیک طبعی اور ریاکاری نے مل جل کر پیدا کیا ہے، مگر جس کی پابندی کے لئے کوئی مجبور کن قوت بجز ایک قطعی خوفِ انتقام کے نہیں ہے۔"

یہ "خوفِ انتقام" درحقیقت یورپ کے قوانینِ جنگ کا پشتیبان ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم میں جب سلطنتوں کے جوشِ انتقام نے اس خوفِ انتقام کو دلوں سے دور کر دیا، اور بعض طاقتوں نے جوابی کارروائی کے خطرے سے بے پروا ہو کر ہیگ اور جنیوا کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی شروع کر دی تو دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ "تمام سلطنتیں جنہیں "مہذب قوانینِ جنگ" کے احترام کا دعویٰ تھا، دفعۃً قانون کی پابندی سے آزاد ہو گئیں۔ ہر گناہ جو ایک فریق نے کیا اس کے مخالف فریق کے لئے ثواب بن گیا۔ ہر قانون شکنی جو ایک سلطنت نے کی اس کی تقلید دوسری سلطنت کے لئے جائز ہو گئی۔ تمام یورپ نے مل کر ان قوانینِ جنگ کی دھجیاں اڑا دیں جنہیں خود یورپ ہی نے سات برس پہلے ہیگ اور جنیوا میں وضع کیا تھا۔ اگر یہ قوانین کسی حقیقی اخلاقی احساس پر مبنی ہوتے تو کیا اسی طرح ان کے چیتھڑے بکھیرے جاتے؟ جنگی ضروریات کا غالب تر قانون اس کے بعد ان قوانین میں جو کچھ جان باقی رہ جاتی ہے اس کو جنگی ضروریات کا غالب تر قانون اور بھی مضمحل کر دیتا ہے۔ میدانِ جنگ کی وقتی ضروریات ہمیشہ ان قوانین سے ٹکراتی رہتی ہیں اور ان کے مقابلہ میں کتابوں کے لکھے ہوئے اور صلح کانفرنسوں کے بنائے ہوئے قوانین کو ہمیشہ شکست نصیب ہوتی رہتی ہے۔ پروفیسر شولڈ لکھتا ہے:۔

"قانونِ جنگ کے ضوابط میں قانون بین الملل کے دوسرے شعبوں کی بہ نسبت "تناقض و اختلاف بہت زیادہ واقع ہوتا ہے، کیونکہ جنگی قوانین اور جنگی ضروریات میں بآسانی تصادم ہو جایا کرتا ہے۔ اسی بنا پر قانونِ جنگ کو بین الملی قوانین میں شامل رکھنے کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ جو بے ثباتی و ناپائداری قانونِ جنگ کو حاصل ہے وہی عام بین الملی قوانین کو بھی حاصل ہو جائے گی۔"

ل Kriegs Brauch P. 2

ك Development of International Law After the World War. P. 9

ایک دوسرے موقع پر یہی مصنف لکھتا ہے:-

"عمومی حیثیت سے جنگ کا چلن ہمیشہ اور ہر موقع پر صرف ضروریات جنگ ہی کے تابع رہے گا نہ کہ کسی اور چیز کے تابع۔ اس خود امدادی کی حالت میں جو قانونی ضابطے وضع کیئے جائیں ان کی تدوین میں کامل اعتدال اور خاص خاص حدود کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ اگر ان حدود کو ملحوظ نہ رکھا گیا تو قرین قیاس یہ ہے کہ قانونی قیود کلیۃً توڑ دی جائیں گی۔ اس خیال کی صداقت کو جنگ عظیم نے اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ لہٰذا آئندہ جو قوانین جنگ وضع کیئے جائیں ان میں اس کو ہمیشہ مدنظر رکھنا ضروری ہوگا"[1]

نمائش اور حقیقت کا فرق جس وقت ہیگ کانفرنس میں قوانین جنگ وضع کیئے جا رہے تھے، یورپ کے اہل سیاست پر نمائشی تہذیب کا اس قدر غلبہ تھا کہ انہوں نے اپنی قوموں کے حقیقی جنگی رجحانات و میلانات اور ان کی جنگی عادات کو نظر انداز کر کے اس قسم کے قوانین بنا لیئے جو دیکھنے میں تو نہایت مہذب، نہایت شاندار اور حد درجہ انسانیت پرور تھے، مگر فی الواقع ان کے فوجی گروہ ان کی پابندی کرنے کے لیئے ہرگز راضی نہ تھے۔ جرمنی کے فوجی نمائندے مارشل بی برسٹائن نے کانفرنس کی ابتدا ہی میں یہ تنبیہ کر دی تھی کہ:-

"جو بین الملی قانون ہم بنانا چاہتے ہیں اسے صرف انہیں دفعات پر مشتمل ہونا چاہیئے جن کی تعمیل جنگی نقطۂ نظر سے مخصوص احوال میں بھی ممکن ہو"

لیکن اس وقت اس تنبیہ کی پروا نہیں کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہیگ کانفرنس کے چار سال بعد پہلی مرتبہ جب طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں میں ان قوانین کی عملی تنفیذ کا موقع آیا تو ان کی علانیہ خلاف ورزی کی گئی، اور اس کے سال بھر بعد جنگ عظیم کے سیلاب نے تو یکلخت تمام بند توڑ کر رکھ دیئے۔ یہ حال دیکھ کر یورپ کے اہل سیاست اور علمائے قانون کو عقل آئی اور انہوں نے تسلیم کرنا شروع کیا کہ جنگ کو خیالی قوانین اور نمائشی ضوابط سے محدود کرنے کی کوشش قطعاً بے سود ہے۔ اس کے بعد سے

[1] Nippold, P. 112

ان لوگوں نے جس قسم کے خیالات ظاہر کرنے شروع کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اب علمائے قانون کا میلان کس طرف ہے۔ ایک جرمن عالم میکس ہوبر لکھتا ہے:-

"مستقبل میں بین الملّی قانون کے فن کا یہ غرض ہونا چاہئے کہ وہ تمام خیالی اور مبہم قوانین سے میدان کو صاف کر کے یقینی حدود قائم کرے۔ بین الملّی قانون کی فوری اور وسیع ترقی کی خواہش اور امید سے مغلوب ہو کر ایسا نہ ہو کہ وہ "ناتمامی" اور "غیر یقینیت" سے مطمئن ہو جائے۔ اس کو سختی کے ساتھ اُن تمام ظاہر فریبیوں کو مٹا دینا چاہئے جنہیں ڈپلومیسی نے محض رائے عام کی تسکین خاطر کے لئے بین الملّی قانون کی ترقی کا بے معنی طلسم بنا کر کھڑا کر دیا تھا"[ل]

پروفیسر نیولڈ تو اس ناکامی سے یہاں تک متاثر ہوا ہے کہ قانون جنگ کو بین الملّی قانون کی حدود سے کلیۃً خارج کر دینے کا مشورہ دیتا ہے۔ بلکہ اسے تو یہ بھی تسلیم کرنے سے انکار ہے کہ جنگ فی الواقع قانون سے کوئی تعلق رکھتی ہے، یا اس کو کسی قانون سے محدود و مقید کرنا درست ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"بین الملّی قانون مسئلہ جنگ سے تعرض کرنے میں اب تک اپنی اصلی حد سے بہت تجاوز کرتا رہا ہے۔ جنگ کو قانونی حیثیت سے تعبیر کرنے کی کوشش میں اسے یہ نظریہ قائم کرنا پڑا کہ جنگ ایک قانونی ادارہ ہے، اور اس نظری بحث میں وہ اکثر اوقات حقائق کی حدود سے بہت دور نکل گیا۔ ان نظریئین نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ قانون کبھی جنگ پر حاوی نہیں ہو سکتا، اور نہ تمام حیثیات سے اس کو ضبط میں لا سکتا ہے۔ اس کی سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ جنگ فی نفسہ قانون کی نقیض ہے۔ لڑائی میں قانونی ملحوظات نہیں بلکہ جنگی ضروریات انسان کے لئے محرک عمل ہوا کرتی ہیں، اور یہ ایک واقعہ ہے کہ جنگ کوئی قانونی ادارہ نہیں ہے بلکہ قوت سے کام نکالنے کی کوشش ہے۔ وہ ایک کشمکش ہے جس میں قوت کا استعمال ہے، اور اس حیثیت سے کہ وہ بجبر اپنا دعویٰ منوانے کے لئے لڑی جاتی

ل Development of International Law After P. 113

ہے جو نامداری کا فعل ہے۔ فنِ حرب میں جنگ کی یہی تعریف کی گئی ہے، اور اسی تعریف پر بین الملی قانون کو بھی قناعت کرنی چاہئے۔ اس تعریف سے اگر قطع نظر کر بھی لیا جائے تو اب یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ جنگ بحیثیتِ مجموعی قانون کی حدود سے خارج ہے۔ اگرچہ اس کو مختلف صورتوں سے ضابطہ میں لانے کی کوششیں کی گئیں، اور ایک جدید قانونِ جنگ مدون بھی کر لیا گیا، مگر اصل واقعہ جوں کا توں رہا۔"[1]

ایک اور ماہرِ قانون ہورو تس (Hurwitz) لکھتا ہے:-

"قانون طبیعتِ جنگ سے اس قدر بے لگاؤ ہے کہ جو بین الملی قانون جنگ حالتِ جنگ میں سلطنتوں کے تعلقات کو منضبط کرتا ہے اس کی نوعیت محض بے ضابطہ (Anarchical) ہے۔ بین الملی قانونِ جنگ اپنی عین فطرت کے لحاظ سے صرف ایک قرار دادِ باہمی کی کوشش ہے اور رہے گا۔"[2]

اسی رائے سے میکس ہوبر نے بھی اتفاق کیا ہے، وہ کہتا ہے:-

"جنگِ عظیم سے پہلے تو اس خیال نے جڑ پکڑنی شروع کر دی تھی کہ جنگ عہدِ وحشت کے باقیات میں سے ہے، اور قوانینِ جنگ کی غیر معمولی ترقی ایک قسم کی ذہنیت بندی اور شعبدہ گری سے زیادہ نہیں ہے، کیونکہ وہ ہم کو حقیقتِ جنگ کے بارے میں دھوکہ دیتی ہے، اور سیاست کو اس بنیادی مسئلہ سے غافل کر دیتی ہے کہ ہمیں یا تو پُرامن قانونی حالت قائم رکھنی چاہئے یا جبر و زور کی غیر قانونی حالت میں مبتلا ہو جانا چاہئے۔"[3]

ایک دوسرے موقع پر یہی مصنف لکھتا ہے:-

"جنگ کو ایک قانونی ادارہ سمجھ کر اس کی کارروائیوں کو ایک عدالت کے مقدمہ کی

---

[1] Nippold, P. 7

[2] Nippold P. 8

[3] Nippold P. 8

طرح عقد البحر میں داخلہ کا تخیل بین الملی قانون کی خطا ہے جو رحم اور تمدن رسمی کے تخیلات میں سے ہے۔"

یہ ان لوگوں کے اقوال ہیں جو یورپ میں بین الملی قانون کے مسلّم ماہر ہیں۔ ان کو اپنے مایۂ ناز قوانین جنگ کی کمزوری و بے بیچ میرزی کا اعتراف کرتے ہوئے یقیناً اذیت ہوتی ہوگی، مگر جب مغربیا کی پہلی بین الملی جنگ ہی نے یہ ثابت کر دیا کہ انہی محنتوں سے انہوں نے قانون جنگ کا جو عالیشان قصر تعمیر کیا ہے وہ مکڑی کے جالے اور پانی کے بلبلے سے بھی زیادہ ناپائدار ہے تو انہیں خوف پیدا ہو گیا کہ کہیں بین الملی قانون بھی اس شیشۂ جنگ کی ناپائداری پر سے بین الملی قانون ہی کا اعتبار نہ کھو دے۔ اس لئے انہوں نے صاف صاف اعتراف کر لیا کہ جنگ کو کسی ضابطہ اور قانون کے تحت لانا سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔ جنگ اور قانون میں ایک فطری تناقض ہے، جنگ قانون کی عین طبیعت کے خلاف ہے، اور جنگ کا اصلی قانون وہ نہیں ہے جو ہیگ اور جنیوا میں مرتب کیا گیا ہے، بلکہ وہ ہے جسے میدان جنگ میں توپیں اور سنگینیں مدوّن کرتی ہیں۔

یہ ہے اس قانون جنگ کی حقیقت جسے بیسویں صدی کا مہذب قانون کہا جاتا ہے۔

فوجی اور قانونی گروہوں کا اختلاف | اس نمائش اور حقیقت کے اختلاف کی اصلی وجہ یہ ہے کہ یورپ میں ابتدا سے دو مختلف خیال کے گروہ رہے ہیں۔ ایک گروہ فلاسفۂ اخلاق اور علمائے قانون اور سیاسی مدبرین کا ہے جو زیادہ تر نمائش و تصنع کی خاطر، اور کچھ لطیف احساسات سے مغلوب ہو کر، جنگ کو اخلاقی حدود کا پابند بنانے اور اسے محض ایک مہذب مقابلہ کی صورت میں ڈھال دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور دوسرا گروہ فوجی ہے جس کے نزدیک جنگ ایک خود امدادی (Self help) کا فعل ہے، اور اس کو انسان تمام قانونی تدابیر میں ناکام ہو کر اختیار ہی اس لئے کرتا ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے دشمن کو مغلوب کر کے اپنا مقصد حاصل کرے۔ ان دونوں کے نقطۂ نظر میں اصولی تباین ہے۔ ایک گروہ صرف حصول مقصد کو اصل کار سمجھتا ہے، دوسرا تہذیب و اخلاق کو غالب رکھنے کا خواہشمند ہے۔ ایک گروہ کی رائے میں

قانون کو توڑ کر قانون ہی کی پابندی کرنا بے معنی ہے، دوسرے گروہ کے نزدیک قانون کی پابندی تہذیب کی خصوصیات سے ہے اس لئے مہذب انسانوں کو قانون شکنی بھی ایک قسم کی پابندئ قانون کے ساتھ کرنی چاہئے۔ لیکن یہ اصولی اختلاف صرف فکر و خیال ہی کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ دونوں کے دائرِ عمل بھی مختلف ہیں۔ قانونی و سیاسی گروہ کو بین المللی کانفرنسوں اور بین الدولی مجلسوں پر اقتدار حاصل ہے اس لئے وہ اپنے اثرات سے کام لیکر صفحۂ کاغذ پر جنگ کو ایک خوشنما شکنجہ میں خوب جکڑ دیتا ہے۔ مگر عرصۂ جنگ میں اس شکنجہ کی بندش کو قائم رکھنا اس کے بس کا کام نہیں ہے۔ فوجوں کی قیادت و رہنمائی، جنگی محکموں کی تنظیم و ترتیب، قوئ حربیہ کی ہدایت و نگرانی، اور حالتِ جنگ کی سربراہی کلیتہً فوجی گروہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے جب جنگ کا موقع آتا ہے تو وہ اس خوشنما شکنجہ کا ایک ایک تار الگ کر کے رکھ دیتا ہے، اور قانونی گروہ کے علی الرغم، عمل کی دنیا میں وہ سب کچھ کرتا ہے جو ہیگ کے قانون میں ناجائز، مگر ضروریاتِ جنگ کے قانون میں جائز ہے۔

ظاہر ہے کہ اصل اعتبار قول کا نہیں بلکہ عمل کا ہے۔ کہنے والا کچھ کہا کرے ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ کرنے والا کیا کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک مغرب کا اصلی قانونِ جنگ وہ نہیں ہے جو کاغذوں میں لکھا ہوا ہے، بلکہ وہ ہے جس پر اہلِ مغرب حالتِ جنگ میں عمل کرتے ہیں۔ اس لئے ہم اعتبار کے قابل قانونی گروہ کو نہیں بلکہ فوجی گروہ کو سمجھتے ہیں جو دراصل واحد با اختیار گروہ ہے۔ قوانینِ جنگ کے متعلق اس گروہ کے جو کچھ خیالات ہیں ان کے مطالعہ سے اہلِ مغرب کا اصلی میلانِ طبع معلوم ہوتا ہے، اور وہی درحقیقت معلوم کرنے کے قابل ہے۔

یورپ کا مشہور ماہرِ حربیات کلاؤس وِٹس (Clausewitz) اپنی کتاب (Vom Kriege) میں لکھتا ہے:-

قوانینِ جنگ محض خود عائد کردہ قیود ہیں، تقریباً ناقابلِ ادراک، اور مشکل سے قابلِ ذکر، جنہیں اصطلاح میں "مروجاتِ جنگ" کہا جاتا ہے۔ اب محبانِ انسانیت کے لئے اپنے خیال میں یہ سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ دشمن کو کسی بڑی خونریزی کے بغیر نہتا اور مغلوب

کر لینے کا ایک دانشمندانہ طریقہ موجود ہے اور یہی فن حرب کا مناسب مقصد ہے لیکن یہ خیال خواہ کتنا ہی دل خوش کن معلوم ہو، حقیقتہً بالکل غلط ہے اور اس کو جتنی جلدی دور کر دیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ ایسی ایک خوفناک چیز میں جیسی کہ جنگ ہے، رحم و کرم کی روح کو داخل کرنے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ اور بھی زیادہ بری ہیں۔۔۔۔۔۔۔ خود جنگ کے فلسفہ ہی میں نرمی و اعتدال کے اصول کو داخل کرنا ایک غلطی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جنگ دراصل ایک جبر اور زبردستی کا عمل ہے جس کا ارتکاب کسی قسم کے حدود و قیود کی پابندی قبول نہیں کر سکتا۔[1]"

جرمنی کی کتاب جنگ جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، ایک موقع پر ضروریات جنگ کے قانون کو اس طرح بیان کرتی ہے:-

"فوجی سپاہی کو تاریخ پر نظر ڈالنی چاہئے۔ وہ دیکھے گا کہ ایک قسم کی سختیاں بہرحال جنگ میں ناگزیر ہیں، اور بسا اوقات سچی انسانیت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ان کو بے دھڑک استعمال کیا جائے۔[2]"

اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر ہیگ کے مہذب قوانین جنگ اور ایسے ہی دوسرے سمجھوتوں کو "لطیف و رقیق جذبات کی ایک ایسی لہر" قرار دیا گیا ہے جو "خود جنگ کی فطرت اور مقاصد سے بنیادی تناقض رکھتی ہے۔"

امیر البحر آوبے (Amiral Aube) اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:-

"جنگ کی تعریف ہم اس طرح کرتے ہیں کہ وہ حق کا اپیل ہے اُس قوت کے خلاف جو اس حق سے انکار کرتی ہو۔ اس سے قدرتی طور پر یہ لازم آتا ہے کہ جنگ کا غالب مقصد یہ ہے کہ دشمن کو ہر ممکن طریقہ سے نقصان پہنچایا جائے، اور چونکہ ایک قوم کے وسائل ثروت

---

[1] Vom Kriege 1, Kap. 1

[2] Kriegsbrauch, P. 3

دراصل جنگ کے اعصاب ہیں، اس لئے ہر وہ چیز جو دشمن قوم کی ثروت پر، اور سب سے زیادہ اس کے وسائل ثروت پر ضرب لگاتی ہو اس کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے قطع نظر اس سے کہ دنیا اس کو کس نظر سے دیکھتی ہو۔"[۱]

ان اقوال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کے اخلاقیین و سیاسیین نے دنیا میں اپنی تہذیب کی نمائش کرنے کے لئے جو دلکش اور انسانیت پرور قوانین جنگ وضع کئے ہیں ان کی عملی تنفیذ کا انحصار جس گروہ کی مرضی اور پسند پر ہے وہ ان قوانین کو کس قدر لغو اور مہمل سمجھتا ہے، اور ضروریات جنگ کے مقابلہ میں ان کی پابندی سے کس قدر نفور ہے۔ ابتداءً قانونی گروہ اس کے خلاف اپنے دعوائے تہذیب و انسانیت کی تائید میں جدوجہد کرتا رہا، مگر جب جنگ عظیم میں فوجی گروہ نے اپنی قدرت و طاقت کو عملاً ثابت کر دیا تو آخر اس تخیل پرست گروہ کو تلخ حقائق کے آگے سپر ڈال دینی پڑی، اور اس نے بھی جنگ کے اسی نظریہ کو قبول کر لیا جسے عملی طاقت کے ساتھ فوجی گروہ نے پیش کیا تھا۔ پروفیسر ہولنڈ اور میکس ہوبر وغیرہ علمائے قانون کی زبان سے آپ اس اعتراف شکست کو سن چکے ہیں۔ آگے چل کر آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ان مادی حقائق کے زور سے دب کر جزئیات قانون میں کس کس طرح ترمیمیں کی گئیں۔

۳۔ مغربی قوانین جنگ کی اصلی حیثیت

جہاں تک اصول کا تعلق تھا ہم نے تہذیب مغربی کے بین المللی قانون اور اس کے شعبہ جنگ کی حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ یہ قانون کیا چیز ہے؟ بحیثیت ایک قانون کے اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ معنوی حیثیت سے وہ کیا وزن رکھتا ہے؟ پھر خود اس کی اپنی نظر میں اس کے شعبہ جنگ کا کیا مرتبہ ہے؟ اس میں جنگ کو اخلاقی حدود کا پابند بنانے کی قوت کہاں تک موجود ہے؟ عملی و نظری حیثیات سے جنگ کو قیود و نظام کے تحت لانے میں وہ کس حد تک کارگر ہو سکتا ہے؟ ان سوالات کو اوپر کی مختصر بحث نے ایک حد تک صاف کر دیا ہے اور اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ جس چیز کو مغرب کا قانون جنگ کہا

---

[۱] Revue des Deux mondes (1882) P. 314

جاسکتا ہے وہ دراصل کوئی قانون ہی نہیں ہے۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ نام نہاد قانون جیسا کچھ بھی ہے جنگ کی تہذیب و تنظیم میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ اس نے جو حدود و ضوابط مقرر کئے ہیں وہ اسلامی قانون کے مقرر کردہ حدود کے مقابلہ میں کیسے ہیں؟ ان کے نمائشی اور اصلی قواعد میں کیا فرق ہے؟ مسئلہ جنگ کے سلسلہ میں انسانی افکار کی جو ترقی اس نے ظاہر کی ہے وہ اسلامی قانون کے مقابلہ میں کتنی ہے؟ اور اس نے فی الواقع انسانیت کی کتنی خدمت انجام دی ہے؟

قوانین جنگ کی تاریخ

سترھویں صدی کی ابتدا تک یورپ قوانین جنگ کے تصور تک سے خالی الذہن تھا۔ اصولاً اور عملاً جنگ کو اخلاقی حدود اور قواعد و ضوابط کی پابندیوں سے مستثنیٰ سمجھا جاتا تھا اور محاربین کو ایک دوسرے کی ضرر رسانی کا مطلق اور غیر محدود حق حاصل تھا۔ اس زمانہ کی لڑائیوں کے جو حالات تاریخوں میں محفوظ ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قومیں آپس میں لڑتی تھیں تو اپنے دشمن کو نقصان پہنچانے کے لئے کسی بڑے سے بڑے ظلم اور ہولناک سے ہولناک جرم سے بھی دریغ نہ کرتی تھیں۔ صرف عملاً ہی نہیں بلکہ اعتقاداً بھی ان کے اندر اہل قتال و غیر اہل قتال کے امتیاز کا کوئی احساس موجود نہ تھا۔ گروشیس جیسے اخلاق پرور مقنن کی بھی یہ رائے تھی کہ

> "قانون میں ان تمام لوگوں کو قتل کر دینا جائز ہے جو دشمن کے حدود میں پائے جائیں۔ اس میں عورتوں اور بچوں کا کوئی استثناء نہیں ہے۔ اور وہ اجنبی باشندے بھی مستثنیٰ نہیں ہیں جو ایک معقول مدت کے اندر دشمن کے علاقہ کو نہ چھوڑ دیں۔"[1]

یہ غیر محدود حق ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء کی جنگ سی سالہ میں اتنی آزادی کے ساتھ استعمال کیا گیا تھا کہ تمام یورپ تھرا اٹھا اور اس کے دردناک وقائع نے یورپ کے ارباب فکر میں عام طور پر یہ خواہش پیدا کر دی کہ جنگ کے اعمال پر کسی قسم کے اخلاقی حدود و ضوابط قائم ہونے چاہئیں۔ اس خواہش نے سب سے پہلے ہالینڈ کے مقنن گروشیس کے ذہن میں راستہ پیدا کیا اور اس نے قانون کی وہ مشہور تاریخی کتاب

---

[1] Lawrence, Principles of International Law, P. 330

لکھوائی جو بین المللی قانون کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب De Jure Belli ac Pacis
۱۶۲۵ء میں شائع ہوئی اور اس کو ہائیڈلبرگ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کیا گیا۔ اس سے یورپ کے اہل علم میں ایک عام ذہنی حرکت پیدا ہوگئی اور مصنفین و مؤلفین نے اس نئی راہ میں مغربی افکار کو ترقی دینی شروع کی۔ گروٹیوس کے تقریباً نصف صدی بعد اس کے شاگرد پوفنڈارف Puffendorff نے اپنی کتاب De Jure Naturae et Gentium شائع کی، اور اس کے بعد کتابوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جس نے اٹھارویں صدی تک پہنچ کر بین المللی قانون کے ایک پورے نظام کی شکل اختیار کرلی۔ ۱۷۸۰ء میں انگلستان کے مشہور مقنن جرمی بنتھم Jeremy Benthem نے اس فن کا نام "بین المللی قانون" رکھا جس سے آج وہ دنیا میں مشہور ہے۔

عملی حیثیت سے یورپ کی جنگ پران ترقی یافتہ افکار کا پہلا اثر وسٹفالیا Westphalia کی کانگریس میں رونما ہوا جبکہ یورپ کے مدبرین نے جنگِ سی سالہ کے خاتمہ پر ۱۶۴۸ء میں گروٹیوس کی اس سفارش کو قبول کرلیا کہ

"جنگ میں بطور ایک شریفانہ رعایت کے نہ کہ بطور ایک قانون کے بچوں، بوڑھوں، عورتوں، پادریوں، کاشتکاروں، تاجروں اور اسیرانِ جنگ کو قتل و غارت سے محفوظ رکھنا چاہیئے"[1]

یہ روشنی کی پہلی کرن تھی جو مسیح کی پیدائش کے ۱۶۴۸ برس بعد یورپ کے تاریک مطلع پر نمودار ہوئی۔ اس کے بعد لڑائیوں میں وحشیانہ حرکات کے ارتکاب کا وہ زور نہیں رہا جو جنگِ سی سالہ میں دیکھا گیا تھا، لیکن جہاں تک فوجوں کے جنگی اخلاق کی عملی تحسین اور اعمالِ جنگ کی حقیقی اصلاح کا تعلق ہے، دو سو برس تک یورپ نے اس راہ میں کوئی ترقی نہیں کی، حتیٰ کہ انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کی جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) کے نام نہاد "غدر" کے موقع پر انگریزی فوجوں نے وہ ہولناک مظالم کیے جن کے تصور

[1] Bernard, Paper on Grwoth of the Laws of War (Oxford Essays 1856,) PP. 100-4

سے بھی انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے انیسویں صدی کے وسط تک یورپ میں قوانین جنگ کا کوئی ایسا ضابطہ موجود نہ تھا جس کو سلطنتوں نے منظور کیا ہو، یا جس کو یورپین فوجوں میں جنگی قانون کی حیثیت سے رائج کیا گیا ہو۔ مغربی قوموں میں سب سے پہلے امریکہ نے اس راہ میں اقدام کیا اور ۱۸۶۳ء میں اپنی فوجوں کے لئے ایک ہدایت نامہ Manual of Instructions مرتب کیا جس کا مقصد جنگ کے زمانہ میں فوجوں کے طریق عمل کو منضبط کرنا تھا۔ اس کے بعد سب سے پہلے فرانس، روس، اور انگلستان نے بھی اپنی فوجوں کو اسی قسم کی ہدایات دینے کا سلسلہ شروع کیا اور رفتہ رفتہ یورپ کی تمام قوموں نے وہی طریقہ اختیار کر لیا جو ان سے تقریباً ۱۲ سو برس پہلے عرب کے ۱ وحشی ملک میں ایک اُمّی پیغمبر اور اس کے اُمّی خلفا نے رائج کیا تھا۔

اس کے ایک سال بعد ۱۸۶۴ء میں سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے بمقام جنوا ایک بین الملی اجتماع منعقد کیا جس میں پہلی مرتبہ بیماروں، زخمیوں، اور معالجوں کے متعلق قوانین مرتب کئے گئے، اور ۱۸۶۸ء میں ایک دوسری کانفرنس نے ان کے اندر توضیحات و تشریحات کے ساتھ بہت کچھ اضافہ کیا۔ لیکن قوانین جنگ کے اس شعبہ میں یورپ اس وقت تک ایک مکمل ضابطۂ قانون کا محتاج رہا جب تک کہ ۱۹۰۶ء میں جنوا کی تیسری بین الملی کانفرنس نے اس ضرورت کو پورا نہ کیا۔[1]

تباہ کن آلات و اسلحہ کے استعمال کے بارے میں یورپ ۱۸۶۸ء تک تاریکی میں رہا۔ اس سال پہلی مرتبہ سینٹ پیٹرس برگ میں ایک بین الملی فوجی کمیشن مقرر کیا گیا جس نے دولِ مغرب سے سفارش کی کہ پھٹنے والے گولے Explosive projectiles (جن کا وزن چار سو گرام سے کم ہو) اور پھٹنے والی گولیاں جو جسم میں پھیل جاتی ہیں، اور زہریلی گیسیں، جنگ میں استعمال نہ کی جائیں۔ اس سفارش کے مطابق ۲۹ نومبر ۱۸۶۸ء کو دولِ مغرب نے (باستثنائے اسپین و امریکہ) ایک اقرارنامہ پر دستخط کر دیئے۔

اس کے بعد زارِ روس الگزنڈر دوم کی تحریک پر ۱۸۷۴ء میں برسلز کانفرنس ہوئی اور اس میں پہلی

[1] Birkenhead, International Law P. 207

مرتبہ بری جنگ کے قوانین مرتب کئے گئے لیکن کسی سلطنت نے ان کی توثیق نہیں کی بلکہ جرمنی اور انگلستان نے تو ان کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

بروسلز کی تجاویز ۲۵ برس تک بیکار پڑی رہیں تا آنکہ ۱۸۹۹ء میں زار نکولس ثانی کی تحریک پر پہلی مرتبہ ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی اس میں دنیا کی ۲۶ سلطنتوں نے حصہ لیا اور جنگ کے مختلف شعبوں کے متعلق حسب ذیل سمجھوتے اور اقرار نامے مرتب کئے گئے:۔

(۱) بین الملی نزاعات کے مسالمانہ تصفیہ کی تدبیر،

(۲) جنگ کے قوانین و رسوم،

(۳) بحری جنگ میں بیماروں اور زخمیوں کے متعلق اُن قوانین کی ترویج جو ۱۸۶۴ء کے جنوا کنونشن میں منظور کئے گئے تھے،

(۴) پھٹنے والے گولوں کے متعلق سینٹ پیٹرسبرگ کے اقرار نامہ کی توثیق (یہ صرف پانچ سال کے لئے تھی)،

(۵) پھٹنے والی گولیوں کے متعلق سینٹ پیٹرسبرگ کے اقرار نامہ کی توثیق،

(۶) زہریلی گیسوں کے متعلق سینٹ پیٹرسبرگ کے اقرار نامہ کی توثیق۔

یہ کانفرنس اپنے کام کو مکمل نہ کر سکی اور ۸ سال تک قوانین جنگ کی مزید تدوین کا سلسلہ رُکا رہا۔ ۱۹۰۷ء میں امریکہ کے صدر مسٹر روزویلٹ اور زار نکولس ثانی کی تحریک پر دوبارہ ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی اور اُس کی کوشش سے یورپ کو پہلی مرتبہ ایک مکمل ضابطۂ قانون میسر آیا۔ اس مرتبہ ۱۸۹۹ء کے سمجھوتوں اور اقرار ناموں میں ترمیم و اضافہ کرنے کے علاوہ حسب ذیل مزید سمجھوتے مرتب کئے گئے:۔

(۱) قرضوں کی وصولیابی میں قوت کے استعمال کی تحدید،

(۲) جنگ کی ابتدا کرنے کے لئے اعلان جنگ کا لزوم،

(۳) بری جنگ میں غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض،

(۴) حالت جنگ میں دشمن کے تجارتی جہازوں کی حیثیت۔

(۵) تجارتی جہازوں کو جنگی جہازوں میں تبدیل کرنے کے متعلق قوانین،
(۶) ٹھیس لگنے سے خود بخود پھٹنے والی بحری سرنگوں کے استعمال کے متعلق قوانین،
(۷) حالتِ جنگ میں جہازوں کی گولہ باری کے متعلق قوانین،
(۸) بحری جنگ میں جہازوں کی گرفتاری کے متعلق قوانین،
(۹) بین الملی محکمہ غنائم بحریہ کی تشکیل،
(۱۰) بحری جنگ میں غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض۔

یہ کانفرنس اگرچہ ایک نہایت وسیع ضابطہ قانون وضع کرنے میں کامیاب ہو گئی، مگر اس کا ضابطہ پھر بھی اس قابل نہ ہوا تھا کہ اس کو مکمل کہا جا سکتا، کیونکہ اس کے بعد تحت البحر کشتیوں، ہوائی جہازوں، اور زہریلی گیسوں کے استعمال کے متعلق مزید قوانین کی ضرورت پیش آئی جسے ۱۹۲۲ء میں واشنگٹن کانفرنس نے پورا کیا۔ ابھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ پیش آنے والے مسائل کے متعلق اور کتنی کانفرنسوں کی ضرورت ہو گی۔

اس مختصر تاریخ سے واضح ہو جاتا ہے کہ مغربی دنیا کو ابھی مہذب قوانین جنگ سے آشنا ہوئے ۶۰ برس سے زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے، اور اگر ہم ابتدائی زمانہ تکوین کو چھوڑ کر صرف اس عہد کو لیں جبکہ اس کے قوانین جنگ پایۂ تکمیل کو پہنچے، تو یوں کہنا چاہیئے کہ جنگ کی تہذیب سے وہ آج سے ۲۰ سال پہلے تک نا آشنا تھی۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کو دیکھو کہ وہ ساڑھے تیرہ سو برس سے اپنا ایک مکمل ضابطہ قانون رکھتا ہے اور جہاں تک اصول کا تعلق ہے، اس میں حذف و ترمیم یا اضافہ کرنے کے لئے آج تک کسی کانفرنس یا سمجھوتے یا اقرار نامے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مگر اس کے باوجود اس نے اصول بڑی حد تک وہی ہیں جن کو آج کی مغربی دنیا نے بعد از خرابیٔ بسیار اختیار کیا ہے، اور بعض اصول ایسے بھی ہیں جن تک مغربی دنیا کی اب بھی رسائی نہیں ہوئی ہے۔

ہیگ کے سمجھوتوں کی قانونی حیثیت اوپر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس کی کارروائی اُن تمام سمجھوتوں اور اقرار ناموں پر حاوی تھی جو اس سے قبل سلطنتوں کے درمیان ہوئے تھے

اس لئے جب مغرب کے قوانین جنگ پر تبصرہ کرنا ہو تو صرف دوسری ہیگ کانفرنس کے وضع اور تدقیق کیئے ہوئے معاہدات ہی پر تبصرہ کرنا کافی ہے۔

لیکن اس تبصرہ کو شروع کرنے سے قبل یہ تحقیق کرنا ضروری ہے کہ اس کانفرنس کی آئینی حیثیت کیا تھی اور اس کے سمجھوتے اور اقرار نامے بحیثیت ایک "قانون" کے کیا وقعت رکھتے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں خود ہیگ کے سمجھوتوں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور ان کی اسی تشریح پر اعتماد چاہیئے جو مغرب کے ماہرین قانون نے کی ہے۔

ان سمجھوتوں کی قانونی حیثیت متعیّن کرنے کے لئے پہلا امر تنقیح طلب یہ ہے کہ حکومتیں کس حد تک ان کی پابندی کی ذمہ دار ہیں؟ اس کے متعلق خود سمجھوتوں میں یہ تصریح کردی گئی ہے کہ حکومتیں حرف بحرف ان کی پابندی کرنے پر مجبور نہیں ہیں، بلکہ صرف اس امر کی ذمہ داری لیتی ہیں کہ اپنے قوانین جنگ میں ان کو ملحوظ رکھیں گی۔ چنانچہ چوتھے ہیگ کنونشن متعلق بہ قوانین و رسوم جنگ کی دفعہ اوّل کے الفاظ یہ ہیں:-

"متعاقد طاقتیں اپنی مسلح برّی فوجوں کے لئے ایسی ہدایات جاری کریں گی جو ان ضوابط سے مطابقت رکھتی ہوں گی جو برّی جنگ کے قوانین و رسوم کے متعلق اس سمجھوتے کے ساتھ ملحق کئے گئے ہیں"

دوسرا سوال یہ ہے کہ ان قوانین کی حدودِ عمل کیا ہیں؟ اس کا جواب ہیگ کے سمجھوتوں سے ہمیں یہ ملتا ہے کہ یہ تمام سمجھوتے اور اقرار نامے صرف اُنہی جنگوں میں نافذ ہوں گے جن کے دونوں فریق ان سمجھوتوں اور اقرار ناموں کے متعاقدین میں سے ہوں۔ اگر کوئی ایک فریق غیر متعاقد ہو یا کسی متعاقد فریق کے ساتھ کوئی غیر متعاقد بھی شریک جنگ ہو گیا ہو تو ان سمجھوتوں پر عمل درآمد نہیں کیا جائیگا۔ اسی چوتھی ہیگ کنونشن کی دفعہ دوم کے الفاظ یہ ہیں:-

"یہ قوانین صرف ان لڑائیوں میں قابلِ عمل ہوں گے جن کے فریقین اس سمجھوتے کے متعاقدین میں سے ہوں۔ اگر کوئی ایک فریق متعاقدین میں سے نہ ہو تو ان کا نفاذ نہ ہوگا"

اسی قسم کی ایک دفعہ ہر مجھوتے کے آخر میں رکھی گئی ہے جس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ تمام مہذب قوانین بطور ایک اخلاقی فرض کے اختیار نہیں کئے گئے ہیں، بلکہ محض چند سلطنتوں کے باہمی سمجھوتے ہیں جن کی بنیاد صرف یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اس شرط پر شرافت و انسانیت کا سلوک کرنے کا وعدہ کرتی ہیں کہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ یہ قوانین اپنے اندر پابند کرنے والی قوت کس حد تک رکھتے ہیں؟ اس کے متعلق ہیگ کے سمجھوتے تصریح کرتے ہیں کہ کوئی سلطنت ان کی ہمیشہ پابندی کرتے رہنے پر مجبور نہیں ہے، بلکہ ہر وقت ان کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہر سمجھوتے کے آخر میں باہمیں اس مضمون کی ایک دفعہ ملتی ہے کہ

"متعاقدین میں سے اگر کوئی سلطنت اس سمجھوتے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہے تو وہ نیدرلینڈ کی گورنمنٹ کو اس کی اطلاع دیکر ایسا کر سکتی ہے۔ نیدرلینڈ گورنمنٹ کا فرض ہوگا کہ کسی سلطنت کی جانب سے اس قسم کی اطلاع ملتے ہی تمام متعاقدین کو اسکی اطلاع دے دے۔ یہ اظہار برأت اس سلطنت کے حق میں اس وقت سے قابل تنفیذ ہوگا جبکہ نیدرلینڈ گورنمنٹ کو اطلاع پہنچنے پر ایک سال گذر چکا ہو۔"

ان دفعات کا مفہوم بالکل واضح ہے لیکن مزید توضیح کے لئے ہم مسٹر جیمز براؤن اسکاٹ کی وہ تصریحات یہاں نقل کرتے ہیں جو انہوں نے "مجموعۂ مفاہمات ہیگ" کے مقدمہ میں کی ہیں مسٹر اسکاٹ، کارنیجی کے مشہور وقف "بین الملی صلح" میں شعبۂ قانون بین الملل کے ڈائرکٹر ہیں اور امریکہ میں اس قانون کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ہیگ کانفرنس کو اکثر انسان کی پارلیمنٹ کہا جاتا ہے۔ مگر یہ کہنا غلط اور گمراہ کن ہے وہ اصطلاحی معنی میں پارلیمنٹ نہیں ہے، اور اس کے اعمال صرف ان سلطنتوں پر اثر کرتے ہیں جن کی نمائندگی اس میں ہوئی ہے" (ix)

اس وضع کی ایک جماعت، جیسا کہ اس کا نام ظاہر کرتا ہے، محض ایک کانفرنس ہے۔

وہ کوئی مجلس تشریعی نہیں ہے اس کے سمجھوتے محض سفارشات ہیں جو کانفرنس میں حصہ لینے والی حکومتوں سے کی گئی ہیں تاکہ وہ اپنے قوانین کے مطابق ان کو اختیار کریں۔۔۔۔۔۔ ہیگ میں کسی اقرار نامے پر کسی سلطنت کے نمایندے کا دستخط کر دینا اس سلطنت کے لئے کوئی قانونی ذمہ داری پیدا نہیں کرتا۔ البتہ چونکہ نمایندے اپنی سلطنتوں کی طرف سے سرکاری طور پر منتخب کئے گئے ہیں اس لئے ان کا دستخط کرنا اس امر کی ایک اخلاقی ذمہ داری ان پر عائد کرتا ہے کہ ان اقرار ناموں اور اعلانوں کو اپنی حکومتوں کے متعلقہ شعبوں کے پاس بھیجیں اور ان کو باقاعدہ منظور کرا کے اپنے ملک میں قانونی قوت عطا کریں۔ یہ اقرار نامے صرف اسی وقت واجب العمل ہو سکتے ہیں جب ان کی باضابطہ توثیق ہیگ میں داخل کر دی جائے" (x)

پروفیسر مارگن اپنی کتاب "جنگ، اس کا چلن، اور قانونی نتائج" War, Its Conduct and legal Results میں لکھتا ہے:

"یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہیگ کی مفاہمتوں کا دائرہ اور ان کے تشریعی قوی ایک حد تک مشکوک و غیر معین ہیں۔ تاہم جن مفاہمتوں کو تمام متعاقد سلطنتوں نے منظور کر لیا ہے انہیں ہم تقریباً ایک عمومی ضابطۂ قانون سمجھ سکتے ہیں، اور ان کے مطابق متعاقد سلطنتوں کے جنگی اعمال کو مہذب قومیں جانچ سکتی ہیں"

ان تصریحات سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ہیگ کے وضع کردہ قوانین جنگ قانونی نوعیت کے اعتبار سے کسی طرح بھی اسلام کے قوانین جنگ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسلام کے قوانین تمام مسلمانوں کے لئے کلیتہً واجب العمل بنائے گئے ہیں۔ کسی مسلمان کو مسلمان رہتے ہوئے ان کی بندش سے نکلنے کا حق نہیں دیا گیا۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک شخص اسلام ہی کو چھوڑ دے اور اس طرح اسلام کے قانون جنگ کی پابندی سے بھی سبکدوش ہو جائے، مگر یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی شخص مسلمان رہتے ہوئے اسلام کے ان قوانین کی کم از کم اعتقادی اطاعت سے نکل جائے، یا ان کو اپنے اوپر حجت نہ مانے، یا ان قوانین کو اپنے حسب منشا بدل کر یا منسوخ کر کے کچھ دوسرے قوانین وضع کرے اور وہ نئے قوانین اسلام کے قوانین

قرار دیئے جائیں۔ اہلِ مغرب کے قوانین کی طرح اسلام کے قوانین مسلمانوں کے وضع کردہ نہیں ہیں، بلکہ ایک بالاتر قوت نے ان کو وضع کیا ہے اور مسلمانوں کے سامنے صرف اس لئے پیش کیا ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں۔ اب مسلمانوں کے لئے اس میں صرف دو راہیں ہیں، اگر وہ مسلمان رہنا چاہیں اور اس بالاتر قوت کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوں تو ان قوانین کو بھی تسلیم کریں، اور اگر ان کو تسلیم نہ کرنا چاہیں تو ناگزیر ہے کہ وہ اس بالاتر قوت کو بھی تسلیم نہ کریں اور اسلام کے دائرے سے نکل جائیں۔ اس کے سوا کوئی تیسری راہ مسلمانوں کے لئے نہیں ہے۔ بخلاف اس کے مغربی قوانین جنگ کے واضع خود اہلِ مغرب ہیں، اس لئے ان کو حق ہے کہ جب تک چاہیں اپنے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کریں اور جب چاہیں ان کو منسوخ کر کے دوسرے قوانین وضع کر لیں۔ اصولِ قانون کے لحاظ سے جب کبھی وہ ایسا کریں گے پہلا قانون بحیثیت ایک قانون کے مردہ ہو جائے گا اور دوسرا قانون اس کی جگہ لے لیگا۔ لیکن اگر مسلمان قوم اسلام سے بغاوت کر کے دس ہزار قوانین بھی وضع کر لیں تو ان میں سے کوئی بھی اسلام کا قانون نہ بن سکیگا، بلکہ اسلام کا قانون وہی رہے گا جو اللہ اور اس کے رسول نے وضع کر دیا ہے۔

ایک دوسری حیثیت سے بھی اسلام کے قوانینِ جنگ مغربی قوانین پر اصولی فوقیت رکھتے ہیں۔ مغربی قوانین دراصل قوانین نہیں معاہدے ہیں جن کی پابندی اس شرط پر کی جائیگی کہ دوسرے معاہدین بھی ان کی پابندی کریں۔ بخلاف اس کے اسلامی قانون معاہدہ نہیں بلکہ فی الحقیقت قانون ہے۔ اس میں اس قسم کی کوئی شرط نہیں رکھی گئی ہے کہ ان احکام پر صرف اسی حالت میں عمل کیا جائیگا جبکہ دوسرا فریق بھی ان کی پابندی کرے۔ جس زمانہ میں یہ قوانین وضع کئے گئے تھے اس وقت تو غیر مسلم سلطنتوں سے اس قسم کا کوئی سمجھوتہ ممکن ہی نہ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس صورتِ حال یہ تھی کہ غیر مسلم محاربین ہمیشہ مسلمانوں کے مقابلہ میں وحشیانہ طریقہ سے جنگ کرتے تھے اور ان حرکات پر اس بات نے ان کو اور بھی زیادہ جری کر دیا تھا کہ مسلمانوں کا مذہب ان کو جواب میں ویسے ہی وحشیانہ افعال کرنے سے روکتا تھا۔ پس ان تمام حیثیات سے اسلام کا قانون مغرب کے قانون پر بمراتب فوقیت رکھتا ہے اور یہ ایسی حقیقت ہے جس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۴- جنگ کے احکام وضوابط

اب ہم اصولی مباحث چھوڑ کر تفصیلی احکام وضوابط کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ مختلف جنگی امور کے متعلق ہیگ میں کیا قوانین مقرر کئے گئے ہیں اور مغربی قومیں ان کو کس حد تک قابلِ عمل تسلیم کرتی ہیں۔

اعلانِ جنگ جنگی مسائل میں پہلا مسئلہ یہ ہے کہ جنگ کس طرح شروع کی جائے؟ ابتدائی زمانہ میں یہ عام طریقہ تھا کہ جنگ شروع کرنے سے قبل نقیبوں اور ایلچیوں کی معرفت دشمن کو اطلاع دے دی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں بین الملّی قانون کے مصنفین بھی اعلان وانذار کی ضرورت پر بہت زور دیتے تھے، بلکہ بعض کی تو یہ رائے تھی کہ اعلان کے بغیر حملہ کر دینا درست نہیں ہے۔[1] لیکن بعد میں ماہرینِ قانون کا میلان اس طرف ہو گیا کہ رسمی اعلانِ جنگ کی کوئی ضرورت نہیں[2]۔ چنانچہ سلطنتوں نے بالعموم یہ دستور اختیار کر لیا کہ اعلانِ جنگ کے بغیر ہی مخاصمانہ کارروائیاں شروع کر دیتی تھیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۰۰ء سے ۱۸۷۲ء تک یورپ میں ۱۲۰ لڑائیاں ہوئیں جن میں سے صرف دس لڑائیوں سے پہلے اعلانِ جنگ کیا گیا۔[3] ان میں بعض لڑائیاں ایسی تھیں جو سفارتی تعلقات منقطع ہونے سے بھی قبل چھیڑ دی گئیں، مثلاً ۱۸۱۲ء میں انقطاعِ تعلقات سے قبل امریکہ نے ان تمام انگریزی جہازوں کو گرفتار کر لیا جو اس کے بندرگاہ میں موجود تھے اور بلا اطلاع کینیڈا پر حملہ کر دیا۔ اسی طرح ۱۸۵۵ء میں برطانیہ نے بحرِ اسود کے روسی بیڑے پر حملہ کر کے اسے سباسٹوپول کی طرف بھگا دیا، حالانکہ اس وقت تک دونوں جانب کے سفراء واپس بھی نہ ہوئے تھے۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں یورپ نے پھر پرانے طریقہ کی طرف رجوع کیا اور جنگ سے قبل عام طور پر اعلانِ جنگ کیا جانے لگا، چنانچہ ۱۸۷۰ء کی جنگ جرمنی و فرانس، ۱۸۷۷ء کی جنگ ترکی و روس، ۱۸۹۹ء کی جنگ امریکہ و اسپین، اور ۱۸۹۹ء کی جنگ بور

ؔ۱ Lawrence, P. 290 ۔۔۔ ؔ۲ Birkenhead, P. 197

ؔ۳ Maurice, Hostilities without Declaration of War, PP. 44-45-66

میں بھی اعلان سے جنگ کی ابتدا ہوئی تھی لیکن بیسویں صدی کی ابتدا میں روس اور جاپان کی جو جنگ ہوئی اس میں کوئی اعلانِ جنگ نہیں کیا گیا، اور بلا اطلاع جاپان نے روس پر حملہ کر دیا۔

اس طرح یورپ میں بیسویں صدی کی ابتدا تک جنگ شروع کرنے کے متعلق کوئی متعین قاعدہ نہیں تھا۔ سلطنتیں خود اپنی مرضی کے مطابق جب چاہتی تھیں دشمن پر اچانک جا پڑتی تھیں، اور جب ضرورت ہوتی پہلے سے اعلانِ جنگ بھی کر دیتی تھیں۔ ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس میں پہلی مرتبہ اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس کے متعلق ایک قاعدہ مقرر کیا جائے۔ چنانچہ ایک معاہدہ کیا گیا جس کی دفعات یہ ہیں:-

دفعہ اول، دُوَلِ متعاقدہ عہد کرتی ہیں کہ ان کے درمیان جنگ کی ابتدا اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک اس سے قبل ایک صریح تنبیہ نہ کر دی جائے۔ یہ تنبیہ خواہ اعلانِ جنگ کی صورت میں ہو جس میں وجہِ جنگ بتائی گئی ہو، یا الٹی میٹم (دعوتِ اخیر) کی شکل میں جس میں مشروط اعلانِ جنگ کیا گیا ہو۔

دفعہ دوم، حالتِ جنگ کے وقوع میں آنے کی اطلاع بلا تاخیر غیر جانبدار سلطنتوں کو دے دی جائے، اور جب تک ان کے پاس سے اس اطلاع کی رسید نہ آ جائے جو ہمیشہ تار پر ہونی چاہیے، اس وقت تک غیر جانبداروں کے بارے میں جنگ کی حالت نافذ نہ ہو، تاہم غیر جانبدار سلطنتوں کو اطلاع نامۂ جنگ ہی کا انتظار نہ کرنا چاہیے جب کہ انہیں قطعی طور پر جنگ کے وقوع میں آ جانے کا علم ہو چکا ہو۔

یہ مہذب قانون آج سے صرف بیس اکیس سال قبل یورپ میں وضع ہوا ہے[۲]، اور یہ بھی صرف کچھ شرکا کے لئے ہے۔ لیکن اسلام میں ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ قانون موجود ہے کہ جس دشمن سے تمہارا معاہدہ ہے اس کے خلاف جنگ کی نیت ہو تو جب تک اسے خبردار نہ کر دو کہ اب تمہاری فلاں فلاں حرکات کی وجہ سے ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ باقی نہیں رہا ہے اور اب ہم اور تم دشمن ہیں۔ یہ قانون اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ اس کی پابندی صرف انہی قوموں کے معاملہ

[۱] Hague Conventions (1907) III

[۲] مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کی کوئی پابندی نہیں کی گئی چنانچہ ابھی دنیا کی دوسری جنگ عظیم میں جس ملک نے بھی دوسرے ملک پر حملہ کیا ہے بلا اعلان ہی حملہ کی ابتدا کی ہے۔

میں کی جائیگی جو ہم سے یہ وعدہ کر چکی ہوں کہ وہ بھی ہمارے خلاف کبھی اچانک جنگ نہ چھیڑیں گی۔

اہل قتال اور غیر اہل قتال دو قوموں میں حالتِ جنگ قائم ہو جانے کے بعد سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محارب قوم کے افراد سے کس قسم کا سلوک کیا جائے؟ سترہویں صدی تک یورپ محارب (Belligerent) اور مقاتل (Combatant) کے فرق سے ناآشنا تھا۔ اس کے نزدیک ہر محارب مقاتل تھا، اس لئے اس کا قتل اور اس کی املاک کا سلب ونہب جائز تھا، عام اس سے کہ وہ عورت ہو، بچہ ہو، بڈھا ہو، بیمار ہو، یا دوسرے غیر مقاتل طبقات سے تعلق رکھتا ہو۔ اس کے بعد سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں بین الملی قانون کے جو مصنفین پیدا ہوئے انہوں نے مقاتلین اور غیر مقاتلین کے درمیان طبقات کے اعتبار سے فرق کرنے کی کوشش کی، لیکن کوئی ایسی جامع تقسیم نہ ہو سکی جس پر سب کو اتفاق ہو اور جسے حالتِ جنگ میں ملحوظ رکھا جا سکتا ہو۔ انیسویں صدی میں اس مسئلہ کو اس طرح حل کیا گیا کہ جو لوگ جنگی کارروائیوں میں حصہ لیتے ہیں وہ مقاتل ہیں، اور جو اس میں حصہ نہیں لیتے وہ غیر مقاتل ہیں، لیکن یہ حل اس قدر مجمل تھا کہ جزئیات وتفصیلات میں اس کا قائم رہنا مشکل تھا۔ اس کے بعد پھر یہ اصول قرار دیا گیا کہ صرف غنیم کی باقاعدہ افواج مقاتلین میں شمار کی جائیں گی اور باقی سب طبقات غیر مقاتلین میں داخل ہوں گے۔ لیکن اس سے چند اور پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے۔ ڈاکٹر نویدر کے بقول، "ایک ملک کے باشندوں کا یہ حق کہ وہ اپنے آبائی وطن کی مدافعت کریں کسی معقول دلیل سے رد نہیں کیا جا سکتا"۔ اس لئے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی ملک کے باشندے اپنے وطن کو بچانے کے لئے عام طور پر ہتھیار لے کر کھڑے ہو جائیں اور بغیر کسی ضبط ونظام کے غنیم سے جنگ شروع کر دیں، تو ان کی حیثیت کیا ہوگی؟ آیا ان کو مقاتلین میں شمار کر کے وہی حقوق دیئے جائیں گے جو دشمن کی باضابطہ فوج کے لئے مقرر ہیں؟ یا انہیں غیر مقاتلین میں شمار کر کے قانونِ جنگ کے مطابق لٹیروں اور قزاقوں میں شمار کیا جائیگا؟ مذکورۂ بالا قانون اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ غیر مقاتل (Non Combatant) اگر جنگی کارروائی میں حصہ لے تو اس کو نہ مقاتلین کی رعایات حاصل ہوں گی اور نہ

لہ تشریح کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب پنجم عنوان "اعلان جنگ"۔

غیر مقاتلین کی یعنی وہ قید ہوگا تو قتل کیا جائیگا، زخمی ہوگا تو معالجہ اور تیمارداری سے محروم رہے گا، اور اس کے ساتھ جنگ میں کسی قسم کے جنگی آداب ملحوظ نہ رکھے جائیں گے۔ اس قانون کی رو سے مقاتلین و غیر مقاتلین کے امتیاز کا جو اصول قائم کیا گیا وہ ان قوموں کے لئے غیر معمولی بربادی و معیبت کا موجب ہو گیا جو آزادی حاصل کرنے کے لئے، یا اپنے وطن کی مدافعت کے لئے، محض جذبۂ حب وطن سے متاثر ہو کر لڑنے کھڑی ہو جاتی ہیں اور کسی باقاعدہ جنگی نظام میں منسلک نہیں ہوتیں۔

سنہ ۱۸۷۰ء کی جنگ میں جب فرانس نے اپنی عام آبادی کو بے ضابطہ جماعتوں (Frens Tieurs) کی صورت میں جنگی کرنا شروع کیا اور جرمنی نے ان کو مقاتلین کے حقوق دینے سے انکار کر دیا تو بین الملی قانون کے سامنے یہ مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ آ گیا۔ ۱۸۷۴ء کی بروسلز کانفرنس میں اس پر زبردست بحث ہوئی۔ آخر مقاتلین و غیر مقاتلین کے درمیان ایک قطعی امتیاز قائم کیا گیا جس کی رو سے صرف وہی لوگ اہل قتال قرار دیئے گئے جو:-

الف، ایک ایسے قائد کے زیر فرمان ہوں جو اپنے ماتحتوں کے افعال کا ذمہ دار ہو،

ب، ایسے مقررہ امتیازی نشانات اپنے بدن پر لگائیں جنہیں فاصلہ سے پہچانا جا سکتا ہو،

ج، علم کھلا ہتھیار اٹھائیں،

د، جنگ میں قوانین و رسوم جنگ کی پابندی کریں۔

اسی وجہ امتیاز کو سنہ ۱۸۹۹ء اور سنہ ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنسوں میں تسلیم کیا گیا اور ہیگ کے ضوابط (Regulations) کی دفعہ دوم و سوم میں اس امر کی بھی تصریح کر دی گئی کہ

"اگر کسی غیر مفتوح علاقہ کے باشندے دشمن کی آمد پر اپنے وطن کی حفاظت کے لئے بغیر کسی تنظیم کے ہتھیار لے کر کھڑے ہو جائیں تو ان کو مقاتلین کے حقوق حاصل ہوں گے، بشرطیکہ وہ علانیہ ہتھیار اٹھائیں اور قوانین و رسوم جنگ کی پابندی کریں،

محاربِ فریقین کی مسلح فوجیں مقاتلین و غیر مقاتلین دونوں پر مشتمل ہو سکتی ہیں غنیم کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی صورت میں دونوں کو اسیرانِ جنگ کے حقوق حاصل ہوں گے۔"

British State Papers, No. 1 (1875) PP. 252-57

اس طریقہ سے ایک سوال تو بیشک حل ہو گیا، لیکن دوسرا سوال پھر بھی باقی رہا۔ ہتھیار اٹھانے کی ضرورت صرف آزاد قوموں کو ہی پیش نہیں آتی، بلکہ بعض اوقات نیم آزاد اور غلام قوموں کو بھی اپنے غصب شدہ حقوق حاصل کرنے کے لئے پیش آیا کرتی ہے۔ آزادی و استقلال کے لئے جنگ کرنا ہر قوم کا حق ہے، اور اگر وہ ایک طاقتور دشمن سے خلاصی حاصل کرنے کے لئے تلوار کی مدد حاصل کرے تو کسی دلیل سے اس کو مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پس سوال یہ ہے کہ اگر کوئی قوم اپنی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لئے جنگ کرے تو کیا اس کے تمام افراد مجرم قرار دیئے جائیں گے؟ کیا ان کو اہل قتال کے حقوق نہیں دیئے جائیں گے؟ کیا ان کو قزاقوں اور لٹیروں کی طرح پکڑ پکڑ کر قتل کیا جائے گا؟

ان سوالات کو ہیگ کانفرنسوں نے حل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے اور عملاً دول مغرب کا میلان اسی طرف ہے کہ ایسی قومیں نہ مقاتلین کے حقوق سے متمتع ہو سکتی ہیں اور نہ غیر مقاتلین کی رعایات سے۔ ان کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ انہیں توپوں اور بندوقوں کا لقمہ بنایا جائے، ان کی آبادیوں کا قتل عام کیا جائے، اور ان کے افراد کو پکڑ پکڑ کر قتل کر دیا جائے۔ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد میں برطانیہ نے، ریف میں ہسپانیہ نے، اور شام میں فرانس نے ہماری آنکھوں کے سامنے جو ہولناک مظالم کئے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ مغربی تہذیب کا قانون کسی قوم کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتا کہ وہ حصول آزادی کے لئے جنگ کرے۔

اہل قتال و غیر اہل قتال کے درمیان امتیاز کا یہ قاعدہ اس لحاظ سے بھی غلط ہے کہ اس میں ان تمام لوگوں کو غیر اہل قتال قرار دیا گیا ہے جو جنگ میں ہتھیار نہیں اٹھاتے۔ اگرچہ اہل مغرب کو ایک عرصہ تک اس بات پر فخر رہا کہ انہوں نے دشمنی و مخاصمت صرف فوجوں تک محدود کر دی ہے، اور غیر فوجی جماعتیں[1] جنگ کے اثرات سے بالکل مستثنیٰ کر دی گئی ہیں، لیکن آج خود وہی تسلیم کر رہے ہیں کہ فوجیت و غیر فوجیت

[1] مغربی سیاسیین نے غیر فوجی طبقوں کو جنگ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی ضرورت پر جو اس قدر زیادہ زور دیا ہے اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنی تجارت بہت زیادہ عزیز ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہر حالت میں اس کا سلسلہ جاری رہے۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس نے بالفاظ صریح اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ "سلطنتوں کو جنگ کے دوران میں اس امر کی پوری کوشش [illegible]

کی بنا پر مقاتلین و غیر مقاتلین کا فرق کرنا اصولاً غلط ہے اور عملاً ناممکن ہے۔ اس بارہ میں اپنی ذاتی رائے بیان کرنے کے بجائے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود ان یورپین مصنفین کے اقوال یہاں نقل کر دیں جنہوں نے جنگ عظیم کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اس امر کو محسوس کر لیا ہے کہ مقاتلین و غیر مقاتلین کی وہ تفریق جس پر اب تک ان کو اس قدر ناز تھا، کتنی بے بنیاد ہے۔

پروفیسر نیپولڈ لکھتا ہے:۔

"جدید تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ تجارتی عہد میں، جبکہ لاکھوں آدمی غیر ملکوں میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور ادھر سے اُدھر گردش کرتے پھرتے ہیں، یہ بالکل ناممکن ہے کہ جنگ محض متعلقہ حکومتوں کے فوجی اشخاص کی باہمی لڑائی قرار دی جائے۔ انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ صرف محارب ممالک ہی میں نہیں بلکہ غیر جانبدار دنیا میں بھی کوئی شخص کسی نہ کسی صورت میں ایک بڑی جنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مختلف اشخاص و افراد کے درمیان آج زندگی کے تمام شعبوں میں ایسے پیچ در پیچ تعلقات پیدا ہو گئے ہیں کہ کوئی شخص ایسی جنگ کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ان اثرات کو محدود رکھنے اور روکنے کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہو چکی ہیں۔ لہٰذا یہ نظریہ ایک بے معنی نظریہ ہے کہ جنگ محض سلطنتوں کا ایک معاملہ ہے اور جنگ کا تمام کاروبار صرف فوجی اشخاص ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تجارت کے عہد میں جنگ دراصل قوموں کا معاملہ ہے جو اس کو اپنی تمام جسمانی اور معاشی قوت سے چلاتی ہیں[1]"

آگے چل کر یہی مصنف کہتا ہے:۔

"جنگ کا مقصد دشمن سلطنت کو مغلوب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے بے شک

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۴) اگرچہ چاہیئے کہ محاربین کے درمیان صنعتی و تجارتی تعلقات بدستور قائم رہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ خواہش نہ پوری ہو سکتی ہے اور نہ کبھی آج تک کسی جنگ میں پوری ہوئی ہے۔ جنگ عظیم کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ موجودہ سلطنتیں اس کو پورا کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

[1] Nippold, P 114

اُس ضرر رسانی کا سلسلہ بند ہونا چاہیئے جو اس مقصد کے لئے مفید نہ ہو لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سلطنت صرف سپاہیوں سے آباد نہیں ہوتی، بلکہ عام باشندوں پر بھی مشتمل ہوتی ہے اسی بنا پر مولٹکے (Moltke) نے اس نظریہ سے اختلاف کیا ہے کہ "جنگ کا کام محض غنیم کی فوجی قوت کو ضعیف کرنا ہے" وہ کہتا ہے، "ہر برسرِ جنگ سلطنت کے لئے اپنے تمام ذرائع، اپنے مالیات، ریل کی سڑکیں، غذا کے وسائل حتیٰ کہ اپنا اخلاقی اثر بھی جنگ میں استعمال کرنا ناگزیر ہے۔ اگر دشمن کے ارادہ کو زبردستی جھکانا ہی جنگ کا مقصد ہو تو یہ ضروری ہی نہیں بلکہ جائز ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے فوجی ذرائع نہ صرف مخالف فوج کے خلاف بلکہ غنیم کی تمام معاشی قوتوں کے خلاف بھی استعمال کرے .... اب چونکہ ایک سلطنت کی معاشی قوت اشخاص و افراد کی قوت سے مرکب ہوتی ہے، اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ افراد کی ذات و جائداد اور ان کے معاشی مفاد کو بھی اس حد تک جنگ کا ہدف بنایا جائے جس حد تک کہ وہ جنگ کا مقصد حاصل کرنے کے لئے ضروری اور مفید ہو"[1]

ایک دوسری جگہ یہی مصنف لکھتا ہے:۔

"سلطنتوں کو معاشی جنگ میں بھی اسی طرح ضروریات جنگ کی پیروی کرنی چاہیئے جس طرح وہ فوجی جنگ میں کرتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں تمام وہ ذرائع جن سے غنیم کو مغلوب کرنے کی توقع ہو، استعمال کئے جانے چاہئیں۔ لہٰذا معاشی جنگ صرف تجارت ہی میں مزاحمت تک محدود نہ رہنی چاہیئے، بلکہ اس کو غنیم کی معاشی زندگی پر ایک مہلک ضرب لگانے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اس لحاظ سے اس میں پرائیویٹ اشخاص (یعنی غیر مقاتلین) پر بھی ضرب پڑنی ناگزیر ہے"[2]

---

[1] Nippold, 121

[2] Nippold, P. 122

پروفیسر نیمیر (Neimeyer) اپنی کتاب "بحری جنگ کے قوانین و اصول" میں لکھتا ہے:-

"بحری جنگ میں دشمن قوم پر ہر ممکن ذریعہ سے حتیٰ کہ انتہائی وحشیانہ ذرائع سے بھی زندگی دوبھر کر دینی چاہیئے"[1]

برک ہارٹ (Burckhardt) لکھتا ہے:-

"یہ خوش آیند اصول کہ جنگ محض مسلح افواج کے درمیان کشمکش کا نام ہے جس کا سول آبادی کے پرامن روابط پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اپنے آپ کو ایک خیالی بہشت ثابت کر چکا ہے۔ فوج نہ اپنے تئیں قوم سے جدا کر سکتی ہے اور نہ سلطنت سوسائٹی سے الگ ہو سکتی ہے۔ تمام نظریات کے علی الرغم جنگ ہمیشہ قوموں کے درمیان ہوا کرتی ہے، کیونکہ آبادی کے تمام طبقات اس میں حصہ لیتے ہیں، اگرچہ ان سب کے ہتھیار مختلف ہوتے ہیں۔ جہاں تک سلطنت سے ان کا گہرا تعلق ہے، سلطنت اور اہل ملک میں کوئی امتیاز قائم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جنگ جس طرح دو فوجوں کے درمیان ایک فوجی کشمکش ہے، اسی طرح وہ دو قوموں کے درمیان ایک معاشی کشمکش بھی ہے"[2]

ایک دوسرے موقعہ پر یہی مصنف لکھتا ہے:-

"سمندر کی تہ میں تجارت کو غرق کر دینا آدمیوں کو ڈبو دینے سے بدرجہا زیادہ انسانیت پرور طریقۂ جنگ ہے۔ بلکہ زیادہ گہرا تجزیہ کرو تو دشمن کی فوجی قوت کو مغلوب کرنے کی کوشش ایسی حالت میں بالکل بیکار معلوم ہوگی جبکہ دشمن کی معاشی قوت اتنی مضبوط ہو کہ وہ اسے ہتھیار رکھنے پر مجبور نہ ہونے دے۔ اسی وجہ سے یہ ناگزیر ہے کہ ہر محارب فریق اپنے دشمن کی معاشی قوت برباد کر دینے کی کوشش کرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک سلطنت کی عسکری قوت دفاع، اس کی معاشی قوت کے ساتھ اس طرح گتھی ہوئی ہے کہ ان دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس

---

[1] Prinzipier des See Kriegsrecht P. 17

[2] Nippold, P. 114

کی صنعتی زندگی جنگ جاری رکھنے میں اس کے لئے اتنی ہی مفید ہوتی ہے جتنی اس کے سپاہی کی زندگی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کوئی محارب قوت دشمن کے معاشی وسائل پر حملہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتی۔ دشمن کی عام آبادی کو بھوکا مار دینا خواہ کتنا ہی بے رحمی کا فعل ہو مگر میری رائے میں یہ کوئی ممنوع طریق جنگ نہیں ہے"[1]

آگے چل کر یہ مصنف پھر لکھتا ہے:۔

"جنگ کو کلیتہً فوجی طبقہ تک محدود رکھنا بہت سے تخیل پسندوں کا مطمح نظر ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ خشکی اور تری دونوں پر شخصی املاک محفوظ رہیں، محاربین تک بین اقوال تجارت کا لین دین جاری رہے، اور جنگ محارب فریقین کی فوجی قوتوں کے درمیان ہو نہ کہ محارب سلطنتوں کی عام رعایا کے درمیان۔ لیکن آج کوئی عملی آدمی اس تخیل کا پرستار نہیں ہے۔ صرف اسی بنا پر نہیں کہ وہ حقیقت واقعیہ سے بہت دور ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ یہ صراحتہً ایک مصنوعی اور غیر فطری حالت ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جنگی کارروائیوں سے متصل علاقوں کی باہمی تجارت کو لامحالہ ضرب لگتی ہی ہے۔ اور ویسے بھی یہ بات عقل و خرد کے بالکل منافی معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف ایک سلطنت اپنے ہزاروں نوجوانوں کو جنگ کی آگ میں جھونک رہی ہو اور دوسری طرف دشمن کو چین سے تجارت بھی کرنے دے، ایک طرف وہ دشمن کے بندرگاہوں پر گولہ باری کرنے میں اپنی جان و مال قربان کر رہی ہو اور دوسری طرف ان کی درآمد و برآمد کا سلسلہ بھی جاری رہنے دے"[2]

ایک اور مصنف ایتھر یاشر لکھتا ہے:۔

"چونکہ دشمن کی فوجی قوت کی جڑیں دشمن قوم کی مجموعی قوت میں بہت گہری جمی ہوئی ہوتی ہیں، اس لئے اس قوت کو تمام ممکن ذرائع سے کمزور کر دینا نہایت ضروری ہے۔ اس طرح

---

[1] Nippold, P. 122

[2] Nippold, P. 133

ایک دشمن فوج کے خلاف جو جنگ شروع کی جاتی ہے وہ اس پوری دشمن قوم کے خلاف جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور جب جنگ اس منزل پر پہنچ جاتی ہے تو بین الملّی قانون اس کے پیچھے چلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پہلے زمانہ میں جو یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تھا کہ جنگ محض دشمن کی مسلح فوجوں کے درمیان محدود رہنی چاہئے، اور محاربین کی عام آبادی تک چند مخصوص و متعین صورتوں کے سوا اس کے تشدد کو وسیع نہ ہونا چاہئے، اس پر آج تمادی عارض ہو چکی ہے۔ موجودہ زمانہ کی جنگ نے اس کو دور پھینک دیا ہے۔ وہ صرف انفرادی واقعات ہی میں نہیں توڑا گیا بلکہ اسے ہمیشہ کے لئے اور کلیتہً توڑ دیا گیا ہے۔ آئندہ لڑائیوں میں اس کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے گا کیونکہ ماضی کے ساتھ فنا ہو جانے والی چیز کا پھر اعادہ نہیں ہوا کرتا۔"

ان طویل اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے کہ جنگ میں تمام غیر فوجی طبقوں کو غیر اہل قتال قرار دینا، ان کو جنگی کارروائیوں سے محفوظ رکھ کر آزادی سے کاروبار کرنے دینا، اور انہیں ان تمام رعایات سے جو غیر اہل قتال کے لئے مخصوص ہیں مستفید کرنا، نہ صرف عملاً ناممکن ہے بلکہ اصولاً بھی غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنگ میں غیر فوجی طبقوں کو خاص طور پر ہدف بنانا اور ان کی اقتصادی زندگی برباد کرنے کی اس حیثیت سے کوشش کرنا کہ وہ بھی جنگ کے مقاصد میں سے ہے یقیناً ایک زیادتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کچھ کم زیادتی نہیں ہے کہ ان تمام لوگوں کو غیر اہل قتال کے حقوق دیئے جائیں جو دشمن کی جنگی طاقت کو تقویت پہنچانے میں اتنا ہی حصہ لیتے ہیں، جتنا فوجی طبقے لیتے ہیں۔

اس لحاظ سے مغربی قانون نے اہل قتال و غیر اہل قتال کے درمیان تفریق کا جو خط کھینچا ہے وہ کسی حیثیت سے بھی مستقیم نہیں ہے۔ ایک طرف وہ بہت سے ان طبقات کو اہل قتال کے حقوق سے محروم کر دیتا ہے جو درحقیقت ان کے مستحق ہیں۔ دوسری طرف بہت سے ان طبقات کو غیر اہل قتال کی رعایات دیتا ہے جو درحقیقت اس کے مستحق نہیں ہیں۔ اس افراط و تفریط کے درمیان اسلام نے

ل Nippold, P. 133-34

ایک مستقیم خط کھینچ دیا ہے جو اہلِ قتال و غیر اہلِ قتال کو ان کے پیشوں کے لحاظ سے تقسیم نہیں کرتا بلکہ ان کی قابلیت جنگ کے اعتبار سے تقسیم کرتا ہے۔ اس نے محارب قوم کو "مقاتلہ" کے اصول پر تقسیم کیا ہے۔ جو لوگ عملاً مقاتلہ کرتے ہیں، یا فطرت اور عادت کے اعتبار سے مقاتلہ کی قدرت رکھتے ہیں، وہ سب اہلِ قتال ہیں۔ اور جو فطرت اور عادت کے اعتبار سے مقاتلہ کی قدرت نہیں رکھتے۔ مثلاً عورتیں، بچے، بڈھے، بیمار، معذور، اور فقرا وغیرہ، وہ سب غیر اہلِ قتال میں داخل ہیں۔ دشمن قوم کا ہر مرد جو مسلمانوں سے لڑنے آئے گا، خواہ وہ باقاعدہ فوج سے تعلق رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ اسے بہر صورت مقاتل سمجھا جائیگا اور وہ تمام حقوق اسے دیئے جائیں گے جو مقاتلین کے لئے مخصوص ہیں، بشرطیکہ وہ غدر و عہد شکنی کا عادی مجرم نہ ہو۔ اسی طرح ہر وہ شخص جو جنگ پر قادر ہو گا، اہلِ قتال میں شمار کیا جائے گا اور اسے ضروریات جنگ کے ماتحت، نہ کہ لازماً، شدائد جنگ سے دوچار ہونا پڑیگا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر وہ امان مانگے تو اسے امان دی جائے گی، اگر وہ دار الحرب اور دار الاسلام کے درمیان پر امن طریقہ سے تجارت کرنی چاہے۔ تو مصالح جنگ کی رعایت سے اس کی بھی اجازت دی جاسکتی ہے، اگر وہ جنگی کارروائیوں سے محترز ہو کر اپنے کاروبار میں مشغول رہے تو اس کو غیر اہلِ قتال کی طرح معصوم و مامون بھی رکھا جاسکے گا، لیکن تو عیت کے اعتبار سے وہ اہلِ قتال ہی کے طبقہ میں شمار ہو گا اور غیر مقاتلین کے حقوق اس کو محض رعایۃً دیئے جائیں گے۔ اہلِ قتال اور غیر اہلِ قتال کے درمیان تفریق کی یہی ایک فطری صورت ہے، اور ان دونوں انتہائی نقطوں کے درمیان اسی ایک متوسط نقطہ پر جنگی اور قانونی گروہوں کا اجتماع ممکن ہے۔

مقاتلین کے حقوق و فرائض محاربین کی یہ دو بڑی اقسام یعنی اہلِ قتال و غیر اہلِ قتال اپنے حقوق و فرائض کے اعتبار سے مختلف قوانین کے تابع ہیں، اس لئے ہم ان دونوں سے الگ الگ بحث کریں گے۔ ان میں ترتیب کے اعتبار سے اہلِ قتال مقدم ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، یورپ میں اہلِ قتال کے حقوق کا کلی احساس انیسویں صدی کے دور آخر کی پیداوار ہے۔ اگرچہ اس سے بہت پہلے نظری حیثیت سے ان پر بحث و کلام کی ابتدا ہو چکی تھی، اور شعورِ اجتماعی کی ترقی کے ساتھ ساتھ بعض حقوق عملی دنیا میں بھی تسلیم کئے جاچکے تھے لیکن کلی

طور پر ان حقوق کے تسلیم واعتراف کا دور بہت بعد شروع ہوا ہے۔ ۱۸۲۹ء تک سلطنتیں اس بارے میں کسی متعین قانون کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھیں، اور خود اپنے آپ کو اس امر کے فیصلہ کا مختار سمجھتی تھیں کہ کن محاربین کو وہ اہلِ قتال کے حقوق دیں اور کن کو نہ دیں۔ چنانچہ امریکہ کی خانہ جنگی میں صدر جمہوریہ امریکہ نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ :-

"ایک قوم خود ہی اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ کب وہ محاربین کو اہلِ حرب کے حقوق دے۔ عام اس سے کہ وہ محاربین اس قوم سے ہوں جو اپنے آپ کو ایک ایسی حکومت سے آزاد کرانا چاہتی ہے جسے وہ ظالم سمجھتی ہے، یا وہ آزاد اقوام ہوں اور باہم ایک دوسرے سے برسرِ جنگ ہوں۔"[1]

لیکن ہر قوم کا خود اپنے افعال کے لئے جج بن جانا کسی حال میں بھی متعین حقوق و فرائض پیدا نہیں کر سکتا، اور عملاً اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ سرے سے اہلِ حرب کے حقوق و فرائض ہی فنا ہو جائیں۔ اس مشکل کو اہلِ مغرب نے آخر محسوس کیا اور رفتہ رفتہ یہ اصول تسلیم کیا گیا کہ محاربین کو ہر حالت میں حربیت (Belligerency) کے حقوق دیئے جائیں گے اس کا فیصلہ خود فریقین کے اختیارِ تمیزی پر نہ چھوڑا جائے گا۔

سب سے پہلے سینٹ پیٹرس برگ میں ایک قاعدہ کلیہ وضع کیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے :-

"جنگ میں سلطنتوں کو صرف اسی ایک جائز مقصد کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ دشمن کی فوجی قوت کو کمزور کر دیں، اور اس مقصد کے لئے صرف یہی کافی ہے کہ اس کے آدمیوں کی زیادہ سے زیادہ ممکن تعداد بیکار کر دی جائے۔ اس سے بڑھ کر ایسے اسلحہ استعمال کرنا جن سے بیکار کئے ہوئے آدمیوں کی تکالیف میں غیر ضروری اضافہ ہو، یا ان کی موت ناگزیر ہو جائے، اس مقصد پر تعدی کے حکم میں داخل ہو گا۔"

یہ ابتدائی قاعدہ تھا جو ۱۸۶۸ء میں وضع کیا گیا۔ اس کے چند سال بعد برسلز کانفرنس میں کچھ

[1] Parliamentary Papers, N. America (1872) No. 2, P. 17

حقوق و فرائض بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی لیکن انیسویں صدی کے خاتمہ تک اس موضوع پر کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکا جس کو تمام مغربی طاقتوں نے تسلیم کر لیا ہو۔ اس صدی کے اختتام پر جب پہلی ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی تو اس نے یہ جامع اصول وضع کیا کہ :-

"محاربین کا ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے ذرائع استعمال کرنے کا حق غیر محدود نہیں ہے"

اس کے ساتھ ہی اس نے اہلِ قتال کے حقوق و فرائض بھی متعین کئے جن کو ضوابط ہیگ کی دفعہ ۲۲ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

"مخصوص سمجھوتوں میں جن امور کی ممانعت کی گئی ہے، ان کے علاوہ حسب ذیل امور خصوصیت کے ساتھ ممنوع ہیں،

(الف) زہر یا زہریلے اسلحہ استعمال کرنا،

(ب) محارب قوم یا فوج کے کسی شخص کو دغا سے قتل یا زخمی کرنا،

(ج) ایسے دشمن کو قتل یا زخمی کرنا جس نے ہتھیار ڈال کر، یا مدافعت کے تمام وسائل سے محروم ہو کر، حریف کے اختیار تمیزی کے آگے اپنے تئیں تسلیم کر دیا ہو،

(د) یہ اعلان کرنا کہ کوئی امان نہیں دی جائے گی،

(ہ) ایسے اسلحہ یا اشتعال پذیر مادے یا سامان استعمال کرنا جو حد سے زیادہ نقصان پہنچانے والے ہوں۔

(س) صلح کے پرچم، یا دشمن کے قومی پرچم، یا فوجی علامات، یا وردی، یا معاہدت جنیوا کے مقرر کئے ہوئے امتیازی نشانات ناجائز طریقہ سے استعمال کرنا،

(ش) دشمن کی املاک تباہ کرنا بغیر اس کے کہ جنگی ضروریات کے لحاظ سے ایسا کرنا ناگزیر ہو،

اس اجمالی بیان سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ اہل قتال کے حقوق و فرائض کی تعیین کب اور کس طرح

ا؎ Hague Regulations, Art 22

طرح ہوئی۔ اس کے بعد اب ہم خاص خاص حقوق و فرائض کا الگ الگ تذکرہ کریں گے

۱۔ قواعد حرب کی پابندی | اہل قتال کا سب سے بڑا فرض جس پر حکومتوں کو بڑا اصرار رہا ہے، یہ ہے کہ وہ فوجی ضبط و نظام کے پابند ہوں اور قواعد حرب کو ملحوظ رکھیں۔ جو محاربین بے ضابطہ جنگ کرتے ہیں ان کے حقوق حربیت کو تقریباً تمام سلطنتوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ جرمن قانون میں ان کے لئے کم سے کم دس سال کی قید اور زیادہ سے زیادہ موت کی سزا مقرر ہے۔ امریکہ کے قانون کی ضمن چہارم دفعہ ۸۲ میں ان کو قزاق اور ڈاکو قرار دیا گیا ہے اور ان کے لئے وہی سزا تجویز کی گئی ہے جو اس قسم کے مجرموں کو دی جاتی ہے۔ حربیت کے حقوق تو درکنار ان لوگوں کو انسانیت کے ابتدائی حقوق دینے سے بھی انکار کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس میں برطانیہ نے سخت اصرار کیا کہ غیر مہذب اور وحشی قوموں کے مقابلہ میں ڈم ڈم کی گولیاں استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ لارڈ لینسڈاؤن نے جو برطانیہ کی نمائندگی کر رہے تھے، اپنی تقریر کے دوران میں بڑے زور سے کہا تھا کہ ۱۸۹۵ء کی جنگ چترال میں معمولی قسم کی گولیاں وحشی دشمن کے ہجوم کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں اور ڈم ڈم کی گولیاں ان لوگوں کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچاتیں[ل]۔ یہ وہی ڈم ڈم کی گولیاں ہیں جن کے ذکر سے ایک یورپین کا ضمیر کانپ اٹھتا ہے اور جن کا "مہذب" قوموں کے خلاف استعمال کرنا کسی کو گوارا نہیں ہے۔ لیکن بے ضابطہ جنگ کرنے والی "غیر مہذب" قوموں کے خلاف اسی خلاف انسانیت ہتھیار کو استعمال کرنا اس قدر ضروری اور جائز سمجھا جاتا ہے کہ ایک مہذب ترین یورپین سلطنت ہیگ کے اقرار نامہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیتی ہے، اور دستخط کرتی ہے تو اس وقت جبکہ اس اقرار نامہ کو صرف متعاقدین کی باہمی جنگوں تک محدود کر دیا جاتا ہے۔

۲۔ امان | اہل قتال کا پہلا اور بنیادی حق یہ ہے کہ جب وہ دشمن سے امان مانگیں تو انہیں امان دی جائے۔ سترھویں صدی تک یورپ میں امان دینے کا طریقہ مفقود تھا۔ انگلستان کی خانہ جنگی میں پارلیمنٹ نے آئرش لوگوں کو امان دینے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک محاربین کو حق تھا

ل Birkenhead, P. 220

کہ ایک دوسرے کو امان دینے سے انکار کر دیں۔ چنانچہ ۱۷۹۴ء میں فرنچ کنونشن نے اعلان کر دیا تھا کہ انگریزی سپاہیوں کو امان نہیں دی جائیگی۔ لیکن انیسویں صدی میں اہلِ قتال کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا کہ جب وہ امان طلب کریں تو ان پر کسی قسم کی دست درازی نہ کی جائے، اور ان کو اسیرانِ جنگ کے حقوق دیئے جائیں۔

مگر یہ قانون صرف انہی لوگوں کے لئے ہے جو میدان جنگ میں دشمن سے پناہ مانگیں۔[1] باقی رہے وہ محاربین جو حالتِ جنگ شروع ہوتے وقت دشمن کے قبضہ میں ہوں، سو ان کے متعلق ابھی تک کوئی متعین قاعدہ موجود نہیں ہے۔ اٹھارہویں صدی تک عام قاعدہ تھا کہ ایسے لوگوں کو گرفتار کر لیا جاتا اور معمولی مجرموں کی طرح اختتام جنگ تک قید رکھا جاتا تھا۔ ۱۷۵۶ء میں پہلی مرتبہ انگلستان نے فرانس کے ساتھ یہ رعایت کی کہ جنگ کے آغاز میں جتنے فرانسیسی اس کی حدود میں موجود تھے ان کو اس شرط پر امان دیدی کہ وہ ایمانداری کے ساتھ ناطرفدار رہیں۔ اسی طرح ۱۷۹۴ء میں انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ کے درمیان اس قسم کا ایک سمجھوتہ ہوا کہ ان کی باہمی جنگوں میں دونوں فریق ایک دوسرے کے آدمیوں کو امان دیا کریں گے۔ مگر ۱۸۰۲ء میں معاہدہ امینس (Amiens) کے ٹوٹنے پر نپولین نے پھر پچھلے طریقہ کا اعادہ کیا اور ان تمام انگریزوں کو گرفتار کر لیا جو فرانسیسی علاقہ میں موجود تھے۔ انیسویں صدی میں ایک دوسرا طریقہ اخراج کا بھی اختیار کیا گیا، اور ان تینوں طریقوں پر باوقات مختلفہ عملدرآمد ہوتا رہا۔ ۱۸۵۴ء کی جنگ کریمیا، ۱۸۹۷ء کی جنگ ترکی و یونان، اور ۱۸۹۸ء کی جنگ امریکہ و اسپین میں فریقین نے ایک دوسرے کے آدمیوں کو امان عطا کی۔ مگر ۱۸۷۰ء کی جنگ جرمنی و فرانس میں تمام جرمن فرانسیسی علاقے سے نکال دیئے گئے، اور ۱۸۹۹ء کی جنگ بوئر میں جنوبی افریقہ کی دونوں جمہوریتوں نے انگریزوں کو حدودِ بلاد سے خارج کر دیا۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں بھی اس کے متعلق کوئی قاعدہ نہ بن سکا۔ ۱۹۰۴ء کی جنگ روس و جاپان میں اور ۱۹۱۱ء کی جنگ ترکی و اطالیہ میں کچھ عرصہ تک، فریقین نے امان عطا کرنے کے طریقہ

[1] موجودہ قانون نے میدان جنگ کی امان اور حالتِ جنگ کی امان میں فرق کیا ہے، مگر میں نے اسلامی اصطلاح کے لحاظ سے ان دونوں کا یکجا ذکر کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

کی پابندی کی۔ مگر ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے دشمن کے ان تمام افراد کو جو ان کی حدود میں موجود تھے، ایک خاص مدت کے اندر نکل جانے کا حکم دیدیا، اور جو لوگ نہ نکلے انہیں شدید نظر بندی میں رکھا۔ جرمنی اور آسٹریا نے غیر فوجی عمر کے لوگوں کو مستثنیٰ کر کے سب کو نظر بند کر دیا۔ پرتگال نے غیر فوجی عمر کے لوگوں کو نکال باہر کیا اور فوجی عمر کے لوگوں کو نظر بند کر دیا۔ امریکہ و جاپان نے سب کو امان عطا کر دی۔[۱]

اس کے متعلق ابھی تک کوئی قانون نہیں بنا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں بین الملّی قانون کا عام رجحان یہ ہے کہ غیر فوجی عمر کے لوگوں کو ملک چھوڑ کر چلے جانے کی مہلت دی جائے، اور فوجی عمر کے لوگوں کو روک لیا جائے۔ بخلاف اس کے اسلام میں ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ عام قانون موجود ہے کہ اہل حرب میں سے کوئی شخص اگر دارالاسلام میں امان لیکر رہنا چاہے یا آنا چاہے تو اسے امان دینی چاہئے، اور اگر وہ اپنے "مامن" کی طرف جانا چاہے تو اسے بخیریت پہنچا دینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اسلام نے حربی مستامن کو جو وسیع حقوق دیئے ہیں ان کی گرد تک بھی ابھی مغرب کا بین الملّی قانون نہیں پہنچ سکا ہے۔[۲]

۳۔ اسیران جنگ | اسیران جنگ کے متعلق یورپ کے قوانین بہت مکمل ہیں۔ مگر پروفیسر مارگن کے بقول ان کے مکمل ہونے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں تمام سلطنتوں کے مفاد مشترک ہیں۔ ہر سلطنت خود اپنے سپاہیوں اور افسروں کی آسائش چاہتی ہے، اس لئے وہ محض مبادلہ کے طور پر مخالف کے سپاہیوں اور افسروں کو بھی آسائش پہنچانے پر راضی ہو جاتی ہے۔[۳]

لیکن یہ مہذب قوانین بہت قریبی عہد کی پیداوار ہیں۔ سترھویں صدی تک یورپ میں اسیران جنگ کو غلام بنانے کا دستور تھا۔ گروٹیوس نے اس طریقہ کے خلاف آواز بلند کی اور عیسائی اقوام کو مشورہ دیا

---

[۱] Birkenhead, PP. 197-98

[۲] تفصیل کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب پنجم عنوان "صلح و امان"۔

[۳] War, Its Conduct and Legal Results

کہ وہ ایک دوسرے کو غلام بنا کر بیچنے کے بجائے اسیرانِ جنگ کو فدیہ لیکر چھوڑ دیں، مگر ایک صدی تک اس کی سفارشات بے اثر رہیں۔ اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں فدیہ اور تبادلۂ اسیرانِ جنگ کا طریقہ جاری ہوا اور صدی کے اختتام تک سلطنتیں اس پر کاربند رہیں۔ ۱۷۸۰ء میں فرانس اور انگلستان کے درمیان مبادلہ اور مفادات کے متعلق جو معاہدہ ہوا تھا اس میں ایک سپاہی کی قیمت ایک پونڈ، اور ایک امیر البحر یا مارشل کی قیمت ۶۰ پونڈ یا ۶۰ سپاہی قرار دی گئی تھی۔ انیسویں صدی میں یورپ نے مفادات کا طریقہ چھوڑ دیا، اور صرف مبادلہ کا طریقہ باقی رکھا، لیکن تہذیب کے اس شباب کے زمانہ میں بھی اسیرانِ جنگ کو قتل کرنے کا طریقہ بالکل موقوف نہیں ہوا تھا، چنانچہ ۱۷۹۹ء میں مہذب یورپ کے سب سے بڑے جنرل نپولین بوناپارٹ نے یافا کی چار ہزار نفر کی فوج کو، جس نے جان بخشی کا وعدہ لیکر اطاعت قبول کی تھی، صرف اس عذر کی بنا پر قتل کرا دیا کہ وہ انہیں کھلانے کے لئے خوراک مہیا نہیں کر سکتا تھا اور نہ مصر بھیجنے کا انتظام کر سکتا تھا۔[1] اس کے تقریباً ایک صدی بعد مغربی دنیا میں پھر اسی جرم کا ارتکاب کیا گیا جس کو ابھی تیس برس سے کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے۔ ۱۸۹۶ء میں کیوبا کے ہسپانوی کپتان جنرل ویلر (Gen. Weyler) نے اسیرانِ جنگ کو باغی قرار دے کر قتل کرا دیا تھا، اور ہزاروں نہتے باشندوں کو پکڑ کر اس طرح قید کر دیا تھا کہ وہ مکھیوں اور مچھروں کی طرح بھوک پیاس سے مر گئے۔

بہر حال یہ ایک واقعہ ہے کہ اسیرانِ جنگ کے متعلق باضابطہ قواعد ۱۸۷۴ء کی برسلز کانفرنس میں وضع کئے گئے، ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس نے ان کی توثیق کی، اور ۱۹۰۷ء کی دوسری ہیگ کانفرنس نے ان کو مکمل کر کے ایک بین المللی قانون بنا دیا۔ یہ قواعد ہمیں مفاہمت ہیگ نمبر ۴ کے ملحق ضوابط میں ملتے ہیں جن کا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

دفعہ ۴۔ اسیرانِ جنگ محارب حکومت کے قبضۂ اختیار میں ہوں گے نہ کہ ان اشخاص کے قبضہ میں جنہوں نے ان کو گرفتار کیا ہو۔ ان سے انسانیت کا سلوک روا رکھنا چاہیئے۔ ان کے پاس اسلحہ، گھوڑوں اور جنگی کاغذات کے ماسوا جو اشیاء موجود ہوں وہ انہیں کی

---

[1] Allison, History of Eaurope III, XXV

ملک رہیں گی۔

دفعہ ۵۔ اسیرانِ جنگ کو عموماً نظر بند رکھنا چاہیئے لیکن اگر تحفظ کے لئے ناگزیر ہو تو قید بھی کیا جاسکتا ہے۔

دفعہ ۶۔ قید کرنے والی حکومت اسیرانِ جنگ سے ان کے درجہ کو ملحوظ رکھ کر کام لے سکتی ہے (افسر ہر حال میں اس سے مستثنیٰ ہیں)، بشرطیکہ وہ کام حد سے زیادہ نہ ہو اور جنگی اعمال سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ انہیں اس کام کا معاوضہ دیا جائے گا، جو اسی شرح کے مطابق ہونا چاہیئے جس پر خود اس حکومت کے اسی درجہ کے آدمیوں کو دیا جاتا ہو۔

دفعہ ۷۔ اسیرانِ جنگ جس حکومت کے قبضہ میں ہوں وہی ان کے گزارہ کی ذمہ دار ہوگی، خاص صورتوں کے ماسوی ان کے قیام کا بندوبست اسی پیمانہ پر ہونا چاہیئے جس پر خود گرفتار کرنے والی حکومت اپنے اسی درجہ کے ملازموں کے لئے کرتی ہو۔

دفعہ ۸۔ اسیرانِ جنگ ان قوانین کے تابع ہوں گے جو قید کرنے والی سلطنت میں نافذ ہوں۔ نافرمانی کا ہر فعل ان کے حق میں ایسی سختیوں کو جائز کر دیگا جو اس کے لئے ضروری ہوں۔ بھاگنے والے قیدی اگر اپنی فوج تک پہنچنے سے پہلے گرفتار ہو جائیں تو تادیبی (Disciplinary) سزا کے مستوجب ہوں گے، اور اگر اپنی فوج میں پہنچنے کے بعد دوبارہ گرفتار ہوں تو ان کو گذشتہ جرم کی سزا نہ دی جائے گی۔

دفعہ ۹۔ ہر اسیرِ جنگ کا فرض ہوگا کہ اگر اس سے اس کا نام اور عہدہ دریافت کیا جائے تو وہ ٹھیک ٹھیک بتا دے۔ نہ بتانے یا غلط بتانے کی پاداش میں اس کی آسائشیں کم کر دی جائیں گی۔

دفعہ ۱۰۔ اسیرانِ جنگ کو یہ وعدہ لے کر رہا کیا جاسکتا ہے کہ وہ جنگ میں پھر حصہ نہ لیں گے۔ اگر کوئی اسیر اس طرح رہائی حاصل کرے تو اس کا فرض ہوگا کہ اپنا عہد پورا کرے، اس کی حکومت اس کو عہد شکنی پر مجبور نہ کرے گی۔

دفعہ ۱۱۔ کسی اسیرِ جنگ کو مشروط رہائی حاصل کرنے کے لئے مجبور نہ کیا جائیگا، اور نہ کوئی حکومت اس پر مجبور ہوگی کہ ہر حال میں کسی اسیر کی درخواست رہائی قبول کرے۔

دفعہ ۱۲۔ اگر کوئی اسیرِ جنگ، مشروط رہائی حاصل کرنے کے بعد دوبارہ اسی حکومت کے خلاف لڑنے آئے تو اسے اسیرانِ جنگ کے حقوق حاصل نہ ہوں گے، اور گرفتار ہونے کی صورت میں اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔

دفعہ ۱۳۔ جو غیر مقاتل لوگ کسی فوج کے ساتھ باضابطہ تعلق کے بغیر شامل ہوں، مثلاً اخباروں کے نامہ نگار وغیرہ، ان کو گرفتار کر کے اسیرانِ جنگ کے طور پر رکھا جا سکتا ہے۔

دفعہ ۱۴۔ دورانِ جنگ میں ہر سلطنت ایک محکمۂ اطلاعات قائم کرے گی جو ہر قیدی کے متعلق ضروری معلومات فراہم رکھے گا، اور ان کی قومی حکومت کو وقتاً فوقتاً ان کے حالات سے مطلع کرتا رہے گا۔

دفعہ ۱۵۔ اسیرانِ جنگ کی امدادی سوسائٹیاں، جو اپنے ملک کے قانون کے مطابق قائم کی گئی ہوں، محارب فریقین کی جانب سے ہر قسم کی آسانیوں کی مستحق ہوں گی، ان کو اور ان کے ایجنٹوں کو نظر بندی اور قید کی حالت میں اسیروں تک پہنچنے اور اپنے فرائض انجام دینے کی اجازت ہوگی، بشرطیکہ وہ مقامی حکام کی ہدایات کے مطابق عمل کریں۔

دفعہ ۱۶۔ محکمۂ اطلاعات ڈاک کے محصول سے مستثنیٰ ہوگا۔ خطوط، منی آرڈر، اور قیمتی اشیاء اور پارسل جو اسیرانِ جنگ کے نام یا ان کی جانب سے بھیجے جائیں، ڈاک کے خرچ سے دونوں ملکوں میں مستثنیٰ ہوں گے۔ ان پر کسی قسم کی چنگی بھی نہ ہوگی، اور نہ ریلوے کا محصول لگایا جائیگا۔

دفعہ ۱۷۔ گرفتار شدہ افسروں کو اسی شرح سے تنخواہ دی جائیگی جو قید کرنے والی حکومت اپنے اسی درجہ کے ملازموں کو دیتی ہو۔ یہ رقم آخر میں خود ان کی حکومت ادا کر دے گی۔

دفعہ ۱۸۔ قیدیوں کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی ہوگی اور وہ ان قواعد کے تحت، جو ضبط و نظام کی خاطر مقرر کئے گئے ہوں، اپنے مذہب کے کلیسا میں جا سکیں گے۔

دفعہ ۱۹۔ اسیرانِ جنگ کی وصیتیں اسی طرح پوری کی جائیں گی جس طرح قومی فوج کے سپاہیوں کی کیجاتی ہیں۔ وفات پانے کی صورت میں ان کی تجہیز و تکفین اسی عزت کے ساتھ کی جائے گی جو ان کے ہم رتبہ قومی فوج کے ملازموں کی تجہیز و تکفین میں ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

دفعہ ۲۰۔ صلح ہونے کے بعد جہاں تک ممکن ہوگا اسیرانِ جنگ کا مبادلہ کیا جائے گا[1]

ان قواعد کو اگر ضابطہ کی جزئیات سے مجرد کر کے محض اصول کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اسلام کے مقرر کئے ہوئے اصول پر کوئی خاص اضافہ نہیں کیا ہے[2]۔ مغربی قانون اسیرانِ جنگ کو زیادہ سے زیادہ وہ آسائشیں بہم پہنچانا چاہتا ہے جو ایک سلطنت خود اپنے اسی درجہ کے سپاہیوں اور افسروں کو بہم پہنچاتی ہے۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم، کا طرزِ عمل یہ ہے کہ انہوں نے اسیرانِ جنگ کو اپنے سے بہتر کھانا کھلایا اور اپنے سے بہتر کپڑا پہنایا، حالانکہ دشمنوں کے ہاں ان کے اسیرانِ جنگ کو روٹی کپڑا تو درکنار الٹی جسمانی اذیتیں نصیب ہوتی تھیں۔ مغربی سلطنتیں اسیرانِ جنگ کے خرچ کا ایک بڑا حصہ خود ان کی اپنی قوم سے وصول کرتی ہیں۔ مگر اسلام نے ان پر اس وقت اپنا مال خرچ کیا جبکہ دشمن سلطنتوں سے اس معاملہ میں کسی سمجھوتے کا امکان تک ہی نہیں۔ مغربی سلطنتیں ان کو صرف مبادلہ کی صورت میں رہا کرنے پر آمادہ ہوتی ہیں۔ مگر اسلام نے مبادلہ کے بغیر ہی ان کو اکثر رہا کیا ہے اور بطریقِ احسان رہا کر دینے کو افضل کہا ہے۔ تاہم بعض چیزیں ان میں اسلام سے زائد بھی نظر آتی ہیں۔ لیکن ان کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہئیے کہ ہر سلطنت دوسری سلطنت کے سپاہیوں کو یہ تمام رعایات اس مفاہمت کی بنا پر دینے کے لئے راضی ہوئی ہے کہ اس کے سپاہیوں کو بھی ایسی ہی رعایات دی جائیں گی۔ بخلاف اس کے اسلام نے کسی معاہدہ اور سمجھوتہ کے بغیر ایسی حالت میں اسیرانِ جنگ کو وہ رعایات دی تھیں جبکہ اسے اپنے مخالفوں سے کسی قسم کی رعایت حاصل ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ اس نے غزوۂ بدر کے قیدیوں پر اس زمانہ میں لطف و احسان کیا تھا جبکہ کفارِ قریش کے قبضہ

---

[1] یہ قوانین صرف فوجیوں کے لئے ہیں۔ ابھی یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا نظر بند غیر فوجیوں کو بھی یہ حقوق دیئے جائیں گے یا نہیں؟

[2] مقابلہ کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب پنجم بعنوان "اسیرانِ جنگ"۔

میں عیسائی مسلمان قیدی تپتی ہوئی ریت پر لٹائے جاتے تھے۔ آج کی طرح اس وقت ایسا کوئی سمجھوتہ اور معاہدہ ممکن نہ تھا اس لیے اسیرانِ جنگ کو زیادہ سے زیادہ وہی رعایات دی جاسکتی تھیں جو اسلام نے دیں۔ لیکن آج جبکہ اس بارے میں سمجھوتہ اور معاہدہ ممکن ہے، اسلام پچھلے قوانین پہ ہرگز اصرار نہ کریگا۔ وہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ ہر ایسے معاہدہ کی اجازت دیتا ہے جس میں مساوات کے ساتھ مراعات کا مبادلہ کیا گیا ہو۔

۴۔ **مجروحین، مرضیٰ اور مقتولین** | فوج کے مجروحوں اور بیماروں کے لئے سترھویں صدی تک یورپ میں کوئی خاص انتظام نہ تھا غالباً سترھویں صدی میں پہلی مرتبہ جنگی ہسپتال قائم کرنے اور میدانِ جنگ میں فوری امداد کے لئے طبیب اور جراح رکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن دشمنوں کے مجروحوں اور بیماروں کا احترام اور اس کے ہسپتالوں اور معالجوں کی مامونیت کا تخیل انیسویں صدی تک یورپ میں ناپید تھا۔ مجروح اور بیمار بسا اوقات قتل کر دیئے جاتے اور اکثر اوقات ان کو نہایت خستہ حالت میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ہسپتالوں کو فوجی حملوں سے مستثنیٰ نہ رکھا جاتا تھا۔ معالجوں اور تیمار داروں کو اسیرانِ جنگ میں شمار کیا جاتا اور عام مقاتلین کی طرح وہ بھی قید کر لئے جاتے تھے۔ انیسویں صدی کے وسط تک بین الملی قانون کے ماہرین کے درمیان اسی مسئلہ میں اختلاف تھا کہ ڈاکٹروں اور تیمار داروں کو اسیرانِ جنگ میں شمار کیا جائے یا نہیں۔[۱] امریکی خانہ جنگی میں ریاستہائے متحدہ نے یہ امر جائز قرار دیا تھا کہ اگر غنیم کے ڈاکٹروں کی خدمات درکار ہوں تو انہیں پکڑ کر کام لیا جاسکتا ہے۔ غرض یہ کہ ۱۸۶۴ء تک یورپ مجروحوں اور مریضوں اور معالجوں کے متعلق مہذب قوانین سے نا آشنا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ اس تہذیب سے اس وقت آشنا ہوا جب سوئٹزرلینڈ کے ایک مشہور محبِ انسانیت ہنری ڈونان (Henri Dunant) نے اس کو قوموں کے وحشیانہ اعمال پر متنبہ کرنے کے لئے ایک دردناک آواز بلند کی۔ جون ۱۸۵۹ء میں فرانس اور سارڈینیا کی متحدہ افواج اور آسٹریا کی فوج کے درمیان سولفرینو (Solferino) پر ایک زبردست معرکہ برپا ہوا تھا جس میں علاوہ اور وحشیانہ حرکات کے مجروحینِ جنگ کے ساتھ اس قسم کا

[۱] Lawrence – P. 348

بے دردانہ برتاؤ کیا گیا کہ اس سے تمام یورپ میں انسانیت کے لطیف جذبات متحرک ہو گئے۔ ہنری دوناں نے اس پر ۱۸۶۲ء میں ایک کتاب شائع کی جس نے یورپ کی رائے عام کو ان بے دردیوں کے تدارک پر آمادہ کر دیا۔ اکتوبر ۱۸۶۳ء میں سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے ایک غیر سرکاری کانگریس بمقام جنیوا منعقد کر کے اس امر پر غور کیا کہ آئندہ کے لئے جنگ میں زخمیوں اور بیماروں کی حفاظت کا کیا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ اس کانگریس کے تجویز کردہ خطوط پر دوسرے سال جنیوا میں ایک باضابطہ بین الملی کانفرنس منعقد ہوئی، اور اس نے بحث و مباحثہ کے بعد ایک سمجھوتہ تیار کیا جس پر ۲۲ اگست ۱۸۶۴ء کو تمام سلطنتوں نے (باستثنائے امریکہ) دستخط کر دیئے۔ اس سمجھوتہ میں فوجی ہسپتالوں اور ان کے کارکنوں کو ناطرفدار قرار دیا گیا۔ ان کو جنگی قیدی بنانے یا ان کے شفاخانوں کو جنگی اعمال کا ہدف بنانے کی ممانعت کر دی گئی، اور بیماروں اور زخمیوں کے علاج اور تیمارداری کے کام میں مزاحمت کرنے کو ناجائز قرار دیا گیا۔ نیز اس میں زخمیوں اور بیماروں سے متعلق ہر چیز کے لئے سفید زمین پر سرخ صلیب کا نشان تجویز کیا گیا تاکہ دور سے اس کو دیکھ کر امتیاز کیا جا سکے، اور کسی ایسی چیز کو جنگی کارروائیوں کا نشانہ نہ بنایا جائے جس پر وہ نشان لگا ہوا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ہر محارب فریق پر فرض کیا گیا کہ وہ اپنے زخمیوں کی طرح دشمن کے زخمیوں کا بھی علاج کرائے اور آرام ہو جانے کے بعد یا تو ان سے جنگ میں دوبارہ حصہ نہ لینے کا وعدہ لیکر انہیں رہا کر دے یا بطور اسیران جنگ کے روک رکھے۔

یہ سمجھوتہ متعدد حیثیات سے ناقص تھا، اور اس میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے کو قابل سزا جرم قرار دینے کی کوئی سفارش نہیں کی گئی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ۱۸۶۸ء میں دوبارہ جنیوا ہی میں ایک اور کانفرنس منعقد ہوئی اور ایک ضمنی سمجھوتہ مرتب کیا گیا جو ۱۴ دفعات پر مشتمل تھا، پانچ دفعات بری جنگ کے متعلق اور ۹ دفعات بحری جنگ کے لئے۔ اس کانفرنس نے حکومتوں سے سفارش کی کہ وہ اپنے قوانین جنگ میں اس سمجھوتہ کی دانستہ خلاف ورزی کو جرم مستلزم سزا قرار دیں لیکن نہ تو سلطنتوں نے اس سفارش کو قبول کیا اور نہ اس سمجھوتہ کی توثیق کی، اس لئے دوسری جنیوا کانفرنس بالکل بیکار ثابت ہوئی۔

سنہ ۱۸۷۴ء کی برسلز کانفرنس نے پھر اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا مگر اس کی سفارشات کا حشر بھی وہی ہوا جو دوسری جنیوا کانفرنس کا ہوا تھا۔ اس کے ۲۵ سال بعد سنہ ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس میں سلطنتوں نے یہ بات محسوس کی کہ انہیں مجروحوں اور بیماروں کے متعلق ایک مکمل ضابطۂ قانون کی ضرورت ہے، چنانچہ انہوں نے سوئٹزرلینڈ کی حکومت سے سفارش کی کہ وہ ایک تیسری جنیوا کانفرنس منعقد کرکے اس کام کی تکمیل کرے۔

اس سفارش کے مطابق سنہ ۱۹۰۱ء، سنہ ۱۹۰۳ء اور سنہ ۱۹۰۴ء میں سوئٹزرلینڈ کی حکومت دول مغرب کو پیہم دعوتیں دیتی رہی۔ مگر کسی طرف سے ہمت افزا جواب نہ ملا۔ آخر خدا خدا کرکے سنہ ۱۹۰۶ء کے موسم گرما میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی، اور اس نے ۶ جولائی کو وہ سمجھوتہ مرتب کیا جو آج مغربی سلطنتوں کا معمولہ قانون ہے۔

اس کے بعد سنہ ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس نے اسی سمجھوتہ کی بنیاد پر ایک اور سمجھوتہ[۱] کیا جس میں انہی قوانین کو بحری جنگ پر منطبق کیا گیا تھا۔ مگر کانفرنس میں شریک ہونے والی ۴۴ سلطنتوں میں سے ۸ نے اس کی توثیق نہیں کی جن میں برطانیہ، اٹلی، یونان، بلغاریا، اور سرویا شامل ہیں، اس لئے یہ سمجھوتہ عملاً بیکار رہا اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ عظیم میں ہسپتالی جہاز آزادی کے ساتھ غرق کیے گئے۔[۲]

ان تمام سمجھوتوں کا اصل الاصول صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ جو دشمن جنگ سے معذور ہو چکا ہو، جس کو زخم یا بیماری نے بیکار کر دیا ہو، اسے کسی قسم کی ایذا پہنچانا انسانیت کے خلاف ہے۔ اسی اصل سے وہ فروعی قواعد نکلتے ہیں جو ہسپتالوں اور ان کے کارکنوں کے متعلق جنیوا اور ہیگ کے سمجھوتوں میں وضع کیے گئے ہیں۔ ان قواعد کا ایک بڑا حصہ محض عملی جزئیات پر مشتمل ہے جو ظاہر ہے کہ حالات اور طریقوں کے تغیر کے ساتھ ساتھ بدلتے ہی رہیں گے۔ دیکھنے کی چیز صرف اصول ہے، سو اس کو مغربی دنیا نے تو آج دریافت کیا ہے، لیکن اسلام ساڑھے تیرہ سو برس قبل اسے طے کر چکا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مغربی دنیا نے اسے اس وقت طے کیا جب سب طاقتیں اس اصول کو ماننے پر راضی ہو گئیں۔ مگر

[۱] Hague Conventions, No. 10

[۲] Oppenheim, International Law Vol II, P. 205

اسلام نے اس اصول کو اپنے مستقل قوانین جنگ میں اس وقت شامل کیا جب غیر مسلم دنیا اس کے ساتھ کسی بھی تصور پر تیار نہ تھی اور لڑائیوں میں مسلمان زخمیوں کو بے تکلف مار ڈالا جاتا تھا۔ ایسے وقت میں اسلام نے اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ تم کو دوسرے فریق کے اچھے یا برے طرز عمل سے بے پروا ہو کر خود اپنے ذاتی فرض کے طور پر زخمیوں اور ان تمام لوگوں پر رحم کھانا چاہئے جو زخمیوں کی طرح معذور ہوں۔

۵۔ مہلک اشیاء کا استعمال | جب سے جدید علوم حکمت نے جنگ کے لئے نئے نئے مہلک سامان اختراع کرنے شروع کئے ہیں، یورپ میں ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ ان ہلاکت بار چیزوں کا استعمال روک دیا جائے۔ زہریلی گیسیں، پھٹنے والی گولیاں، آتش گیر مادے، اور ایسی ہی دوسری چیزیں انسانی جسم پر جو ہولناک اثر پیدا کرتی ہیں، ان کو دیکھ کر یورپ کا ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے اور انسانیت پرور اخلاقیین کا ایک گروہ رائے عام کو بھڑکا کر ارباب سیاست پر دباؤ ڈالتا ہے کہ جنگ میں ایسے وحشیانہ آلات اور اشیاء استعمال نہ کریں۔ مگر فوجی گروہ کو مقاصد جنگ کے حصول میں ان چیزوں سے جو مدد ملتی ہے اس کی وجہ سے وہ ان کا استعمال چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک عرصہ سے کشمکش برپا ہے۔ اور اس کا علاج سیاسی مدبرین نے یہ سوچ رکھا ہے کہ اخلاقیین کو تو وہ بین الملی کانفرنسیں منعقد کر کے اور ان میں انسانیت پرور اقرار نامے تیار کر کے مطمئن کر دیتے ہیں، اور فوجی گروہ کو آزادی کے ساتھ نہ صرف ان تمام چیزوں کے استعمال کی بلکہ ایسی ہی دوسری نئی نئی چیزیں ایجاد کر کے رائج کرنے کی بھی اجازت دے دیتے ہیں۔

ان مہلک اشیاء میں سے بعض چیزیں جو بظاہر زیادہ وحشیانہ صورت رکھتی ہیں، ان کو تو یورپ نے ایک عرصہ سے چھوڑ رکھا ہے۔ زہر کے بجھے ہوئے اسلحہ کا استعمال غالباً اٹھارہویں صدی سے بند ہے۔ کانٹے، شیشے کے ٹکڑے، چاقو کے پھل، اور ایسی ہی دوسری چیزیں توپ میں بھر کر چھوڑنی بھی ایک صدی سے ممنوع ہو چکی ہیں۔ لیکن دوسری چیزیں جو اصلیت کے اعتبار سے ان کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ وحشیانہ ہیں، آج تک برابر استعمال ہو رہی ہیں اور یورپ کی مہذب ترین سلطنتیں ان کے استعمال پر سب سے زیادہ مصر ہیں۔ ۱۸۶۸ء اور ۱۹۰۷ء کی کانفرنسوں میں تمام سلطنتوں نے یہ

اصول تسلیم کیا کہ دشمن کو ایسا جسمانی نقصان نہ پہنچانا چاہئے جو جنگ کے مقاصد میں کسی قسم کی مدد دیئے بغیر اس کی تکالیف میں غیر معمولی اضافہ کرتا ہو۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق حسب ذیل اشیاء کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا:۔

۱۔ اشتعال پذیر اور آتش گیر مادے (Explosive or incendiary projectiles) جن کا وزن ۱۴ اونس سے کم ہو،

۲۔ پھٹنے والی گولیاں جو جسم میں داخل ہو کر پھیل جاتی ہوں،

۳۔ زہریلی اور دم گھونٹنے والی گیسیں،

۴۔ بیلونوں اور ہوائی جہازوں سے پھٹنے والے گولے،

ان میں سے نمبر ۴ کی قید کو تو دو سلطنتوں کے سوا کسی نے قبول نہیں کیا اس لئے وہ گویا پیدا ہوتے ہی مر گئی۔ نمبر ۳ کی قید ابتداءً صرف امریکہ اور انگلستان نے نامنظور کی تھی، مگر بعد میں تقریباً تمام مہذب سلطنتوں نے اس کی خلاف ورزی کی، یہاں تک کہ جنگ عظیم میں سب نے مل کر اس کے پرزے اڑا دیئے۔ جنگ کے بعد واشنگٹن کانفرنس میں دوبارہ اس بندش کو مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی اور ایک جدید میثاق لکھا گیا لیکن آج تک کسی نے اس کی توثیق نہیں کی۔ دوسری قید کے متعلق ابھی تک ماہرین حرب میں اسی امر پر اختلاف ہے کہ پھٹنے والی گولی کی صحیح تعریف کیا ہے؟ پھر جب مسمّیٰ کی تعیین ہی نہیں ہوئی تو اسم کی ممانعت کیا معنی؟ اب رہی پہلی قید، سو وہ صرف کاغذ ہی کی زینت ہے عملی دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جنگ عظیم میں جملہ اقسام کے اشتعال پذیر اور آتش گیر مادے جس آزادی کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں، اس کے بعد کوئی شخص ہیگ کانفرنس اور سینٹ پیٹرسبرگ کے اقرارناموں کو یاد دلا کر اپنے تئیں سامانِ مضحکہ بنانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔[1]

اس معاملہ میں اسلامی قانون نے کسی قسم کی تصریح نہیں کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی خاص

[1] حتیٰ کہ دوسری جنگ عظیم میں ایٹم بم کے استعمال تک نوبت پہنچ گئی جس سے زیادہ ہولناک اور تباہ کن ہتھیار کا کبھی تصور بھی نہیں کیا گیا تھا۔

قسم کے ہتھیار یا سامانِ جنگ کے استعمال کو ممنوع قرار دینا محاربین کے باہمی سمجھوتہ پر منحصر ہے۔ اگر ایک محارب فریق ایک مہلک چیز استعمال کرتا ہے تو دوسرے فریق کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اس چیز کو استعمال نہ کرے۔ اس پر ایسی کوئی پابندی عائد کرنا اس کے حق میں شکست کا قطعی فیصلہ کر دینا ہے۔ اسی لئے اسلام نے مسلمانوں کو ایسے تمام ہتھیار اور طریقِ جنگ اختیار کرنے کی اجازت دی ہے جو ان کے زمانہ میں رائج ہوں، اور اس کے ساتھ ان کو اس معاملہ میں بھی آزاد چھوڑ دیا ہے کہ اگر غیر قوموں سے کوئی ایسا سمجھوتہ ممکن ہو جس سے کسی خاص طریقِ جنگ یا آلۂ جنگ کو مساویانہ اصول پر ترک کیا جا سکتا ہو تو وہ اپنے وقتی مصالح کو دیکھ کر اسے منظور کر لیں۔

۵۔ جاسوسی | جاسوس کو کسی قانون نے پناہ نہیں دی ہے۔ دوسرے قوانین کی طرح مغربی قانون بھی اس کی کوئی قانونی حیثیت تسلیم نہیں کرتا۔ ضوابطِ ہیگ کی دفعہ ۳۰ میں اس نے جاسوس کو صرف یہ رعایت دی ہے کہ اسے مقدمہ چلائے بغیر سزا نہیں دی جا سکتی۔ اور دفعہ ۳۱ کی رو سے اس کو دوسری رعایت یہ دی گئی ہے کہ اگر وہ جاسوسی کر کے اپنی فوج میں واپس پہنچ جائے اور اس کے بعد گرفتار ہو تو اسے پچھلے جرم کی بنا پر کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ ان دو رعایتوں کے ساتھ ہیگ کے ضوابط فوجی حکام کو پورا اختیار دیتے ہیں کہ جس شخص پر جاسوسی کا جرم ثابت ہو اس کو جو چاہیں سزا دیں۔

اس معاملہ میں اسلامی قانون بھی مغربی قانون سے مختلف نہیں ہے۔ دونوں صرف اس حربی کو جاسوس قرار دیتے ہیں جو خفیہ طریقہ سے دشمن کے علاقہ میں گھس کر اس کے اسرار کا تجسس کرتا ہے۔ اور جو شخص بغیر کسی دھوکہ اور فریب کے کھلم کھلا دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لئے جائے اس کو دونوں جاسوس شمار نہیں کرتے۔ البتہ اسلامی قانون نے جاسوس کو وہ رعایات نہیں دی ہیں جو مغربی قانون اس کو دیتا ہے۔ مگر یہ رعایات دراصل وہ مراعات ہیں جو فریقین باہمی سمجھوتہ سے ایک دوسرے کے جاسوسوں کو دیتے ہیں۔ چونکہ تمام سلطنتیں جاسوسوں سے کام لیتی ہیں اور کوئی سلطنت نہیں چاہتی کہ اپنے ایسے جاں نثار آدمیوں کو بالکل دشمن کے رحم پر چھوڑ دے، اس لئے انہوں نے مفاہمت کے ساتھ انہیں کچھ رعایات عطا کر دی ہیں۔ یہ رعایات اگر اسلامی حکومت کے جاسوسوں کو حاصل ہوتی ہوں تو

تو اسلام بھی ان کے عوض محاربین کو ایسی ہی رعایات دے سکتا ہے۔

۷۔ خدع فی الحرب | جنگ میں خدع و فریب جائز ہے۔ فریڈرک اعظم کہتا ہے:

"جنگ میں ایک شخص کبھی شیر کی کھال اوڑھتا ہے، اور کبھی لومڑی کی چالاکی اس جگہ کامیاب ہو جاتی ہے جہاں محض قوت ناکام ہوتی ہے"۔[1]

مگر خدع اور دغا میں فرق ہے۔ کمین گاہوں میں بیٹھنا، دشمن کو بے خبر رکھ کر خطرے کی جگہ کھینچ لانا، غلط اطلاعات سے اس کو دھوکہ دینا، دکھاوے کی پیش قدمی اور دکھاوے کی پسپائی سے اس کو غلط فہمی میں ڈالنا، اس کو پسپائی کا دھوکہ دیکر اچانک جا پڑنا، یہ اور ایسی ہی تمام جنگی چالیں خدع میں داخل ہیں، اور ہر دشمن کا خود اپنا فرض ہے کہ ان کے مقابلہ کے لئے مستعد رہے۔ بخلاف اس کے دشمن کو خطرہ کی علامت دکھا کر قریب تر بلانا اور اس پر حملہ کر دینا، صلح کی گفت و شنید کے بہانے سے سفید پرچم بلند کرنا اور پھر اس پر ٹوٹ پڑنا، فوجوں کی قیام گاہ اور میگزینوں پر وہ علم نصب کرنا جو ہسپتالوں کے لئے مقرر ہیں، عورتوں اور بچوں کو آگے کھڑا کر دینا اور ان کے پیچھے سے گولہ باری کرنا، یہ اور ایسی ہی دوسری حرکات دغا ہیں، اور ان کا ارتکاب کسی فوج کے لئے جائز نہیں ہے۔ لیکن بعض امور ایسے بھی ہیں جن کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دغا کے حکم میں داخل ہیں یا خدع کے حکم میں۔ مثلاً دشمن کا قومی پرچم یا اس کی فوجی وردی استعمال کرنا بین المللی قانون کے علماء نے جائز رکھا ہے، مگر فوجی گروہ اس کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ جرمنی کے قانون میں یہ ایک ممنوع طریق جنگ ہے، اور امریکہ کا قانون جنگ اسے ایک ایسی "بے ایمانی" سے تعبیر کرتا ہے جس کا ارتکاب دشمن کو کسی رعایت کا مستحق نہیں رہنے دیتا۔[2] پس درحقیقت خدع و فریب کے متعلق کوئی ایسا قانون نہیں بن سکتا جو جزئیات پر حاوی ہو۔ یہ سوال ایک قوم کے سپاہیانہ اخلاق سے تعلق رکھتا ہے اور ہر قوم اپنے احساس شرافت کی بنا پر خود ہی فیصلہ کر سکتی ہے کہ کون سے اعمال اس کی شجاعت و بہادری کے منافی ہیں اور کون سے نہیں ہیں۔ اسی لئے ہیگ کے ضوابط میں خدع

---

[1] Kriegsbrauch im Land Kriege, P. 23

[2] امریکہ کی جنگی ہدایات دفعہ ۶۵۔

کی کوئی تشریح نہیں کی گئی اور صرف یہ کہدیا گیا کہ خدع فی الحرب ؛ Ruses of war ؛ اور دشمن کے متعلق اطلاعات حاصل کرنے کے وسائل کا استعمال جائز[1] ہے۔

اس مسئلہ میں بھی اسلام کا قانون مغرب کے قانون سے متفق ہے۔ اس نے بھی خدع فی الحرب کو جائز قرار دیا ہے، اور تفصیلات کو فقہائے زمانہ پر چھوڑ دیا ہے تاکہ وقتی حالات کے مطابق وہ خود فیصلہ کریں کہ کون سی چیزیں خدع کی تعریف میں آتی ہیں اور کون سی نہیں آتیں۔

۸۔ انتقامی کارروائیاں ہیگ کے قوانین اور اس سے قبل یا بعد کے قوانین میں بھی انتقام کے متعلق کسی قسم کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ ہمیں مغربی سلطنتوں کے تسلیم کردہ قوانین میں سے کوئی بھی یہ نہیں بتاتا کہ دشمن کی جانب سے تعدی ہونے کی صورت میں انتقام لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو کس حد تک؟ غالباً ہیگ کانفرنسوں میں اس مسئلہ سے دانستہ اعراض کیا گیا ہے، کیونکہ فوجی گروہ اس کے متعلق تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ شخصی طور پر بین الملی قانون کے بعض ماہرین نے اس کے حدود مقرر کرنے کی کوشش کی ہے بخصوصیت کے ساتھ پروفیسر ہالینڈ کی تجویز کردہ حدود اربعہ قانونی گروہ میں بہت مقبول ہیں جن کا مفاد یہ ہے :۔

۱۔ جس جرم کا انتقام لینا ہو اس کی پہلے کافی تحقیق کر لی جائے،

۲۔ اس جرم سے جو نقصان پہنچا ہو اس کی تلافی کسی اور صورت سے ممکن نہ ہو، اور نہ اصلی مجرم کو سزا دینی ممکن ہو،

۳۔ مخصوص حالات کے سوا ہر انتقامی کارروائی فوج کے سپہ سالار اعظم کی اجازت سے کی جائے[2]

۴۔ انتقام کسی حال میں اصل جرم کی نسبت سے زیادہ نہ ہو۔

لیکن یہ سب علمائے قانون کی شخصی آراہیں جن کو جنگی گروہ نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ جنگ عظیم کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اس مسئلہ میں بین الملی تعامل یہ ہے کہ ہر وہ زیادتی جو ایک فریق کی طرف سے کی جائے، دوسرے

---

[1] ضوابط ہیگ، دفعہ ۲۴۔

[2] Holland, Laws of war on Land

فریق کے لئے بھی ویسی ہی زیادتیوں کو جائز کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اسیران جنگ کو اذیت پہنچانا، ہسپتالی جہازوں پر حملہ کرنا، تجارتی جہازوں کو غرق کرنا، غیر محفوظ آبادیوں پر گولہ باری کرنا، زہریلی گیسیں اور پھٹنے والی گولیاں استعمال کرنا قوانین جنگ کی رو سے ناجائز ہے، مگر جنگ عظیم میں ہر فریق ان تمام حرکات کا ارتکاب اس عذر پر کرگزرا کہ دوسرا فریق ان کا ارتکاب کر چکا ہے۔

اس مسئلہ میں اسلام کا قانون بالکل صاف ہے۔ وہ کہتا ہے:

وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ انہ لا یحب الظالمین (الشوریٰ-۴)

بدی کا بدلہ بدی ہے اسی کے مثل، اور جو معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، کیونکہ وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم لھو خیر للصابرین (النحل-۱۶)

اگر تم سزا دو تو اتنی ہی سزا دو جتنی تمہیں تکلیف دی گئی ہے اور صبر کرو تو یہ صابروں کے لئے زیادہ بہتر ہے۔

فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم واتقوا اللہ (البقرہ-۲۴)

جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے، مگر اللہ سے ڈرتے رہو۔

قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (البقرہ-۲۴)

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں، مگر حد سے نہ بڑھ جاؤ، کیونکہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ان آیات میں اول تو انتقام نہ لینے اور صبر کرنے کو زیادہ بہتر قرار دیا گیا ہے، اور مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت بھی دی گئی ہے تو اس شرط کے ساتھ کہ انتقام اسی حد تک ہو جس حد تک زیادتی کی گئی ہے۔ پھر یہ بھی تاکید کی گئی ہے کہ انتقام میں تقویٰ کو ملحوظ رکھا جائے اور کسی حال میں شریعت کی حدود سے قدم نہ بڑھایا جائے۔ تقویٰ اور حدود کی پابندی سے مراد یہ ہے کہ جو افعال شریعت میں فی نفسہ حرام و ناجائز ہیں ان کا ارتکاب کسی حال میں نہ کیا جائے۔ مثلاً اگر دشمن کے سپاہی ہمارے ملک میں گھس کر ہماری عورتوں کی بے حرمتی کریں، یا ہمارے مقتولوں کا مثلہ کریں تو ہمارے لئے اس کے

جواب میں ان کی عورتوں سے زنا کرنا اور ان کے مقتولوں کا مُثلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ یا مثلاً وہ دوران جنگ میں ہماری عورتوں، بچوں، بوڑھوں، زخمیوں، اور بیماروں کو قتل کریں تو ہمیں ان کے اس فعل کی پیروی نہیں کرنی چاہئے۔ بخلاف اس کے اگر وہ ہمارے خلاف زہریلی گیسیں استعمال کریں، یا ہم پر پھٹنے والے بم پھینکیں، تو ہمیں پورا حق ہے کہ اسی طاقت اور ساخت کے آلاتِ جنگ ان کے خلاف استعمال کریں۔

غیر مقاتلین کے حقوق و فرائض مقاتلین کے باہمی معاملات کا ذکر ہو چکا، اب ہم ان قوانین کی طرف توجہ کرتے ہیں جو مقاتلین اور غیر مقاتلین کے باہمی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یورپ میں غیر مقاتلین کے حقوق کا احساس بہت بعد میں پیدا ہوا ہے۔ نظری حیثیت سے تو اس کی ابتدا اٹھارویں صدی میں ہو گئی تھی، لیکن عملی حیثیت سے انیسویں صدی کے وسط تک کوئی ایسا قانونِ جنگ موجود نہ تھا جو ان کو مقاتلین سے ممیز رکھنے کی تاکید کرتا ہو۔ الجزائر میں فرانس نے، غدر دہلی میں انگلستان نے، اور جنگ جزیرہ نما (Peninsular war) میں افواجِ متحدہ نے جس آزادی کے ساتھ غیر مقاتلین کا قتل عام کیا اس سے عہدِ وحشت کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ یوں تو علمائے قانون گروشیوس کے عہد سے ان کے حقوق کی تعیین پر زور دے رہے ہیں، مگر عملاً یہ کام پہلی مرتبہ ۱۸۷۴ء میں برسلز کانفرنس نے شروع کیا۔ ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس نے اس میں باضابطگی پیدا کی، اور ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس نے اس کو مکمل کیا۔ لہٰذا غیر مقاتلین کے متعلق مغربی تہذیب کے قوانین کی عمر زیادہ سے زیادہ ۴۵ سال قرار دی جا سکتی ہے۔

اس حدیث العہد قانون نے غیر مقاتلین کے حقوق و فرائض کی تعیین نہایت وسیع پیمانہ پر کی ہے اور جزئیات و فروع کے احاطہ میں بہت کافی غلو سے کام لیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یورپ میں جنگ کے جو جدید طریقے اور اصول پیدا ہو گئے ہیں ان کی بدولت مقاتلین و غیر مقاتلین کے درمیان فرق و امتیاز قریباً ناممکن ہو گیا ہے، اور یہ کہنا کسی طرح مبالغہ نہیں ہے کہ آج کل کی جنگ غیر مقاتلین کے حق میں عہدِ وحشت کی جنگ سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس حقیقت کو خود یورپ کے اکابر فن محسوس کر رہے

ہیں۔ چنانچہ لارڈ برکن ہیڈ اپنی کتاب "بین الملی قانون" میں لکھتے ہیں :-

"بدقسمتی سے گذشتہ جنگ عظیم جس طریقہ پر لڑی گئی ہے اس سے بلاشائبہ ریب یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سول آبادی اور مسلح فوج کے درمیان تمیز کرنے کا ترقی یافتہ اصول اب نیست و نابود ہونے کے خطرہ میں ہے۔" [۱]

اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ فرق و امتیاز جن قوانین کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے وہ خود نہایت بے بنیاد ہیں، جیسا کہ گارنر اپنی کتاب "بین الملی قانون اور جنگ عظیم" میں لکھتا ہے :-

"۱۹۰۷ء کے ہیگ کنونشن کی دفعات کو جب ہم ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے واقعات سے مقابلہ کر کے دیکھتے ہیں تو ہمیں اس امر واقعہ کو یاد رکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ جنگ عظیم کے تمام شرکاء نے اس کنونشن کی توثیق نہیں کی تھی، لہٰذا یہ امر بہت مشکوک تھا کہ آیا اس کنونشن کے وضع کردہ قوانین سب کے لئے واجب العمل ہیں یا نہیں؟" [۲]

لیکن اس کی اصلی وجوہ کچھ اور ہیں جنہیں پروفیسر اوپن ہائم نے اپنی عالمانہ کتاب "بین الملی قانون" میں بیان کیا ہے۔ اس کی تحقیق کے مطابق موجودہ عہد کی جنگ میں متقاتلین اور غیر متقاتلین کے امتیازی خط کے مٹ جانے کی علت چار چیزوں میں پوشیدہ ہے :-

(۱) جبریہ بھرتی کے طریقہ کی اشاعت، اور ایک قوم کی پوری آبادی کا جنگی خدمت میں اس طرح لگ جانا کہ مضبوط جسم کے لوگ میدان پر چلے جائیں اور ان کی جگہ عورتیں اور کمزور مرد سامان جنگ بنانے اور دوسرے فرائض ادا کرنے میں مشغول ہو جائیں۔

(۲) ہوائی جہازوں کا استعمال، جو صرف قلعوں اور جنگی استحکامات ہی پر نہیں بلکہ مواصلات اور حمل و نقل کے خطوط کو بھی برباد کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ [۳]

---

[۱] International Law, P. 205

[۲] International Law and the World War PP. 16-18

[۳] دوسری جنگ عظیم میں اس سے آگے بڑھ کر ہوائی حملہ کی یہ غرض بھی قرار پا گئی کہ دشمن کی معاشی اور صنعتی طاقت کو باقی ص ۴۷۱ پر

(۳) جمہوری حکومتوں کا ان لوگوں کی رائے کی پابندی سے آزاد ہونا جو دراصل ان کو منتخب کرتے ہیں۔

(۴) دشمن پر معاشی دباؤ ڈالنے اور اس کے وسائل ثروت برباد کرنے کی جنگی اہمیت۔[1]

پس موجودہ زمانہ کی "مہذب" جنگ میں غیر مقاتلین کے حقوق محفوظ نہ رہنے کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ مغرب کے قوانین جنگ کی بنیاد کمزور ہے، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کی جنگ جن وسائل اور جن طریقوں سے لڑی جاتی ہے ان میں غیر مقاتلین کو مقاتلین سے ممتاز کرنا، اور ان کے امتیازی حقوق کا احترام ملحوظ رکھنا غیر ممکن ہو گیا ہے۔

تاہم ان اصولی نقائص کے باوجود ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ مغربی قانون نے غیر مقاتلین کے لئے کیا حقوق و فرائض مقرر کئے ہیں اور وہ بذات خود کیا قیمت رکھتے ہیں؟

غیر مقاتلین کا اولین فرض — غیر مقاتلین کا اولین فرض جس کا ہر محارب دشمن مطالبہ کرتا ہے، یہ ہے کہ وہ جنگی کارروائیوں میں کسی قسم کا حصہ نہ لیں۔ جس وقت ان کے سامنے دشمن نمودار ہو تو ان کو فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ آیا انہیں جنگ میں حصہ لینا ہے یا نہیں۔ اگر وہ جنگ میں حصہ لینے کا فیصلہ کریں تو ان کو اپنی قومی فوج میں باقاعدہ شریک ہو جانا چاہیئے، اور اگر وہ حصہ نہ لینا چاہیں تو اپنے کاروبار میں پر امن طریقہ سے مشغول رہنا چاہیئے۔ ان میں سے جو لوگ کسی ایک بات کا فیصلہ نہ کریں گے اور بے قاعدہ طریقہ سے جنگ میں حصہ لیں گے، ان کو مغربی قوانین جنگ کی رو سے نہ تو مقاتلین کے حقوق حاصل ہوں گے اور نہ غیر مقاتلین کے یعنی ان کے ساتھ رحم کا برتاؤ نہیں کیا جائیگا، ان کو کسی حال میں امان نہیں دی جائیگی، اور انہیں گرفتار ہونے کی صورت میں اسیران جنگ کا رتبہ بھی نہیں دیا جائیگا۔[2]

اس مسئلہ میں اسلامی قانون اس حد تک تو بین المللی قانون سے متفق ہے کہ جو غیر مقاتلین جنگ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) برباد کیا جائے۔ اس غرض کے لئے بہت بڑے پیمانہ پر صنعتی و تجارتی مرکزوں اور بندرگاہوں پر بمباری کی گئی اور بڑے بڑے شہروں کو تہس نہس کر دیا گیا۔

[2] Lawrence, P. 345 [1] Lawrence, P. 345

میں حصہ لیں گے انہیں وہ حقوق حاصل نہ رہیں گے جو غیر مقاتلین کے لئے مخصوص ہیں لیکن اسلام اس سے متفق نہیں ہے کہ ان کو مقاتلین کے حقوق بھی نہ دیئے جائیں۔ وہ ہر اس شخص کو جو مقاتلہ کرے مقاتلین کے حقوق دیتا ہے، البتہ ایسی حالت میں وہ ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا جب کہ وہ مقاتلہ کے ساتھ غدر اور دغابازی بھی کرتے ہوں۔ مثلاً کوئی عورت اگر خفیہ طریقہ سے مسلمانوں کے پانی میں زہر ملا دے تو وہ یقیناً قتل کی جائے گی، یا کوئی شخص مسلمانوں کی پناہ میں آکر انہیں دھوکہ سے نقصان پہنچائے تو اس پر ہرگز رحم نہ کیا جائے گا۔ قبائل عکل و عرینہ کے لوگوں نے یہی کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ میں آکر رہے اور دھوکہ سے آپ کے چرواہوں کو قتل کر کے اونٹ ہانک لے گئے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مقاتلین و غیر مقاتلین دونوں کے حقوق سے محروم کر دیا اور انہیں ڈاکو اور رہزن قرار دے کر نہایت عبرتناک سزا دی۔

غیر مقاتلین کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ جب دشمن کی فوج ان کے علاقہ سے گزرے یا ان سے رہنمائی کا مطالبہ کرے تو وہ اس کو صحیح راستہ بتائیں، اگر وہ وسائل نقل و حمل طلب کرے تو وہ انہیں اس کی خدمت کے لئے دے دیں، اور اس کے جنگی اعمال میں کسی قسم کی مزاحمت نہ کریں۔ اس کے خلاف عمل کرنے کی صورت میں حملہ آور فوج کو سخت سزا دینے کا حق حاصل ہے۔[1]

اس مسئلہ میں اسلامی اور مغربی قوانین متفق ہیں۔

۲۔ غیر مقاتلین کی عصمت: ان فرائض کے مقابلہ میں غیر مقاتلین کا ایک بنیادی حق یہ ہے کہ ان کو جنگ میں قتل و غارت سے محفوظ رہنا چاہئے۔ اگرچہ حالت جنگ میں بعض اوقات ان کا بھی فوجوں کی زد میں آجانا ناگزیر ہے، مثلاً ایک جنگی مقام پر گولہ باری ہو رہی ہو اور اس میں عورتیں اور بچے بھی ہوں تو ان کا بچنا غیر ممکن ہوگا۔ یا مثلاً ایک ریل گاڑی میں مقاتلین اور غیر مقاتلین سفر کر رہے ہوں اور دشمن اس پر آپڑے تو لامحالہ کچھ غیر مقاتلین بھی مارے جائیں گے لیکن اس طرح نادانستہ اور ناچار جنگ کی زد میں آجانے سے ان کی حفاظت کے بنیادی اصول پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ قانون کی رو سے

[1] Lawrence, P. 345

حملہ آور فوج کا فرض ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنی جنگی کارروائیوں کا رخ غیر مقاتلین کی طرف نہ پھیر دے اور جہاں تک ممکن ہو ان کو بچانے کی کوشش کرے۔[1]

اس معاملہ میں بھی اسلامی قانون اور مغربی قانون باہم متفق ہیں۔ اسلامی قانون نے غیر مقاتلین پر محض دانستہ حملہ کو ممنوع قرار دیا ہے، باقی رہی یہ صورت کہ جنگی اعمال کے دوران میں نادانستہ ان پر بھی ضرب لگ جائے، سو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ چنانچہ طائف کے محاصرہ میں جب دبابہ اور منجنیق وغیرہ قلعہ شکن آلات استعمال کئے گئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ ان کی سنگ باری سے شہر کے غیر اہل قتال کو بھی نقصان پہنچنا ممکن ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنا پر ان کے استعمال کو جائز رکھا کہ اس کا اصل مقصد فصیل توڑنا تھا، غیر مقاتلین کو ہدف بنانا مقصود نہ تھا۔

۴- غیر محفوظ آبادیوں پر گولہ باری

غیر مقاتلین کا حق مامونیت تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنگی اعمال میں اس کو کس طرح ملحوظ رکھا جائے؟ اس مسئلہ میں جنگی اور قانونی گروہوں کے درمیان بہت بڑا اختلاف ہے، اور اب خود قانونی گروہ کی رائے بھی جنگی گروہ کی رائے سے مغلوب ہوتی جا رہی ہے۔

اگر لڑائی دست بدست ہو، یا دو مقابل فوجوں کے درمیان ہو، تو غیر مقاتلین کو تلوار کی زد سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں میلوں کے فاصلہ سے گولہ باری ہو رہی ہو، اور خصوصیت کے ساتھ جہاں غنیم کے کسی شہر کو فتح کرنا مقصود ہو، وہاں غیر مقاتلین کو مہالک جنگ سے محفوظ رکھنے کی کیا صورت ہے؟

اس سوال کا جواب قانونی گروہ یہ دیتا ہے کہ گولہ باری کے حق پر قیود عائد کرنی چاہئیں اور جنگی گروہ کہتا ہے کہ کسی قسم کی قیود عائد نہ کرنی چاہئیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں ان کی حفاظت کا یہ طریقہ تجویز کیا گیا تھا کہ گولہ باری سے قبل غیر مقاتلین کو مہلت دینی چاہئے کہ وہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں۔ سنہ ۱۸۷۰ء کی جنگ میں جرمنی نے ایک دو مقامات پر اس تجویز کی تعمیل بھی کی۔ مگر بعد میں فوجی گروہ نے بالاتفاق فیصلہ کیا کہ اس قسم کی مہلت دینا جنگی مصالح کے بالکل خلاف ہے۔ چنانچہ جب جرمن فوجوں نے پیرس پر گولہ باری شروع کی تو غیر مقاتلین کو نکلنے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ بالفاظ صریح یہ کہہ دیا کہ اس وقت پر

---

[1] Lawrence, P. 345

میں غیر مقاتلین کا موجود رہنا ہی مطلوب ہے، تاکہ غنیم فاقہ کی مصیبت میں مبتلا ہو کر شہر کو ہمارے حوالہ کر دے۔
اس کے تھوڑے عرصہ بعد امیر البحر آذبے کا وہ مشہور مضمون شائع ہوا جس نے فوجی گروہ میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ اس نے جنگ میں غنیم کے وسائل ثروت کو برباد کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیا اور یہاں تک لکھ دیا کہ:-

"آئندہ جنگ میں ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ مسلح بیڑے اپنی قوت ضرب و تخریب کا رُخ ساحلی شہروں کی طرف پھیر دیں گے، خواہ وہ شہر قلعہ بند ہوں یا نہ ہوں، خواہ وہ وسائل مدافعت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔ وہ ان کو جلائیں گے، تباہ کریں گے، اور کم از کم اتنا تو ضرور کریں گے کہ پوری بے دردی سے ان سے فدیہ وصول کریں گے۔"[1]

اس کے چند سال بعد ۱۸۸۸ء میں انگلستان کے بحری بیڑے کی مصنوعی جنگ ہوئی جس میں منجملہ اور کارروائیوں کے ایک یہ بھی تھی کہ ساحلی آبادیوں پر حملے کئے گئے، اور ان سے فدیہ وصول کیا گیا۔ اس پر پروفیسر ہالینڈ نے سخت اعتراض کیا اور لندن ٹائمز میں مسلسل مضامین لکھے جن سے یہ سوال چھیڑ گیا کہ آیا شہری آبادیوں پر گولہ باری کرنی جائز ہے یا نہیں؟ قانونی گروہ کی رائے یہ تھی کہ یہ فعل ناجائز ہے، مگر امارت بحریہ کے اعلیٰ افسروں نے اس کو بالکل جائز قرار دیا اور ۱۸۸۹ء میں امراء البحر کی ایک کمیٹی نے بالاتفاق اس کے حق میں رپورٹ کی۔[2]

۱۸۹۹ء میں جب پہلی ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی تو یہ مسئلہ از سر نو پیش ہوا۔ اس وقت کانفرنس پر قانونی گروہ کا غلبہ تھا اور جنگی گروہ بھی سلطنتوں کے سیاسی مصالح کا لحاظ کر کے خاموش ہو گیا تھا اس لئے بری جنگ کے ضوابط میں گولہ باری کے حق پر قیود عاید کی گئیں اور ۱۹۰۷ء کی کانفرنس میں بحری جنگ پر بھی ان قیود کو وسیع کر دیا گیا۔ یہ قیود حسب ذیل ہیں:-

"ایسے شہروں، قریوں، بستیوں، اور عمارتوں پر گولہ باری کرنا یا کسی دوسرے ذریعہ سے حملہ

۱۔ Revue de Deux Mondes, 1882, PP. 314-46

۲۔ Birkenhead, P. 228

کرنا ممنوع ہے، جو غیر محفوظ ہوں (ضوابط ہیگ، دفعہ ۲۵)۔

ایک حملہ آور فوج کے امیر پر لازم ہے کہ گولہ باری شروع کرتے وقت محصور آبادی کے حکام کو متنبہ کر دینے کے، وہ تمام ذرائع استعمال کرے جو اس کے اختیار میں ہوں، اِلّا اس صورت میں کہ فوری حملہ ناگزیر ہو (دفعہ ۲۶)

گولہ باری اور قلعہ گیری کے موقع پر تمام ممکن طریقوں سے ایسی عمارتوں کو جو مذہبی یا علوم و فنون یا خیراتی اغراض کے لئے وقف کی ہوئی ہوں، اور تاریخی یادگاروں، ہسپتالوں اور ایسے مقامات کو جہاں زخمی اور بیمار رکھے گئے ہوں، بچانے کی کوشش کرنی چاہئے، بشرطیکہ وہ عمارات اس وقت جنگی اغراض کے لئے استعمال نہ کی جا رہی ہوں" (دفعہ ۲۷)

اسی طرح بحری جنگ کے قوانین کے متعلق دوسری ہیگ کانفرنس کی مفاہمت نمبر ۹ میں گولہ باری و قلعہ گیری پر حسب ذیل قیود عائد کی گئیں:۔

دفعہ اول۔ غیر محفوظ شہروں، بندرگاہوں، قریوں، بستیوں، اور عمارتوں پر قوائے بحریہ کا گولہ باری کرنا ممنوع ہے۔ کسی بندرگاہ پر صرف اس وجہ سے گولہ باری نہیں کی جاسکتی کہ اس کے پاس خودبخود تصادم سے پھٹنے والی تحت البحر سرنگیں (Automatic Submarine contact mines) لنگر انداز ہیں[1]۔

دفعہ دوم۔ فوجی کارخانے، فوجی یا بحری محکمے، اسلحہ خانے، سامانِ جنگ کے گودام، ایسے کارخانے یا انجن جو غنیم کی فوج یا بیڑے کے کام آسکتے ہوں، اور بندرگاہ میں ٹھہرے ہوئے جنگی جہاز اس ممانعت میں داخل نہیں ہیں۔ بحری قوت کا کمانڈر ابتداءً نوٹس دینے اور کافی عرصہ انتظار کرنے کے بعد ان کو برباد کر سکتا ہے اگر دشمن خود ان کو برباد نہ کر دے۔ ایسے حالات میں اگر کچھ ناگزیر نقصان پہنچے تو وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر جنگی اسباب کی بنا پر فوری کاروائی ضروری ہو، اور دشمن کو کوئی مہلت نہ دی جاسکتی ہو، تو شہر کے غیر محفوظ حصہ

---

[1] اس دفعہ کے آخری فقرہ سے برطانیہ، فرانس، جاپان اور جرمنی نے اختلاف کیا۔

کی حرمت ملحوظ رکھنی چاہئے، اور کمانڈر کو کوشش کرنی چاہیئے کہ شہر کو کم سے کم ممکن نقصان پہنچے۔

دفعۂ سوم۔ اگر مقامی حکام کسی بحری قوت کے باقاعدہ مطالبہ کے باوجود اس کے لئے ضروری سامان رسد و مایحتاج مہیا نہ کریں تو ان کو مناسب مہلت دینے کے بعد غیر محفوظ بندرگاہ، شہر، گاؤں، بستی، یا عمارت پر گولہ باری کی جاسکتی ہے۔

دفعۂ چہارم۔ مالی تاوان ادا نہ کرنے کی پاداش میں کسی غیر محفوظ مقام پر گولہ باری نہیں کی جاسکتی۔

دفعۂ پنجم۔ جب کوئی بحری قوت کسی شہر پر گولہ باری شروع کرے تو اس کے کمانڈر کو پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو، مقدس عمارات، اور عمارات موقوفہ برائے علوم و فنون و امور خیریہ، اور تاریخی یادگاروں اور ہسپتالوں، اور ان مقامات کو جہاں زخمی اور بیمار رکھے جاتے ہوں، ضرر نہ پہنچے، بشرطیکہ انہیں جنگی اغراض کے لئے استعمال نہ کیا جارہا ہو۔ اس شہر کے باشندوں کو چاہیئے کہ اس قسم کی عمارات کو ایسی مرئی علامات سے ممتاز کریں جو بڑے بڑے مستطیل اضلاع پر مشتمل ہوں اور جن میں بشکل وتر دو رنگ کے مثلث بنائے جائیں، اوپر کا مثلث سیاہ اور نیچے کا سفید۔

دفعۂ ششم۔ اگر فوجی حالات اجازت دیں تو گولہ باری کرنے سے قبل حملہ آور قوت کے کمانڈر کو چاہیئے کہ مقامی حکام کو متنبہ کرنے کی پوری کوشش کرے۔

یہ قیود فی نفسہٖ نہایت ناقص ہیں۔ ان کا سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ ان میں غیر محفوظ مقام کی کوئی تعریف و تحدید نہیں کی گئی۔ ان سے بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ ایک مقام کن علامات سے محفوظ قرار دیا جائیگا اور کن چیزوں کے موجود نہ ہونے کے باعث وہ غیر محفوظ سمجھا جائے گا۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ گولہ باری کرنے سے قبل اہل شہر کو متنبہ کرنے کا معاملہ کلیتہً حملہ آور فوج کے کمانڈر پر چھوڑ دیا گیا ہے، یہاں تک کہ اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ اگر چاہے تو متنبہ نہ کرے۔ تیسرا نقص یہ ہے کہ ایک طرف مقدس عمارات اور علمی و تاریخی یادگاروں کی حرمت کی تاکید کی گئی ہے، اور دوسری طرف یہ شرط بھی لگا دی

گئی ہے کہ وہ جنگی اغراض کے لئے استعمال نہ کی جا رہی ہوں۔ اس سے ایک حملہ آور فوج یا بیڑے کا کمانڈر ہر وقت یہ بہانہ کر سکتا ہے کہ اس کے علم میں وہ عمارات جنگی اغراض کے لئے استعمال کی جا رہی تھیں لہٰذا وہ ان پر گولہ باری کرنے کا مجاز تھا لیکن ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان میں حملہ آور فوج کو ایسی حالت میں غیر محفوظ آبادیوں کو تباہ کرنے کا حق دے دیا گیا ہے جبکہ ان کے باشندے اس کے لئے سامان رسد و مایحتاج مہیا کرنے سے انکار کر دیں۔ اس ایک بات نے ان تمام قیود کو بے معنی کر دیا ہے۔ کیونکہ ایک حملہ آور فوج کے لئے یہ بالکل آسان ہے کہ جب وہ کسی "غیر محفوظ" آبادی پر حملہ کرنا چاہے تو اس سے اتنا سامان رسد طلب کرے جسے وہ کسی حال میں ادا نہ کر سکتی ہو اور جب وہ ادا نہ کرے تو اس پر گولہ باری شروع کر دے۔ اگرچہ مفاہمت نمبر ۹ کی دفعہ سوم کے دوسرے فقرے میں یہ توضیح بھی کر دی گئی ہے کہ سامان رسد کا مطالبہ اس مقام کے وسائل کی مناسبت سے ہونا چاہئے، مگر سوال یہ ہے کہ مقامی وسائل کی "مناسبت" کا فیصلہ کون کرے گا؟ اگر حملہ آور فوج کی رائے میں ایک خاص مقدار کا مطالبہ اس مقام کے لئے مناسب ہو اور مقامی حکام کے نزدیک وہ مناسب نہ ہو تو ایسی صورت میں کون سی عدالت یہ فیصلہ کرنے آئے گی کہ فریقین میں سے کس کا قول صحیح ہے؟

لیکن ان نقائص کے باوجود فوجی گروہ نے ان قیود سے علانیہ اختلاف کیا ہے۔ گولہ باری سے قبل دشمن کو متنبہ کرنے اور مہلت دینے کے متعلق وہ کہتا ہے کہ ایسا کرنا "قیمتی وقت کو کھو دینے کا ہم معنی ہے"[1] سامان رسد کا مطالبہ مقامی وسائل کی مناسبت ملحوظ رکھ کر کرنے کی جو شرط لگائی گئی ہے اس کے متعلق یہ گروہ کہتا ہے کہ وہ "نظری حیثیت سے بہت خوب ہے، مگر اس پر عمل کرنا ناممکن ہے"[2] سب سے زیادہ یہ کہ اس گروہ کے نزدیک گولہ باری کے موقع پر غیر مقاتلین کی رعایت کرنا صرف یہی نہیں کہ غیر ضروری ہے، بلکہ ان کو خاص طور پر ہدف بنانا جنگی مصالح کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ

---

[1] Kriegsbrauch, P. 19

[2] Kriegsbrauch, P. 62

وہ کہتا ہے :-

"گولہ باری کے وقت محصورین میں عورتوں، بچوں، اور دوسرے غیر مقاتلین کا موجود ہونا ہی جنگی نقطۂ نظر سے مطلوب ہے، کیونکہ صرف اسی صورت سے محاصر فوج محصورین کو خوفزدہ کر کے ہتھیار ڈالنے پر جلدی سے جلدی مجبور کر سکتی ہے"[1]

یہ خیالات صرف زبان و قلم ہی سے ظاہر نہیں کیے گئے، بلکہ عمل میں بھی ہیگ کانفرنس کی مقرر کردہ قیود کا تار و پود بکھیر دیا گیا۔ ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس کے بعد یورپ میں پہلی جنگ اٹلی اور ترکی کے درمیان ہوئی، اور اس میں اٹلی نے شہر بیروت پر گولہ باری کر کے غیر محفوظ شہری آبادی کے ایک حصہ کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد دوسری جنگ دول متحدہ بلقان اور ترکی کے درمیان ہوئی اور تھریس و مقدونیہ میں غیر مقاتلین کو علانیہ قتل و غارت کیا گیا۔ تنہا مغربی تھریس کے متعلق تحقیق ہوا ہے کہ وہاں ۴۲۰۰۰ مسلمان غیر مقاتلین تلوار کے گھاٹ اتارے گئے[2]۔ اس کے بعد جب ۱۹۱۴ء میں یورپ کی مہذب ترین سلطنتوں کے درمیان جنگ عظیم برپا ہوئی تو یہ تمام قیود اس طرح توڑ دی گئیں گویا کہ وہ قائم ہی نہیں ہوئی تھیں۔ برکن ہیڈ اپنی کتاب بین الملی قانون میں لکھتا ہے :-

"جنگ عظیم سے قبل محفوظ اور غیر محفوظ آبادیوں کے درمیان جو امتیاز قائم کیا گیا تھا، جنگ عظیم نے اس کا تار و پود بکھیر دیا ہے۔ اب سرے سے محفوظ و غیر محفوظ کی تعریف و تحدید ہی میں بہت بڑا اختلاف پیدا ہو گیا ہے، اور جنگ کے بعد سے آج تک ان کے درمیان حد بندی و نشان امتیاز قائم کرنے کی کوئی خاص کوشش بھی نہیں کی گئی ہے"[3]

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جس چیز نے ہیگ کی قیود کو مٹانے میں حصہ لیا ہے وہ ہوائی جہازوں کا جنگی استعمال ہے۔ ہوائی جہاز دراصل اس معنی میں کوئی آلۂ جنگ ہی نہیں ہے کہ اس

---

[1] Kriegsbrauch, P. 21

[2] "بمبئی کرانیکل" مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۲۲ء میں مسٹر پکتھال کا مقالہ افتتاحیہ۔

[3] Birkenhead, P. 226

سے جنگ کے مقصد کی طرف کوئی اقدام ہوتا ہو۔ جنگ کا اصلی مقصد غنیم کی فوجی طاقت کو توڑنا اور غنیم کے زیادہ سے زیادہ علاقہ پر قبضہ کر لینا ہے۔ لیکن ہوائی جہاز یہ دونوں کام نہیں کر سکتا۔ البتہ وہ صرف اتنا کر سکتا ہے کہ فضائے آسمانی سے عام آبادیوں پر بلا امتیاز گولے برسائے، عورتوں، بچوں، بیماروں اور زخمیوں سمیت سب کو برباد کر دے، شہروں اور قصبوں کو بم برسا کر نہس نہس کر دے، دشمن قوم کے عوام کو اس حد تک خوفزدہ اور پریشان کر دے کہ وہ جنگ سے جی چرانے لگیں، اور اس طرح اپنے دشمن کی اخلاقی قوت توڑ دے۔ جنگ عظیم سے قبل قانونی گروہ اس طریق جنگ کو حرام و ناجائز سمجھتا تھا، مگر جنگ عظیم میں جب یہ ایک عام اور معمول بہ طریق جنگ بن گیا تو خود قانونی گروہ کے نقطۂ نظر میں بھی تغیر واقع ہو گیا اور وہ اس کو ایک ناگزیر طریقہ سمجھنے لگا۔ چنانچہ ایلبنر باشر لکھتا ہے:۔

"جنگی کارروائی کی بہت سی اقسام ایسی ہیں جو صرف اس بنا پر جائز ہیں کہ ان کا مدعا غنیم کی قوت جنگ کی معنوی بنیاد کو پراگندہ کرنا ہوتا ہے، (غیر محفوظ ساحلی شہروں پر گولہ باری بھی اسی قسم کی جائز کارروائیوں میں سے ہے، کیونکہ اس سے غنیم کی معاشی زندگی پراگندہ ہو جاتی ہے، اور اس کے علاوہ دشمن کی رعایا میں ایک خاص قسم کی خوفزدگی پیدا ہو جاتی ہے) ...... اسی دلیل کی بنا پر ہوائی جہازوں سے بم گرانے پر بھی کوئی پابندی عائد نہ ہونی چاہیے۔ ان حملوں کے مسئلہ میں مستحکم یا محفوظ مقامات کے درمیان کوئی امتیاز قائم کرنا بے سود ہے، کیونکہ اکثر حالات میں کسی مقام پر بم اس لئے نہیں گرائے جاتے کہ اسے فتح کیا جائے، بلکہ ان سے محض دشمن کی معاشی زندگی کو پراگندہ کرنا، اور دشمن قوم میں ہراس اور جنگ سے بیزاری پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، اور یہ مقصد انہیں گولوں سے حاصل ہوتا ہے جو غیر مستحکم مقامات پر گرائے جاتے ہیں۔"[1]

جنگ عظیم کے بعد خاص طور پر ہوائی جہازوں کی گولہ باری کے لئے حدود مقرر کرنے کا سوال پیدا ہوا اور یورپ و امریکہ کی رائے عام نے زور دیا کہ اس کے لئے قواعد و ضوابط مقرر کئے جائیں۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں

---

[1] Nippold, P. 124

واشنگٹن کانفرنس نے اس غرض کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جس میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، ہالینڈ، جاپان اور امریکہ کے نمایندے شامل تھے۔ انہوں نے بہت کچھ غور و خوض کے بعد ۱۹۲۳ء میں چند سفارشات پیش کیں جن کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) ہوائی جہازوں سے گولہ باری کرنا صرف اس صورت میں جائز ہے کہ ان کے ہدف فوجی مقامات ہوں۔ فوجی مقامات سے مراد ہیں قوائے حرب، جنگی کارخانے، جنگی گودام، جنگی محکمے اور عملے، آلات و اسباب جنگ بنانے والے کارخانے، خطوط و ذرائع حمل و نقل جو جنگی اغراض کے لئے مستعمل ہوں۔

(۲) ان فوجی مقامات پر بھی ایسی حالت میں گولہ باری نہیں کرنی چاہیئے جبکہ وہ ایسی جائے وقوع میں ہوں جہاں شہری آبادی کو نقصان پہنچائے بغیر ان پر ضرب نہ لگائی جا سکتی ہو۔

(۳) ایسی بستیاں اور عمارتیں جو عین حلقۂ جنگ میں واقع ہوں، اور جن کے متعلق یہ یقین کرنے کی وجہ موجود ہو کہ ان میں اجتماع افواج ہوا ہے، ہوائی گولہ باری کے لئے جائز ہدف بن سکتی ہیں، مگر حلقۂ جنگ سے باہر کسی آبادی پر گولہ باری نہیں کی جا سکتی۔ اس لحاظ سے ہر وہ گولہ باری جس کا مقصد شہری آبادیوں کو پریشان کرنا اور شخصی املاک کو برباد کرتا ہو، ممنوع ہے۔

(۴) جو ہوائی جہاز راں چھتری (Parachute) کے ذریعہ جان بچا رہا ہو، اس پر حملہ کرنا ممنوع ہے۔[۱]

مگر یہ قوانین اب تک محض زیب قرطاس ہی ہیں، کسی سلطنت نے ان کو قبول کر کے اپنی کتاب آئین میں داخل نہیں کیا ہے[۲] اور صرف یہی نہیں بلکہ ابھی یہ بھی مشکوک ہے کہ جنگ میں ان کی پابندی کی بھی جا سکتی ہے یا نہیں؟ چنانچہ برکن ہیڈ لکھتا ہے:-

---

[۱] Brikenhead, PP. 226-27

[۲] Birkenhead, P. 205

"ان مجوزہ قوانین پر، جن کا مقصد ہوائی گولہ باری کو منضبط کرنا ہے، ان کی فیاضانہ روح کے باعث بہت کچھ نکتہ چینی کی گئی ہے۔ یہ بات صراحۃً مشکوک ہے کہ اگر ان کو منظور کر لیا جائے تو آیا کسی ایسی جنگ میں ان کی پابندی کی بھی جا سکتی ہے جس میں اُس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر ہوائی قوتیں استعمال کی جائیں جس کا تصور ۱۹۱۸ء کے خاتمہ پر کیا جا سکتا تھا"[1]

اس مفصل بحث سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مغربی قانون جنگ میں محفوظ و غیر محفوظ آبادیوں کا جو امتیاز قائم کیا گیا ہے، اور غیر محفوظ آبادیوں کے لئے جو حقوق مقرر کئے گئے ہیں، وہ محض ایک فریب نظر ہیں اور عملاً مغربی قانون اپنے دامن میں اس ایک نظریہ سے زیادہ کوئی سرمایہ نہیں رکھتا کہ "غیر مقاتلین کی جان و مال قابلِ رعایت ہے"۔ رہا اس کا واقعی لحاظ، تو وہ آج اسی قدر مفقود ہے جس قدر گروشیس کے زمانہ میں تھا۔

۴۔ عنوۃً فتح ہونے والے شہروں کا حکم | غیر مقاتلین کے حقوق کی بحث میں ایک دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ جب کوئی شہر پوری طرح مقابلہ کرنے کے بعد بزورِ شمشیر فتح ہو تو اس کے باشندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائیگا۔ قدیم زمانہ میں ایک فوج کا یہ قدرتی حق تھا کہ جس شہر کو وہ عنوۃً فتح کرے اس کے باشندوں کو تہ تیغ کر دے۔ یورپ میں بھی زمانہ قریب تک یہ دستور موجود تھا۔ اسپین کے خلاف متحد نیدرلینڈس کی بغاوت اور اس کے بعد پیش آنے والی مذہبی لڑائیوں میں فریقین نہایت آزادی سے ایک دوسرے کے شہروں میں گھس کر قتل عام کرتے تھے۔ اگرچہ جنگ سی سالہ کے بعد اس فعل کو یورپ کے ضمیر نے ظلم سے تعبیر کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن انیسویں صدی کے وسط تک وہ متروک نہ تھا چنانچہ ڈیوک آف ولنگٹن کی رائے میں کسی شہر کے محافظین اگر عنوۃً مغلوب ہوں تو انہیں امان کا حق[2] نہ تھا۔ جنگ جزیرہ نما میں فرانس نے متعدد مرتبہ محصور شہر کے لوگوں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے مزاحمت جاری رکھی تو ان کا قتل عام کیا جائیگا[3]

[1] Birkenhead, P. 227 — [3] Despatches, 2nd Series, I., 93, 94

[2] Bernard, Growth of the Laws of War (Oxford Essays for 1856) P. III, note

چنانچہ کیوڈاڈروڈریگو (Ciudad Rodrigo) اور باڈاجوس (Badajoz) اور سان سباستیان (San Sebastian) کی فتح کے بعد فی الواقع فرانسیسی فوجوں نے قتل وغارت کا بازار گرم کیا۔ سنہ ۱۷۹۰ء کی جنگ ترکیہ و روس میں جب روسی فوجیں اسمعیل میں داخل ہوئیں تو انہوں نے بھی مقاتلین وغیر مقاتلین سب کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔ ۱۸۳۷ء میں جب فرانس نے الجزائر کا دار الحکومت قسطنطینہ فتح کیا تو تین دن تک اس کی فوجیں قتل وغارت میں مشغول رہیں۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں جب انگریزی فوجوں نے دلی فتح کی تو آزادی کے ساتھ شہر میں قتل عام کیا اور مفتوح شاہی خاندان کے افراد کا بھی احترام ملحوظ نہ رکھا۔ اس زمانہ تک یورپ میں کوئی ایسا قانون نہیں تھا جس میں اس فعل کو ممنوع قرار دیا گیا ہو۔ سنہ ۱۸۷۴ء کی بروسلز کانفرنس نے بیشک یہ قرار دیا تھا کہ کسی شہر کو فتح کرنے کے بعد فوجوں کو لوٹ مار کے لئے آزاد نہیں چھوڑنا چاہیئے، مگر جیسا کہ معلوم ہے، اس کانفرنس کے مقرر کردہ قوانین کی کسی سلطنت نے توثیق نہیں کی اس لئے اس کو دول یورپ کی کتاب آئین میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہی نہیں ہوا۔ پس یورپ میں پہلی مرتبہ اس فعل کو جس چیز نے ممنوع قرار دیا ہے وہ سنہ ۱۸۹۹ء کے ضوابط ہیگ ہیں جن کی دفعہ ۲۸ عنوۃً فتح ہونے والے شہروں کو لوٹنے اور غارت کرنے کی ممانعت کرتی ہے۔ اگرچہ عملاً اب بھی یہ طریقہ بند نہیں ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء اور سنہ ۱۹۲۰ء میں یورپ کی مہذب ترین سلطنتوں کے زیر سرپرستی یونانی فوجوں نے سمرنا اور تھریس میں داخل ہو کر غیر مقاتل شہری آبادیوں کے ساتھ جو کچھ سلوک کیا وہ ثابت کرتا ہے کہ بیسویں صدی کے عہد تہذیب میں بھی عہد وحشت کی یہ یادگار ابھی تک باقی ہے۔ تاہم جہاں تک نظری حیثیت کا تعلق ہے یورپ کو آج سے صرف ۳۰ سال قبل فاتحانہ داخلہ کا وہ مہذب قانون دریافت کرنے کی توفیق ہوئی ہے جسے آج سے ۱۳۴۰ سال قبل رسول عربی (فداہ ابی و امی) نے فتح مکہ کے موقع پر پیش کیا تھا۔

۵۔ احتلال اور اس کے قوانین | احتلال (Occupation) ایک جدید اصطلاح ہے، اور اس کا تخیل بھی جدید ہے۔ عہد قدیم میں تو جب ایک سلطنت کسی ملک پر قابض ہو جاتی تھی تو وہ ملک اس کی جائز ملک ہو جاتا تھا۔ اسلامی قانون میں بھی کسی ملک کا مفتوح ہو جانا یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ دار الاسلام بن گیا اور اس کی رعایا کو ذمیوں کے حقوق حاصل ہو گئے۔ لیکن جدید بین الملی قانون کی رو سے ایک ملک کا غنیم کے تصرف

میں آجانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ باضابطہ اس کی سیادت میں آگیا، بلکہ جس وقت تک حکومت سابقہ سے باقاعدہ صلحنامہ ہو کر اس کے حقوقِ ملکیت فاتح کو منتقل نہ ہو جائیں اس وقت تک وہ صرف اس کے انتظام میں رہتا ہے۔ اس کو اصطلاح میں "احتلال" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس احتلال کے تحت جو علاقہ واقع ہوتا ہے اس کے باشندے نہ تو عملاً اپنی سابقہ حکومت کی رعیت ہوتے ہیں، نہ اصولاً اپنی موجودہ حکومت ہی کی رعایا بنتے ہیں، بلکہ وہ ایک غیر قانونی فوجی حکومت کے تحت مغلوب و مقہور قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کے ضوابطِ ہیگ نے اس مقہوریت کی حدود مقرر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے، اور نہ یہ طے کیا ہے کہ حکومت محتلہ اپنے حاکمانہ اختیارات کس حد تک ان پر وسیع کر سکتی ہے اور کس حد تک نہیں کر سکتی۔ البتہ چند قوانین مقرر کر دیئے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقۂ محتلہ میں حکومت اور باشندوں کے حقوق و فرائض کیا ہیں۔ ذیل میں ہم ان قوانین کو نقل کرتے ہیں:

(۱) جبکہ لشکرِ احتلال کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات باقاعدہ منتقل ہو جائیں تو وہ اپنے تمام ممکن وسائل سے امن عام کو محفوظ رکھنے اور قائم کرنے کی کوشش کرے گا اور حتی الامکان ان قوانین کو ملحوظ رکھے گا جو اس ملک میں پہلے سے نافذ ہوں۔" (دفعہ ۴۳)

یہ دفعہ حکومتِ احتلال کے لئے صرف ایک عام پالیسی وضع کرتی ہے اور در اصل ایک بے معنی دفعہ ہے۔ سابقہ قوانین کو برقرار رکھنے یا نہ رکھنے کے لئے "حتی الامکان" کی جو حد اس نے مقرر کی ہے وہ بالکل مبہم ہے، اور اس سے حکومت احتلال کو اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ علاقۂ محتلہ میں بالکل اسی طرح اپنے قوانین نافذ کرے جس طرح باضابطہ سیادت قائم ہو جانے کی صورت میں وہ کرتی، کیونکہ وہ بآسانی کہہ سکتی ہے کہ سابقہ قوانین برقرار رکھنا اس کے "امکان" میں نہیں ہے۔ لہٰذا اس دفعہ سے احتلال اور باضابطہ سیادت میں بہت کم فرق باقی رہ جاتا ہے۔

(۲) ایک محارب فریق کے لئے ممنوع ہے کہ اپنے زیرِ احتلال علاقہ کے باشندوں کو دوسرے فریق کی فوج یا اس کے ذرائع و وسائل کے متعلق معلومات بہم پہنچانے پر مجبور کرے (دفعہ ۴۴)

اس دفعہ کو جرمنی، جاپان، روس اور آسٹریا ہنگری نے اسی وقت مسترد کر دیا تھا۔ فوجی گروہ کو اس

پر سخت اعتراض ہے، کیونکہ وہ جنگی مصالح کے لئے اپنے وسائل معلومات پر کسی قسم کی پابندی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جرمنی کی "کتاب جنگ" میں اس پر جو تنقید کی گئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:-

"ایک ملک کے باشندوں کو خود اپنی قومی فوج، اس کی جنگی حرکات، اس کے وسائل اور اس کے فوجی اسرار کے متعلق معلومات بہم پہنچانے پر مجبور کرنا یقیناً ایک نہایت سخت کارروائی ہے، اس قسم کی کارروائی کو تمام قوموں کے مصنفین کی ایک بڑی اکثریت قابل ملامت قرار دیتی ہے، لیکن اس کے باوجود کوئی جنگی قائد ہمیشہ اس سے احتراز کرنے کا اہتمام نہیں کر سکتا۔ بیشک وہ جب کبھی اس پر عمل کریگا افسوس ہی کے ساتھ کرے گا، مگر جنگ کی دلیل بسا اوقات اس کو اس ذریعہ سے استفادہ کرنے پر مجبور کر دیگی"[1]

آگے چل کر پھر لکھا ہے:-

"ایک شخص کو خود اپنے ملک کی ضرر رسانی اور خود اپنی قومی فوج کی شکست میں آسانی پیدا کرنے پر مجبور کرنا، انسانی حسیات کے لئے خواہ کتنا ہی تکلیف دہ ہو، مگر کوئی محارب فوج، جو غنیم کے ملک میں پڑی ہوئی ہو، اس ذریعۂ معلومات سے اجتناب نہیں کر سکتی"[2]

یہ خیالات صرف جرمن محکمۂ جنگ ہی کے نہیں ہیں، بلکہ تمام یورپ کا فوجی گروہ یہی رائے رکھتا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، آج تک کسی جنگ میں ضوابط ہیگ کی دفعہ ۴۴ پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔

(۳) ایک محارب سلطنت کے لئے ممنوع ہے کہ وہ اپنے دشمن کی رعایا کو خود اس کی اپنی قوم کے خلاف جنگی اعمال میں حصہ لینے پر مجبور کرے، خواہ وہ جنگ سے قبل اس کے ملازم ہی کیوں نہ رہ چکے ہوں" (دفعہ ۲۳)

[1] Kriegsbrauch, P. 48

[2] Kriegsbrauch, P. 48

پروفیسر مارگن کے بقول یہ دفعہ صرف ایک "عمومی بیانِ اصول" ہی کی حیثیت رکھتی ہے اور جزئیات و تفصیلات میں حکومتوں کو خود یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیتی ہے کہ جس طرح چاہیں اپنی پالیسی وضع کریں۔[1] اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں حکومتوں کو، یا دراصل ان کی فوجوں کو، آزادیٔ عمل دے دی جائے وہاں اس قسم کا "عمومی بیانِ اصول" بالکل بیکار ثابت ہوتا ہے۔ فوجیں تو وہی عمل کرتی ہیں جو جنگی ضروریات کے لحاظ سے وہ اپنے لئے ضروری سمجھتی ہیں۔ چنانچہ جنگِ عظیم میں اس آزادیٔ عمل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا اور محارب سلطنتوں نے ایک دوسرے کی رعایا کو صرف خطوطِ مواصلات ہی میں کام کرنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ خندقیں کھودنے اور فوجوں کے عقب میں استحکامات تیار کرنے کا کام بھی زبردستی ان سے لیا۔[2]

(۴) علاقۂ محتلہ کے باشندوں کو دشمن سلطنت کی وفاداری کا حلف اٹھانے پر مجبور کرنا ممنوع ہے۔ (دفعہ ۴۵)

(۵) خاندانی اعزاز اور حقوق، اور جان و مال اور مذہبی عقائد کا احترام ملحوظ رکھنا لازمی ہے، اور شخصی املاک کو ضبط کرنا ممنوع ہے۔ (دفعہ ۴۶)

(۶) غارت گری حسبِ ضابطہ ممنوع ہے۔ (دفعہ ۴۷)

یہ تینوں دفعات ایک "عمومی بیانِ اصول" کی حیثیت رکھتی ہیں اور درحقیقت ان کی کوئی تشریعی قیمت نہیں ہے۔

(۷) اگر علاقۂ محتلہ میں حکومتِ احتلال وہ محصولات و واجبات اور محاصل راہ داری وصول کرے جو حکومت کے نفع کے لئے عائد کئے جاتے ہیں، تو اس کو حتی الامکان وہاں کے رائج الوقت قواعدِ تشخیص اور شرح کے مطابق ایسا کرنا چاہئے۔ نیز علاقۂ محتلہ کے نظامِ حکومت کا خرچ اسی پیمانہ پر ادا کرنا اس کا فرض ہے جو وہاں کی جائز حکومت ادا کرتی تھی۔ (دفعہ ۴۸)

(۸) اگر ان محصولات کے علاوہ حکومتِ احتلال علاقۂ محتلہ کے باشندوں پر کچھ اور مالی ندرانوں

[1] War, Its Conduct and Legal Results

[2] Birkenhead, P. 225

کا بوجھ ڈالے تو یہ صرف فوج یا اس علاقہ کے نظم ونسق کے لئے ہونا چاہیئے۔ (دفعہ ۴۹)

(۹) کسی نذرانہ کی تحصیل ایک تحریری حکم کے بغیر نہیں کی جاسکتی جو ایک کمانڈر انچیف کی ذمہ داری پر جاری کیا گیا ہو۔ اس قسم کے نذرانے صرف اس طور پر وصول کئے جاسکتے ہیں کہ وہ اس ملک کے قواعد تشخیص و شرح محصولات کے مطابق ہوں۔ ہر ایسے نذرانے کے لئے ایک باقاعدہ رسید دی جانی چاہیئے (دفعہ ۵۱)

(۱۰) میونسپلٹیوں اور عام باشندوں سے عملی خدمات یا اجناس کی شکل میں رسد طلب نہیں کی جاسکتی، سوائے اس کے کہ فوجِ احتلال کے لئے اس کی ضرورت ہو۔ یہ مطالبہ ملک کے وسائل کی نسبت سے متناسب ہونا چاہیئے، اور وہ اس نوعیت کا نہ ہونا چاہئے کہ اس کو پورا کرنا اس ملک کے باشندوں کے خود اپنے وطن کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کا ہم معنی ہو۔ جہاں تک ممکن ہو ایسے نذرانوں کی نقد قیمت ادا کرنی چاہیئے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ایک رسید دینی چاہیئے اور بعد میں جس قدر جلد ممکن ہو یہ رقم ادا کر دینی چاہیئے۔ (دفعہ ۵۲)

(۱۱) ایک فوجِ احتلال صرف ان املاک پر قبضہ کر سکتی ہے جو دشمن سلطنت سے تعلق رکھتی ہوں، اور جنگی اغراض کے لئے استعمال کی جاسکتی ہوں۔ البتہ تمام وہ آلات واسباب، جو خشکی یا تری یا ہوا میں خبر رسانی یا نقل وحرکت کے لئے استعمال کئے جاتے ہوں، اور تمام اسلحہ خانے اور سامانِ جنگ کے گودام، خواہ وہ شخصی ملک ہی کیوں نہ ہوں، بے تکلف ضبط کئے جاسکتے ہیں۔ مگر صلح ہونے کے بعد انہیں واپس کر دینا ضروری ہے۔" (دفعہ ۵۳)

ان تمام دفعات میں حکومتِ احتلال کے حقوقِ قبض وتصرف اور استعمال وانتفاع پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور علاقہ محتلہ کے باشندوں کو بڑی حد تک فوجی دست برد سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ لیکن فوجی گروہ بالاتفاق ان تمام قیود کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اور اپنی جنگی ضروریات کے مطابق مفتوح علاقہ سے تمام ممکن فوائد حاصل کرنے پر مصر ہے۔ اس گروہ کے خیال کی ترجمانی جرمنی کی "کتابِ جنگ" میں اس طرح کی گئی ہے:-

"جنگی ضرورت کے موقع پر ہر قسم کی ضبطی، ہر قسم کے مستقل یا عارضی استعمال، ہر قسم کا استعمال ہر قسم کی ضرر رسانی اور تخریب جائز ہے[1]"

ملک کے وسائل اور اس کی قوتِ برداشت کو ملحوظ رکھنے کے متعلق اُس کی رائے یہ ہے :-

"یہ تناسب کا نظریہ بس نظریہ کی حیثیت سے تو بہت خوب ہے، مگر اس کو عمل میں لانا بہت مشکل بلکہ محال ہے[2]"

اس معاملہ میں کلاؤسوتز کی رائے جنگی گروہ میں بہت مقبول ہے۔ وہ فوجوں کی ضروریات کے لئے ہر ایسی چیز کو بے چون وچرا استعمال کرنا جائز رکھتا ہے جو مفتوح ملک میں ہاتھ آئے۔ اس کے لئے وہ صرف مقامی حکام پر دباؤ ڈالنے ہی کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ عام آبادی کو خوف زدہ کر کے اسے ہر مطلوب چیز حوالہ کر دینے پر مجبور کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے :-

"اس وسیلۂ انتفاع کی کوئی حد نہیں ہے، سوائے اس کے کہ مفتوح ملک بالکل مفلس اور قلاش ہو جائے اور اس میں ایک حبہ ادا کرنے کی بھی قوت نہ رہے[3]"

یہاں بھی فوجی گروہ کی رائے حسبِ معمول قانونی گروہ کی تجاویز پر غالب آگئی ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ کسی جنگ میں ہیگ کے مہذب قوانینِ احتلال پر عملدر آمد نہیں ہوتا۔[4]

(۱۲) کسی قسم کی عام تعزیر، خواہ وہ مالی ہو یا دوسری قسم کی، ایسے اعمال پر عاید نہیں کی جا سکتی جن کا ارتکاب پرائیویٹ اشخاص نے انفرادی طور پر کیا ہو۔ (دفعہ ۵۰)

جنگ عظیم میں یہ قید بھی کالعدم ہو گئی، کیونکہ محاربین نے اپنے زیر تصرف و احتلال علاقوں میں نہایت آزادی سے پوری پوری آبادیوں پر تعزیری جرمانے عائد کئے اور ایسے مواقع پر اس طریق تنبیہ کو اکثر استعمال

[1] Kriegsbrauch. P. 53

[2] Kriegsbrauch, P. 62

[3] Vom Kriege V., Kap. 14

[4] دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی اور جاپان کے احتلال میں جو کچھ امریکہ، برطانیہ اور روس کر رہے ہیں اس کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یورپ کی مہذب قومیں احتلال کے متعلق خود اپنے تجویز کردہ ضوابط کی پابند ہیں۔

کیا گیا جبکہ خاص مجرم کا سراغ نہ مل سکا۔[1]

۶۔غارت گری و تباہ کاری | سترہویں صدی تک یورپ میں عام دستور تھا کہ جب ایک فوج دشمن کے ملک میں پیش قدمی کرتی تھی تو ہر چیز کو تباہ کرتی چلی جاتی تھی۔ دشمن کا حق غارت گری و تباہ کاری اس زمانہ میں غیر محدود تھا۔ انیسویں صدی کے وسط تک ہمیں اس حق کے استعمال کی مثالیں ملتی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۱۳ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے کینیڈا کے متعدد گاؤں جلا دیئے اور اس کے جواب میں ۱۸۱۴ء میں انگریزوں نے واشنگٹن کی عمارتوں کو تباہ کیا۔ ۱۸۳۰ء میں فرانسیسی فوجوں نے الجزائر میں عام تباہی پھیلائی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزی فوجوں نے کان پور، لکھنؤ، اور دلی کے علاقوں میں آتش زنی، لوٹ مار، اور قتل وغارت کا عام بازار گرم کیا۔ جنگ کریمیا سے قبل روس اور ترکی کی جتنی جنگیں ہوئیں ان میں روسی فوجیں ہمیشہ ترکی کے علاقہ میں پیش قدمی کرتے وقت عام تباہی پھیلاتی رہیں۔ تاہم نظری حیثیت سے اس حق کو محدود کرنے کا تخیل سترہویں صدی میں پیدا ہو چکا تھا، چنانچہ گروٹیوس نے یہ قاعدہ کلیہ وضع کیا تھا کہ

"صرف اس حد تک تباہ کاری جائز ہے جس سے ایک قلیل عرصہ میں دشمن صلح کی درخواست کرنے پر مجبور ہو جائے"[2]

اس کے بعد اٹھارہویں صدی میں واٹل (Vattel) نے یہ قاعدہ کلیہ وضع کیا کہ دشمن کے ملک میں عام تخریب و تباہ کاری تین صورتوں میں جائز ہے:

۱۔ جبکہ ایک ظالم اور وحشی دشمن کے وحشیانہ اعمال کا سلسلہ بند کرانا مقصود ہو،

۲۔ جبکہ اپنے سرحدی خط کو محفوظ کرنے کے لئے ایک سدِ راہ بنانی مقصود ہو۔

۳۔ جبکہ ایک میدانی کاروائی یا محاصرہ کے لئے اس کی ضرورت ہو،[3]

---

[1] Oppenheim, Vol. 11, P. 170

[2] Lawrence, PP. 440-41

[3] Lawrence, P. 441

انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی افکار نے تہذیب کی جانب کچھ ادنیٰ ترقی کی اور یہ عام اصول وضع کیا گیا کہ:-

"صرف اسی قدر تباہ کاری جائز ہے جس قدر جنگی ضروریات کے لحاظ سے ناگزیر ہو"[1]

لیکن بیسویں صدی کے یورپین مصنفین اور ماہرین جنگ کا میلان اس طرف ہے کہ جنگی ضروریات کے لحاظ سے ہر قسم کی تباہ کاری جائز ہے، البتہ جس تباہ کاری کا مقصد محض تباہ کاری ہو، وہ حرام ہے۔

لارنیس اپنی کتاب "اصول قانون بین الملل" میں لکھتا ہے:-

"قوانین جنگ ایک شہر کے مضافات کو تباہ کر دینا جائز رکھتے ہیں، تاکہ محصورین کو ان میں پناہ لینے سے روکا جائے، یا توپ خانے کی کارروائی کے لئے میدان صاف کیا جائے[2] اس غرض کے لئے عمارتیں توڑی جا سکتی ہیں، درخت کاٹے جا سکتے ہیں، بلکہ پسپائی کے لئے راستہ صاف رکھنے کی غرض سے گاؤں بھی جلائے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ کارروائی صرف اس صورت میں ہونی چاہئے جبکہ فوری اغراض جنگ کے لئے ایسا کرنا بیحد ضروری ہو"[2]

پروفیسر ویسٹ لیک (Westlake) لکھتا ہے:-

"غنیم کے ملک میں عام تباہی صرف اس وقت جائز ہے جبکہ زیر عمل جنگی کارروائی کی کامیابی کے لئے ایسا کرنا ضروری ہو"[3]

جرمنی کی کتاب جنگ اس مسئلہ میں یہ فیصلہ دیتی ہے:-

"بلا ضرورت تو ذرہ برابر تباہ کاری بھی ناجائز ہے، لیکن اگر ضرورت پڑے تو بڑی سی بڑی تباہ کاری بھی جائز ہے"[4]

---

[1] Brussels Code, Art. 13

[2] Lawrence P. 441

[3] Chapters on the Principles of International Law, P, 236

[4] Birkenhead, P. 261

یہاں آکر مغربی قانون ایک حد تک اسلامی قانون سے مل جاتا ہے۔ اسلامی قانون بھی یہی ہے کہ کسی شہر کی تسخیر یا کسی اور فوجی کارروائی کے لئے تخریب کی ضرورت ہو تو وہ جائز ہے مگر صرف اس حد تک کہ ایسا کرنا اس کارروائی کی کامیابی کے لئے ناگزیر ہو۔ اس کی تفصیل اس کتاب کے باب پنجم بعنوان "تباہ کاری کی ممانعت" میں گذر چکی ہے۔ لیکن مسئلہ کے ایک پہلو میں اسلام اور مغربی قانون کے درمیان اختلاف ہے۔ اسلام مہذب اور غیر مہذب دشمن میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک غیر مہذب دشمن کی فصلیں تباہ کرنا اور بستیاں اجاڑنا بھی ویسا ہی ظلم ہے جیسا کہ مہذب دشمن کی بستیوں اور کھیتوں کو غارت کرنا۔ بلکہ درحقیقت اسلامی قانون جس زمانہ میں وضع ہوا تھا اس وقت "مہذب دشمن" کا تو کہیں وجود ہی نہ تھا۔ ہر طرف غیر مہذب ہی غیر مہذب تھے۔ مگر مغربی قانون ان دونوں قسم کے دشمنوں میں امتیاز کرتا ہے۔ اس کے نزدیک تباہ کاری کے لئے "حسب ضرورت" کی قید صرف "مہذب" دشمن کے لئے ہے، رہا بیچارہ "غیر مہذب"، تو اس کو تباہ و برباد کرنے کا حق مہذب قوموں کے لئے غیر محدود ہے۔ پروفیسر لارنس صاف تصریح کرتا ہے:۔

"وحشی یا نیم وحشی قوموں سے جنگ کرتے وقت قاعدہ اول کے پہلے استثناء پر عمل کیا گیا ہے۔ عام طور پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ وحشی و غیر مہذب قوموں کے مواشی کو ہانک لے جانا، ان کی فصلوں کو تباہ کر دینا، ان کے چھپروں اور جھونپڑیوں میں آگ لگا دینا، ان کے نفوس پر نہایت وسیع اثر پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ تباہ کاری قبل از گولوں کے ذریعہ سے کی جائے اور اس کے ناگہانی نتیجہ کے طور پر بہت سے باشندے بھی ہلاک ہو جائیں تو اس سے ایسا گہرا اور پائدار اثر پیدا ہو گا کہ اس قوم کے بقیۃ السیف افراد کے دلوں میں سفید فام انسان کے عدل و طاقت کے برقرار رہنے والے احساس کا نشوونما یقینی ہے"[1]

غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض اب مغربی قوانین جنگ میں صرف ایک غیر جانبداری کا قانون باقی رہ گیا ہے جس کا ذکر کرنا باقی ہے۔ اس پر تبصرہ کرنے کے بعد ہم اس طویل باب کو ختم کر دیں گے۔

[1] Lawrence, PP. 241-42

غیر جانبداری کی تاریخ | مغربی اقوام میں غیر جانبداری کا تصور بہت قریبی عہد کی پیداوار ہے۔ ایک سے دو صدی قبل تک ان کے ذہن میں اس کا کوئی تصور نہیں تھا، یا اگر تھا تو وہ غیر مکمل تھا۔ اسی لئے مغربی زبانوں میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ بھی موجود نہ تھا۔ گروٹیوس اس کو لفظ "متوسط" (Medii) سے ادا کرتا ہے، اور بائنکر شویک اس کے لئے لفظ "غیر معاند" (Non-hostes) وضع کرتا ہے۔ سترہویں صدی کے آخر میں جرمن اور انگریزی زبانیں لفظ "نوئسترال" اور "نیوٹرل" (Neutral) سے پہلی مرتبہ آشنا ہوئیں۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں واٹل نے اس کو بین الملی قانون میں رواج دیا۔

سولہویں اور سترہویں صدی تک یورپ میں غیر جانبداری کی حالت کو ناممکن اور خطرناک سمجھا جاتا تھا اور عملاً اس کا کوئی صحیح مفہوم ہی نہ تھا۔ فلارینس کا مدبر میکیاویلی (Machiavelli) ایک حکمراں کے لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ جب اس کے ہمسایوں میں کبھی لڑائی ہو تو وہ ایک نہ ایک فریق کے ساتھ شریک ہو جائے۔ اس کے ایک صدی بعد گروٹیوس بھی یہ مشورہ دیتا ہے کہ ایک حکمراں کو محارب فریقین میں سے اس کا ساتھ دینا چاہئے جس کو وہ حق پر دیکھے، اور اس کی مخالفت کرنی چاہئے جو ناحق پر ہو، البتہ جب یہ تمیز مشکل ہو جائے کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر، تو اس صورت میں اس کو دونوں سے یکساں سلوک کرنا چاہئے۔ عملی حیثیت سے بھی اٹھارہویں صدی کے خاتمہ تک غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض کچھ نہ تھے۔ محارب قوتیں لڑتے لڑتے ان کے حدود میں بے تکلف تجاوز کر جاتی تھیں اور غیر جانبدار طاقتیں بھی جس فریق سے ہمدردی رکھتیں اس کو امداد پہنچانے میں دریغ نہ کرتی تھیں۔ قانون کے اس شعبہ میں حقوق و فرائض اور حدود و قیود مقرر کرنے کی ابتدا ۱۷۹۴ء سے ہوئی جبکہ امریکن کانگریس نے پہلی مرتبہ امریکن رعایا کے لئے ان محاربین کی جنگی خدمت کرنا ممنوع قرار دیا جن سے حکومت امریکہ برسر جنگ نہ ہو۔ اس کے بعد اس شعبہ میں قانون سازی کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ ۱۸۱۸ء میں غیر جانبداری کا ایک پورا ضابطۂ قانون وضع ہو گیا۔ ۱۸۱۹ء میں

ل Lawrence, PP. 475-77

برطانیہ عظمیٰ نے امریکہ کی تقلید کی اور کانگریس کے بنائے ہوئے قوانین اپنی کتاب آئین میں منتقل کر لئے۔ اس کے بعد دوسری سلطنتوں نے بھی اسی قسم کے قوانین اپنے ہاں رائج کئے اور انیسویں صدی کے اندر تمام مغربی سلطنتوں میں غیر جانبداری کے قوانین بن گئے۔ تاہم صحیح معنوں میں غیر جانبداری کا بین الملی قانون سنہ ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس میں وضع کیا گیا، کیونکہ اسی میں پہلی مرتبہ دول مغرب نے مل کر غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض متعین کئے۔

موجودہ زمانہ میں غیر جانبداروں کی حیثیت لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بیسویں صدی میں غیر جانبداری کا قانون پایہ تکمیل کو پہنچا اور بیسویں ہی صدی میں اس پر سکرات موت بھی طاری ہو گئی۔ دوسری ہیگ کانفرنس کو قانون سازی کا کام ختم کئے ابھی سات سال بھی نہ ہوئے تھے کہ یورپ میں عالمگیر جنگ شروع ہوئی اور اس نے غیر جانبداری کے پورے قانون کی دھجیاں اڑا دیں[1]۔ سنہ ۱۹۱۴ء-۱۸ء کی جنگ عظیم میں غیر جانبداروں کا کوئی حق ایسا نہ تھا جسے آزادی کے ساتھ پامال نہ کیا گیا ہو۔ ان کی سرحدوں پر تجاوز کیا گیا، ان کے جہاز ڈبوئے گئے، ان کی تجارت برباد کی گئی، ان کی تلاشیاں لی گئیں، ان کو گرفتار کیا گیا، غرض یہ کہ ان کے ساتھ وہ سب کچھ کیا گیا جو محاربین کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ امر بھی مشکوک ہو گیا کہ آیا فی الواقع غیر جانبداروں کا کوئی حق ہے بھی یا نہیں۔ پھر اسی پر بس نہیں، خود غیر جانبداری کی حقیقت بھی بڑی حد تک مشکوک ہو گئی۔ چونکہ جنگ اب صرف فوجی جنگ نہیں رہی ہے بلکہ اس سے زیادہ معاشی جنگ ہو گئی ہے، اس لئے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ جو طاقت دشمن کے ساتھ تجارتی

---

[1] اس قبا میں جو تھوڑے بہت تار باقی تھے اُن کو دوسری جنگ عظیم نے پوری طرح نوچ ڈالا۔ اس جنگ میں دونوں فریقوں نے جس بے باکی کے ساتھ غیر جانبدار ملکوں پر حملے کئے، ان کے حدود میں فوجیں اتاریں، ان کے درمیان سے اپنا راستہ بزور نکالا اور ان کے وسائل و ذرائع کو زبردستی استعمال کیا، اس کے بعد تو غیر جانبداری کا کوئی مفہوم باقی ہی نہیں رہا ہے۔ آخر میں جب امریکہ و برطانیہ اور روس نے اقوام متحدہ کا ایک نظام، امن عالم برقرار رکھنے کے لئے قائم کرنے کا اعلان کیا تو تمام غیر جانبدار قوموں کو نوٹس دے دیا کہ جب تک تم جرمنی کے خلاف اعلان جنگ نہ کرو گے، تم کو اس نظام میں شریک نہ کیا جائیگا اور تم مہذب اقوام، یا امن پسند اقوام کی برادری سے خارج سمجھے جاؤ گے۔

تعلقات رکھتی ہو، اس کو مایحتاج بہم پہنچاتی ہو، اور اس کی معاشی زندگی کے لئے تعاون و استحکام کے وسائل فراہم کرتی ہو، کیا وہ فی الواقع غیر جانبدار ہے؟ کیا وہ جائز طور پر اپنے اس کام کے لئے آزادانہ حقوق کا مطالبہ کر سکتی ہے؟ اس مسئلہ نے غیر جانبداری کی عین بنیاد پر ایک کاری ضرب لگائی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ بین الملّی قانون اب تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا ہے کہ ان جدید مسائل کی روشنی میں غیر جانبداروں کے کیا فرائض مقرر کرے اور ان کو کیا حقوق دلوائے۔

یہ حالات کا ایک مبالغہ آمیز تخمینہ نہیں ہے بلکہ ٹھیک یہی خیالات ہیں جو بین الملّی قانون کے علماء کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ پروفیسر نیپولڈ نے اپنی کتاب "بین الملّی قانون کا ارتقاء جنگ عظیم کے بعد" میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اکابر علمائے قانون کے خیالات سے استشہاد کیا ہے۔ ذیل میں ہم اس سے ایلتزباشر کے خیالات نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"موجودہ جنگ نے غیر جانبداروں کی حیثیت بہت زیادہ خراب کر دی ہے۔ ان کے بہت سے حقوق پر اس کثرت کے ساتھ دست درازی کی گئی ہے کہ اب مشکل ہی سے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ یہ حقوق فی الواقع قانون میں موجود ہیں۔۔۔۔۔ چونکہ اب وہ ضرورت سے زیادہ پامال ہو چکے ہیں اس لئے آیندہ لڑائیوں میں ان کو زیادہ عرصہ تک تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ حق اور انصاف کے نئے عقائد نے پرانے حقوق کو الگ پھینک دیا ہے، اور جو رخنہ پڑ گیا ہے وہ اب ناقابل تلافی ہے پہلے قوانین، اور خصوصاً اقرار نامۂ پیرس کے قانون بحری کی دفعہ ۲ و ۳ کو بین الملّی قانون میں جو پوزیشن حاصل تھی، اس پر اب ایک انقلابی تشکیل جدید کے عمل نے ایک نئے غیر نوشتہ قانون کو مسلط کر دیا ہے اور یہ ایسا قانون ہے جو غیر جانبدار حکومتوں کی زندگی پر بہت زیادہ گہرے حملوں کو جائز رکھتا ہے"[1]

آگے چل کر یہ مصنف پھر لکھتا ہے:۔

---

[1] Nippold, P. 143

"دنیا میں عالمگیر لڑائیوں کا دَور شروع ہو چکا ہے اور ہر بڑی طاقت کو یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ ان میں ضرور کھینچی جائے گی۔ بین الملّی قانون آخر الامر بڑی قوموں کی خواہش ہی پر قائم ہے، کیونکہ ان کی مدد کے بغیر بین الملّی قانون کا کوئی حکم قائم نہیں رہ سکتا، لہٰذا ایسے زمانہ میں جبکہ غیر جانبداروں کا ناقابلِ تعدّی ہونا بڑی قوموں کی اکثریت کو ایک ناگوار قید معلوم ہو رہا ہے، اگر بین الملّی قانون میں بھی غیر جانبداروں کی پوزیشن روز بروز خراب ہوتی جائے تو کچھ جائے تعجب نہیں ہے[1]"

اس بیان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مغربی قانون میں غیر جانبداری کی حیثیت کیا ہے۔ اب ہم غیر جانبداری کے قانون کی تفصیلات و جزئیات پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ یہ قانون بجائے خود کس حد تک مکمل اور پائدار ہے، اور اسلامی قانون کے مقابلہ میں اس کی حیثیت کیا ہے۔

محاربین کے فرائض غیر جانبداروں کے متعلق | ہیگ کی مقاہمت ۵ اور ۱۳ کی رو سے بّری اور بحری جنگ میں غیر جانبداروں کے متعلق محاربین کے جو فرائض مقرر کئے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) غیر جانبدار سلطنت کے حدود میں کسی قسم کی جنگی کاروائی نہ کی جائے۔

(۲) محاربین کے لئے ممنوع ہے کہ اپنی فوجیں یا سامانِ جنگ وسامانِ رسد غیر جانبدار علاقہ سے گزار کر لے جائیں۔

(۳) غیر جانبدار علاقہ کو جنگی تیاریوں کے لئے "قاعدہ" (Base) نہیں بنایا جا سکتا۔ وہاں فوجوں کو آراستہ کرنا یا جنگی قوتوں کو مرتب کرنا یا ایسی ہی دوسری کارروائیاں کرنا ممنوع ہے۔

(۵) غیر جانبدار علاقے یا پانی میں گھس کر دشمن کو گرفتار کرنا یا اس پر حملہ کرنا حقوق غیر جانبداری پر تعدی ہے جس سے احتراز واجب ہے۔

(۶) محاربین کا فرض ہے کہ ایک غیر جانبدار سلطنت اپنے فرائض غیر جانبداری ادا کرنے کے لئے جو قوانین وضع کرے ان کی وہ پابندی کریں۔

---

[1] Nippold, P. 146

(۷) اگر کبھی دانستہ یا نادانستہ کسی غیر جانبدار سلطنت کے حقوق پر تعدی ہو جائے تو تعدی کرنے والے فریق کا فرض ہے کہ اس کی تلافی کرے۔

یہ تمام فرائض فروع ہیں۔ اصول ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ "غیر جانبدار سلطنت کے حدود واجب الاحترام ہیں اور ان پر تجاوز نہ کرنا چاہیئے" یہ اصول بعینہٖ اسلام میں موجود ہے۔ اسلامی قانون کے مستقل ضابطوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس قوم سے اسلامی حکومت کی مسالمت ہو، اور جو جنگ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی قسم کا حصہ نہ لے، اس کے حدود پر کسی قسم کا تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر دشمن لڑتے لڑتے اس کے ملک میں جا پہنچے تو اس کا تعاقب نہیں کیا جا سکتا۔ دشمن کے جو افراد اس کے ملک میں مقیم ہوں ان پر کوئی حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ مجموعی طور پر دوران جنگ میں اس کے افراد سے یا اس کے حدودِ سلطنت سے ہر قسم کا تعرض قطعاً حرام ہے۔[1]

غیر جانبداروں کے فرائض محاربین کے متعلق: جدید بین الملی قانون غیر جانبداروں پر محاربین فریقین کے متعلق جو فرائض عائد کرتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کسی محارب فریق کو جنگ یا مسلح امداد نہ دینا، اور فریقین کے ساتھ یکساں سلوک کرنا۔

یہ غیر جانبداری کا بنیادی فرض ہے، اور اس کے عین مفہوم میں اس طرح داخل ہے کہ غیر جانبداری کا تصور اس چیز کے تصور کے بغیر ذہن میں قائم ہی نہیں ہو سکتا۔

(۲) محاربین میں سے کسی کو یا دونوں کو آلات جنگ اور روپیہ فراہم نہ کرنا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دوران جنگ میں ایک غیر جانبدار سلطنت کو کسی محارب کے ہاتھ اسلحہ و آلاتِ جنگ فروخت نہ کرنے چاہئیں، اور نہ اسے قرض دینا چاہیئے۔ لیکن یہ امر مشکوک ہے کہ اس فرض کے حدودِ عمل کیا ہیں؟ اسلحہ و آلاتِ جنگ کی فروخت کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایک سلطنت خاص طور پر ایک محارب فریق سے معاملہ کرے۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذخائر حرب کا عام نیلام کرے جس میں دوسرے خریداروں کی طرح محاربین کے ایجنٹ بھی ہوں۔ پہلا طریقہ تو بالاتفاق ممنوع ہے؛

[1] تفصیل کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب پنجم، عنوان "غیر جانبداروں کے حقوق"

لیکن دوسرے طریقہ کے ممنوع ہونے میں اختلاف ہے اور ایسی نظائر موجود ہیں کہ بڑی بڑی سلطنتوں نے اس کو جائز رکھا ہے۔ سنہ ۱۸۷۰ء کی جنگِ جرمنی و فرانس کے زمانہ میں حکومت امریکہ نے اپنے ذخائر حرب کا نیلام کیا اور اس میں سے حکومتِ فرانس کے ایجنٹوں نے ایک بہت بڑی مقدار خرید کر فرانس بھیج دی جو جنگ میں کام آئی۔ اس پر جب اعتراض اٹھا تو امریکہ کی مجلس الشیوخ (Senate) نے تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی اور اس کمیٹی نے یہ رپورٹ کی کہ "اگر خود حکومت فرانس کا رئیس بھی خریداروں میں موجود ہوتا تو اس کے ہاتھ سامان بیچنا ناجائز نہ ہوتا، کیونکہ نیلام، عام تھا اور محاربین کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا"[۱] اس فیصلہ سے جائز اور ناجائز میں بہت ہی کم فرق رہ جاتا ہے، اور وہ فائدہ باقی نہیں رہتا جس کے لئے غیر جانبداروں پر یہ فرض عاید کیا گیا ہے۔

اس فرض کا دوسرا حصہ، جو روپے کی امداد سے متعلق ہے، اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ سلطنت خود کسی محارب فریق کو قرضہ یا عطیہ دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غیر جانبدار سلطنت کی رعایا اس کو امداد دے۔ پہلی صورت بالاتفاق ممنوع ہے، مگر دوسری صورت میں اختلاف ہے۔ عام تعامل یہی ہے کہ غیر جانبدار سلطنتوں کے صرافہ سے محاربین نہایت آزادی کے ساتھ روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ سنہ ۱۸۹۴ء کی جنگِ چین و جاپان، سنہ ۱۹۰۴ء کی جنگِ روس و جاپان، سنہ ۱۹۱۱ء کی جنگِ اٹلی و ترکی اور سنہ ۱۹۱۲ء کی جنگِ بلقان میں فریقین نے غیر جانبدار سلطنتوں کی رعایا سے نہایت آزادی کے ساتھ قرضوں اور عطیوں کی صورت میں امداد حاصل کی۔ سنہ ۱۸۲۳ء میں حکومتِ انگلستان نے ماہرین قانون بین الاقوام سے یہ سوال کیا تھا کہ آیا ایک غیر جانبدار سلطنت کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ اپنی رعایا کو محاربین کی مالی اعانت سے باز رکھے؟ اس کے جواب میں لارڈ لینڈہرسٹ (Lyndherst) نے لکھا کہ "مصنفین کا اجماع اس پر ہے کہ یہ فعل غیر جانبداری کے نواقض میں سے نہیں ہے"[۲] اس طرح بین الملی قانون نے قوم اور حکومت میں امتیاز پیدا کر کے حکومت کو تو غیر جانبداری

---

[۱] Wharton, International Law of the United States, P. 391

[۲] Halleck, International Law, PP, 110, 195,- 197

کے احترام کا مکلف قرار دیا ہے مگر قوم کو پوری آزادی دی ہے کہ محاربین میں سے کسی ایک یا دونوں کے ساتھ جنگ میں تعاون کرے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت سے یہ فرض بالکل بے معنی ہو جاتا ہے، کیونکہ ایک سلطنت کے مالی اور معاشی وسائل جب محاربین کی خدمت کے لئے وقف ہوں تو غیر جانبداری کا عدم و وجود برابر ہے۔

(۳) محاربین کی فوجوں کو اپنے علاقہ سے نہ گذرنے دینا۔

یہ فرض بہت بعد کی پیداوار ہے۔ سلطنتوں کا عمل اور مصنفین کی آراء، دونوں کا میلان انیسویں صدی تک اس جانب رہا ہے کہ محاربین کو راستہ دینا جائز ہے۔ سترھویں صدی کا مصنف گروٹیس لکھتا ہے کہ "محاربین کو غیر جانبدار علاقہ سے فوج گذارنے کا حق پہنچتا ہے، اور اگر یہ حق دینے سے بلا کسی معقول وجہ کے انکار کیا جائے تو اسے بجبر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے"۔ اٹھارہویں صدی کا مصنف واٹل لکھتا ہے کہ "محارب اپنے غیر جانبدار ہمسایہ سے اپنی فوجوں کے لئے راستہ مانگ سکتا ہے، لیکن شدید ضرورت کے بغیر اس کو جبراً حاصل نہیں کر سکتا"۔[2] وہیٹن (Wheaton) جس کی کتاب "بین الملتی قانون" ۱۸۳۶ء میں شائع ہوئی، اس حق کو تسلیم کرتا ہے، مگر غیر جانبدار سلطنت کی مرضی کے خلاف اسے حاصل کرنے کو جائز نہیں رکھتا۔[3] میننگ (Manning) جس کی کتاب "قانون اقوام" ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی، اس قسم کی اجازت دینے کو غیر جانبداری کے نواقض میں شمار نہیں کرتا، بشرطیکہ دونوں فریقوں کو یکساں اجازت دی جائے۔[4] البتہ ہال (Hall) جو ۱۸۸۰ء کا مصنف ہے اس کو ناجائز قرار دیتا ہے، اور اس کے قریب العہد مصنفین بھی اس کے عدم جواز کے قائل ہیں۔

یہی حال سلطنتوں کے تعامل کا ہے۔ ۱۸۱۵ء میں آسٹریا نے جنوب مشرقی فرانس پر حملہ کرنے کے لئے سوئٹزرلینڈ کے علاقہ سے زبردستی راستہ حاصل کیا۔[5] ۱۸۷۰ء میں میکسیکو کی فوجوں نے امریکہ

---

[1] Lawrence, P. 525

[2] Law of Nations, Ch, II,

[3] Wheaton, International Law, PP. 418

[4] International Law, PP. 4-7

کے علاقہ میں گھس کر اپنے دشمنوں سے جنگ کی۔ اسی سال جنگ ترکی و روس میں حکومت روس نے حکومت رومانیا سے سمجھوتہ کیا کہ وہ روسی فوجوں کو یورپین ٹرکی پر حملہ کرنے کے لئے رومانوی علاقہ سے گذرنے کی اجازت دیدے، چنانچہ دوران جنگ میں تقریباً پانچ لاکھ روسی فوج رومانوی علاقہ سے گذری اور اس نے رومانیہ کی ریلوے، اور خطوطِ مواصلات کو آزادی کے ساتھ استعمال کیا[2]۔ سب سے بڑی نمایاں مثال ہمارے موجودہ عہد کی ہے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں جرمنی نے بلجیم سے زبردستی راستہ حاصل کیا، اور حکومتِ بلجیم کی مزاحمت کے باوجود جرمن فوجیں بلجیکی علاقہ سے گذریں۔ اگرچہ اس آخری فعل کو غیر جانبداری کے حقوق پر صریح دست درازی سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن واقعات کی رفتار بتا رہی ہے کہ آئندہ جنگ میں جب کبھی طاقتور سلطنتوں کے سامنے موت و حیات کا نازک مسئلہ پیش ہوگا، وہ کمزور ہمسایہ سلطنتوں کو راستہ دینے پر ضرور مجبور کریں گی[3]۔ اس لئے یہ قیاس غلط نہیں ہے کہ بین المللی قانون اب پھر اُس نظریہ کی طرف رجوع کرنے والا ہے جو بال سے پہلے کے مصنفین پیش کرتے رہے ہیں۔

دوم، محاربین کو اپنے حدود میں جنگی مہمیں طیار کرنے یا جنگی جہاز آراستہ کرنے کی اجازت نہ دینا۔

یہ فرض غیر جانبداری کے ضمنی فرائض میں سے ہے اور غالباً پہلی مرتبہ ۱۸۷۱ء کے معاہدۂ واشنگٹن سے پیدا ہوا ہے۔ اس سے قبل غیر جانبدار سلطنتوں کے حدود میں جنگی طیاریوں کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

---

[1] Wharton P. 397

[2] Fyffe, Modern Europe, III, 497

[3] دوسری جنگِ عظیم میں ایران کے ساتھ بھی کچھ پیش آیا۔ امریکہ اور برطانیہ نے روس کو مدد پہنچانے کے لئے اس سے زبردستی راستہ حاصل کیا اور اس کے ایک بڑے حصہ پر اپنا فوجی قبضہ قائم کر لیا۔ جرمنی کی مثالیں ہم اس لئے پیش نہیں کرتے کہ وہ مہذب قوانین کو توڑنے میں بہت زیادہ بدنام ہے۔

(۵) اپنی رعایا کو محاربین کی فوج میں بھرتی ہونے سے روکنا۔

یہ فرض بھی غیر جانبداری کے ضمنی فرائض میں سے ہے اور اس کے مفہوم میں داخل ہے۔ لیکن مغرب میں اس کا تصور بہت قریبی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۷۹۳ء کی جنگ انگلستان و فرانس میں امریکہ کے باشندے بکثرت فرانسیسی فوج میں جا جا کر بھرتی ہوئے۔ یونان کی جنگ استقلال میں لارڈ بائرن کی زیر قیادت سینکڑوں انگریزوں نے ٹرکی کے خلاف جا کر جنگ کی۔ ۱۸۷۶ء کی بغاوت سرویا میں روسی رعایا کے ہزارہا افراد ٹرکی کے خلاف لڑنے گئے۔ سوئٹزرلینڈ تو ۱۸۵۹ء تک باقاعدہ بھرتی کا میدان بنا رہا اور محارب سلطنتیں ہمیشہ اس سے رنگروٹ حاصل کرتی رہیں۔ انیسویں صدی کے آخری ایام میں غیر جانبداری کے قانون کا یہ شعبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا اور ماہرین قانون بین الملل نے بالاتفاق یہ فتویٰ دیا کہ اس قسم کی بھرتی کی اجازت دینا غیر جانبداری کے لئے ناقض ہے۔

یہ اُن فرائض کا خلاصہ ہے جو بین المللی قانون غیر جانبداروں پر عاید کرتا ہے۔ ان کی تفصیلات میں جو کچھ کمزوریاں ہیں وہ صفحات بالا میں بیان کی جا چکی ہیں۔ تاہم ان سب کا اصل الاصول صرف ایک فرض ہے اور وہ یہ کہ "غیر جانبدار قوم کو جنگ میں کسی فریق کی معاونت نہ کرنی چاہئے، اور نہ ایسا فعل کرنا چاہئے جو معاونت کی حد تک پہنچتا ہو" یہ اصل الاصول بعینہٖ اسلام کے قانون میں موجود ہے۔ اسلامی قانون میں غیر جانبدار کی تعریف یہ ہے کہ الذی لم یظاھر علینا احدا و لم ینقصنا شیئا یعنی "وہ ہمارے خلاف کسی کی مدد نہ کرے اور نہ ہمارے حق میں کوئی کمی کرے۔"[1] اس اصل سے فروع خود نکالی جا سکتی ہیں۔ ہر وہ فعل جو "مظاہرہ" اور "نقص" کی تعریف میں آتا ہو، غیر جانبداری کیلئے ناقض ہے، اور اس سے احتراز کرنا غیر جانبدار کا فرض ہے۔

۵۔ تبصرہ

یہ باب اُمید سے زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ لیکن اسے ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ پچھلے مباحث

[1] تفصیل کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب پنجم، عنوان: "غیر جانبداروں کے حقوق"

پر ایک آخری تبصرہ کر کے واضح کر دیا جائے کہ اسلامی قانون کس حیثیت سے مغربی قوانین پر ترجیح کا حق رکھتا ہے۔ اگر گذشتہ اوراق آپ کے ذہن میں محفوظ ہیں تو مباحث کو دوبارہ نقل کرنے کی حاجت نہیں، صرف وجوہِ ترجیح کی طرف اشارہ کافی ہے۔

اولاً، بین الملّی قانون فی الحقیقت کوئی "قانون" ہی نہیں ہے۔ وہ اپنے اصول و فروع کے لحاظ سے کلیتہً سلطنتوں کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ جس طرح چاہتی ہیں اپنے مصالح و اغراض کے مطابق اس کو بناتی اور بدلتی ہیں، اور جس چیز کو سب یا چند بڑی سلطنتیں پسند نہیں کرتیں، وہ آخر الامر قانون میں شامل ہی نہیں رہ سکتی۔ اس طرح در اصل قانون یہ فیصلہ نہیں کرتا کہ حکومتوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے؟ بلکہ حکومتیں خود یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ قانون کیا ہونا چاہیئے؟ بخلاف اس کے اسلام کا قانون صحیح معنوں میں ایک "قانون" ہے۔ اس کو ایک بالاتر قوت نے وضع کیا ہے۔ مسلمانوں کو اس میں حذف و ترمیم کا کوئی حق نہیں دیا گیا۔ وہ صرف اس لئے وضع کیا گیا ہے کہ جو اسلام کے پیرو ہوں وہ اس کی بے چون و چرا پابندی کریں، اور جو اس کی پابندی نہ کریں وہ قانون شکن اور نافرمان قرار دیئے جائیں۔ اہلِ مغرب اگر اپنے بین الملّی قانون کی خلاف ورزی کریں تو وہ سرے سے قانون ہی نہیں رہتا لیکن مسلمان اگر سب مل کر بھی اسلام کے خلاف عمل کریں تب بھی اسلامی قانون بجائے خود قانون رہتا ہے۔

ثانیاً، بین الملّی قانون کا وہ شعبہ جس کو قانونِ جنگ کہا جاتا ہے، اصل بین الملّی قانون سے بھی زیادہ ناپائدار اور ناقابلِ اعتماد ہے۔ ضروریاتِ جنگ سے اس کا ہر وقت تصادم ہوتا رہتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کو مغلوب کرتی رہتی ہیں۔ پھر فوجی اور قانونی گروہوں کے اختلافات اس کو اور بھی زیادہ کمزور کر دیتے ہیں۔ قانونی گروہ ایک چیز کو قانون میں داخل کرتا ہے اور فوجی گروہ اسے خارج کر دیتا ہے۔ قانونی گروہ ایک مہذب قاعدہ وضع کرتا ہے اور فوجی گروہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور چونکہ عمل کی تمام قوتیں فوجی گروہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں اس لئے کتابوں میں لکھا ہوا قانونِ جنگ کتابوں ہی میں دھرا رہتا ہے اور اصلی قانونِ جنگ وہ ہوتا ہے جس کو فوجیں خود اپنے عمل سے میدانِ جنگ میں وضع کرتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کا قانونِ جنگ پورے اسلامی

قانون کی طرح ایک پختہ اور ناقابلِ تغیّر قانون ہے۔ اس میں جنگی ضروریات کی رعایت ملحوظ رکھ کر جو قواعد و ضوابط مقرر کر دیئے گئے ہیں ان کو اب کوئی نہیں بدل سکتا کسی اسلامی فوج یا جنرل کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ اس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ کرے یا اس کی کسی چیز کو ماننے سے انکار کر دے۔

ثالثًا، بین الملّی قانونِ جنگ کی بنیاد لڑنے والوں کی باہمی مفاہمت پر رکھی گئی ہے۔ چند سلطنتیں آپس میں ملکر طے کر لیتی ہیں کہ جب ہم آپس میں لڑیں گے تو فلاں فلاں قواعد کی پابندی کریں گے۔ اس مفاہمت میں جو قومیں شریک نہیں ہیں ان سے جنگ ہونے کی صورت میں اس قانون پر عمل نہیں ہوگا۔ جو قومیں اس مفاہمت سے الگ ہو جائیں وہ بھی اس قانون کی حدود سے نکل جائیں گی اور انہیں مہذب قوموں کے مہذب سلوک کا استحقاق باقی نہیں رہیگا۔ خود مفاہمت کے شرکاء میں سے بھی اگر کوئی مفاہمت کی خلاف ورزی کرے تو باقی شرکاء کے لئے جائز ہو جائیگا کہ اس کے مقابلہ میں قوانینِ جنگ کو بالائے طاق رکھ دیں۔ آخر الامر اس قانون شکنی سے خود قانون ہی بدل جاتا ہے۔ اس طرح یہ قانون کسی اخلاقی فرض کے احساس پر قائم نہیں ہے بلکہ محض مبادلہ اور باہمی مراعات پر قائم ہے۔ ایک فریقِ جنگ دوسرے فریقِ جنگ سے اس لئے مہذب سلوک نہیں کرتا کہ اسے بذاتِ خود ایسا کرنا چاہئے، بلکہ اس شرط کے ساتھ کرتا ہے کہ اگر اس کے ساتھ مہذب سلوک کیا گیا تو وہ بھی مہذب سلوک کرے گا، اور اگر نہ کیا گیا تو نہیں کرے گا۔ اسلامی قانون اس مفاہمت پر قائم نہیں ہے۔ اس نے جو ضوابط مقرر کئے ہیں ان کی پابندی مسلمانوں پر ہر حال میں واجب ہے خواہ غیر مسلم اس کے معاوضہ میں ان کے ساتھ مہذب سلوک کریں یا نہ کریں۔ اسلامی قانون کسی مسلمان کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کسی حال میں ان کی پابندی سے بری الذمہ ہو جائے۔ جسے مسلمان رہنا ہے اس کو ہر حال اس قانون کی سیادت تسلیم کرنی ہے۔

رابعًا، مغرب کے مہذب قوانین کو وجود میں آئے آج نصف صدی سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے، حالانکہ اسلامی قانون ساڑھے تیرہ سو برس سے دنیا میں تہذیب کا علم بلند کئے ہوئے ہے۔ اتنے بڑے تفاوتِ زمانی کے باوجود، جہاں تک اصول کا تعلق ہے، مغربی قانون نے اسلامی قانون

پر ایک حرف کا اضافہ نہیں کیا ہے۔ رہے فروع، تو ان میں بھی ان عملی جزئیات کو مستثنیٰ کر کے، جن کا تعلق ہر زمانہ کے وقتی حالات سے ہے، اسلامی قانون سے مغربی قانون کسی طرح بڑھا ہوا نہیں ہے، بلکہ اکثر پہلوؤں سے اسلام اب بھی مغربی قانون کے مقابلہ میں فوقیت رکھتا ہے۔

خامساً مغربی تہذیب نے انسان کو چند عملی قوانین کا پابند بنا کر آزاد چھوڑ دیا ہے کہ اپنی قوت کو جہاں چاہے اور جس غرض کے لئے چاہے استعمال کرے۔ وہ اس سے صرف یہ مطالبہ کرتی ہے کہ جب کسی کو مارے تو فلاں طریقوں سے مارے، اور فلاں طریقوں سے نہ مارے۔ باقی رہا یہ سوال کہ کس غرض کے لئے مارے اور کس غرض کے لئے نہ مارے، اس سے وہ کوئی تعرض نہیں کرتی جہاں تک ان مہذب قوموں کا عمل بتاتا ہے، اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مغربی تہذیب ملک گیری، توسیع تجارت، حصول مال و جاہ، جہانگیرانہ لوٹ مار، غرض تمام حیوانی خواہشات کے لئے جنگ کرنا جائز رکھتی ہے۔ بخلاف اس کے اسلام اپنے پیروؤں کو صرف لڑنے کے مہذب طریقوں ہی کا پابند نہیں بناتا بلکہ ان کو یہ بھی بتاتا ہے کہ فلاں فلاں مقاصد کے لئے تم جنگ کر سکتے ہو، اور فلاں مقاصد کے لئے نہیں کر سکتے۔ اس مسئلہ کو اس نے انسان کی اپنی ذاتی پسند پر نہیں چھوڑا ہے، بلکہ اسکو مخصوص اخلاقی حدود کا پابند بنا دیا ہے جن سے نکلنے کا اس کو حق نہیں دیا۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر اسلام کا قانونِ جنگ، مغرب کے قانون کے مقابلہ میں زیادہ صحیح، زیادہ مفید، زیادہ معقول، اور زیادہ مضبوط ہے۔

یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ مغرب کے معاملہ میں تو تم مغربی قوموں کے عمل دیکھتے ہو مگر اسلام کے معاملہ میں مسلمانوں کے عمل کو نہیں دیکھتے بلکہ محض اسلامی قانون کو دیکھتے ہو لیکن گذشتہ مباحث کو بغور دیکھنے سے یہ اعتراض خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی قانون اور مسلمانوں کا عمل دو بالکل الگ چیزیں ہیں۔ قانون سازی میں مسلمانوں کے عمل کو، بلکہ انکی مرضی کو بھی کوئی دخل نہیں ہے۔ اسلئے جب قانون کے حسن و قبح پر بحث ہو تو عمل کا سوال قدرتی طور پر خارج از بحث ہونا چاہیے۔ برعکس اس کے مغربی قانون اور مغربی قوموں کا عمل دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ قانون سازی میں ان قوموں کی مرضی کو ہی نہیں بلکہ ان کے عمل کو بھی خاص دخل حاصل ہے۔ اوپر یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ جہاں تک قانون جنگ کا تعلق ہے، مغربی قوموں کا عمل آگے آگے چلتا ہے اور قانون کو انکی پیروی کرنی پڑتی ہے اسلئے ہم مغرب کے معاملہ میں انکے عمل کو دیکھنے پر مجبور ہیں۔

فہرست مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

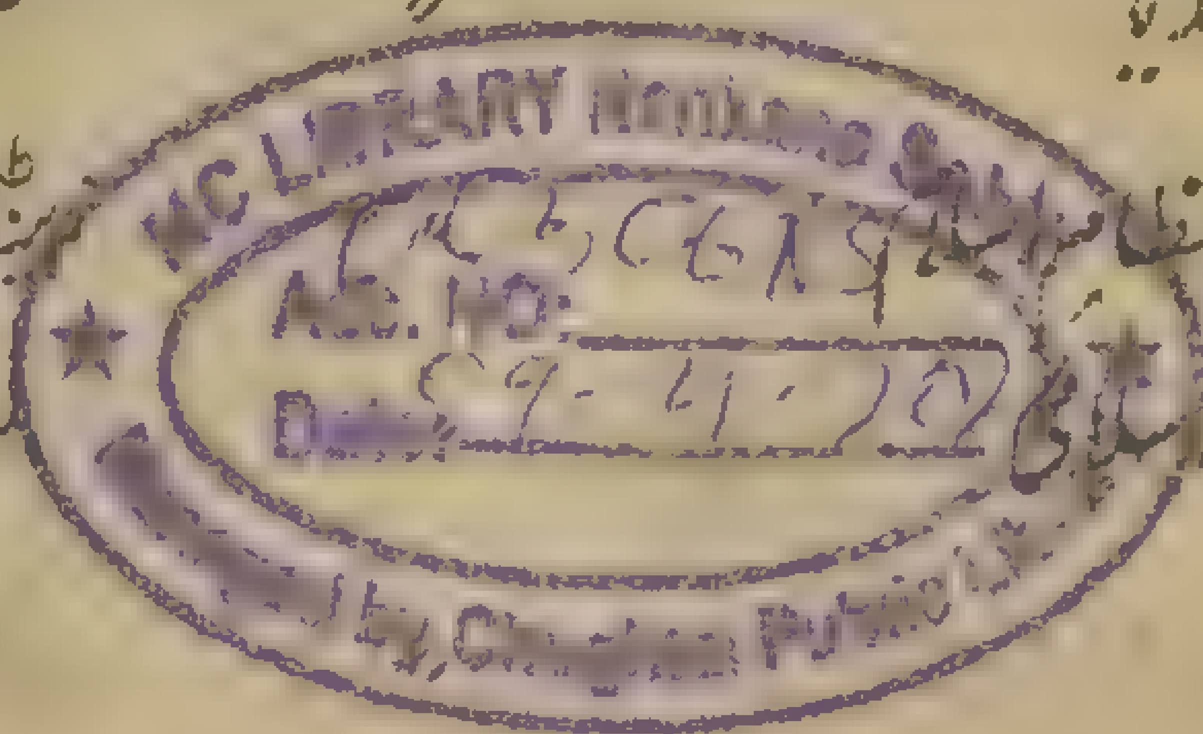
لاہور (پاکستان)

۱۔ رسالہ دینیات	قیمت	عہ ۹ر	(علاوہ محصول ڈاک)
۲۔ خطبات	"	سے ر	"
۳۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول	"	عہ ر	"
۴۔ " " " " " (دوم)	"	عا ۸ر	"
۵۔ " " " " " (سوم)	"	عا ر	"
۶۔ مسئلہ قومیت	"	عہ ۸ر	"
۷۔ تنقیحات	"	عا ۸ر	"
۸۔ تفہیمات	"	سے ۸ر	"
۹۔ مسئلہ جبر وقدر	"	عہ ر	"
۱۰۔ تجدید واحیائے دین	"	عہ ر	"
۱۱۔ پردہ	"	عا ۸ر	"
۱۲۔ حقوق الزوجین	"	عہ ۹	"
۱۳۔ اسلام اور ضبط ولادت	"	عہ ر	"
۱۴۔ الجہاد فی الاسلام	"	شے	"
۱۵۔ سُود	"	عا ۸ر	"

۱۶-قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں قیمت ۴؍ علاوہ محصولڈاک

تبلیغی پمفلٹ

۱۷-سلامتی کا راستہ	قیمت	۶ر	(علاوہ محصولڈاک)
۱۸-اسلام اور جاہلیت	"	۴ر	"
۱۹-نشانِ راہ	"	۶ر	"
۲۰-اسلام کا نظریہ سیاسی	"	۸ر	"
۲۱-اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	"	۸ر	"
۲۲-ایک نہایت اہم استفتا	"	۱۳ر	"
۲۳-انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	"	۸ر	"
۲۴-نیا نظام تعلیم	"	۶ر	"
۲۵-انگریزی ترجمہ رسالہ دینیات	"	۳؍	"
۲۶-انگریزی ترجمہ نظریہ سیاسی	"	۱۲ر	"
۲۷- " " اسلامی حکومت	"	۱۲ر	"
۲۸-نیشنلزم اینڈ انڈیا	"	۱۲ر	"
۲۹-ہیگل مارکس اور نظام اشتراکیت	"	زیر طبع	
۳۰-دستور جماعت اسلامی		۱۲ر	"
۳۱-دینِ حق		۶ر	"



ملنے کا پتہ: مکتبہ جماعت اسلامی ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ-لاہور

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi —This treatise deals with Nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & Its Islamic Solution** —By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56-Price As. 12

7. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

8. **After Secularism what ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from :

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/-/-	اسلام کیا ہے (انگریزی) نیاایڈیشن
رسالہ دینیات	۱/۸/-	الحاد کے بعد کیا (")
حقوق الزوجین	۱/۸/-	سلامتی کا راستہ
مسئلہ قومیت	۱/۸/-	اسلام کا نظریہ سیاسی
مسئلہ جبر و قدر	۱/-/-	" " " (انگریزی)
تجدید و احیائے دین	۱/-/-	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-/-	" " " (انگریزی)
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴/-	انسان کا معاشی مسئلہ
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴/-	" " " (انگریزی)
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸/-	اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/-/-	" " " (انگریزی)
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	نیا نظام تعلیم
پردہ	۲/۸/-	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا ائندہ
تنقیحات	۲/۸/-	لائحہ عمل
خطبات نیا ایڈیشن	۳/-/-	دین حق
تفہیمات	۳/۸/-	اسلام اور جاہلیت
حقیقت توحید	۱/۲/-	ایک اہم استفتا
اسلام اور ضبط ولادت	۱/-/-	دستور جماعت اسلامی
سود	۲/۸/-	روداد جماعت اسلامی حصہ اول
اشتراکیت اور نظام اسلام	(زیر طبع)	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم
رسالہ دینیات (انگریزی)		روداد جماعت اسلامی حصہ سوم
نیاایڈیشن	۳/۸/-	روداد اجتماع خواتین

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

۵۔الف ذیلدار پارک اچھرہ۔لاہور (پاکستان)

مطبوعہ رتن پریس، لاہور

